

جنوری 2012

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

# عمران ڈائجسٹ

دو سوسے طرز تحریریں

کاربری - فولاد

رسم ادبی کی تاریخی کہانی

نیکوش و نگاری

آدم و رکتہ ماسشرق ناول

کھانا لکنا

8 بابینہ ہے

۴۱

بابینہ کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

10 سکن لکجی

۱۳۸

سکن لکجی کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

46 رشتہ خوں

۱۳۹

رشتہ خوں کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

61 شہنشاہ

۱۴۰

شہنشاہ کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

82 انجہام

۱۴۱

انجہام کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

88 دگر

۱۴۲

دگر کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔



111 پیراچاول

۱۴۳

پیراچاول کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

122 شکست خوردہ

۱۴۴

شکست خوردہ کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

130 استہیا

۱۴۵

استہیا کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

137 قیمت کاسفر

۱۴۶

قیمت کاسفر کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

175 گھاٹ کا سوگا

۱۴۷

گھاٹ کا سوگا کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

186 تہمت

۱۴۸

تہمت کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

192 فولاد

۱۴۹

فولاد کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

117 دل بے شیشہ

۱۵۰

دل بے شیشہ کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

222 کوئی

۱۵۱

کوئی کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

229 دوزخ لارہ

۱۵۲

دوزخ لارہ کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔



236 خاموشی

۱۵۳

خاموشی کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

241 احساں زندگی

۱۵۴

احساں زندگی کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

249 صغیر کی عالتی

۱۵۵

صغیر کی عالتی کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

260 بکرا کی لمبا

۱۵۶

بکرا کی لمبا کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

264 رگنا اشکا

۱۵۷

رگنا اشکا کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔

\*\*\* کرینہ

۱۵۸

کرینہ کے لئے ایک نیا عالم ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔ یہ ایک نیا عالم ہے جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔





## قارئین محترم ..... سلام مسنون!

نئے سال کا پہلا شمارہ حاضر ہے۔ موجودہ شمارے میں آپ کی پسند کے مطابق انتخاب کردہ تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ آخری صفحات پر ایک طویل اور سنسنی خیز ناول شامل ہے جو قارئین کے معیار پر پورا اترے گا۔ اس کے علاوہ ان قلم کاروں کی تحریریں بھی جن کو آپ پسند کرتے ہیں۔ قارئین طویل کہانیوں کے علاوہ مختصر کہانیاں بھی پسند کرتے ہیں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ مختصر کہانیوں کی تعداد زیادہ ہو۔ اردو ادب سے انتخاب کے علاوہ سچی داستانیں کے حوالے سے بھی کہانیاں موجود ہیں، سچی داستانیں کی کہانیاں قارئین کی ارسال کردہ ہیں۔ ہم آپ تمام قارئین کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ کوئی بھی واقعہ جو آپ کے ذہن میں تازہ ہو ہمیں لکھ بھیجیں، ہم اس کی نوک پلک سنوار کر اسے شائع کر دیں گے۔ اب چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب جہاں آپ کے محبت نامے اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔

☆ محمد اقبال تبسم صاحب فیصل آباد سے لکھتے ہیں کہ عمران ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ اس ماہ کی اچھی تحریروں میں اسلم راہی کی ”سرکش راجپوتاری“ احمد صغیر صدیقی کی ”عشق کہانی“ ایم الیاس کی ”دو گز زمین بھی“ شمیم غلام نبی کی ”خوشبو کا جھونکا“ کامران جاذب کی ”یتیم“ غزالہ جلیل راؤ کی ”داسی“ سیما کاجل کی ”پرکار“ عابد علی سیدی کی ”دودھ کا جلا“ دانش کمال کی ”قیمت“ نازش شاہین کی ”انوکھا شخص“ کبیر احمد صدیقی کی ”نادان“ حسن علی خان کی ”حقیقت حال“ محمد صدیق طاہر کی ”علم“ صابر علی ہاشمی کی ”اعتراف جرم“ وقار بن سعید کی ”حق“ راحیلہ جبین بدر کی ”قاتل یا مقتول“ آغا دلدار کی ”کج فہمی“ ایم اے راحت کی ”فولاد“ مرزا حیدر عباس کی ”بوری“ اشفاق احمد کی ”چور“ ممتاز مفتی کی ”پالجر“ منیرہ احمد شمیم کی ”ادھوری لڑکی“ نوازش شاہین کی ”سزا“ ہما صفدر کی ”غبار کاروان“ اور ایم اے راحت کی ”درد مشترک“ اچھی کہانیاں تھیں۔

☆ محترم محمد اقبال تبسم صاحب! آپ کے تبصرے کا شکریہ۔ کہانیاں آپ کو پسند آئیں، اس کے لیے ہم آپ کے ممنون ہیں۔ آپ کی رائے ہی ہمارے لیے اچھی تحریروں کے انتخاب کے لیے راہ متعین کرتی ہے۔

☆ ملتان کی ارم طاہر صاحبہ سال کے آخری شمارے پر اپنے تبصرے میں لکھتی ہیں کہ دبیر کے عمران ڈائجسٹ کا کھلنا ہوا اور دیدہ زیب ٹائٹل دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ اس شمارے کی پہلی کہانی سے لے کر آخری کہانی تک تمام کی تمام اچھی اور دلچسپ تھیں۔ خاص خاص کہانیوں میں سے ”سرکش راجپوتاری“ عشق کہانی“ دو گز زمین بھی“ خوشبو کا جھونکا“ یتیم“ داسی“ پرکار“ دودھ کا جلا“ قیمت“ انوکھا شخص“ نادان“ حقیقت حال“ علم“ اعتراف جرم“ حق“ قاتل یا مقتول“ کج فہمی“ فولاد“ بوری“ چور“ پالجر“ ادھوری لڑکی“ سزا“ غبار کاروان“ اور ”درد مشترک“ اچھی لگیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بہت اچھا تھا۔

☆ محترمہ ارم طاہر صاحبہ! آپ کو ہماری محنت پسند آئی، ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ ان سطور کے ذریعے آپ کی مبارکباد تمام افراد تک پہنچ جائے گی۔ آپ کے تبصرے کا شکریہ۔

☆ کراچی کے ڈاکٹر احمد حسین گزشتہ شمارے پر اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں کہ موجودہ شمارہ ٹائٹل اور کہانیوں کے انتخاب کے اعتبار سے تمام دیگر شماروں سے مختلف ثابت ہوا۔ خاص طور پر تینوں سلسلے وار کہانیاں..... اس شمارے کی دیگر کہانیوں میں اسلم راہی کی ”سرکش راجپوتاری“ احمد صغیر صدیقی کی ”عشق کہانی“ ایم الیاس کی ”دو گز زمین بھی“ شمیم غلام نبی کی ”خوشبو کا جھونکا“ کامران جاذب کی ”یتیم“ غزالہ جلیل راؤ کی ”داسی“ سیما کاجل کی ”پرکار“ عابد علی سیدی کی ”دودھ کا جلا“ دانش کمال کی ”قیمت“ نازش شاہین کی ”انوکھا شخص“ کبیر احمد صدیقی کی ”نادان“ حسن علی خان کی ”حقیقت حال“ محمد صدیق طاہر کی ”علم“

صابر علی ہاشمی کی ”اعتراف جرم“ وقار بن سعید کی ”حق“ راحیلہ جبین بدر کی ”قاتل یا مقتول“ آغا دلدار کی ”کج فہمی“ ایم اے راحت کی ”فولاد“ مرزا حیدر عباس کی ”بوری“ اشفاق احمد کی ”چور“ ممتاز مفتی کی ”پالجر“ منیرہ احمد شمیم کی ”ادھوری لڑکی“ نوازش شاہین کی ”سزا“ ہما صفدر کی ”غبار کاروان“ اور ایم اے راحت کی ”درد مشترک“ اچھی تھیں۔ ہاں..... میری جانب سے آپ تمام افراد کو سال نو کی مبارکباد۔

☆ محترم ڈاکٹر احمد حسین! آپ کی مبارکباد تمام افراد تک پہنچادی گئی ہے۔ آپ کو عمران ڈائجسٹ پسند آیا، ہم اس کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اس محفل میں رونق افروز ہوتے رہیں گے۔

☆ لاہور کے شوکت علی رقم طراز ہیں کہ موجودہ شمارہ ٹائٹل سے آخری کہانی کی آخری سطر تک نہ صرف دلچسپیاں موجود تھیں۔ اس شمارے میں ”سرکش راجپوتاری“ عشق کہانی“ دو گز زمین بھی“ خوشبو کا جھونکا“ یتیم“ داسی“ پرکار“ دودھ کا جلا“ قیمت“ انوکھا شخص“ نادان“ حقیقت حال“ علم“ اعتراف جرم“ حق“ قاتل یا مقتول“ کج فہمی“ فولاد“ بوری“ چور“ پالجر“ ادھوری لڑکی“ سزا“ غبار کاروان“ اور ”درد مشترک“ اچھی تھیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بہت پسند آیا۔

☆ برادر شوکت علی! آپ نے یاد رکھا، ہمارے لیے یہ بے حد خوشی کی بات ہے۔

☆ پشاور دہلی سے عمران ڈائجسٹ کے ایک پرانے قاری مقصود علی راحت رقم طراز ہیں کہ ایک طویل عرصہ کے بعد اس رنگارنگ محفل میں شرکت کر رہا ہوں۔ حالیہ شمارے میں اسلم راہی کی ”سرکش راجپوتاری“ احمد صغیر صدیقی کی ”عشق کہانی“ ایم الیاس کی ”دو گز زمین بھی“ شمیم غلام نبی کی ”خوشبو کا جھونکا“ کامران جاذب کی ”یتیم“ غزالہ جلیل راؤ کی ”داسی“ سیما کاجل کی ”پرکار“ عابد علی سیدی کی ”دودھ کا جلا“ دانش کمال کی ”قیمت“ نازش شاہین کی ”انوکھا شخص“ کبیر احمد صدیقی کی ”نادان“ حسن علی خان کی ”حقیقت حال“ محمد صدیق طاہر کی ”علم“ صابر علی ہاشمی کی ”اعتراف جرم“ وقار بن سعید کی ”حق“ راحیلہ جبین بدر کی ”قاتل یا مقتول“ آغا دلدار کی ”کج فہمی“ ایم اے راحت کی ”فولاد“ مرزا حیدر عباس کی ”بوری“ اشفاق احمد کی ”چور“ ممتاز مفتی کی ”پالجر“ منیرہ احمد شمیم کی ”ادھوری لڑکی“ نوازش شاہین کی ”سزا“ ہما صفدر کی ”غبار کاروان“ اور ایم اے راحت کی ”درد مشترک“ متاثر کن تھیں۔

☆ محترم مقصود علی راحت صاحب! بڑے پر تبصرہ کرنے کا شکریہ۔ آپ کے مشورے قابل عمل ہیں، نوٹ کر لیے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اپنی اس محفل کو رونق بخشیں گے۔

☆ بہاولنگر سے عزیز الدین بدر پرچے پر اپنی پسندیدگی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ دبیر کا پر جانظر افروز ہوا۔ ٹائٹل شاندار تھا۔ فہرست کی تبدیلی بھلی لگی۔ تحریروں میں اسلم راہی کی ”سرکش راجپوتاری“ احمد صغیر صدیقی کی ”عشق کہانی“ ایم الیاس کی ”دو گز زمین بھی“ شمیم غلام نبی کی ”خوشبو کا جھونکا“ کامران جاذب کی ”یتیم“ غزالہ جلیل راؤ کی ”داسی“ سیما کاجل کی ”پرکار“ عابد علی سیدی کی ”دودھ کا جلا“ دانش کمال کی ”قیمت“ نازش شاہین کی ”انوکھا شخص“ کبیر احمد صدیقی کی ”نادان“ حسن علی خان کی ”حقیقت حال“ محمد صدیق طاہر کی ”علم“ صابر علی ہاشمی کی ”اعتراف جرم“ وقار بن سعید کی ”حق“ راحیلہ جبین بدر کی ”قاتل یا مقتول“ آغا دلدار کی ”کج فہمی“ ایم اے راحت کی ”فولاد“ مرزا حیدر عباس کی ”بوری“ اشفاق احمد کی ”چور“ ممتاز مفتی کی ”پالجر“ منیرہ احمد شمیم کی ”ادھوری لڑکی“ نوازش شاہین کی ”سزا“ ہما صفدر کی ”غبار کاروان“ اور ایم اے راحت کی ”درد مشترک“ بہت اچھی تھیں۔ اردو ادب کا انتخاب بھی اچھا تھا۔ ادارہ کے تمام کارکنان کو نئے سال کی مبارکباد پہنچادیں۔

☆ عزیز الدین بدر صاحب! آپ کو ہماری محنت پسند آئی، شکریہ۔ آئندہ بھی اپنی محبتوں میں یاد رکھیے گا۔ شکریہ۔

قارئین..... آئندہ ماہ تک کے لیے اجازت اللہ حافظ مدیر



تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے بطور خاص

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں اس کا اہم سبب جہاں اختیارات اقتدار اور دولت تھی وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگجو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آنے لگی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال تاریخی حقائق طویل داستان





**مالوہ** کا حکمران سلطان محمود جی کا وزیر میدتی رائے ایک اپنے قریب ترین ساتھی اور محمود جی کے لشکر کے اچھے سالاروں میں سے ایک نام جس کا سالباہن تھا۔ دونوں بیٹے بڑی راز داری سے کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اور میدتی رائے کا ایک خاص آدمی پہرہ دے رہا تھا۔ ایسے میں وہ پہرہ دینے والا اس کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا جس میں میدتی رائے اور سالباہن دونوں بیٹھے باہم گفتگو کر رہے تھے۔ اس کے اس طرح کمرے کے دروازے پر آنے پر میدتی رائے اور سالباہن دونوں چونکے پھر میدتی رائے نے اسے مخاطب کیا۔

”کیا کوئی کام ہے۔“

اس پر اس محافظ نے پہلے اثبات میں گردن ہلائی پھر دہشتی اور بلکے آواز میں کہنے لگا۔

”ایک شخص آپ دونوں کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ رکا اور پھر ذرا آگے بڑھ کے قریب ہوتے ہوئے انتہائی راز داری میں کہنے لگا۔

”آنے والا رانا سانگا کا خاص آدمی ہے اور وہ آپ دونوں کے لیے رانا سانگا کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔“

میدتی رائے اور سالباہن دونوں چونکے پھر اس محافظ سے کہا۔

”اسے زیادہ دیر باہر کھڑا نہ کرو جلدی اندر بھیجو تاکہ ہم جائیں رانا سانگا کی طرف سے وہ کیا پیغام لے کر آیا ہے۔“ اس پر تھوڑی دیر بعد ایک شخص جو رانا سانگا کا قاصد تھا کمرے میں داخل ہوا۔ میدتی رائے اور سالباہن نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ اپنے قریب بٹھایا پھر میدتی رائے نے اسے مخاطب کیا۔

”میرے عزیز تو ہمارے لیے کیا پیغام لایا ہے۔“

جواب میں وہ قاصد اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”رانا سانگا کا آپ دونوں کا

نام پیغام یہ ہے کہ مالوہ کی مملکت کے اندر سلطان محمود جی کے خلاف آپ دونوں اپنی کاروائیوں میں تیزی اور سرعت پیدا کریں رانا سانگا اب زیادہ عرصہ سلطان محمود جی کو مالوہ کا حکمران نہیں دیکھنا چاہتا۔ رانا سانگا کے پاس سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مالوہ میں ہندو راجپوتوں کی تعداد زیادہ ہے اور پھر چالیس ہزار کے لگ بھگ راجپوت سلطان محمود جی کے لشکر میں شامل ہیں ایسی صورت میں سلطان محمود جی کیسے زیادہ عرصہ تک مالوہ کا حکمران رہ سکتا ہے۔ آپ دونوں کے نام اس کا پیغام ہے کہ دو کاموں میں سے ایک کریں یا تو کسی طریقہ سے محمود جی اور اس کے حواریوں کا کام تمام کر دیں یہاں اس کے لیے حالات اس قدر تنگ اور ناقابل برداشت کر دیں کہ وہ شک ہو کر مالوہ سے بھاگنے پر مجبور ہو جائے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد قاصد رکا جب وہ رکا تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے میدتی رائے کہنے لگا۔

”اس معاملے میں اس قدر جلدی نہیں کرنی چاہیے ورنہ بنایا تھیل بگڑ بھی سکتا ہے دیکھو معاملے کو بگاڑنا بڑا آسان ہے اور کامیابی سے اس کے انجام تک پہنچنا بڑا مشکل ہے۔ سلطان محمود جی کو مجھ سے اور سالباہن سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ اس میں کوئی شک نہیں اس کے لشکر میں راجپوتوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن اس کے اپنے لشکر اور مسلمان بھی بہت ہیں اور پھر رانا کو یہ بات بھی اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خود سلطان محمود جی انتہا کا دلیر بہادر جرات مند اور جنگجو ہے چھوٹے موٹے معاملات سے وہ گھبرانے والا نہیں ہے ہم آہستہ آہستہ اس کے خلاف اپنی سازشوں کے دائرے کو تنگ کرنے جا رہے ہیں اور ایک دن ایسا آئے گا کہ ہمیں اسے قتل نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ اسی میں اپنی بہتری اور تحفظ خیال کرے گا کہ وہ مالوہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔“

اتنا کہنے کے بعد میدتی رائے جب خاموش ہوا تب آنے والا قاصد بولا اور کہنے لگا۔

”جب میں مالوہ کی سرزمینوں میں داخل ہوا تو مجھے کچھ لوگوں سے پتہ چلا کہ سلطان محمود جی کے علاقوں میں دھارو اور بروہہ کے مقام پر کچھ راجپوتوں نے اس کے خلاف بغاوت کھڑی کر رکھی ہے اور وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ سلطان محمود جی کو تخت و تاج سے محروم کیا جائے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد وہ قاصد جب خاموش ہوا تب میدتی رائے نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا شروع کیا۔

”یہ بروہہ اور دھارو کے راجپوتوں کی بہت بڑی غلطی ہے انہیں ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح حالات ہمارے حق میں عزیز خراب ہوں گے میں اور سالباہن رانا سانگا کے کہنے پر جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کر پائیں گے اب جو بروہہ اور دھارو کے راجپوتوں نے بغاوت اور سرکشی کی ہے اس سے میں اور سالباہن نے تو لاتعلقی ظاہر کر دی ہے اور ہم نے اپنی حالت سلطان محمود جی کے سامنے صاف کر دی جن کے نتیجے میں میرا اندازہ کہ سلطان محمود جی بروہہ اور دھارو کے راجپوتوں کے خلاف ضرور حرکت میں آئے گا اور جب وہ ایسا کرے گا تو وہاں پھر راجپوتوں کو سلطان محمود جی کے ہاتھوں بے پناہ نقصان اٹھانا پڑے گا اور یہ کوئی اچھا فعل نہیں ہوگا۔“

میدتی رائے جب خاموش ہوا تب قاصد کہنے لگا۔ ”دراصل رانا سانگا چاہتا ہے کہ بہت جلد گجرات کے سلطان مظفر کے گرد گھیرا تنگ کیا جائے اس لیے کہ ان دنوں رانا سانگا کی سلطان مظفر کے ساتھ پیش قدمی چل رہی ہے اصل بات یہ ہے کہ رانا سانگا کے سینا پتی رنیر سنگھ کے بھائی اور اس کے آدمیوں نے مسلمانوں کے ایک تجارتی کارواں پر حملہ کیا اور بہت سے تاجروں کو قتل کر کے ان کا سامان لوٹ لیا۔ ان تاجروں میں کچھ ایسے معزز تاجر بھی تھے جن کے تعلقات گجرات کے سلطان مظفر کے ساتھ بڑے گہرے تھے چنانچہ ان کا انتقام لینے کے لیے سلطان مظفر کے لشکر کا ایک حصہ ہمارے علاقوں پر حملہ آور

ہونا شروع ہو گیا۔ ان جملوں کو روکنے کے لیے رانا سانگا نے اپنے سینا پتی رنیر سنگھ کو روانہ کیا۔ دونوں لشکروں کا ٹکراؤ ہوا اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں سلطان مظفر کے ایک سالار نام جس کا قیصر خاں ہے اس نے جنگ کے دوران رنیر سنگھ کی گردن کاٹ دی اور اس کے لشکر کو شکست دی۔

اس کے بعد رانا سانگا نے اپنے ایک اور بڑے سالار کرشن دیو کو سینا پتی بنایا اسے اس ہم پر بھیجا لیکن کرشن دیو کی بد قسمتی کہ اسے بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس بار رانا سانگا کی راج کمار کی کوشلیا بھی اس لشکر میں شامل تھی۔

دو شکستوں کے بعد نہ صرف یہ کہ راج کمار کی کوشلیا اور رانا سانگا کی غصے اور غضبناکی کی کوئی انتہا نہ تھی بلکہ راجپوت لشکر کی بھی غضبناک ہو گئے تھے لہذا دو لشکر تیار کیے گئے ایک رتن چند کی سالاری میں اور دوسرا کرشن دیو کی سالاری میں۔ دونوں کو گجرات کے لشکر سے ٹکرانے کے لیے بھیجا گیا لیکن دونوں لشکروں کی بد قسمتی کہ دونوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور حیرت کی بات اس ٹکراؤ میں گجرات کے سلطان مظفر کے سالار قیصر خاں نے راج کمار کی کوشلیا کو پکڑ لیا۔ میدتی رائے سالباہن نے میرے محترم جانتے ہو اس نے راج کمار کی کو کیسے پکڑا۔

شکست کے بعد جب راج کمار کی بھاگنے لگی تو اس نے اس کا پھینکا کیا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے راج کمار کی کوشلیا کی گردن پر اتار دیا اور اتار سے گھوڑے کی پیٹھ سے اٹھا کر کسی ہلکی پھلکی لکڑی کی چیز کی طرف اس نے زمین پر دے پٹھا اس موقع پر وہ نیزہ اتار کر اس کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا کہ کوشلیا کی خوش قسمتی کہ اس کے سر سے خود اتر گیا اور اس کے بال بکھر گئے جس پر وہ جان گیا کہ وہ راج کمار کی کوشلیا ہے اس نے اپنا نیزہ زمین سے لگا لیا اور کوشلیا سے کہا کہ وہ چلی جائے اس لیے کہ مسلمان عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے اس طرح کوشلیا کی جان بچ گئی لیکن شکست تیسری بار بھی ہمارے ہی حصے میں آئی۔“



یہ سب سننے کے بعد سالباہن پہلی دفعہ بولا اور کہنے لگا۔ ”یہ تو بڑی بے غیرتی والا معاملہ ہوا ہم نے تو سن رکھا ہے راج کماری کو شلیا جنگی امور میں ایسی مہارت اور ہنرمندی رکھتی ہے نہ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا پھر کجرات کے سلطان مظفر کے سالار نے اسے گردن سے پکڑ کر زمین پر دے پٹا تو پھر میں سمجھتا ہوں وہ بھی بڑا خونخوار اور ہنرمند سپہ سالار ہوگا لیکن رانا سانگا کو اس کا کسی نہ کسی طریقہ سے کام تمام کرنا چاہیے اس لیے کہ اس نے اس کی راج کماری کو چھوٹا ہاتھ لگایا وہ اچھوت ہے۔“

اس پر قاصد نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر کہنے لگا۔

”رانا سانگا نے اس کا بندوبست کیا ہے اس نے اپنی مملکت میں منادی کرا کے عہدہ عہدہ تیغ زبوں کو اپنے پاس جمع کیا اور ان دنوں وہ ان کے مقابلے کرا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دو بہترین تیغ زبوں کا چنناؤ کرے جو آئے والے دور میں لکراؤ کے دوران سلطان مظفر کے سالار قیصر خاں سے باری باری انفرادی مقابلہ کریں اور اس کا کام تمام کریں لیکن ان دنوں رانا ایک اور بہت بڑا کام کرنے پر تھلا ہوا ہے۔“

”کیا کام.....“ غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے میدنی رائے نے پوچھ لیا۔

قاصد نے پھر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہنے لگا۔

”رانا نے اپنے داماد اور اپنی بڑی راج کماری کو تلیا کے شوہر رائے تل کو اپنے پاس بلایا ہے اب رانا اپنی تیار یوں کو آخری شکل دے رہا ہے وہ ایدر کے راجہ رائے بھیم پر حملہ آور ہوگا اس لیے کہ رائے بھیم کا جھکاؤ کجرات کے سلطان مظفر کی طرف ہے اس لیے رانا سانگا اس پر حملہ آور ہو کر اس کے علاقوں پر قبضہ کر کے وہاں کا راجہ اپنے داماد رائے تل کو بھانا چاہتا ہے۔ یہ کام سرانجام دینے کے بعد رانا چاہتا ہے کہ پوری توجہ مالوہ کے حکمران سلطان محمود علی کے خلاف کی جائے اور اسے یا تو قتل کر دیا جائے یا مالوہ

کی حکومت سے محروم کر دیا جائے اس طرح رانا سانگا کجرات کے سلطان مظفر گرد ایک گھیر آہستہ آہستہ تنگ کرتے ہوئے اس پر ایسی ضرب لگانا چاہتا ہے کہ اس کا کام تمام کر دے یا کم از کم اس سے اپنی شکستوں کا انتقام لے۔“

قاصد جب خاموش ہوا تب اس بار پھر سالباہن بولا اور کہنے لگا۔

”رانا سانگا کے خیالات بہت اچھے ہیں ایسا ہونا بھی چاہیے اور ایسا ہو کر رہے گا۔“ سالباہن جب خاموش ہوا تب بڑی راز داری میں میدنی رائے قاصد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”دیکھو یہ کام اتنی تیزی سے نہیں کیا جاسکتا جتنی تیزی سے رانا چاہتا ہے یہاں کے مسلمان اپنے ہی سلطان محمود علی کی طرف سے بیزار ہیں ان کا کہنا ہے کہ سلطان محمود علی نے راجپوتوں کو خواہ اس پر چڑھ کر رکھا ہے وہ میرے وزیر ہونے پر بھی اعتراض کرتے ہیں اور سالباہن کے سالار ہونے پر بھی انہیں اعتراض ہے ان کے پاس یہ بھی بڑا اعتراض ہے کہ سلطان محمود علی مسلمانوں پر ہندو راجپوتوں کو ترجیح دیتا ہے اور انہیں نوازتا ہے ان حالات میں اگر ہم نے جلدی بازی کرنے کی کوشش کی تو مسلمان اٹھ کھڑے ہوں گے اور سلطان محمود علی کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں گے اور دیکھو سلطان محمود علی اس طرح کھل کر اپنے مسلمان لشکریوں کے ہمارے خلاف آگیا تو پھر وہ ہمارے لیے بڑا نقصان دہ ہوگا لہذا واپس جا کر میری اور سالباہن کی طرف سے رانا سے کہنا کہ جو کام آپ نے ہمیں سونپا ہوا ہے اسے ہم بڑی دیانتداری اور بڑی جانفشانی سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور عنقریب اس کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے تو ہمارے حق میں یقیناً سودمند ہوں گے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ قاصد اٹھا اور کہنے لگا۔

”میرا یہاں قیام نقصان دہ ہے میں اب جاتا ہوں بہر حال میں نے جو پیغام دینا تھا اس تک پہنچا دیا۔“ اس کے ہی وہ مقاصد وہاں سے نکل گیا تھا۔

جب کہ میدنی رائے سالباہن بڑی راز داری سے اس موضوع پر گفتگو کرنے لگے تھے۔ ان دنوں کی گفتگو کا موضوع اور ان کی ساری کارکردگی اور تنگ و دو کا لب لباب اب صرف یہی رہ گیا تھا کہ رانا سانگا کی مدد سے کسی نہ کسی طرح مالوہ کے سلطان محمود علی کو تحت و تاج سے محروم کر دیا جائے۔ یا اسے حالات کی ایسی تنگنا میں مل کھڑا کر دیا جائے کہ وہ مالوہ سے بھاگنے پر مجبور ہو جائے۔

☆☆

میدنی رائے اور سالباہن کے اندازے اور اندیشے درست ثابت ہوئے اس لیے کہ مالوہ کا حکمران محمود علی ایک لشکر کے ساتھ نکلا اور دھارو اور بروہہ کے باغی اور سرکش راجپوتوں کی بغاوت اور سرکشی کو کچلنے کے لیے اس نے پہلے بڑی تیزی اور برق رفتاری سے دھارو کا رخ کیا تھا۔

دوسری طرف باغی راجپوتوں کے خیر بھی کام کر رہے تھے انہیں جب خبر ہوئی کہ سلطان محمود علی ان پر حملہ آور ہونے کے لیے نکلا ہے اور پہلے وہ دھارو کا رخ کرے گا لہذا بروہہ میں جو راجپوت باغی تھے وہ بھی بڑی تیزی سے حرکت میں آئے اور سلطان محمود علی کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ بروہہ سے نکل کر دھارو پہنچ گئے۔ اس طرح دھارو کے نواح میں سلطان محمود علی کا مقابلہ کرنے کے لیے راجپوتوں نے ایک بڑا لشکر تیار کر لیا تھا اور اس لشکر کی پشت پناہی یقیناً رانا سانگا کر رہا تھا۔

سلطان محمود علی بلاتا خیر راجپوتوں کے لشکر کے سامنے گیا اور وہاں پڑاؤ کر لیا یوں ہی اس نے پڑاؤ کیا راجپوتوں نے فیصلہ کیا اس پر ضرب لگانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ وہ اپنے لشکر کی صفیں درست کرنے لگے ان کی حالت دیکھتے ہوئے سلطان محمود علی نے بھی اپنے لشکر کو استوار کرنا شروع کر دیا تھا چونکہ راجپوتوں نے بغاوت کرنے میں پہل کی تھی لہذا ان پر حملہ آور ہونے میں پہل سلطان محمود علی نے کی اس نے اپنے لشکر کو آگے بڑھایا پھر وہ راجپوتوں پر رگول

تک چوس لینے والے خیالی حلقوں کو مسمار کر دینے والی خوفناک زہریلی آوازوں، تاریخ کے اوراق پر تشدد کے آلاؤ، انتقام بھرے غماز کھڑے کر دینے والے دیو مالائی طلسم کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

جوانی کا ردائی کرتے ہوئے باغی اور سرکش راجپوت بھی سلطان محمود علی کے لشکر پر نصب کی کھوکھو، عنادی بھڑکتی آگ، نفرت کی جوالا آگ اور شام کے لباس میں جھپکتی دکھ بھرے اندھیروں کی چادر میں نحوست کی بیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔

اس طرح دھارو کے نواح میں دونوں لشکریوں کے ٹکرانے سے آنکھوں میں قضا کے رنگ ہونٹوں پر موت کی پڑیاں درد کے فاصلے دکھ والہ کے حروف کرب کی لکھی رقص کرنے لگی تھیں کچھ دیر تک دونوں لشکریوں کے درمیان ہولناک ٹکراؤ ہوتا رہا راجپوتوں کو بڑی امید تھی کہ وہ سلطان محمود علی کو پس کر دینے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ان کی بد قسمتی سلطان محمود علی نے اپنے لشکر کی تعداد کم ہونے کے باوجود راجپوتوں کو بدترین شکست دی اور راجپوت شکست اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

سلطان محمود علی نے اسی پر اتفاق نہیں کیا بلکہ آندھیوں کے دوش پر پہنچوں کے نزول پر جنگل کے اندھے کالے طوفانوں، جذلوں کی وحشی آوازوں، بھڑکتی رگ کے غضب اور دکھ کی گرم ہواؤں کی طرح ان کے پیچھے لگ گیا تھا اور بڑی شدت سے ان کا تعاقب کرنا شروع کر دیا تھا اس تعاقب کے دوران اس نے راجپوتوں کا قتل عام کر کے ان کی تعداد مزید کم کی اس کے بعد وہ اس جگہ آیا جہاں دھارو کے نواح میں یہ ٹکراؤ ہوا تھا، بھاگنے والے راجپوتوں کے پڑاؤ کی ہر چیز پر اس نے قبضہ کر لیا اور احتیاط کی خاطر اپنے لشکر کے ساتھ اس نے وہاں پڑاؤ کر لیا تھا۔

☆☆

رانا سانگا ایک روز اپنے قصر میں اپنی رانی لکھاوتی کے ساتھ بیٹھا کسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا کہ اس کمرے میں اس کی دونوں بیٹیاں کوشلیا اور



کوتلیا داخل ہوئیں، دونوں اپنے مانا پتا کے سامنے  
تشت پر بیٹھ گئیں۔

اس موقع پر حسین کوٹلیا نے اپنے باپ رانا  
سانگا کی طرف دیکھتے ہوئے شکوہ بھری آواز میں کہنا  
شروع کیا۔

”پتا جی آپ نے میری بہن کوٹلیا اور بہنوں  
راے ل کو یہاں بلایا تھا تا کہ ایدر کا علاقہ فتح کر کے  
راے ل کو وہاں کا راجہ بنائیں گے لیکن انہیں یہاں  
آئے ہوئے کئی ہفتے گزر چکے ہیں اور آپ نے ابھی  
تک کوئی کارروائی نہیں کی۔“

کوٹلیا کے ان الفاظ پر ہلکا سا تبسم رانا سانگا  
کے چہرے پر نمودار ہوا پھر کہنے لگا۔

”میری بیٹی تیرا کہنا درست ہے تو جانتی ہے ان  
دونوں ایدر کے راجہ کے گجرات کے سلطان مظفر کے  
ساتھ بڑے گہرے اور دوستانہ تعلقات ہیں اور  
گجرات کے سلطان مظفر کی اس وقت عسکری طاقت  
بڑی مضبوط اور مستحکم ہے اس لشکر اس سے پہلے تین  
بار ہمارے لشکر کو پسپا کر چکا ہے اور ہمارے سینا پتی  
رنیر کی گردن بھی کاٹ چکا ہے اس بناء پر ان کے  
مقابلے میں ہمارے لشکریوں کے حوصلے ان دنوں  
پست اور سلطان مظفر کے لشکریوں کے حوصلے بلند  
ہیں لہذا ایدر کا علاقہ کسی طریقے اور کسی سلیقے اور جتن  
سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

بیٹی مالوہ کے حالات میں نے خراب کر دیے  
ہیں وہاں دو مقامات پر بروہہ اور دھارو میں  
راچیوٹوں نے سلطان محمود کے خلاف بغاوت کھڑی  
کر دی ہے اس کے علاوہ سلطان محمود جلی کے خلاف  
میرے دو اپنے آدمی میدنی رائے اور سالباہن بھی  
کام کر رہے ہیں اور مجھے امید ہے عفریب ہم مالوہ  
سے سلطان محمود جلی کو چلا کر لیں گے۔

اگر ایسا ہوتا ہے تو مالوہ میں ایک طرح سے  
ہماری حمایتی حکومت قائم ہو جائے گی اور ہماری  
طاقت اور قوت میں اضافہ ہوگا اس وقت اگر ہم ایدر  
پر حملہ کرتے ہیں تو ایدر کا راجہ رائے تبسم ضرور سلطان

مظفر سے مدد طلب کرے گا اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر ان  
علاقوں میں بہت بڑی اور ایک خونی کش کش شروع  
ہو جائے گی جس میں ہم نقصان بھی اٹھا سکتے ہیں۔

میں نے چند دن ہوئے اپنا ایک خاص آدمی جو  
بات بنانے کا بڑا ماہر ہے اسے میں نے ایدر کے راجہ  
رائے تبسم کی طرف بھیجا ہے دراصل میں چاہتا ہوں  
پہلے ایدر کے راجہ اور گجرات کے سلطان مظفر کے  
تعلقات کو خراب کیا جائے جب ان دونوں کے  
تعلقات خراب ہو جائیں گے تو ہم ایدر پر حملہ آور  
ہوں گے تو کوئی بڑا طوفان نہیں اٹھے گا اس بنا پر میں  
نے جو اپنا آدمی ایدر کے راجہ رائے تبسم کی طرف بھیجا  
ہے اس کے ذریعے میں ایدر کے راجہ کو یہ مشورہ دیا  
ہے کہ وہ آگے بڑھ کر سامبر متی کے علاقوں پر حملہ آور  
ہو اور ان پر قبضہ کرنے سے علاقے ان دنوں گجرات  
کے سلطان مظفر کی حدود میں شامل ہیں اور ماضی میں  
یہ علاقے بھی ایدر کے راجہ کے ہوا کرتے تھے مجھے  
امید ہے کہ میرا جو آدمی ایدر راجہ رائے تبسم کی طرف  
گیا ہے وہ رائے تبسم کو اس پر آمادہ کرنے میں  
کامیاب ہو جائے گا اور جب ایدر کا راجہ رائے تبسم  
سامبر متی پر حملہ آور ہوگا اور وہاں قتل و غارت گری  
کے علاوہ ان علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کرے گا  
تب لازمی بات ہے کہ گجرات کا سلطان مظفر ایدر کے  
راجہ کے خلاف حرکت میں آئے گا اس طرح دونوں  
قوتیں ٹکرائیں گی اور ایسی صورت میں یقیناً گجرات  
کے سلطان اور ایدر کے راجہ رائے تبسم کے تعلقات  
خراب ہو جائیں گے مجھے امید ہے کہ اس ٹکراؤ میں  
یقیناً گجرات کا سلطان رائے تبسم کو کچھ کر رکھ دے گا  
ہو سکتا ہے وہ رائے تبسم کے کچھ علاقوں پر بھی قبضہ  
کرے چنانچہ جب دونوں کے تعلقات خراب ہوں  
گے اور گجرات کا سلطان مظفر رائے تبسم کے کچھ  
علاقوں پر قبضہ کرے گا ان حالات میں اگر ہم بھی ایدر  
کے راجہ پر حملہ آور ہو کر اس کی مملکت پر چھا جاتے ہیں  
تو میرے خیال میں گجرات کے سلطان مظفر کو اتنا  
افسوس نہیں ہوگا اور میرا یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ ایدر

کے راجہ رائے تبسم کی کوئی مدد بھی نہیں کرے گا۔“  
یہاں تک کہنے کے بعد رانا سانگا رکھا پھر غور  
سے اپنی بیٹی کوٹلیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔  
”بیٹی اب بتا کیا میری منصوبہ بندی درست  
ہے۔“

کوٹلیا کے چہرے پر اس موقع پر مسکراہٹ  
نمودار ہوئی اور وہ برسرِ انداز میں کہنے لگی۔

”یقیناً آپ کی جو سچیں بہتر ہیں مجھے امید ہے  
اگر اس منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنایا گیا تو یقیناً ہر  
طرف کامیابیاں ہمارے قدم چومیں گی۔“ اس کے  
ساتھ ہی رانا سانگا نے موضوع بدلا پھر وہ اپنے گھریلو  
موضوع پر گفتگو کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

سلطان مظفر ایک روز اپنے دونوں بیٹوں بہادر  
خاں اور لطیف خاں کے ساتھ گھر دوڑ کے بعد جب  
اپنے قیصر کے قریب آیا تب سامنے سلطان محمود جلی کا  
پھونٹا بھائی صاحب خاں کھڑا تھا صاحب خاں کے  
پاس آ کر سلطان مظفر نے اپنے گھوڑے کو روک دیا  
اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے دونوں بیٹے  
بہادر خاں اور لطیف خاں بھی اپنے گھوڑوں کو روک  
چکے تھے یہاں تک کہ صاحب خاں نے سلطان مظفر  
کو مخاطب کیا۔

”سلطان محترم میں ایک امید اور آس لے کر  
آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ آپ مجھے میرے  
بھائی محمود جلی سے باپ کی سلطنت میں سے حصہ  
دلائیں گے لیکن میں دیکھتا ہوں گزشتہ کئی دنوں سے  
آپ کے شہر میں بیکار پڑا ہوں اس بیکاری کی وجہ  
سے.....“ صاحب خاں اپنی بات مکمل نہ کر سکا  
سلطان مظفر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”صاحب خاں! تمہارا کہنا درست ہے میں  
یقیناً محمود جلی سے تمہارے متعلق بات کرتا لیکن گزشتہ  
بارشوں نے مجھے نکلنے ہی نہیں دیا اب میں تم سے  
وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے ہفتے میں اپنے لشکر کے ساتھ  
انکوں کا تم میرے ساتھ چلتا تمہاری موجودگی میں

مانڈو کا رخ کروں گا تمہارے بھائی محمود جلی سے  
ملوں گا اور تم دونوں بھائیوں کے درمیان جو تنازع  
چل رہا ہے اسے حل کروں گا اگر یہ معاملہ حل نہ ہوا تو  
پھر کوٹلیا یہ کی جائے گی تمہارے باپ کی مملکت کو تم  
دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔“

سلطان مظفر کا یہ جواب سن کر صاحب خاں  
خوش ہو گیا چنانچہ سلطان اپنے دونوں بیٹوں کے  
ساتھ آگے بڑھ گیا تھا اس طرح ایک ہفتے بعد اپنے  
لاؤ لشکر کے ساتھ صاحب خاں کو ساتھ لے کر سلطان  
اپنے مرکزی شہر محمد آباد سے نکلا تھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ سلطان مظفر نے اپنے  
مرکزی شہر محمد آباد سے نکل کر پہلے احمد آباد کا رخ کیا یہ  
سارے اس کے اپنے علاقے تھے ان کا جائزہ لیتا رہا  
یہاں تک کہ اس نے مالوہ کا رخ کیا مالوہ کی طرف  
روانگی سے پہلے وہ احمد آباد میں کچھ دن قیام بھی کر چکا  
تھا۔ مورخین کہتے ہیں کہ اس شہر میں اس نے لگ بھگ  
ایک ہفتہ قیام کیا اس کے بعد وہ کوڈھرہ کے مقام پر پہنچا  
تھا کہ اس کے تجزروں نے اسے دو جریں دیں۔

پہلی خیر یہ کہ ان دنوں مالوہ کا حکمران سلطان محمود  
جلی بروہہ اور دھارو کے باغی اور سرکش راجپوتوں کے  
خلاف حرکت میں آیا ہوا تھا اور دوسری خبر یہ تھی کہ ایدر  
کے راجہ رائے تبسم نے سامبر متی کی حدود پر حملہ کر دیا ہے  
اور سلطان مظفر کے کچھ علاقوں پر قابض ہو گیا ہے۔

یہ دو خبریں ملنے کے بعد مورخین کا کہنا ہے کہ  
سلطان رک گیا مالوہ کی طرف نہیں بڑھا۔

اس موقع پر اس نے صاحب خاں کو اپنی طرف  
بلایا صاحب خاں جب سلطان کے سامنے آیا تب  
صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”صاحب خان اس وقت حالات اجازت  
نہیں دیتے کہ میں مالوہ کا رخ کروں اگر میں ایسا  
کرتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں بددینائی ہی نہیں بلکہ  
اسلام دشمنی ہوگی اس لیے کہ تمہارا بھائی محمود جلی ان  
دنوں بروہہ اور دھارو کے باغی راجپوتوں کے خلاف  
حرکت میں آیا ہوا ہے یہ راجپوت رانا سانگا کے حمایتی







بڑھایا پھر وہ عمروں کی کڑی دھوپ میں آفتوں کے پتھر برساتی دشتوں تن و جان میں کھرام برپا کرتی ہوں برستی کی آتش عداوتوں کے شہر آباد کرتے حرس ہوں کی منڈی کے سودا گروں اور دن رات کی بھٹی میں حوادث کے دھکتے شعلوں کی طرح قیصر خاں اور اعتماد خان کے لشکر پر حملہ آور ہوا تھا۔

قیصر خاں اور اعتماد خاں بھی بڑے مستعد اور تیار تھے لشکر انہوں نے پہلے ہی دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا چنانچہ دونوں طرف سے وہ بھی رائے بہیم کے لشکر پر زندگی کے صحرا میں دکھ کے نگر آباد کرنی موت کی انڈھی چاپ آنکھوں کے منجد حار میں جبر کی دھول اڑا دینے والے خوف کے چلتے دشت اور زیت کی بے ثباتی کے قسے کھڑی کرتی نفرتوں کی آگ کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔

اس طرح میدان جنگ میں ایک بار پھر روایات کی دہلیز پر جوش زن موت کے مناظر ارم محوں کو جنم بناتے صدیوں کے برہول عذاب اور زیت کا عنوان بدلتی بدلتی کی بارش رقص کرنے لگی تھی۔

رائے بہیم نے بڑھ چڑھ کر حملے شروع کیے لیکن اس نے دیکھا اس بار معاملہ کھٹ اٹھا تھا رائے بہیم جو اپنے لشکر کے وسط میں تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ مسلمانوں کا سالار جس سمت بھی وقت کی دہلیز پر خوابوں کے زنداں کھڑے کرتے گرجے بادلوں کے حشر کی طرح حملہ آور ہو رہا تھا اپنے پیچھے وہ رائے بہیم کے لشکر یوں کی لاشوں کے انبار چھوڑ کر چلا جاتا تھا آشوب محشر اور المیوں کے خوفناک مناظر کی طرح وہ اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ رائے بہیم کے لشکر کی صفوں کی صفیں لٹنے لگا تھا۔

رائے بہیم جس کے حوصلے بڑے بلند تھے جس کے لشکر یوں کے جذبے جوان تھے اس لیے کہ وہ اس سے پہلے سلطان مظفر کے ایک لشکر کو شکست دے چکے تھے لہذا اس بار بھی وہ امیر رکھتے تھے کہ کامیاب وہی رہیں گے لیکن تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد ایدر کے راجہ رائے بہیم نے دیکھا کہ قیصر خاں اور اعتماد

خاں کے سامنے اب اس کے لشکر کی حالت بے ربط بھاگتے لحوں اجڑی ویران راہوں بے چیرگی کے زخموں پرانی دھلتی چوٹوں وسوسوں کے اندیشوں خطرات کے وہموں سے بھی زیادہ المناک ہونا شروع ہو گئی تھی۔

یہاں تک کہ رائے بہیم نے یہ بھی دیکھا اس کے لشکر کی اکثریت کو قیصر خاں اور اعتماد خاں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس کے لشکر اب قیصر خاں کا سامنا کرتے ہوئے خوف زدہ ہو رہے تھے اور پیچھے ہٹ رہے تھے۔

یہ صورت حال دیکھتے ہوئے رائے بہیم نے فوراً شکست قبول کی اور بھاگ کھڑا ہوا لیکن اس طرح بھاگنا بھی آسان نہیں تھا قیصر خاں اور اعتماد خان نے پر شور عدا یوں فراق رتوں کے المیوں اور پھرے کا لے طوفانوں کی طرح رائے بہیم کا تعاقب شروع کر دیا تھا اور اس کے لشکر پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس کی تعداد کو کمزیر کرنے لگ گئے تھے۔

آخر تعاقب ترک کر کے قیصر خاں پلٹا رائے بہیم کے پڑاؤ سے جو کچھ حاصل ہوا اسے چند دستوں کی عمرانی میں دے کر اس نے سلطان مظفر کی طرف روانہ کر دیا تھا اپنا پڑاؤ اس نے اٹھایا اور ایک بار پھر ادھر روانہ ہوا جہر ایدر کا راجہ رائے بہیم بھاگتا تھا۔ اس جنگ کے متعلق مورخین رائے بہیم کی شکست کے متعلق لکھتے ہیں کہ شکست اٹھا کر رائے بہیم بیجا نگر کے کوہستانی سلسلوں میں چھپ گیا تھا۔

☆☆☆  
دوسری طرف سلطان مظفر کو جب قیصر خاں اور اعتماد خاں کی شاندار فتح کا علم ہوا تو اس نے بھی راجہ ایدر کے علاقوں کا رخ کیا چنانچہ مورخین مزید لکھتے ہیں کہ سلطان مظفر نے ایدر کے علاقے میں پہنچ کر جو راجپوت راستے میں لے آئیں بڑی ذلت اور خواری کے ساتھ تلوار کے گھاٹ اتارا اس کے ساتھ ہی مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایدر کے راجہ رائے بہیم کے علاقے میں سلطان مظفر کے لشکر کینچا ہو گئے اور تباہی

اور بربادی کا ایسا بازار گرم کیا کہ ایدر کی کوئی عمارت باغ مندر باقی نہ رہا رائے بہیم نے پریشان ہو کر جب دیکھا کہ اب اس کی خیریت نہیں اور اس کے علاقوں کو پامال کرنے کے بعد سلطان اسے حاصل کیے بغیر واپس نہیں جائے گا۔

تب وہ بیجا نگر کے کوہستانی سلسلوں سے نکلا اور اپنے ایک مشیر گوپال کو سلطان مظفر کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی غلطی اور قصور کی معافی مانگے۔

چنانچہ جس وقت سلطان مظفر اور قیصر خاں نے اپنے لشکر کے ساتھ ایدر کے راجہ رائے بہیم کے علاقوں میں بڑاؤ کیا ہوا تھا رائے بہیم کا آدمی گوپال سلطان کے لشکر میں داخل ہوا اس موقع پر سلطان کے محافظ دستوں کا سالار خداوند خاں سلطان کے سامنے آیا اور سلطان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”سلطان محترم ایدر کے راجہ رائے بہیم کا ایک نمائندہ نام جس کا گوپال ہے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔“

چنانچہ سلطان مظفر نے ایدر کے راجہ رائے بہیم کے گوپال کو جب حاضر کرنے کا حکم دیا تب گوپال کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا سلطان تھوڑی دیر تک بڑے غور سے گوپال کا جائزہ لیتا رہا پھر اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں اور کہنے لگا۔

”کیا تم بتا سکتے ہو تمہارے راجہ رائے بہیم نے کیا سمجھ کر ایدر کیا جان کر ہمارے علاقے سامبر متی پر حملہ کیا اور اسے اپنی حدود میں شامل کرنے کی کوشش کی؟“ سلطان مظفر کے اس سوال پر گوپال چند لمحوں تک گھبرا سا گیا تھا پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سلطان مظفر کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”سلطان محترم اس کے پیچھے ایک بہت بڑی اور گہری سازش ہے اور یہ سازش کرنے والے آپ اور ہمارے راجہ رائے بہیم کے تعلقات کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلے ہمیں اس سازش کا علم نہیں تھا لیکن بعد میں ہمارے مخبروں نے

ہمارے راجہ رائے بہیم کو اطلاع دی کہ اس کے پیچھے ہمارے دشمنوں کے کیا عزائم اور ان کے کیا ارادے اور خواہشیں تھیں۔“

گوپال کے یہ الفاظ سن کر سلطان کے چہرے پر حنگی اور پریشانی پر پل سے پڑ گئے تھے ایک بار پھر گوپال کی طرف اس نے دیکھا اور اسے مخاطب کیا۔

”تم کس سازش کی بات کر رہے ہو؟“ گوپال نے اپنے ہونٹوں پر زباں پھیری پھر کہنے لگا۔

”سلطان محترم چند ہفتے پہلے رانا سانگا کا ایک نمائندہ ہمارے راجہ رائے بہیم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اسے اس بات کی انجنت کی تھی کہ ماضی میں سامبر متی کا علاقہ ایدر کی حدود میں ہوا کرتا تھا لہذا رائے بہیم اپنے لشکر کو حرکت میں لائے اور سامبر متی پر قبضہ کر کے اس لیے کہ سامبر متی پر قبضہ کرنے کا یہ بہترین موقع ہے کیونکہ گجرات کے سلطان مظفر ان دنوں مالوہ کی طرف کوچ کر رہے ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں سامبر متی پر قبضہ کرنا آسان اور ہلکا ہے ایک بار قبضہ ہو گیا تو پھر اس کی واپسی بڑی مشکل ہو جائے گی۔ رائے بہیم کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی گئی تھی اس سلسلے میں اگر اسے رانا سانگا کی مدد کی ضرورت ہوئی تو اس کی مدد بھی کی جائے گی یہ ساری باتیں سارا معاملہ میری موجودگی میں ہوا تھا۔ رائے بہیم پہلے تو اس کے لیے تیار ہی نہیں تھا جب رانا سانگا کے نمائندے نے زور دیا بڑے بڑے الفاظ میں انجنت کی تب رائے بہیم حامی بھر گیا اور اس نے یہ غلطی کر لی اب یہ غلطی کر بیٹھنے کے بعد وہ پچھتا رہا ہے اور آپ سے معافی کا طلب گار ہے۔ سلطان محترم رانا سانگا ہمارے اور خراب تعلقات سے وہ اپنے لیے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

دراصل رانا سانگا چاہتا ہے کہ وہ ہندوستان کی سب سے مضبوط حکومت کا حکمران بن کر سامنے آئے اور ہندوستان کا ایسا راجہ بنے جس کے سامنے ہندوستان کی سب چھوٹی بڑی طاقتیں اور حکومتیں سر



جھکانے پر مجبور ہو جائیں۔ سلطان محترم میں پھر آپ سے گزارش کرتا ہوں رائے بھیم کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے آپ جانتے ہیں کہ ماضی میں اس کے تعلق رانا سانگا کے نسبت آپ سے زیادہ اچھے اور بہتر تھے اور میرے خیال میں ان کے اچھے تعلقات کی وجہ سے رانا سانگا نے یہ سازش تاکہ آپ کے تعلقات رائے بھیم سے کشیدہ ہو جائیں جس سے صرف رانا سانگا ہی کو فائدہ ہو سکتا ہے لہذا رائے بھیم نے مجھے اپنی بنا کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے تاکہ میں رائے بھیم کے رویے کی معافی مانگوں اور آئندہ رائے بھیم آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کا مطیع اور فرمان بردار بن کر رہے گا اور ہر طرح سے آپ کا حلیف اور حامی ہوگا۔

مورخین اس معاملے کو کچھ اس طرح لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رائے بھیم نے پریشان ہو کر اپنے شیر گوپال کو سلطان مظفر کی خدمت میں روانہ کیا اور گزارش کی کہ اس نے پریشانی اور الجھن کے عالم میں ایسی حرکت کی اور میں آپ کے قہر و غضب کا شکار ہوا لہذا میں حضور کی خدمت میں 20 لاکھ تنگے جو دو ہزار تومان کے برابر ہوتے تھے اور ایک سو گھوڑے پیش کرتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرا قصور معاف کیا جائے حضور کی رحم دلی اور بندہ نوازی سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ آپ میری اس معذرت کو قبول فرمائیں گے اور میری پریشان حالی کی لاج رکھ لیں گے۔ یہ الفاظ مورخین کے ہیں جو گوپال کے ذریعے سلطان مظفر تک پہنچائے گئے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ سلطان مظفر نے ایدر کے راجہ رائے بھیم کی اس معذرت کو قبول کر لیا اسے معاف کر دیا اور جو علاقے پہلے سے اس کے تحت تھے ان پر اس کے راج کو بحال کر دیا تھا رانا سانگا جو گجرات کے سلطان کے خلاف کرتا چاہتا تھا اس میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

☆☆

رانا سانگا کی بیوی لکھاروتی دونوں بیٹے جمل

رام داس اور راج کمار کی کوشلیا اپنے راج محل کے ایک کمرے میں بیٹھے باہم گفتگو کر رہے تھے کہ رانا سانگا جو اپنے لشکر کی تربیت کا گاہ کی طرف گیا ہوا تھا مسکراتا ہوا اور بڑی خوشی کا اظہار کرتا ہوا وہ اسی کمرے میں داخل ہوا جس میں اس کی بیوی دونوں بیٹے اور راج کمار کی کوشلیا بیٹھے ہوئے تھے۔ جب رانا سانگا مسکراتا ہوا اس کے بیچ میں آن بیٹھا تب کوشلیا کچھ دیر تک خوش کن انداز میں اپنے باپ کی طرف دیکھتی رہی پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”پتا جی آج ضرور آپ کو کوئی اچھی خبر ملی ہے جو اس طرح آپ تیز تیز چلتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے ہیں اور ہمارے بیچ میں بیٹھ گئے ہیں۔“

اس موقع پر گہری مسکراہٹ رانا سانگا کے چہرے پر نمودار ہوئی پھر کہنے لگا۔

”پتی میرا کہنا درست ہے آج مجھے بہت اچھی خبر ملی ہے اور میں نے جو منصوبہ بندی کی تھی میں سمجھتا ہوں وہ اب اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے۔“ رانا سانگا کے ان الفاظ پر جمل رام داس اور لکھاروتی خوشی کا اظہار کر رہے تھے یہاں تک کہ جبو بھرے انداز میں راج کمار کی کوشلیا نے پوچھ لیا۔

”پتا جی آپ کو نئی منصوبہ بندی کا ذکر کر رہے ہیں۔“ اس پر رانا سانگا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”ہمارے کہنے کے مطابق ایدر کے راجہ رائے بھیم نے ایک خاصا بڑا لشکر تیار کیا اور گجرات کے سلطان مظفر کے علاقے سامبرمتی پر حملہ آور ہوا اور اس پر اس نے قبضہ کر لیا یہ قبضہ چھڑانے کے لیے گجرات کے سلطان مظفر نے اپنے دو سالاروں عین الملک اور عبد الملک کو روانہ کیا ان دونوں کا ٹکراؤ رائے بھیم سے ہوا رائے بھیم ایسے خونخوار انداز سے ان پر حملہ آور ہوا کہ گجرات کے سلطان مظفر کے سالار عبد الملک کو اس نے لڑائی کے دوران نبوت کے گھاٹ اتار دیا عین الملک اس موقع پر اپنے بھائی پر سوار تھا اس کا ہاتھی بھی مر گیا اور عین الملک بچے بچے

لشکر کے ساتھ شکست اٹھا کر بھاگ گیا اس طرح ہمارے کہنے کے مطابق رائے بھیم نے گجرات کے سلطان مظفر کے علاقے سامبرمتی پر قبضہ کر لیا ہے۔“

رانا سانگا جب خاموش ہوا تب اس کی راج کمار کی کوشلیا اور دونوں بیٹے بے پناہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے یہاں تک کہ اس کا بیٹا جمل بولا اور اپنے باپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”پتا جی جس وقت رائے بھیم نے گجرات کے سلطان مظفر کے لشکر کو شکست دی اور اس کے سالار کا خاتمہ کر دیا تو جواب میں گجرات کے سلطان مظفر نے کسی رومل کا اظہار نہیں کیا۔“ اس پر رانا سانگا کہنے لگا۔

”میرے خیال میں وہ رومل کا اظہار نہیں کرے گا اس لیے کہ جہاں تک مجھے خبریں ملی ہیں ان دنوں وہ مالوہ کے معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ مالوہ کے سلطان محمود غلی کا بھائی صاحب خاں مالوہ سے نکل کر سلطان مظفر کے پاس گیا ہوا ہے اس نے ناش پیش کی ہے کہ اس کے بھائی محمود غلی کے تعلقات اس سے اچھے نہیں ہیں لہذا باپ کی حکومت کے آدھے حصے کی حکومت اسے دلائی جائے۔ یہ بھی خبریں پہنچی ہیں کہ سلطان مظفر اس کے لیے تیار ہو گیا ہے اور اس نے ارادہ کر لیا ہے کہ مالوہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے پر محمود غلی کی حکومت تسلیم کر لی جائے اور دوسرے حصے پر اس کا بھائی صاحب خاں حکومت کرے گا۔“

رانا سانگا جب خاموش ہو تب راج کمار کی کوشلیا نے پوچھ لیا۔

”پتا جی اگر ایسا ہوتا ہے تو کیا ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔“

”ہمارے حق میں بہتر بہتر ہوگا اس طرح مالوہ کی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی محمود غلی کی طاقت پہلے سے کم ہو جائے گی اور میدانی رائے اور سالارین کے ذریعے پہلے ہم محمود غلی سے نہیں گے اور اس کے بعد صاحب خاں کو بھی چلنا کر کے مالوہ پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔“

رانا سانگا کے ان الفاظ کا جواب کوشلیا دینا ہی چاہتی تھی کہ رانا سانگا کے چوب دار نے رانا کو اطلاع دی ایک خبر رانا کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔

رانا اس وقت بڑی ترنگ میں تھا بڑا خوش تھا کہ اس نے جو منصوبہ بندی کی ہے اس میں وہ کامیاب رہا ہے لہذا خوشی سے ہاتھ لہراتے ہوئے کہنے لگا۔

”خبر کو جلد اندر بھیجو۔“ چنانچہ وہ خبر جب اندر آیا تب رانا نے اسے مخاطب کیا اور کہنے لگا۔

”تم کس سمت کی خبر لائے ہو۔“ اس پر وہ خبر بولا کہنے لگا۔

”رانا میں سامبرمتی اور ایدر کے علاقوں کی طرف سے آیا ہوں۔“

یہ الفاظ سن کر رانا سانگا ہی نہیں چونکا تھا کوشلیا بھی جتنوں میں بڑھ گئی تھی یہاں تک کہ وہ خبر بولا اور کہنے لگا۔

”سلطان مظفر نے ایدر کے راجہ رائے بھیم سے سامبرمتی کا علاقہ واپس لے لیا ہے اور رائے بھیم نے سلطان کی خدمت میں بیس لاکھ تنگے اور ایک سو گھوڑے خراج کے طور پر پیش کیے ہیں۔“ یہ الفاظ سن کر رانا سانگا ہی نہیں راج کمار کی کوشلیا بھی چونک گئی۔

جمل رام داس اور لکھاروتی افسردہ سے ہو گئے تھے یہاں تک رانا سانگا بولا اور اپنے اس خبر کو کہنے لگا۔

”ذرا تفصیل کے ساتھ کہو کیا معاملہ ہوا۔“

جواب میں وہ خبر بولا اور کہنے لگا۔

”رانا! ایدر کا راجہ رائے بھیم سامبرمتی پر حملہ آور ہوا اور اس علاقے پر اس نے قبضہ کر لیا جوابی کارروائی کرتے ہوئے گجرات کے سلطان نے اپنے دو سالاروں عین الملک اور عبد الملک کو روانہ کیا لیکن رائے بھیم کے ہاتھوں ان دونوں کو شکست ہوئی بلکہ عبد الملک نام کا سالار جنگ کے دوران مارا بھی گیا۔ چنانچہ اپنے اس لشکر کی شکست کے بعد سلطان مظفر نے اپنے سالار قیصر خاں اور اس کے نائب



سانول داس اور راج کماری کوشلیا ایک بہت بڑا لشکر لے کر سلطان مظفر کے علاقوں کی طرف روانہ ہوئے تھے دوسری طرف قیصر خاں اور اعتماد خاں بھی ایدر کے راجہ رائے بھیم کی ہم سے فارغ ہونے کے بعد سلطان سے علیحدہ ہو کر اپنے لشکر کے حصے کے ساتھ سرحدوں کی طرف آگئے تھے جب کہ صفدر خاں اور نصرت خاں پہلے سے وہاں موجود تھے۔

ایک مناسب جگہ آ کر سانول داس اور راج کماری کوشلیا نے پڑاؤ کر لیا تھا دوسری طرف قیصر خاں اعتماد خاں صفدر خاں اور نصرت خاں چاروں کو ان کی آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لہذا پہلے خبروں کے ذریعے ان کے لشکر کا جائزہ لیا گیا پھر چاروں ایک جگہ جمع ہوئے اور قیصر خاں نے اپنے تینوں ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”میرے عزیز ساتھیوں جو تفصیل ہمارے خبروں نے رانا سانگا کے آنے والے لشکر کے متعلق بتائی ہے اس کے مطابق اس لشکر کا مکان دارا اس دفعہ ایک سو راجا سانول داس ہے جو جنگ شروع سے پہلے انفرادی مقابلے کے لیے لکڑے گا اور رانا سانگا کی راج کماری کوشلیا بھی اس لشکر میں شامل ہے جو نہ صرف جنگ میں حصہ لے گی بلکہ اپنے لشکریوں کا حوصلہ بھی بڑھائے گی۔

میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ کہ صفدر خاں اور نصرت خاں دونوں اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ یہی رہیں سانول داس اور کوشلیا نے یہاں سے نزدیک ہی آ کے پڑاؤ کیا ہے پہلے میں اور اعتماد خاں ان کا مقابلہ کریں گے اگر ہم انہیں پسپا اور شکست دینے میں کامیاب ہو گے تو یہ بہترین معرکہ ہوگا اور اگر ان کا پہلہ ہم پر بھاری ہونا شروع ہوا تو پھر صفدر خاں اور نصرت خاں تم بھی ہمارے ساتھ ان کے خلاف حرکت میں آ جانا۔“

قیصر خاں کی اس منصوبہ بندی سے اس کے تینوں بڑے سالاروں نے اتفاق کیا تھا چنانچہ یہ

پر نگاہ رکھوں گی اور مجھے امید ہے کہ وہ چونکہ اچھا تیغ زن ہے لہذا مسلمانوں کے سالار قیصر خاں کے خلاف اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا اگر تو اس نگرانہ کے دوران ہی اس نے قیصر خاں کو کاٹ کر رکھ دیا پتا جی وعدہ کے مطابق میں اس سے شادی کر لوں گی اور اگر وہ ایسا نہ ہو سکا قیصر خاں نے اس کی گردن کاٹ دی تو پھر آنے والے دور میں ہمارا نگرانہ سلطان مظفر کے لشکر کے ساتھ ہوگا اس میں دوسرے تیغ زن کو استعمال کریں گے پھر دیکھیں گے کہ کیا صورت حال سامنے آتی ہے جو لشکر یہاں سے جائے گا وہ پہلے سلطان مظفر کے علاقوں پر جا کر پڑاؤ کرے گا ظاہر ہے مسلمانوں کا لشکر بھی آس پاس ہی ہوگا اس لیے کہ جو خبریں مجھے ملی ہیں ان کے مطابق مسلمانوں کا ایک لشکر مستقل طور پر سرحد پر رہنے لگا ہے چنانچہ اس لشکر کے ساتھ نگرانہ ہوگا نگرانہ سے پہلے ہمارے لشکر کا جو مکان دار ہوگا وہ میدان میں ٹپکے گا اور قیصر خاں کو انفرادی مقابلے کی دعوت دے گا اس مقابلے کے دوران اگر قیصر خاں کام آ گیا تو ہمارا کام بن جائے گا اور اگر وہ کامیاب رہا تو پھر اس کی گردن کاٹنے کے لیے اگلے موقعہ پر اپنے دوسرے سالار کو اتاریں گے۔“ اپنی راج کماری کوشلیا کی اس منصوبہ بندی کو رانا سانگا نے پسند کیا تھا لہذا بولا اور کہنے لگا۔

”یہی جن دو عمدہ سالاروں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں سے ایک کا نام سانول داس اور دوسرے کا نام سورج مل ہے میرے خیال میں پہلے سانول داس کو آزما تے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے یہی اگر تو اس لشکر میں شامل ہونا چاہتی ہے تو پھر میں تم لوگوں کو ایک ہفتہ دیتا ہوں۔ سانول داس کے ساتھ مل کر اپنی تیاری کی آخری شکل دو اس کے بعد سلطان مظفر کے علاقوں کی طرف کوچ ہوگا۔“ رانا سانگا کے اس فیصلہ کو کوشلیا نے پسند کیا تھا لہذا اسی روز اس نے سانول داس سے مل کر لشکر کے اس حصے کو خاص تربیت دینا شروع کی تھی جس نے ایک ہفتہ بعد سلطان مظفر کے علاقوں کی طرف کوچ کرنا تھا۔

موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔“

اس پر دکھ بھرے انداز میں رانا سانگا نے اثبات میں گردن ہلاتی اور کہنے لگا۔

”میرا اندازہ ہے قیصر خاں وہی ہے اپنے ایک لشکر کے شکست کھانے کے بعد آخر اس نے اپنے اس نایاب سالار کو طلب کر لیا اسے رائے بھیم کی طرف بھیجا اور اس نے رائے بھیم کو شکست دے کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں مظفر کا یہ سالار نام جس کا قیصر خاں ہے یہ شخص بھی عجیب و غریب ہے کیا اس کی قسمت اس کے مقدر میں کوئی ناکامی اور شکست نہیں لکھی ہوئی۔“

جواب میں بے پناہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے کوشلیا بولی اور کہنے لگی۔

”پتا جی ناکامی اور شکست تو ایک طرف ہم نے تو اس قیصر خاں کی گردن کاٹنے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور یہ کام ہم ہر صورت میں کر کے رہیں گے۔“ یہاں تک کہنے کے بعد کوشلیا کی پھر اپنے باپ رانا سانگا کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”پتا جی ایک کام کرتے ہیں آپ نے جن دو بہترین تیغ زنوں کو انتخاب کیا ہے جنہیں ہم آنے والے دور میں قیصر خاں کے خلاف انفرادی مقابلے کے لیے تیار کریں گے وہ واقعی بڑے لا جواب تیغ زن ہیں اور اس بات پر بھی خوش ہیں کہ ان میں سے جو بھی مسلمانوں کے سالار قیصر خاں کے خلاف کامیابی حاصل کرے گا اس کی شادی مجھ سے ہو جائے گی اور اسے وہ اپنے لیے بہت بڑا اعزاز خیال کر رہے ہیں پتا جی کیا ایسا ممکن نہیں کہ ان دو میں سے ایک کو ہم پہلے استعمال کر لیں سرحدوں پر ہمارے اور سلطان مظفر کے لشکریوں کے درمیان نگرانہ کو اب آئے دن کی بات ہوگی ہے ہمیں تین بار شکست اٹھانا پڑی ہے اور یہ بڑا بدترین داغ ہے میں چاہتی ہوں ایک لشکر تیار کیا جائے جو دو تیغ زن میں ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں سے ایک کو اس لشکر کا کمان دار مقرر کیا جائے میں خود بھی لشکر میں رہ کر اس

اعتماد خاں کو طلب کر لیا چنانچہ ان دونوں سالاروں کو ایک لشکر دے کر رائے بھیم کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا گیا سامبرمتی کے علاقوں میں ایک بار پھر خوفناک نگرانہ ہوا اس نگرانہ کے دوران خبرات کے سلطان مظفر کے سالار قیصر خاں نے ایدر کے راجہ رائے بھیم کو بدترین شکست دی اس کے لشکر کی اکثریت کو اس نے کاٹ کر رکھ دیا۔ قیصر خاں کے ہاتھوں شکست اٹھانے کے بعد رائے بھیم بڑی بے بسی کے عالم میں بیجا نگر کے کوبستانی سلسلوں کے اندر جا کے چھپ گیا تھا۔ جب اسے احساس ہوا کہ اس طرح چھپنے سے کام نہیں چلے گا اس لیے کہ خبرات کے سلطان مظفر نے یہ کر لیا تھا کہ رائے بھیم کہیں بھی چھپ جائے اس کا تعاقب کیا جائے گا ان حالات کو دیکھتے ہوئے رائے بھیم نے اپنے مشیر گوپال کو ایک سوھوڑوں اور رقم کے ساتھ سفیر بنا کر خبرات کے سلطان مظفر کی خدمت میں بھیجا اس نے رائے بھیم کی طرف سے سلطان سے معافی مانگی وعدہ کیا کہ آئندہ وہ سلطان کا مطیع اور فرمانبردار بن کر رہے گا اب صورت حال یہ ہے کہ سلطان مظفر نے رائے بھیم کو معاف کر دیا ہے اور اس کے علاقوں پر اس کے راج کو اس نے بحال کر دیا ہے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد وہ خبر کا پھر کہنے لگا۔

”رانا میں یہی کچھ کہنے آیا تھا۔“ یہ صورت حال جان کر رانا سانگا اداں ہو گیا تھا۔ کوشلیا کا منہ بھی لٹک گیا تھا ہے مل رام داس اور لکھاروی بھی افسردہ ہو گئے تھے پھر رانا سانگا کے کہنے پر وہ خبر وہاں سے نکل گیا تھا تھوڑی دیر تک گہری کاٹ کھانے والی خاموشی راج محل کے اس کمرے میں طاری رہی یہاں تک کہ کوشلیا بولی اور اس سکوت کو توڑتے ہوئے وہ اپنے باپ رانا سانگا کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”پتا جی قیصر نام کا سلطان مظفر کا یہ سالار وہی تو نہیں ہے جس کے ہاتھوں ہمیں تین بار شکست کا سامنا کرنا پڑا جس نے جنگ کے دوران رنیر سنگھ کو



فیصلہ ہونے کے بعد قیصر خاں اور اعتماد خاں نے اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ رانا ساٹکا کے لشکر کا رخ کیا تھا اور اس کے سامنے پڑاؤ کر لیا تھا۔

اس کے بعد دونوں لشکروں نے اپنی صفیں درست کرنا شروع کیں جب صفیں درست ہو گئیں تب سانول داس اپنے سرکش گھوڑے کو ایز پر ایز لگاتا ہوا دونوں لشکریوں کے بیچ میں آیا درمیان میں آ کے رکا چند لرے اپنی زبان میں وحشی انداز میں اس نے لگائے اس کے بعد اس نے قیصر خاں کا نام لے کر انفرادی مقابلے کے لیے لٹکا رہا تھا اس موقع پر راج کمار کی کوشلیا اپنے لشکر کے سامنے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی اس کے دایں بائیں دوسرے سالار اپنے لشکر کی کمان داری کے لیے بالکل تیار اور مستعد ہو چکے تھے۔

قیصر خاں پہلے ہی اس کی امید رکھتا تھا جوں ہی سانول داس نے انفرادی مقابلے کے لیے لٹکا رہا اس نے اپنے گھوڑے کو ایز لگائی آگے بڑھا اور سانول داس کے سامنے جا کے اپنے گھوڑے کو روکا سانول داس نے بھر پوری نگاہ اس پر ڈالی پھر کھانے والے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا اور کہنے لگا۔

”کیا تمہارا ہی نام قیصر خاں ہے۔“ قیصر خاں مسکرایا اور کہنے لگا۔

”جب تم نے قیصر خاں کو انفرادی مقابلے کے لیے لٹکا رہا ہے تو وہی تجھ سے مقابلہ کرنے کے لیے نکلے گا کوئی اور تو نہیں آئے گا۔“

اس پر کچھ دیر تک بڑے غور و انتہاک سے سانول داس اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

”گزشتہ چند کامیابیوں نے میں نے سنا ہے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے اور تو اوچی ہواؤں میں اڑنے لگا ہے دیکھ آج اس میدان میں جب لوہے سے لوہے بجے گا تب تجھے اپنی اوقات کا احساس ہوگا اس میدان میں تیری آتما کو آہن تیرا دل پتھر کر کے چھوڑو گا اس لیے کہ رانا ساٹکا کے خلاف حرکت میں آتے ہوئے ترے پاپ کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے

نربھاگی جب تیرا میرا مقابلہ شروع ہوگا تو تو زیادہ دیر تک میرے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا اور جلد ہی تو آگ کی چمک پانی کی نمی ہوا کے لمس کے احساس تک کو فراموش کر بیٹھے گا۔ گناہوں کے اندھیروں میں چند اندھی کہانیاں اپنی جرات مندی اور کامیابی کی لے کر تو سمجھتا ہے کہ تو بڑا بلوان اور بلونت ہو گیا ہے جب تیرا مرا ٹکڑا ہوگا یاد رکھنا میں تیری تخلیق کو خاموش تیرے گمان کو اندھا کر کے رکھوں گا۔

یوں سمجھنا کہ اب اس میدان میں تیری حالت چھاؤں سے محروم تباہ و برباد ہے اس لیے کہ تیرے جسم کا گاڑھا بھلاوے کی طرح یہاں ابلے گا تیری ذات کے گارے سے خیالوں کی ساری تر و تازگی نکال کے رکھوں گا۔

میرے سامنے ایک مقصد اور آدرش ہے جب کہ تیرے سامنے کچھ بھی نہیں ہے سن سور اور نر دھن میرے سامنے راج کمار کی کوشلیا کا حصول ہے وہ رنگ و رنگ کی صبح ہے اس کی مسکراتی بلوزین آنکھیں سحر کے نور کا ہالہ ہیں اس کے دھنک رنگ بازو جگمگاتے ریشمی رخسار نگاہوں کے درمیاں رکھے موتی ہیں اس کی زلف زرتار اس کی آواز کہکشاں کی پھوار ہے وہ پری جمال پیکرے مثال ہے اب وہ راج کنیا میری روح کی راگنی بن چکی ہے تو پورب بھیم اتر دن کہیں بھی جائے راج کمار کی کوشلیا کی سی پورن ماشی جیسی حسین لڑکی تجھے کہیں نہیں ملے گی اس لیے کہ وہ اندر کی اپسرا ہے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد سانول داس جب خاموش ہوا تب اس کی طرف قہر بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے قیصر خاں بول اٹھا۔

”سن سانول داس اب تک تو اس طرح گفتگو کرتا رہا ہے جیسے برکھارت میں ندی اندھتی ہے لیکن جب میری تلوار تجھ پر برسے گی تو یاد رکھنا تجھے ہر طرف چار کھونٹ اس کی چمک کا اجالا دکھائی دے گا تو ہر اپسرا اور راج کنیا کی گفتگو کو بھول جائے گا میری تلوار جب بلند ہوگی تو یاد رکھنا تجھ پر نفرت برسانے

لگے گی اور راج کمار کی کوشلیا کی وہ آواز جواب تک میرے کانوں میں امرت گھولتی ہے وہی آواز تیرے لیے سماعت کی خراش بن جائے گی تو نے راج کمار کی کوشلیا کی ذات کو اپنے دل کے سنگان میں پریم کا مندر بنا کر جو سجا رکھا ہے یاد رکھنا اسے میں دیراں شب کے دوش لٹخوں میں تبدیل کر کے رکھ دوں گا۔ سن سور کہ میری تلوار فضا میں بلند ہو کر جب تجھے خون کی عس دکھائے گی تو تو ہر جبر اور جتن کو بھول جائے گا۔

سن سانول داس ان کو ہستاتوں کے دامنوں میں سمجھتے ہیں کالی رتوں کا وہ مسافر بنا کر رکھوں گا جس کے سامنے منہ زلوں کو کوئی بھولا ہوا راستہ تک نہ رہ گیا ہو سانول داس دیکھ رہے ہیں میدان جنگ اور رزم گاہ ہے۔ کیا زندگی کے حادثوں کی حکمرانی بھی ہوتی ہے خراب اور قطع و برید یہاں رخص کرنی ہیں فتنہ گری شعلہ لہرائی ہے شرور برسانی ہے تو اپنے دست شجاعت کو اتار دلا کر کے پیش نہ کر کہ موروثی تمدن سے محرومی کی طرف اسے میں کاٹ کے رکھ دوں تیرا ابھی کسی بیچ زن سے پالا نہیں پڑا بالا پڑھا ہوتا تو ابھی تک وہ میری آتش نما تیری رویت و سماعت تیرے مخاطب و کلام تیرے فہم و دانش کو منجمد کر چکا ہوتا۔

سن سانول داس مزید گفتگو نہیں ہوگی آج مجھ سے ٹکرا پھر دیکھ تیرے مقدر میں کیا لکھا ہے۔“

قیصر خاں کے ان الفاظ کے جواب میں سانول داس پھر سے کالے سمندر گردش ایام میں سسکتی پیاس کی طرح قیصر خان پر حملہ آور ہوا تھا جواب میں قیصر خاں بھی اپنی کاروائی کرتے ہوئے بگولوں سے بے مل سراپوں حصار الاالا کے چوپانوں خیالات کو منہمک کر کے خوشنک کالی رتوں کی طرح سانول داس کو ٹوٹ پڑا تھا۔

دونوں آپس میں ٹکراتے رہے یہاں تک قیصر خاں نے آندھیوں کے دوش پر رخص کرتے شر پھروں کے سناٹوں میں جذبول کی وحشی آوازوں کی طرح اپنے رب کے نام کی تکبیریں کئی بار بلند کیں اس کے بعد اس نے اپنے جملوں میں انتہائی قسم کی

تیزی اور خوفناکی پیدا کر لی تھی وہ فطرت کی بدترین قہرمانیت اور آفاق پر سنسنائی آندھیوں کی طرح سانول داس پر ضربیں لگانے لگا تھا۔

سانول داس کھبرا گیا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس سمت سے حملہ کرے اس لیے کہ بڑی تیزی سے حرکت کرتی قیصر خاں کی ہر جھٹکا تلوار نے اس کے سامنے ایک سفیدی دھند پر پا کر کے رکھی دی تھی وہ بڑی مشکل سے اپنی ڈھال پر حملوں کو روکا رہا تھا دفاع تک محدود تھا جارحیت اختیار نہیں کر رہا تھا۔

ایسے میں قیصر خاں عجیب سے انداز میں حرکت میں آیا جب دونوں کی تلواres ایک دوسرے سے ٹکرائیں تب ایک زوردار جھٹکا قیصر خاں نے سانول داس کو دبا سانول داس توازن کو بیٹھا اپنے گھوڑے سے نیچے گر گیا اس کے ہاتھ سے اس کی تلوار اور ڈھال بھی چھوٹ گئی تھی اسی لمحہ قیصر خاں بھی اپنے گھوڑے سے کود گیا تھا سانول داس بوکھلا سا گیا تھا اس لیے کہ اپنے گھوڑے سے کود کر قیصر خاں اس کے اور اس کی تلوار ڈھال کے درمیان ٹکڑا ہو گیا تھا سانول داس مین پر پڑا لرز اور کاپ رہا تھا کچھ دیر تک طنز سے انداز میں قیصر خاں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

”یہ ہے تمہاری جرات مندی اور حرب ضرب میں مہارت جس پر تم مجھ سے اندھے طوفانوں کی سی گفتگو کرتے تھے یہ ہے تمہاری اوقات اور اسی اوقات کو لے کر تم مجھ سے انفرادی مقابلہ کرنے کے لیے آئے تھے۔“

اس کے ساتھ ہی قیصر خاں پیچھے ہٹ گیا اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”اٹھ اپنی تلوار اور ڈھال ایک بار پھر سنبھال اور میرا مقابلہ کرو پھر دیکھ میں کس قہرمانیت کے ساتھ تیرے سر کو تیرے تن سے جدا کرتا ہوں۔“

سانول داس آہستہ آہستہ اٹھا اپنی تلوار اور ڈھال اس سے سنبھالی پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور بائیں سنبھالیں قیصر خاں بھی اپنے گھوڑے پر



سوار ہو کر بالکل مستعد ہو گیا تھا گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد سانول داس نے اپنے گھوڑے کو ایک سخت ایڑ لگائی اس کی بائیں ہلائیں اور پھر قیصر خاں کے سامنے آ کر مقابلہ کرنے کے بجائے وہ اپنی جان بچا کر میدان سے بھاگ نکلا تھا۔

قیصر خاں مسکرایا سرخ رنگ کی اپنی چڑے کی بیٹی سے بھاری پھل کا ایک خنجر نکالا تاکہ کر مارا خنجر سانول داس کی پیٹھ سے ہوتا ہوا دوسری طرف نکل گیا تھا سانول داس نے ایک ہولناک چیخ بلند کی اور اپنے گھوڑے سے گر گیا تھا۔

قیصر خاں اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اس کے قریب آیا اور طنزیہ سے انداز میں کہنے لگا۔

”ظالم کے بیٹے اگر اس طرح میدان جنگ سے فرار ہی ہوتا تھا تو پھر انفرادی مقابلے کے لیے اترنے کی کیا ضرورت تھی۔“ اس کے ساتھ وہ گھوڑے سے کودا سانول داس کی گردن کاٹ دی پھر اس کے گھوڑے کی باگ پڑے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہ اپنے لشکر میں چلا گیا تھا اس موقع پر رانا سانگا کے لشکر کے آگے راج کمار کی کوشلیا کے دائیں بائیں جو سالار کھڑے تھے ان میں سے ایک راج کمار کی کوشلیا کے پاس آیا بڑی زار داری میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”راج کمار کی لگتا ہے حالات آج بھی ہمارے حق میں نہیں ہیں مسلمانوں کے سالار نے جو اپنا چہرہ ڈھانپ کے رکھا ہے کتنی آسانی سے سانول داس کو بھی اپنے سامنے زیر کر دیا ہے جبکہ ہمارا اندازہ تو یہ تھا کہ مسلمانوں کا سالار سانول داس کے سامنے چند لمحے بھی نہیں نکالے گا یہ کہ اس کا اور اس کے ساتھی سورج مل کا چٹاؤ سینکڑوں تیغ زونوں کے مقابلے کے بعد ہی کیا تھا پھر بھی یہ سانول داس مسلمانوں کے سالار کے آگے ٹک نہیں سکا اس موقع پر میں یہی مشورہ دوں گا کہ ہمیں لشکر کو یہاں سے ہٹا لیتا چاہیے اور جنگ کی طرح نہیں ڈالنی چاہیے اور اگر ہم نے اپنے لشکر کو پیچھے نہ ہٹایا اور مسلمانوں کا سالار حملہ آور

ہو گیا تو کہیں ایسا نہ ہو ہمیں چوتھی بار شکست کا سامنا کرنا پڑے اور یہ جو لشکر ہم لیے بیٹھے ہیں اس کی اکثریت کو بھی مسلمانوں کا وہ سالار موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دے۔“

وہ سالار جب خاموش ہوا تب کوشلیا نا پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں تمہارے اس مشورے کو قبول نہیں کرتی ہم انفرادی مقابلہ ہمارے ہیں اجتماعی کھراؤ بھی باقی ہے اگر میں یہ کھراؤ ختم کر کے لشکر کو لے کر بھاگ جاؤں تو یہ راجپوتوں کے لیے انتہائی بدترین فعل ہوگا اور کم از کم میں اسے برداشت نہیں کرنی لہذا مقابلہ کیا جائے گا ہو سکتا ہے اس بار ہم سرخرو ہو جائیں اور کامیابی ہمارا مقدر بن جائے۔“

یہاں تک کہتے کہتے راج کمار کی کوشلیا کو رک جانا پڑا اس لیے کہ اس نے دیکھا کہ حملہ آور ہونے کے لیے قیصر خاں نے اپنے لشکر کو آگے بڑھایا تھا یہ صورت حال دیکھتے ہوئے کوشلیا اپنے گھوڑے کو حرکت میں لائی اور اپنے سالاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”بالکل تیار اور مستعد ہو جاؤ مسلمانوں کا سالار حملہ آور ہونے لگا ہے پہلے اس کے حملے کو روکنا ہے اس کے بعد جوابی کارروائی کرنی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی راج کمار کی کوشلیا لشکر کے سامنے سے ہٹ کر لشکر کے بیچ میں چلی گئی تھی تاکہ وہاں رہتے ہوئے اپنے لشکر یوں کو ہدایت جاری کر سکے انہیں زور دار حملے کرنے کی ترغیب اور انہیں لگاتار جنگ کرنے پر ابھار سکے۔

تھوڑی ہی دیر بعد قیصر خاں نے اپنے کام کی ابتدا کی چنانچہ وہ راج کمار کی کوشلیا کے اس لشکر پر ازل اور ابد کے درمیان وقت کے پاؤں مل کر دینے والے ایلنے طوفانوں بے کراں غصہ کی مسافروں کو آتشیں محوں میں ڈھال دینے والی کرب کی دہشت ویرانیوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

جوابی کارروائی کرتے ہوئے راج کمار کی کوشلیا کا

لشکر بھی نفرتوں کی خلیج میں عذاب رتوں اذیتوں کی اندھی کہانیوں اور بغاوت کے محوں کی ہی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔ اس طرح دونوں ملکوں کی سرحد پر دونوں لشکر یوں کے ٹکرانے سے جسموں کے سائے روجوں کی تپش لیوں کا نطق جرات مندی کی روح خیالات کے سنے جسم و جاں کی شادابیاں لٹکی کے فریب کا شکار ہوئی ہوئی خون کی پیمان خیزیوں میں ڈوبنے لگی تھی۔

راج کمار کی کوشلیا زیادہ دیر تک اسے لشکر کو قیصر خاں کے حملوں کے سامنے جما کے نہ رکھ سکی اس کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں اگلی صفوں کی تنظیم جب خراب ہوئی تب اس سے پچھلی صفیں بھی متاثر ہونے لگیں تھیں اور پھر کوشلیا کے لشکر کی پچھلی صفوں سے اگلی صفوں کی طرف جا کر مسلمانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے پہلو تھپی کرنے لگے تھے یہ کیفیت تھوڑی دیر تک جاری رہی اس کے بعد کوشلیا نے اندازہ لگایا کہ یہ سلسلہ مزید جاری رہا تو قیصر خاں اس کے لشکر کا کل عام شروع کر دے گا لہذا اس نے شکست قبول کی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

قیصر خاں نے رانا سانگا کے اس بھاگتے لشکر کا تعاقب نہیں کیا بلکہ جانے دیا اس طرح رانا سانگا کی قیصر خاں کے خلاف یہ تدبیر بھی بری طرح ناکام ثابت ہوئی تھی۔

جب راج کمار کی کوشلیا نے اپنے شکست خوردہ لشکر کو لے کر اپنے مرکزی شہر میں داخل ہوئی تب لوگوں کے دکھ اور آفسوس کا کوئی شمار نہیں تھا لشکر بھی بد دل تھے گردنیں جھکائے کچھ اپنے گھروں اور کچھ لشکر کی طرف چلے گئے تھے۔ اس موقع پر راج کمار کی کوشلیا جب اپنے راج محل میں داخل ہوئی تو اس کا استقبال کرنے کے لیے خود رانا سانگا رانی لکھنؤ کی کوشلیا کے دونوں بھائی بچل اور رام داس موجود تھے۔ کوشلیا سب سے ملی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر رانا سانگا راج محل کے ایک کمرے میں لے گیا سب نشستوں پر بیٹھ گئے کچھ دیر تک کاٹ کھانے والی اہم روٹی میں ڈوبی خاموشی طاری رہی اس کے بعد

گفتگو کا آغاز رانا سانگا نے کیا اور راج کمار کی کوشلیا کو مخاطب کر کے وہ کہنے لگا۔

”کوشلیا میری بیٹی اس بار کیا ہوا اس بار تو تم لوگوں کے پاس خاصا بڑا لشکر تھا تو پھر اس لشکر کی کمان داری سانول داس کر رہا تھا۔“

رانا سانگا کے اس سوال پر کوشلیا غصہ میں برس پڑی کہنے لگی۔

”سانول داس بالکل بے ہودہ تیغ زن نکلا وہ چند لمحے بھی مسلمانوں کے اس سالار کے سامنے نہ نکال سکا اور پھر اس نے جو بہت بدترین حرکت کی وہ یہ کہ جب ایک بار مسلمانوں کے سالار نے اسے گھوڑے سے گرا دیا اور اس کی تلوار اور ڈھال اس سے چھوٹ گئی تو مسلمانوں کے سالار نے اسے موقع دیا کہ وہ اپنی تلوار اور ڈھال اٹھا کر پھر مقابلہ کر سکتا ہے۔

سانول داس تلوار ڈھال سنبھال کر اٹھا اس وقت میرا ارادہ تھا کہ پہلے کی نسبت زیادہ وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کے سالار پر حملہ آور ہوگا لیکن وہ ایسا بدوا اور بزدل نکلا کہ اپنے ہتھیار اٹھانے کے بعد اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اسے ایڑ لگا کر اپنی جاں بچانے کے لیے اپنے لشکر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن تیغ نہ سکا اس لیے کہ مسلمانوں کے اس سالار نے اپنی بیٹی سے خنجر نکالا اور ایسا تاک کر مارا کہ سانول داس کا اس نے کام تمام کر کے رکھ دیا اس کے بعد وہ بڑے وحشیانہ انداز میں ہمارے لشکر پر حملہ آور ہوا ہمارا لشکر اس کے زور دار حملوں کو برداشت نہ کر سکا اور جب میں نے اندازہ لگایا کہ اگر جنگ کو جاری رکھا تو ہمارے لشکر کا بے پناہ نقصان ہوگا اس بنا پر میں نے شکست قبول کی اور باقی لشکروں کو بچا کر واپس آ گئی۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی یہاں تک کہ رانا سانگا غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”اب مسلمانوں کے اس سالار کا بندوبست مجھے اور میری بیٹی کو کرنا ہوگا میں سمجھتا ہوں اگر سانول داس اس سے مار کھا گیا ہے تو شاید ہمارا چٹا ہوا دوسرا



تین زن سورج مل بھی اس کے سامنے نہ ٹھہر سکے گا لیکن موقع ملا تو ایک بار سورج مل کو ٹکرائیں گے ضرور..... یہاں تک کہنے کے بعد رانا ساٹھا رکا اور پھر کوشلیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”میری بیٹی اب تم اٹھو راج مل کے دوسرے حصے کی طرف جاؤ اور جا کے آرام کرو تم تھکی ہوئی ہو۔“ اس کے ساتھ ہی کوشلیا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی عین اسی وقت کوشلیا کی بڑی بہن کوتلیا اور اس کا شوہر رائے مل اس کمرے میں داخل ہوئے کوتلیا گلے لگ کر کوشلیا سے ملی پھر اس کے کان میں دکھ بھرے انداز میں کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میری بہن کو شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے میرے خیال میں میں بتا جی کے پاس بیٹھتی ہوں تم جاؤ جا کر آرام کرو۔“ اس کے ساتھ ہی کوشلیا اس کمرے سے نکل گئی تھی جب کہ کوتلیا اور اس کا شوہر رام رائے مل دونوں وہاں بیٹھ گئے اور ایدر کے راجہ رائے بھییم پر حملہ آور ہونے کے لیے گفتگو کرنے لگے تھے۔

☆☆

رانا ساٹھا نے چند ہفتے میں ایک خاصا بڑا لشکر تیار کیا اس کے بعد وہ اس لشکر کو حرکت میں لایا اس لشکر میں جہاں اس کی راجہ کماری کوشلیا شامل تھی وہاں اس لشکر میں رانا ساٹھا کے دونوں بیٹے جے مل رام داس بھی شامل تھے اور بڑی بیٹی کوتلیا کا شوہر رائے مل بھی اس لشکر میں شامل ہو چکا تھا اس طرح ایک جہاز اور بڑے لشکر کو لے کر رانا ساٹھا ایدر کے راجہ رائے بھییم کی سر زمینوں کی طرف بڑھا تھا۔

دوسری طرف ایدر کے راجہ رائے بھییم کو بھی خبر ہو چکی تھی کہ اس پر حملہ آور ہونے کے لیے رانا ساٹھا ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے چنانچہ رائے بھییم نے بھی ایک خاصا بڑا لشکر تیار کیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ رانا ساٹھا اور اس کے لشکر کو وہ اپنی سرحدوں پر روکے گا چنانچہ وہ بڑی تیزی اور برقی رفتاری کے ساتھ حرکت میں آیا اور اپنی سرحدوں پر

پہنچ کر اس نے وہاں پڑاؤ کر لیا تھا رانا ساٹھا بھی اس کے سامنے آیا اور رائے بھییم کے سامنے اس نے اپنے لشکر کو پڑاؤ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

ایک رات اور ایک دن دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے پڑاؤ کیے رہے اس کے بعد ہی صبح رانا ساٹھا نے اپنے لشکر کے اندر قبل بچوانے شروع کر دیے تھے یہ صورت حال دیکھتے ہوئے ایدر کا راجہ رائے بھییم بھی حرکت میں آیا لشکر کی صفیں اس نے درست کرنا شروع کی اس نے بھی اپنے لشکر کے اندر بڑے بڑے قبل پینے کا حکم دے دیا تھا اس طرح یہاں دونوں لشکر کی صفیں درست ہو رہی تھیں وہاں دونوں لشکروں کے اندر خوفناک انداز میں بڑے بڑے قبل پینے جا رہے تھے۔

اس کے بعد رانا ساٹھا نے اپنے کام کی ابتدا کی اپنے لشکر کو وہ حرکت میں لایا، مفاہمت کی ساعتوں اور زیست کی رفاقتوں کے چھترے اڑاتے طوفانوں کرب کے سیکے ٹھل میں نسلوں کی نفرت ان دیکھے درد بھرے اندیشوں میں خطرات کے وہموں اور کشت روح تک کو ویران کر دینے والی عذاب رتوں کی الم انگیزیوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

جوانی کا روانی کرتے ہوئے ایدر کا راجہ رائے بھییم بھی رانا ساٹھا کے لشکر پر ذہنوں کو متفکری کا شکار کرتی ہوئی کیوں کی کالی فضاؤں پر ہنرمندی کو رنگ آلود کرتی بربریت پھیلاتی آندھوں نفرت کھڑی کرتے بگولوں اور خونخوار جدوجہد کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔

اس طرح دونوں لشکروں کے ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے سے روز مگاہ کے اندر تند عناصر کی بیلغار منافع پر چھائیاں دوعاشی ہوائیں کرب کے طوفان بن کر چھانے لگی تھیں۔ موت زیست کے زخموں پر نمک پاشی کرنے لگی تھی میدان جنگ کے اندر ارادے دوسووں میں ولولے خاک میں تبدیل ہونے لگے تھے چاروسلازمتوں کی صدا میں بعض وعداوت کی شرانگیزیوں تاج اٹھی تھیں۔

ایدر کے راجہ رائے بھییم نے رانا ساٹھا کا ڈٹ

کر لیا۔ کیا جنگ کے دوران اس کی بد قسمتی کہ وہ مارا گیا اس کے مرنے سے اس کے مرنے سے لشکر کے اندر ہدایتی اور مراغ کے آثار بڑی تیزی سے پھیلنے لگے اس موقع پر رائے بھییم کے بیٹے بہادر مل نے لشکر کو سنبھال دینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور بہادر مل نے دیکھا کہ اب وہ رانا ساٹھا کے لشکر کے سامنے ٹک نہیں سکتا تب وہ اپنے اہل خانہ و عزیز و اقارب کے ساتھ ہجرات کے سلطان مظفر کی طرف بھاگ گیا۔

بہادر مل کے بھاگ جانے پر رانا ساٹھا اس کا سینا پتی کرشن دیو اور سب سے عمدہ پنے ہوئے تین زن سورج مل دونوں بیٹوں جے مل رام داس دونوں بیٹیوں کوتلیا اور کوشلیا بیوی لکھاروی خونی کی کوئی انتہا نہ تھی وہ اس پر پھولے نہ سارے تھے کہ انہوں نے جنگ کے دوران نہ صرف رائے بھییم کا خاتمہ کر دیا ہے اور اسے شکست دی ہے اس کا بیٹا جنگ جو جاری شدہ اس کا اپنی جان بچا کر بھاگ گیا ہے۔

اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے نتیجے میں رانا ساٹھا کے ہاتھ بے پناہ مال غنیمت لگا اس کے علاوہ میدان جنگ کے قریب ہی اور آس پاس جو شودروں کی بستی تھیں انہیں بھی رانا نے خوب لوٹا اس کے بعد رانا نے اپنے لشکر کے ساتھ اس جگہ قیام کر لیا تھا جہاں رائے بھییم اور اس کے بیٹے بہادر مل کے ساتھ جنگ ہوئی تھی۔

پھر رانا ساٹھا اپنی بیوی دونوں بیٹیوں کے علاوہ اپنے داماد رائے مل سینا پتی کرشن دیو اور لا جواب تین زن سورج مل کے ساتھ اپنے خیمہ میں آیا شامیانہ نما وہ بہت بڑا خیمہ تھا جب سب وہاں بیٹھ گئے تب رانا ساٹھا نے گفتگو کا آغاز کیا سب سے پہلے اس نے سب کو اس شاندار فتح پر مبارک باد دی پھر باری باری کرشن دیو اور سورج مل کی طرف دیکھتے ہوئے رانا ساٹھا کہنے لگا۔

”اس جنگ کے دوران تم دونوں کی کارگزاری سب سے اچھی رہی سورج مل تمہارے کارگزاری

لا جواب تھی اور ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ آنے والے دور میں بھی تمہیں مسلمانوں کے سالار قیصر خاں کے مقابلے میں انفرادی جنگ کے لیے نکالا گیا تو تم کامیاب اور کامران ہو گے۔“

رانا ساٹھا کی ان الفاظ پر سورج مل کی چھاتی تن کی تھی لہذا وہ کہنے لگا۔

”قیصر خاں کی گردن میں ضرور کاٹوں گا۔“ یہاں تک کہتے کہتے سورج مل کو روک جانا پڑا اس لیے کہ رانا ساٹھا بول اٹھا۔

”اگر تم قیصر خاں کی گردن کاٹتے ہو جس دن تم ایسا کرو گے اسی روز میں اپنی راجہ کماری کوشلیا کو تم سے بیاہ دوں گا۔“

سورج مل نے اس موقع پر ایک گہری نگاہ اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھی کوشلیا پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

”یہ میرے لیے ایک بہت بڑا اور انتہائی نایاب تحفہ ہو گا اس کے علاوہ اپنے ساتھی سانول داس اور آپ کے لشکریوں کی گزشتہ ناکامیوں کا قیصر خاں سے انتقام لینے کے لیے مجھے ہر صورت ہر طریقے ہر حربے اور ہر بہن کو استعمال کر کے اس کی گردن کاٹنا ہوگی۔“

سورج مل جب خاموش ہوا تب پہلی بار راجہ کماری کوشلیا بولی اور اپنے باپ رانا ساٹھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”پتا جی ہم اپنے لشکر کے ساتھ کچھ عرصہ یہی قیام رکھیں گے ہو سکتا ہے کہ مرنے والا رائے بھییم کا بیٹا بہادر مل ہندوستان کے کسی حکمران سے مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور اس کے ساتھ ہمارا ٹکراؤ ہو اور امید ہے کہ یہ ٹکراؤ گجرات کے سلطان مظفر کے ساتھ ہو سکتا ہے چنانچہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں ایدر کے علاقوں میں ہی قیام کرنا ہو گا تاہم اس سلسلے میں ہمیں کچھ احتیاطی تدابیر کرنا ہوگی۔“

کوشلیا جب خاموش ہوئی تب رانا ساٹھا کچھ دیر تک فخریہ انداز میں اپنی راجہ کماری کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔



”یہی تمہارا اشارہ کن احتیاطی تدابیر کی طرف ہے۔“ کوشلیا نے کچھ سوچا پھر کہنے لگی۔

”ہمتی اگر تو بہادر میدان جنگ سے بھاگ کر ہجرات کی طرف گیا ہے تو میرا اپنا اندازہ ہے کہ ہجرات کے سلطان مظفر کو ہمارے خلاف کھڑا کرنے میں وہ کامیاب ہو جائے گا میں نہیں سمجھتی کہ سلطان مظفر کی عسکری طاقت ہم سے زیادہ ہے لیکن اس کے پاس سالار ہم سے بہتر ہیں اس کے پاس قیصر نام کا سالار ہے ابھی تک اسے کسی نے شکست نہیں دی جب کہ اس نے ہر لشکر کو اپنے سامنے لمحوں کے اندر کھنگال کر رکھ دیا اس بنا پر ہجرات کے سلطان مظفر کے ساتھ ہماری جنگوں کا سلسلہ طویل بھی ہو سکتا ہے اور اس کے لیے ہمیں جو احتیاطی تدابیر کرنی ہیں ان میں سے پہلے یہ کہ.....!

ماتا، کوشلیا اور لشکر کے اندر جو دوسری عورتیں ہیں انہیں چند محافظ دستوں کے ساتھ واپس اپنے مرکز کی طرف روانہ کر دیا جائے اس لیے کہ آنے والے دور میں ہو سکتا ہے ہمیں اپنے لشکر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑی برق رفتاری سے پیش قدمی کرنا پڑے ایسی صورت میں کوئی ایسی عورت لشکر میں نہ رہے جو جنگوں میں حصہ نہ لے رہی ہو اس کے ساتھ ہی ہمتی میں آپ سے یہ بھی گزارش کروں گی کہ دونوں بھائیوں جے مل رام داس کو بھی واپس بھیج دیا جائے اس لیے کہ اس جنگ میں تو ہمارے خاندان کے سارے لوگ اس لیے شامل ہو گئے تھے کہ ہمیں یقین تھا ہم ایدر کے راجہ رائے بھیج کو شکست دیں گے اس طرح سب دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے کونسا ایدر کے علاقوں کی رانی اور ہمارا بھائی رائے ل ایدر کا حکمران راجہ بنے۔

ایسا ہو چکا ہے دونوں بھائیوں کے علاوہ ماتا اور کوشلیا دیگر عورتوں کو واپس بھیج دینا چاہیے اور یہاں رہتے ہوئے بھائی رائے ل کے ذمہ یہ کام لگانا چاہیے کہ وہ چونکہ اب ان علاقوں کا حاکم اور راجہ ہے لہذا یہاں کے لوگوں کے ساتھ نرمی اور بڑی عاجزی کا

مظاہرہ کرتے ہوئے پیش آئے ایدر کے خزانے اب ہمارے پاس ہیں ہم ان کے مالک میں لہذا بڑی رقوم خرچ کر کے بھائی رائے ل کو چاہیے کہ ایک مقامی لشکر بھی تیار کرے آنے والے دور میں اگر ہجرات کا سلطان مرنے والے راجہ رائے بھیج کے بیٹے بہادرل کی حمایت میں ہمارے خلاف اٹھتا ہے تو اس لشکر کے ساتھ اس سے نمٹ سکتے ہیں۔“ رانا سانگا نے اپنی راجکاری کی اس تجویز کو پسند کیا تھا۔

اس کے بعد رانا سانگا نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ اپنے دونوں بیٹوں کے علاوہ اپنی بڑی بیٹی کوشلیا اپنی بیوی اور لشکر میں شامل دوسری عورتوں کو واپس اپنے مرکزی شہر بھیجوا دیا تھا اس کے بعد وہ اپنی راج کماری کوشلیا اور اپنے داماد کے ساتھ مل کر ایدر کے سارے علاقوں کا نظم و نسق ہاتھ میں لے رہے تھے جب کہ رائے ل نے کڑانے کے منہ کھول دیے اور لوگوں کو اپنے حق میں کرنے کے لیے اس نے ایدر کی زمینوں سے ہی ایک لشکر تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆

ایدر کے راجہ رائے بھیج کا بیٹا رائے بہادر شکست اٹھا کر ہجرات کی طرف بھاگا تھا ایک روز جب کہ سلطان مظفر اپنے قیصر کے ایک کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے چوہدار نے بہادرل کے آنے کی اطلاع دی۔

سلطان مظفر نے فوراً بہادرل کو اپنے پاس بلا لیا چنانچہ جب بہادرل سلطان کے سامنے گیا تو سلطان اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے بلا اپنے سامنے بیٹھایا بہادرل کی اس حالت پر بڑے غور اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سلطان مظفر نے پوچھ لیا۔

”تم حیرت سے تو آئے ہو۔“

جواب میں بہادرل نے اچانک رانا سانگا کے حملہ آور ہونے اپنے باپ کے مار جانے پر سلطان کی طرف آنے کی تفصیل کہہ دی تھی یہ تفصیل جان کر کچھ دیر تو سلطان مظفر گہری سوچوں میں ڈوبا رہا پھر کہنے لگا۔

”تم اب اہل خانہ اور لوگوں کو کہاں چھوڑ آئے

ہو۔“ اس پر دکھ بھرے انداز میں بہادرل کہنے لگا۔

”آپ کے علاقوں میں انہیں ایک سرانے میں ٹھہرا کر آیا ہوں اور رانا سانگا کے خلاف آپ سے مدد کرنے کی درخواست لے کر آیا ہوں۔ رانا سانگا نے نہ صرف یہ کہ ہمیں بڑا نقصان پہنچایا ہے اور اچانک حملہ آور ہو کر ہمارے علاقوں پر قابض ہو گیا ہے بلکہ اوپنی ذات کے ہندو کا سا کردار کرتے ہوئے ہمارے علاقوں میں جو شور و زور اور اچھوتوں کی بتیاں ہیں ان پر بھی حملہ آور ہو کر ان کے اندر اس نے لوٹ مار مچائی ہے۔“

بہادرل کے ان الفاظ میں سلطان مظفر بولا اور کہنے لگا۔

”کیا رانا سانگا تو ریڈ کی اعلیٰ نسل سے تعلق نہیں رکھتا؟ کیا وہ ہندوؤں کی چار قومیتوں میں سے اپنے آپ کو کھتری خیال نہیں کرتا۔“

جواب میں بہادرل نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

”سلطان محترم یہ چار قومیتیں قدیم ہندی کے اندر ہیں جبکہ رانا سانگا راجپوت ہے اور راجپوتوں کا تعلق ہم سے نہیں ہے۔“ سلطان مظفر نے حیرت سے بہادرل کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

”اگر یہ تم لوگوں میں نہیں ہے تو پھر کون ہے۔“

بہادرل نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

”سلطان محترم راجپوت ہندی قوم نہیں تھیں نہ ہی ہندوستان سے ان کا کوئی تعلق اور واسطہ ہے بلکہ ان کا تعلق منگولوں سے بنتا ہے آپ جانتے ہیں کہ یہ منگول مسلمانوں کی آمد کے وقت یا اس سے کچھ پہلے ہندوستان میں آ کر ہندی قوم میں شامل ہو گئے تھے

ہندی راجپوت ہندوستان کی غیر آریہ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں ہندوستان میں بدھوں کی حکومت اور سلطنت کمزور ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تو

ہم ان مذہب کے ماننے والوں یا یوں کہیے کہ بدھوں نے بدھوں کی حکومت کے اس ضعف اور کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور پنڈت منوں جو بدھو معاشرے کو چار قومیتوں میں تقسیم کیا تھا اس کے

عہد کے انہوں نے پھر واپس لانے کی کوشش کی۔ اس کوشش کی کامیابی کا انھما چونکہ بہت کچھ جنگی طاقت پر بھی منحصر تھا پنڈت منوں کے زمانے کی تقسیم کے مطابق کھتری یا کھتری لوگ طاقت کے وارث اور جنگی کاموں میں ماہر تھے اور برہمن کھتری دیس شور کی تقسیم بالکل غیر فطری تھی۔

کھتری یا کھتری کی نسل کو چونکہ پراسرام خاتمہ کر چکا تھا لہذا برہمنوں نے اب بدھوں کے مذہب اور حکومت کو مٹانے کے لیے ایک نئی جنگی قوم تیار کر کے ان سے وہ کام لیا جو کھتریوں سے لیا جاتا تھا یہ نئی قوم منگولوں کے جنگجو قبائل اور غیر آریوں یعنی سوردوں کے ذی حوصلہ اور بہادر لوگوں کو اپنا ہمدرد اور ہوا خواہ بنا کر تیار کی گئی اور ان کو راجپوت کا خطاب دیا گیا یہ منگول اور غیر آریہ یقیناً وہ لوگ تھے جو ڈاکڑی اور لوٹ مار کا پیشہ رکھتے تھے ان کو برہمنوں نے اپنے سازش میں شریک کر کے باقاعدہ طور پر اپنی قوم اور مذہب کا رکن بنا لیا تھا۔

کچھ مورخین راجپوتوں کے متعلق یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ ہندو سوسائٹی میں سے بہت سے آدمی ایسے شامل ہیں جو خالص آریہ نسل سے تھے جو مشرق یا مغرب سے ہندوستان میں آئے اور جن کو ہندوؤں نے اپنے مذہب میں شامل کر کے اپنی سوسائٹی کا رکن بنا لیا ہے کسی طریقہ سے انہوں نے بہت سی ایسی قوموں کو بھی ہندو سوسائٹی میں شامل کر لیا گیا جو اس ملک کے ابتدائی باشندوں گوڈ بیل وغیرہ سے تھے یہ طریقہ نہایت قدیم زمانے سے جاری رہا اور اب تک جاری ہے ہندو سماج میں نئی جاتیاں روز بیتی ہیں اور ہمیشہ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے بعض کو اونچا اور بعض کو نیچا درجہ دیا جاتا ہے۔

یہ عمل بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ سمجھا گیا ہے کہ منگول قوم کے بہت سے آدمی جو کوئی ترکستانی نسل سے تھے سن عیسوی کی ابتدائی صدی میں اس ملک میں آئے اور ہندو سوسائٹی میں شامل ہو گئے



چنانچہ یورپین مسیحین جات امیر اور کوجروں کو بھی ان ہی قبیلہ جات میں گنتے ہیں۔

راجپوتوں کو جانوں کو گجروں کو اور امیروں کو ہندو سماج اپنا رکن سمجھتی ہے یہ امر کہ وہ کب ہندو سوسائٹی میں داخل ہوئے بالکل انوکھا سا ہے اور اس پر زیادہ بحث بھی نہیں کی گئی اس طرح بیسیوں خاندان برہمنوں کے اصلی آریا نسل سے نہیں ہیں اور جس طرح سے بہت سی اور ذاتیں بھی اصلی آریہ نسل سے نہیں ہیں بلکہ مخلوط ہے اس طرح موجودہ راج بھی کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔

دوسرے بہت سے مورخ بھی راجپوتوں کو منگول اور غیر آریہ نسل سے ہوتا مانتے ہیں بہر حال جس طرح یہ نئی قوم تیار ہوئی اس طرح مذہب بھی بالکل نیا ترتیب دیا گیا پران برہمنی مذہب یا وہدک دھرم میں عناصر پرستی کا زور شور تھا جس کو پنڈت منو کے زمانے میں تغیر و تبدل کیا گیا تھا اس کے بعد بدھ مذہب نے اس کو بالکل مٹا ڈالا اور ذات بات کی تقسیم کو پنڈت منو کے زمانے میں بہت سخت ہو گئی تھی بالکل مٹا ڈالا بدھ مذہب میں بدھ پرستی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی اب برہمنوں نے چونکہ منگولوں کو جو بدھ مذہب کے پرتوہ اپنی سازش میں شامل کیا لہذا بہت سی باتیں بدھ مذہب کی بھی اپنے جدید مذہب میں شامل کر کے ان کے بہت سے بتوں کی پرستش کا جائزہ لیا اور بدھ کو بھی وشنو کا اوتار تسلیم کر لیا اور اس طرح غیر آریوں کی بہت سی باتیں اپنے جدید مذہب میں شامل کر لیں یہ سلسلہ غالباً مسلمانوں کی آمد سے تھوڑی سی دنوں پہلے تک جاری رہا ہوگا۔

یہاں تک کہنے کے بعد بہادر مل رکا اور اس کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔ ”مسلمانوں کا مذہب چونکہ سب سے پہلے جنوبی ہند سری لنکا اور مالا بار میں آیا تھا وہاں کے لوگوں نے اسلام سے اپنی مرضی کے مطابق بہت کچھ فائدہ اٹھا کر شمالی ہند کی طرف خرچ کیا اور بدھوں سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری کیا حسب

زمانے میں سندھ پر ایک اسلامی حکومت قائم ہو چکی اس زمانے میں شکر اچاریہ یقیناً پسند نہیں ہوا تھا شکر اچاریہ غالباً خلافت عباسیہ کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا تھا شکر اچاریہ سے پہلے راجپوتوں کی اس نوزائیدہ قوم میں جان پڑنے لگی تھی اور وہ بعض چھوٹے چھوٹے قطعات پر قابض ہوتے گئے۔

شکر اچاریہ نے جب بدھوں کے خلاف جہاد شروع کیا اور نوزائیدہ جدید برہمنی مذہب کی تائید شروع کی تو راجپوتوں کی اس جدید قوم اور طاقت نے شکر چار کی خوب امانت کی تو شکر اچاریہ نے راجپوتوں کی طاقت سے فائدہ اٹھانے میں خوب مستعدی دکھائی۔

بنارس وسط ہند اور دامن کوہ ہمالیہ تک برہمنوں اور راجپوتوں کو نمایاں غلبہ حاصل ہو گیا اس جدید مذہب جدید قومی کی تعمیر میں چونکہ شکر اچاریہ سب سے پہلا مصنف اور محقق تھا لہذا اس کی تعلیم خصوصی وقعت اور عزت و احترام کی نظر سے راجپوتوں کی اندر دیکھی جاتی ہے۔

برہمنوں کی مجوزہ یہ تحریک سیاسی تحریک تھی۔ جا بجائے مذہبی اصول قائم ہوئے کہیں وشنو کو سب سے بڑا اوتار مانا گیا کہیں برہما کو اور کئی بیش کو اس طرح ہندو مذہب کے نام پر ہزار ہا فرقے پیدا ہو گئے جن میں کوئی اصولی اتفاق بجز لفظ ہندو کے نہیں پایا جاتا۔ عرض مسلمانوں کی آمد اور حملہ آوری کے وقت بدھوں کی قومیت مذہب اور حکومت پر برہمنوں اور راجپوتوں نے حملہ آوری شروع کر رکھی تھی اور ملک میں ایک پھیل چکی ہوئی تھی اس کش مکش اور زور آوری کا سلسلہ محمد بن قاسم کے حملہ سے شہاب غوری کے حملوں یعنی تقریباً پانچ سو سال تک ملک کے کسی نہ کسی حصے میں جاری رہا۔

اس طویل مدت میں کوئی علامت ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے قطعی طور پر یہ حکم لگایا جاسکے کہ اگر مسلمان اس ملک میں نہ آتے تو جدید ہندو مذہب بدھ مذہب پر غلبہ پا کر اپنی حکومت قائم کر لیتا چونکہ

سندھ میں مسلمانوں کو بدھوں کی حکومت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا سندھ کے فرمانروؤں کی قوم برہمن تھی لیکن مذہب اس حکومت کا بدھ ہی تھا۔

مذہب کو فتح کرتے ہوئے محمود غزنوی کو بدھوں کی حکومت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا کیونکہ راجہ جے پال اور اس کے بیٹے نند پال کی حکومت منگول تھی اور مذہب بدھ تھا بنگال اور آسام کو بھی مسلمانوں نے بدھ حکومتوں سے چھینا علاوہ الدین خلجی نے دکن کا ملک بھی بدھ حکومت کو شکست دے کر فتح کیا صرف قنوج اور کانپور کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے یہاں کے راجہ جدید برہمن مذہب کو اختیار کر چکے تھے۔

لیکن پنجاب اور سندھ کے راجاؤں نے جس بہادری سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا قنوج اور کانپور سے اس ہمت کا اظہار نہیں ہوا قنوج کے راجہ نے سلطان محمود غزنوی کی بلاتلائی اطاعت قبول کر لی جس پر کانپور کے راجہ کو بہت غصہ آیا لیکن اگلے سال خود اس نے بھی محمود غزنوی کے فرمانبردار کی جاوائے کندھے پر رکھا اور سلطان محمود غزنوی کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی لکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ یہاں تک کہنے کے بعد بہادر مل ذرا رک کر پھر کہنے لگا۔

”چنانچہ سلطان محترم موجودہ ہندو مذہب یا جدید برہمنی مذہب جس کام کو پانچ سو سال میں پورا نہ کر سکا تھا اسے مسلمانوں نے با آسانی انجام دیا اگر مسلمان اس ملک میں نہ آتے تو بہت زیادہ ممکن بلکہ ناممکن ہے کہ بدھ مذہب اپنی قوت کو ختم کر کے اس جدید مذہب اور طاقت کو جو بدھوں کے مقابلے میں پڑا اور اسے بھی بالکل چل ڈالتا اور ان مظالم کا انتقام لے لیا۔ بنارس آگرہ یاد وغیرہ میں برہمنوں اور راجپوتوں نے بدھوں پر شکر اچاریہ وغیرہ کی رہبری میں کیے تھے لیکن سندھ کی اسلامی حکومت اور کابل خراسان اور ماوراء النہر کے مسلمانوں کی فتوحات میں ہندوستان کے بدھ حکمران کو ششدر و حیراں بنا کر قنوج وغیرہ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا اور نند پال فرمانروا پنجاب کو مجبور کیا کہ وہ تمام ہندو اور بدھ

راجاؤں کو متحد ہونے اور متفقہ طاقت سے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دے۔

اگر اس موقع پر ہندوستان کے بدھ حکمرانوں کے خلاف برہمنوں اور راجپوتوں کی تحریک کامیاب ہو جاتی تو وہ تمام ملک ہندوستان پر قابض اور متصرف ہو جاتے تو غیر ممکن تھا کہ کابل خراساں اور کشمیر وغیرہ کے بدھ خاموش بیٹھے وہ ایک تماشا دیکھنے بلکہ کابل خراساں اور بخارا کے جنگجو لوگ جو بدھ مذہب کے پیرو تھے یقیناً ہندوستان پر حملہ آور ہوتے جس طرح ان لوگوں نے راجہ کشک کے زمانے میں اپنی بادشاہی اس ملک میں قائم کر لی تھی پھر قابض اور متصرف ہو جاتے اور تمام ملک میں بدھ مذہب کا دور دورہ ہوتا۔

لیکن مسلمانوں نے چونکہ پہلے ہی کابل خراساں اور بخارا کو فتح کر کے بیرونی بدھوں کے حملوں کو غیر ممکن بنا دیا تھا اور اس کے بعد ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے لہذا آہستہ برہمنوں کو راجپوتوں کے پیدا کرنے اور جدید قوم و مذہب کی ترتیب دینے کی ترغیب ہوئی۔

مگر وہ اپنی اس کوشش میں کافی کامیابی حاصل نہ کر سکے آخر مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کر کے ہندوؤں کے اس جدید مذہب کو باقی رہنے دیا اور بربادی کے خطرے سے بچالیا مسلمانوں کے رخ مند ہونے کے بعد موجودہ ہندو مذہب اور موجودہ ہندو قومیت بالکل محفوظ ہو گئی اور اس نے مسلمانوں کے سامنے میں نہایت ہی اطمینان کے ساتھ اپنی قومی اور مذہبی اصول مرتب کئے۔

چنانچہ موجودہ ہندو مذہب کی تصانیت اور مذہب کی اصولی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ اسلامی حکومت میں تیار ہوا اور بڑے بڑے عظیم الشان مذہبی فرقے جو آج اپنی روش میں قریباً تمام ہندو آبادی کو لیے ہوئے ہیں سب کے سب اس زمانے میں مرتب و مدون ہوئے جب کہ اسلامی شہنشاہی ہندوستان میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ گاحزن تھی اسلامی مساوات اسلامی درگزر اسلامی مذہبی



آزادی کا غالباً اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ یقیناً مسلمانوں کی رودادری اور ان کی فراخ دلی ہے کہ ہندو مذہب کو ہندوستان میں مزید پنپنے کا موقع ملا۔“ اتنا کہنے کے بعد ایک بار پھر بہادر مل رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”بہر حال سلطان محترم یہ راجپوت غیر آریہ ہیں ہندوستان کی قدیم نسل سے ان کا کوئی تعلق نہیں بنیادی طور پر منکول ہیں لیکن اب یہ لوگ اپنے آپ کو اور ہندو ذات کے لوگ انہیں اونچے درجے کا ہندو شمار کرنے لگے ہیں۔“

بہادر مل یہاں تک کہنے کے بعد جب خاموش ہوا تب توصیفی انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سلطان مظفر کہنے لگا۔

”بہادر مل راجپوتوں سے متعلق تفصیل بتا کر تو نے میرے علم میں اضافہ کیا ہے رانا سانگا اس وقت نہ صرف اپنے آپ کو سب سے طاقت ور راجہ بلکہ اعلیٰ نسل اور اونچے درجے کا ہندو شمار کرتا ہے اب بولو تم ہم سے کیا چاہتے ہو۔“

سلطان مظفر کے اس استفسار پر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بہادر مل نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر کہنے لگا۔

”سلطان محترم سب سے پہلے تو مجھے اس بات کی شرمندگی ہے کہ ایک موقع پر میرا باپ اسی رانا سانگا کی اکٹھا ہٹ پر آپ کے علاقوں پر چڑھ دوڑا اس کے لیے جتنی بار معذرت طلب کی جائے کم ہے سلطان محترم رانا سانگا نے یہ منصوبہ بندی کی ہے کہ پہلے ایدر کے علاقوں پر قبضہ کیا جائے اس کے بعد وہ ماوہ کے سلطان محمود جی کے علاقوں میں داخل اندازی کرے گا اور پھر اپنی طاقت اور قوت میں اضافہ کر کے وہ غم ٹھونک کر آپ کے مقابل آنا چاہتا ہے میری اس سلسلے میں آپ سے گزارش ہے کہ رانا سانگا کے ان مکروہ منصوبوں کی تکمیل نہ ہونے دی جائے وہ جو خواب دیکھ رہا ہے اس کے ان خوابوں کو مسمار کر دیا

جائے میری آپ سے گزارش ہے کہ رانا سانگا کے خلاف میری مدد کریں اور اس نے جو ہمارے علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے وہ حاصل کرنے میں میری اعانت کریں سلطان محترم میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تاحیات آپ کا مطیع اور فرمانبردار بن کر رہوں گا اس سلسلے میں آپ مجھ پر کوئی خراج کی رقم بھی مقرر کرے ہیں تو وہ بھی میں باقاعدگی سے ادا کرتا رہوں گا۔“

بہادر مل کے ان الفاظ پر سلطان مسکرایا اور کہنے لگا۔

”تم کچھ زیادہ ہی افساری سے کام لے رہے ہو میں تم پر کوئی خراج مقرر نہیں کروں گا ساتھ ہی تمہیں یہ بھی یقین دلانا ہوں کہ ان علاقوں میں میں رانا سانگا کو بے تحشہ تیل اور پاگل اونٹ کی حیثیت اختیار نہیں کرنے دوں گا اس کا راستہ روکا جائے گا اور اسے اس کے علاقوں میں محدود کیا جائے گا۔“ سلطان مظفر کا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا وہ کہہ رہا تھا۔

”بہادر مل پہلے تم یہ کام کرو کہ اپنے عزیز قارب اپنے رشتے داروں کو جنہیں سرانے میں ضم کر آگئے ہو یہاں لے آؤ ان کا قیام یہاں ہو تمہارے آنے تک ایک عمارت تم سب کی رہائش کے لیے خالی کر دی جائے گی اتنی دیر تک میں اپنے سرحدوں سے قیصر خاں اور اعتماد خاں صفدر خاں اور نصرت خاں چاروں سالاروں کو واپس بلاتا ہوں اگر دیر تک تم اپنے اہل خانہ کو لے کر آ جاؤ گے اس کے بعد سارے سالاروں کا اجلاس طلب کیا جائے گا اس اجلاس میں فیصلہ کیا جائے گا کہ رانا سانگا سے کس طرح نبھنا چاہیے۔“

سلطان مظفر کا یہ جواب سن کر بہادر مل خوش ہو گیا تھا چنانچہ سلطان کے کہنے پر وہ اسی روز اپنے عزیز اقارب کو لانے محمد آباد سے نکل گیا تھا جب کہ اس روز سلطان نے اپنے سالاروں کی طرف تیز رفتار قاصد روانہ کیے اور انہیں محمد آباد طلب کر لیا تھا کہ رانا سانگا کی سازشوں اور مختلف حکمرانوں کے خلاف اس کی یلغار اور ترکیز رفتگو کر کے ان کا سد باب کرنے کے لیے منصوبہ بندی کو آخری شکل دی جائے۔

☆☆

قیصر خاں اعتماد خاں صفدر خاں اور نصرت خاں اور ان کے اپنے لشکریوں کو لے کر محمد آباد پہنچے تو اس کے دوسرے روز سلطان مظفر نے سب سے پہلے سالاروں کا ایک خفیہ اجلاس اپنے قصر میں طلب کیا اس اجلاس میں سالاروں میں سے نظام الملک قیصر خاں اعتماد خاں نصرت خاں ظہیر خاں صفدر خاں مبارک خاں اسد خاں کے علاوہ سلطان مظفر کے محافظ دستوں کے سالار عماد الملک اور خداوند خاں بھی شامل تھے۔

جب یہ سب سلطان کے پاس جمع ہو گئے تب سلطان نے سب سے پہلے انہیں ایدر کی صورت حال آگاہ کیا اور ایدر کے نئے راجہ بہادر مل کے یہاں آنے اور رانا سانگا کے خلاف مدد طلب کرنے کی تفصیل بھی ان سے کہہ دی گئی۔

یہ ساری تفصیل کہنے کے بعد سلطان مظفر نے پھر اپنے سالاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”جو حالات اچانک نمودار ہوئے ہیں ان کی تفصیل میں نے آپ لوگوں سے کہہ دی ہے اب آپ سارے مل کر یہ فیصلہ کریں کہ ایدر کے راجہ بہادر مل کی مدد کرتے ہوئے ہمیں رانا سانگا کے خلاف کس طرح حرکت میں آنا چاہیے۔“

کچھ دیر سارے سالار آپس میں صلح مشورہ اور کھسک پھسک کرتے رہے یہاں تک کہ سالاروں میں نظام الملک جو عمر میں سب سے بڑا تھا وہ سلطان مظفر کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”سلطان محترم ہم نے قیصر خاں کو اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہم نے ایک منصوبہ بندی کی ہے اور میں یہ کہتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتا یہ منصوبہ بندی بھی قیصر خاں کی ہی تجویز کردہ ہے لہذا جو کچھ قیصر خاں کہے گا وہ ہم سب کے لیے آواز ہے۔“

اپنے سالاروں کے اس رد عمل پر سلطان مظفر خوشی کا اظہار کیا پھر وہ قیصر خاں کی طرف دیکھتے

ہوئے بول اٹھا۔

”قیصر خاں اب بولو بیٹے! کیا منصوبہ بندی ہے اور کیسے اس پر عمل کیا جائے گا۔“ جواب میں قیصر خاں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری کہنے لگا۔

”سلطان محترم جو کچھ میں کہنے لگا ہوں یہ حرف آخر نہیں ہے یہ ہماری طرف سے ایک تجویز ہے اس میں جو تبدیلی آپ کرنا چاہیں گے وہ ہمارے لیے آخری ہوگی سلطان محترم میں چاہتا ہوں دو لشکر تیار کئے جائیں دو لشکر جو میرے اور اعتماد کے تحت کام کرتا رہا اسے ہمارے پاس ہی رہنے دیا جائے اس کے علاوہ اس سے پہلے جو لشکر صفدر خاں اور نصرت خاں کے تحت کام کرتا رہا ہے وہ بھی میرے اور اعتماد خاں کے اشاروں کو سمجھتا ہے۔

اب جو ہم نے تبدیلی کی ہے وہ یہ کہ ایک بڑا لشکر تیار کیا جائے اس کا سالار اعلیٰ نظام الملک کو بتایا جائے اور بڑے سالاروں میں سے صفدر خاں اور نصرت خاں دونوں کو اس کے ساتھ رکھا جائے اس کے علاوہ میرے اور اعتماد خاں کے ساتھ وہی پرانا لشکر ہوگا یہاں سے دن کی روشنی میں نظام الملک صفدر خاں اور نصرت خاں اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ کوچ کریں گے اور محمڑوں کے ذریعے چاروں طرف یہ خبر پھیلا دی جائے گی کہ سلطان کا سالار نظام الملک ایک لشکر لے کر رانا سانگا کا مقابلہ کرنے کے لیے آ رہا ہے۔

سلطان محترم یہ ایک بڑی اور فیصلہ کن جنگ ہوگی دن کے وقت جب نظام الملک صفدر خاں اور نصرت خاں تینوں اپنے لشکر کو لے کر کوچ کر جائیں گے تب آنے والی شب کو میں اور اعتماد خاں کوچ کریں گے۔

نظام الملک کو کوشش کرے گا کہ وہ اس رفتار سے رانا سانگا کی طرف بڑھے کہ شام کے وقت وہ اس کے لشکر کے سامنے جائے اور بڑا کرنا شروع کر دے ظاہر ہے رانا سانگا کے پاس ایک بہت بڑا لشکر ہوگا چنانچہ یقیناً اگلے روز رانا سانگا جنگ کی ابتدا کرتا



چاہے گا اور جس روز شام کے وقت رانا ساٹگا کے سامنے نظام الملک اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کرے گا اسی رات کو میں اور اعتماد خاں بھی وہاں پہنچیں گے اور نظام الملک کے لشکر کے پیچھے جو بار برداری کی جانور اور رسد کا سامان ہوگا وہاں قیام کر لیں گے اگلے روز جب سورج طلوع ہوگا تو میں اور اعتماد خاں اپنے لشکریوں کے ساتھ بار برداری کے جانوروں اور سامان کے پیچھے ہی ایک طرح کی گھات میں رہیں گے جنگ کی ابتدا نظام الملک ہی کرے گا۔

یہاں تک کہتے کہتے قیصر خاں کو رک جانا پڑا اس لیے کہ راج میں سلطان مظفر بول پڑا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”بیٹے اس قدر زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے تمہیں پڑاؤ کے پیچھے گھات لگانے کی کیا ضرورت ہے میں تو بچھتا ہوں اگر تم نے نظام الملک کے بعد رات کے وقت یہاں سے کوچ کرنا ہے تو پھر میدان جنگ کی طرف محفوظ جگہ میں گھات میں چلے جانا اور وہیں سے نکل کر جنگ کے دوران رانا ساٹگا کے لشکر پر ضرب لگانا۔“

سلطان مظفر جب خاموش ہوا تب مسکراتے ہوئے قیصر خاں بول اٹھا اور کہنے لگا۔

”سلطان محترم ایسا کرنے کی ایک وجہ ہے ورنہ میں علیحدہ جگہ گھات میں بھی جا سکتا تھا میں وہیں سے نکل کر رانا ساٹگا کے لشکر پر ضرب لگا سکتا تھا لیکن اپنے لشکر کے اندر رہنا سلطان محترم ایک مجبوری ہے آپ جانتے ہیں کہ رانا ساٹگا نے اپنی مملکت کے عمدہ بیچ زونوں کا پتاؤ کر کے دو بیچ زونوں کا انتخاب کیا تھا ان بیچ زونوں میں سے ایک کا نام سانول داس اور دوسرے کا نام سورج مل ہے سانول داس کو تو گزشتہ جنگ میں انفرادی مقابلہ کر کے میرے سامنے لائے اور وہ میرے ہاتھوں مار کھا گیا اصل میں رانا ساٹگا اس کی بیٹی کو شلیا اور اس کے سارے سالار یہ چاہتے ہیں کہ سلطان مظفر کے سالار قیصر خاں کے ہاتھوں انہیں جو ماضی میں تین بار شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے

اور ان کے سیاحتی رہبر سنگھ کی جو گردن کاٹی گئی اس کے بارے میں وہ میری گردن کاٹنے کے درپہ ہیں اس کے لیے ہی انہوں نے اپنے دو بہترین بیچ زونوں کا انتخاب کیا تھا ان میں سے سانول داس تو میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے اور اب ہمارے مخبروں نے جو خبر دی ہے اس کے مطابق اب میں رانا ساٹگا یا اس کے کسی لشکر سے ٹکراتا ہوں تو سب سے پہلے وہ سورج مل کو انفرادی مقابلے کے لیے نکالیں گے۔

سلطان محترم نظام الملک یہاں سے کوچ کرے گا اور خبریں پھیل جائیں گی کہ سلطان کا سالار نظام الملک کے ایک لشکر کے ساتھ رانا ساٹگا کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلا ہے تب لوگوں کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ اس بار میں جنگ میں حصہ نہیں لے رہا اس بنا پر خدشہ ہے کہ سورج مل کا حوصلہ بلند ہوگا اور وہ میدان میں نکلے گا اور انفرادی مقابلے کے لیے لڑکارے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور اس کا مقابلہ کرنے میں خود ہی ان دونوں سورماؤں کی گردنیں کاٹنے کا عہد کر چکا ہوں چنانچہ نظام الملک کے لشکر کے پیچھے پڑاؤ میں اپنے حصے کے ساتھ قیام کرنے کا مقصد یہی ہے کہ اگر اس موقع پر سورج مل انفرادی مقابلے کے لیے نکلے گا تو میں اس کے مقابلے میں جاؤں گا۔

دوسرے سلطان محترم جب جنگ شروع ہوگی تو میں اور اعتماد خاں دونوں اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ کے اندر ہی موجود رہیں گے رانا ساٹگا اپنے سامنے نظام الملک کے لشکر کی کم تعداد کو دیکھتے ہوئے بڑا خوش ہوگا اور مطمئن ہوگا کہ فتح اور کامیابی اسی کی ہے۔

چنانچہ اگلے روز جب جنگ کی ابتدا کرے گا تو اس کے ٹھوڈی دیر بعد میں اور اعتماد خاں بھی اپنے لشکر کی پچھلی صفوں کے پیچھے رہتے ہوئے حرکت میں آئیں گے ایک طرف سے باہر نکل کر رانا ساٹگا کے لشکر کے ایک پہلو پر ضرب لگائیں گے پھر دیکھیں گے جب سامنے کی طرف سے نظام الملک صفدر خاں اور نصرت خاں رانا ساٹگا کے لشکر سے ٹکرائیں گے اور اس

لشکر کے پہلو پر میں اور اعتماد خاں حملہ آور ہوں گے اور اس کے دیر تک رانا ساٹگا ہمارا مقابلہ کرتا ہے اور کیسے کامیابی کے درکھوتے ہیں میرا دل کہتا ہے کہ اگر ہم مارنے میں کامیاب ہو گئے تو سلطان محترم رانا ساٹگا کو ہم بدترین شکست دیں گے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد قیصر خاں رکا دوبارہ وہ سلطان مظفر کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”سلطان محترم رانا ساٹگا نے اپنی ساری عسکری طاقت اور قوت کو ایدر کے علاقے میں جمع کر لیا ہے اور کاراجہ ان دنوں یہاں قیام کئے ہوئے ہے اس کا کوئی لشکر نہیں ہے اور یہ بھی سنایا ہے کہ رانا ساٹگا کے داماد رائے مل نے ایدر کے خزانوں کے منہ کھول دیے ہیں اور مقامی لوگوں کا بھی ایک لشکر اس نے تیار کر لیا ہے اس طرح رانا ساٹگا کی طاقت اور قوت میں اضافہ ہوا ہے لیکن ہم نے اس اضافی طاقت کو کوئی اہمیت نہیں دینی ہمارے سامنے اب ایک ہی حکمہ دار ایک ہی مقصد ہوگا کہ ہم نے ہر صورت میں رانا ساٹگا کو شکست سے دوچار کرنا ہے اور اس نے جو بیانی طاقت کا دامن پھیلارکھا ہے وہ جو اپنے آپ کو ان طاقتوں میں ناقابلِ تغیر خیال کرتا ہے اس کی اس کمزوری کو ہم نے ہی میں ملانا ہے اور اس کی اتنی اس ردا کو ہمیں بھیر کرنا ہے۔“

قیصر خاں جب خاموش ہوا تو تب کچھ دیر تک سلطان مظفر کو صمیمی انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا کہ کہنے لگا۔

”قیصر آج سے میں تمہیں قیصر خاں ہی نہیں بیٹا کہہ کر مخاطب کروں گا تمہاری حیثیت میرے سب سے اعلیٰ سالاروں میں ہوگی آج میں سب کے سامنے قرار کرتا ہوں کہ تم میری سلطنت کے ایک معزز ترین سالار ہو۔“

سلطان مظفر کے یہ الفاظ سن کر قیصر خاں بڑی حیرت اور بڑی انکساری میں کہنے لگا۔

”سلطان محترم خداوند قدوس کے بعد آپ کا امیر بہت بڑا احسان ہے میں اور اعتماد خاں دونوں

حالات کی تپش میں سرکتے منگوس سبائوں لنگڑے گبولوں کی طرح علم و ادب کے گہواروں تہذیب کے مرکزوں سے دور دھکے کھاتے پھرتے تھے غلامی کے زخم کریدتے آشوب ہم دونوں کو اپنی حسرتوں کا اسیر بنائے ہوئے تھے۔

پتھریلی مسافروں کے مسافروں کی طرح ہم جنجروں کی باڑھ شمشیروں کی جھپتی نوک پر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے آپ کی مہربانی آپ کا شکریہ کہ آپ نے اپنی بات اور الزامات کے لاعلاج تعصب سے ہمیں نجات دی پرزہ سرائی تو ہیں آئینہ تنقید سے ہمیں بچایا ہمارے ساتھ دوستی سا مہربان نیکی سایا د اور رفاقت سا سنگسار پھولوں کی بے ضرر مسکراہٹ سایہ دار درختوں کی آسودہ حالی کا ساعمدہ سلوک کیا سلطان محترم ہم جہاں بھی جائیں گے جہاں بھی زندگی کی ضرورتیں ہمیں لے جائیں گی زندگی بھر آپ کے احسان تلے دبے رہیں گے خداوند قدوس کے بعد آپ کی ہی کی ذات ہے جس نے اپنے دلائل و براہین سے ہمارے پاؤں سے غلامی کی زنجیر گراں بار کو علیحدہ کیا۔

اب خداوند قدوس کے بعد آپ کی ذات کی وجہ سے میں اور اعتماد خاں دونوں برقی کی تیز گامی روشنی کی سبک خرا می دم بخود کر دینے والے علم سرگولوں کر دینے والی حکمت کی طرح آزاد ہیں۔“

یہاں تک کہنے کے بعد قیصر خاں رکا مزید کچھ کہنا چاہتا تھا اس کی بات کاٹتے ہوئے سلطان مظفر بڑے پیار اور شفقت اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ اٹھا۔

”قیصر خاں میرے بیٹے ایسی کوئی بات نہیں ہے میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا گلابوں کے تازہ بدن سے تمہارے کارناموں خوش رنگ خوابوں کی سی تمہارا کارگزاری خوشبوؤں کی لہروں تپسوں کے اجالوں جیسی تمہاری کارکردگی نے یہاں تک پہنچایا بس یوں جانو خداوند قدوس کے حکم اور اس کی مہربانی سے اس نے تمہیں آندھیوں کی شناسائی سی تمہاری شجاعت آزادی کے تڑپتے جذبوں جیسی تمہاری



جراثمدی کی بے صوت حکایات سی تہاری دلیری  
گری نبض حیات کی سی تہاری ہمت کی وجہ سے ہمیں  
اس مقام پر پہنچایا میں جب تک زندہ ہوں تہاری  
اس شجاعت، جراثمدی دلیری اور ہمت کے کن گاتا  
رہوں گا۔“ سلطان مظفر کی اس گفتگو سے سب خوش  
ہو گئے تھے یہاں تک سلطان نے موضوع بدلا اور  
سب سالاروں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”میں آپ سب لوگوں کو ایک ہفتے کی مہلت  
دیتا ہوں ایک ہفتے کے اندر اندر اپنی تیاری کو آخری  
شکل دے لیں، کل آپ سب لوگوں کو ساتھ لے کر  
میں خود مستقر کی طرف جاؤں گا اور وہ لشکر تیار کیا جائے  
گا جو نظام الملک صفدر خاں اور نصرت خاں کے تحت  
کام کرے گا اور جس لشکر نے قیصر خاں اور اعتماد خاں  
کے ساتھ کام کرنا ہے اس کا تعین پہلے ہی ہو چکا ہے۔“  
سلطان کی اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا تھا  
لہذا سلطان نے وہ اجلاس ختم کر دیا تھا اور ایک ہفتے  
بعد سلطان کے سالار نظام الملک نے اپنے دو ساتھی  
سالاروں صفدر خاں اور نصرت خاں کے ساتھ اپنے  
لشکر کو لے کر رانا سانگا کا رخ کیا تھا جب کہ ایدر کے  
راہجہ بہادر مل کو سلطان نے اپنے مرکزی شہر محمد آبادی  
میں رہنے کا مشورہ دیا تھا۔

☆☆

رانا سانگا ایک روز اپنے لشکریوں کی فلاح  
بہود کا جائزہ لے رہا تھا اس موقع پر اس کا سینا پتی  
کرشن دیو عہدہ تیغ زن سورج مل اس کا داماد رائے مل  
راج کمار کی کوشلیا اور دوسرے سالار بھی اس کے  
ساتھ تھے یہاں تک کہ ایک جگہ ٹھہر کر رک گیا اس  
لیے کہ اس کا ایک خیر اپنے گھوڑے کو سریت دوڑاتا  
ہوا آیا رانا سانگا کے سامنے آ کر اس نے گھوڑے کو  
سریت دوڑاتا ہوا آیا رانا سانگا کے سامنے آ کر اس  
نے گھوڑے کی باگیں پھینچتے ہوئے روکا نیچے اترا دونا  
سانگا کو تعظیم دی پھر رانا سانگا کو مخاطب کر کے کچھ کہنا  
ہی چاہتا تھا رانا سانگا نے خود بڑی بے چینی اور بڑے  
بے تابی سے پوچھ لیا۔

”کس سمت سے آئے ہو۔“ جواب میں اس  
مخبر نے ایک گہری نگاہ رانا سانگا پر ڈالی پھر کہنے لگا۔  
”میں سلطان مظفر کے لشکر کی اطلاع لے کر آیا  
ہوں۔“

یہ الفاظ سن کر رانا سانگا نے خوشی کا اظہار کیا تھا  
کوشلیا اور رانا سانگا کے دوسرے سالار بھی مطمئن  
دکھائی دے رہے تھے یہاں تک کہ خبر بول اٹھا۔

”رانا اصل بات یہ ہے کہ ایدر کا تیار راہجہ بہادر مل  
اپنے باپ کے مرنے اور ہمارے لشکر سے شکست  
کھانے کے بعد ہجرات کے سلطان مظفر کی خدمت  
میں حاضر ہوا اور آپ کے خلاف اس نے مدد کی  
درخواست کی ہے اسی درخواست کے نتیجے میں ہجرات  
کے سلطان نے ایک لشکر آپ کا مقابلہ کرنے کے لیے  
روانہ کیا ہے اس لشکر کی روانگی شاید بہت پہلی ہوئی  
لیکن بہادر مل کے وہاں پہنچ کر مدد کی درخواست کرنے  
کے بعد سب پہلے ہجرات کے سلطان نے اپنے  
سالاروں قیصر خاں، اعتماد خاں، صفدر خاں اور نصرت کو  
اپنی سرحدوں سے واپس اپنے مرکزی شہر بلا لیا اب  
قیصر خاں اور اعتماد خاں کو تو سلطان مظفر نے اپنے پاس  
رکھ لیا ہے جب کہ اپنے بزرگ سالار نظام الملک کو  
ایک لشکر دے کر آپ کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا ہے  
اور نظام الملک کی مدد کے لیے نصرت خاں اور صفدر  
خاں کو اس کے ساتھ کیا ہے۔“

یہ الفاظ سن کر رانا سانگا کچھ پریشانی کا اظہار  
کرنے لگا تھا یہاں تک کہ مدھم می آواز سے بولا اور  
کہنے لگا۔

”میں جو امید لگا بے بیٹھا تھا وہ پوری نہیں ہوئی  
میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ہجرات کا سلطان مظفر اس بار بھی  
ہم سے ٹکرانے کے لیے اپنے سالار قیصر خاں کو روانہ  
کرے گا اور میں نے ہر صورت میں تہیہ کیا ہوا تھا اس  
کا سراپا جنگ کے دوران کاٹوں گا میری منصوبہ بندی  
یہی پہلے تو سورج مل اس سے ٹکرانے کا مجھے پہلی پختہ  
امید تھی کہ سورج مل اسے کاٹ کے رکھ دے گا لیکن  
افسوس وہ اس لشکر میں شامل نہیں جو ہمارا مقابلہ کرنے

کے لیے نظام الملک کے تحت آ رہا ہے۔“

رانا سانگا جب خاموش ہوا تب راج کمار  
کوشلیا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا شروع کیا۔  
”پتا چلیا اگر وہ یعنی قیصر خاں اس لشکر میں شامل  
نہیں تو کوئی بات نہیں پھر بھی سہی لیکن اس جنگ کے  
دوران انفرادی مقابلے کے لیے ہم سورج مل کو ٹکھیں  
گے ظاہر ہے مسلمانوں کے لشکر کا سالار نظام الملک تو  
مقابلے میں نہیں آئے گا صفدر خاں یا نصرت خاں  
دونوں میں کسی کو بھیجے گا جس کی کو بھیجے گا سورج  
مل ٹکھوں کے اندر اس کی گردن کاٹ کے رکھ دے گا  
اس طرح ہمارے لشکریوں کے حوصلے بلند اور  
مسلمانوں کے لشکر میں ایک بے چینی پھیل جائے گی  
اور یہی بے دلی ان کے مقابلے میں ہماری فتح مندی  
اور کامیابی کا باعث بن سکتی ہے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد راج کمار کی کوشلیا کی  
پراپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔  
”پتا چلیا ابھی بہت مواقع آئیں گے کہ قیصر  
خاں کے ساتھ ٹکرانا ہوگا کسی نہ کسی ٹکڑا میں اسے ہم  
در ضرور کریں گے۔“ راج کمار کی کوشلیا جب  
خاموش ہوئی تب گہری سوچوں میں کھویا ہوا رانا سانگا  
پوچھنے لگا۔

”کوہم نے اس کا سر کاٹنے کا تہیہ کر رکھا ہے  
لیکن اس کا سر کاٹنے وقت مجھے افسوس بھی ہوگا۔“

رانا سانگا کے ان الفاظ پر راج کمار کی کوشلیا  
پوچھی اور جتو بھرے انداز میں رانا سانگا کی طرف  
دیکھتے ہوئے اس نے پوچھ لیا۔

”پتا چلیا وہ کیوں؟“  
اس موقع پر رانا سانگا کہیں دور کھو گیا تھا بوجھل  
آواز میں کہنے لگا۔ ”کوشلیا میری بیٹی کبھی بھی میں  
سوچتا ہوں کہ ایسے تیاقتہ جنت کا پستانا اور سر بلندی اور  
سر لڑائی کا باعث بنے والے جواہر و گوہر بہت کم  
ہوتے ہیں ایسے جوان کا روان انقلاب کا اجالا حوالہ  
دیتے ہیں جو زندگی کی نعمت میں بلندیوں کا کمال  
وقت کے مصور میں فطرت کی قہرمانیت بن جاتے

ہیں میری بیٹی اکثر تنہائی میں میں سوچتا ہوں کہ کاش  
قیصر خاں جیسا نایاب سالار میرا بیٹا ہوتا اگر ایسا ہوتا تو  
میں دنیا کے سامنے وہ کارہائے نمایاں پیش کرتا کہ  
لوگ دنگ رہ جاتے۔“ یہ الفاظ سن کر راج کمار  
کوشلیا عجیب سے انداز میں اپنے باپ رانا سانگا کی  
طرف دیکھے جا رہی تھی یہاں تک کہ وہ کھسکی پھر  
مسکرائی رانا سانگا کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”پتا چلی لگتا ہے کہ آپ دن کے وقت خواب  
دیکھنے لگے ہیں اب حقیقت یہ ہے کہ ہجرات کے  
سلطان مظفر کا سالار نظام الملک اپنے ساتھیوں کے  
صفدر خاں اور نصرت خاں کے ساتھ ایک لشکر لے کر  
ہم سے مقابلہ کرنے کے لیے آ رہا ہے اور ہمیں اس  
سے فکر ہے قیصر خاں کی بات پتا چلی بعد میں ہوگی۔“

راج کمار کی کوشلیا کے ان الفاظ سے رانا سانگا  
نے اتفاق کیا پھر وہ پہلے کی طرح اپنے سالاروں اور  
راج کمار کی کوشلیا کے ساتھ اپنے لشکریوں کے احوال  
کا جائزہ لینے لگا تھا۔

☆☆

عصر کے بعد نظام الدین صفدر خاں اور نصرت  
خاں تینوں اپنے لشکر کو لے کر رانا سانگا کے لشکر کے  
سامنے آئے اور وہاں انہوں نے پڑاؤ کرنا شروع کر  
دیا تھا اس موقع پر تینوں سالار اپنے لشکر کے سامنے  
آ کے کھڑے ہو گئے تھے تاکہ اگر رانا سانگا آجاک  
حملہ آور ہو کر بددیانتی کرنے کی کوشش کرے تو اس  
سے نشانہ لگے۔

جس وقت نظام الملک کا لشکر پڑاؤ کر رہا تھا اس  
وقت رانا سانگا اپنے سینا پتی کرشن دیو سورج مل اور  
رائے مل اپنی راج کمار کی کوشلیا اور دوسرے  
سالاروں کے ساتھ اپنے لشکر کے سامنے آن کھڑا ہوا  
تھا راج کمار کی کوشلیا توڑی دیر تک نظام الملک کے  
لشکر کا جائزہ لیتی رہی پھر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے  
اپنے باپ رانا سانگا کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”پتا چلی مسلمانوں کے تینوں بڑے سالار اپنے  
لشکر کے سامنے کھڑے ہیں اور ان میں قیصر خاں



## حاصل مطالعہ

☆ ایک شخص نے سرسید کو لکھا کہ میں نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا جن کی لوگ تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ان کی ساری عمر قوم کی بھلائی اور خیر خواہی میں گزاری ہے۔ جب آنکھ کھلی تو یقین ہو گیا کہ وہ بزرگ آپ ہیں۔ پس میری مشکل اگر حل ہوگی تو آپ ہی سے حل ہوگی۔ سرسید نے جواب میں لکھا۔ ”جس باب میں آپ مجھ سے سفارش چاہتے ہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور جس سے سفارش چاہتے ہیں اور جس آدمی کو آپ نے خواب میں دیکھا تھا وہ غالباً شیطان تھا۔“

☆ ایک دن شیخ نازخ نے ایک شخص کے لئے کسی نے شے کے دو تین چمچ تحفہ بھیجے ان دنوں یہ نئی نئی ایجاد تھی اور بہت پسند کیے جاتے تھے۔ ویسے بھی بہت خوش نما اور نفیس ہوتے تھے۔ شیخ صاحب انہیں ہمیشہ قریب والے علاقہ میں رکھتے تھے۔ ایک امیر زادے نے اسے ملے اور پوچھا۔ ”حضرت یہ تحفے کہاں سے آئے۔“ شیخ صاحب نے بتا دیا۔ امیر زادے نے ہاتھ بڑھا کر ایک چمچ اٹھایا اور تعریف کی۔ باتوں باتوں میں چمچ نے خیالی سے زمین سے ٹکرایا۔ شے کی بساط ہی کیا تھی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا۔ شیخ صاحب نے یہ دیکھا تو بہت دکھ ہوا۔ دوسرا چمچ اٹھا کر ان کے سامنے رکھا اور کہا اب اس سے شغل فرمائیے۔

☆ کلکتے کی مشہور مغنیہ گوہر جان ایک دفعہ الہ آباد گئی تو اپنی میزبان جاگتی دیوی کو لے کر اکبر الہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ سخن فہم تھی اور اکبر کی قدردان بھی۔ جاگتی بائی نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ کلکتے کی بہت مشہور مغنیہ ہیں آپ سے ملنے کی بے حد مشتاق تھیں۔“ اکبر نے کہا۔ ”زبے نصیب ورنہ میں نہ بنی ہوں نہ امام نہ غوث نہ قطب جو قابل زیارت خیال کیا جاؤں۔ پہلے بیچ تھا اب ریانہ ہو کر صرف اکبرہ گیا ہوں۔ حیران ہوں آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں۔ ہاں ایک شعر بطور یادگار لکھ دیتا ہوں۔“ قبول فرمایا۔

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا  
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا  
☆ (توصیف بسم کی یادداشتیں)

یہی وہی ہے اس پر بیٹھا سوار بھی وہی ہے یہ اپنا چہرہ اپنے غود سے ڈھانپے ہوئے اور گھوڑے پر وہ اس طرح استوار اور مستحکم بیٹھا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قیصر خاں کی طرح ہی دراز قد اور کڑیل قسم کا جوان ہے۔ راج کماری کو شلیا جب خاموش ہوئی تب رانا ساٹنگا کہنے لگا۔

”بیٹی اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں اول یہ کہ اس بار قیصر خاں اس لشکر میں ایک چھوٹے سالار یا عام لشکر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ قیصر خاں نہیں اس جیسا اور اسی کی طرح کا کوئی چھوٹا سالار ہے بیٹی گھوڑوں کے رنگ آپس میں جھل سکتے ہیں اور بہت سے لشکر میں میدان جنگ میں اپنے خود کا نقاب اپنے چہرے پر بھی ڈال لیتے ہیں اور انفرادی مقابلوں میں ایسا اکثر میں نے دیکھا ہے میرا اپنا اندازہ ہے کہ قیصر خاں نہیں ہو سکتا یہ اس لیے اگر قیصر خاں لشکر میں شامل ہوتا تو یقیناً وہ اس لشکر کی کمان داری کر رہا ہوتا۔“

رانا ساٹنگا کے ان الفاظ کا جواب کو شلیا نے کچھ نہ دیا اسی لیے کہ قیصر خاں اپنے گھوڑے کو سورج مل کے سامنے آ کر روکا تھا پھر سورج مل نے قیصر خاں کو مخاطب کیا۔

”جنگ کی ابتدا کرنے سے پہلے ذرا اپنا نام کہو۔“ اس موقع پر دھیمے سے لہجے میں سورج مل کو آواز سنائی دی۔

”میرا نام قیصر خاں ہے۔“  
سورج مل چونکا تھا تاہم اس نے اپنے آپ کو سنہالا اور کہنے لگا۔ ”کیا تم نے ہی اس سے پہلے ہمارے لشکر کو تین بار شکست دی اور تم نے یہی کیا ہمارے سابق سینا پتی زبیر سنگھ کا سر کاٹا تھا۔“

اس بار قیصر خاں کی کھوتی ہوئی آواز سنائی دی۔  
”اس کا بھی سر کاٹا تھا اور آج اس میدان میں میرا بھی میرے ہاتھوں کٹے گا۔“

قیصر خاں کے ان الفاظ پر سورج مل تاؤ کھا گیا تھا کہنے لگا۔ ”یہ تیری خام خیالی ہے جب میرے

سب سے پہلے رانا ساٹنگا نے اپنے لشکر میں جنگ کی ابتدا کرنے کے لیے طبل بجنے کا حکم دیا تھا۔

جواب میں نظام الملک صفدر خاں اور نصرت کے لشکر بھی بڑے بڑے طبل اور ڈھول بجنے لگی تھیں کچھ دیر ایسا ہی ساں رہا اس موقع پر رانا ساٹنگا اور اس کا سینا پتی سورج مل دوسرے سالار راج کماری کو شلیا اپنے لشکر کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے جب کہ دوسری طرف نظام الملک صفدر خاں اور نصرت خاں بھی تنوں اپنے لشکر کے سامنے بالکل مستعد ہو چکے تھے ایسے میں بڑا نتج زن سورج مل اپنے گھوڑوں کو ایڑ پراڑ لگا کرتا اسے سر پٹ دوڑاتا ہوا دونوں لشکریوں کے بیچ میں آیا پھر نظام الملک کے لشکر کی طرف منہ کرتے ہوئے اس نے سلطان مظفر کے سالاروں سے انفرادی مقابلے کے لیے اپنا مقابلہ مانگا تھا۔

نظام الملک صفدر خاں اور نصرت خاں تنوں اپنے لشکر کے سامنے بالکل مستعد کھڑے رہنے اور ان میں سے کوئی بھی حرکت میں نہ آیا اس لیے کہ سارا معاملہ پہلے سے طے شدہ تھا اس موقع پر کو شلیا بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے باپ رانا ساٹنگا کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”پتا جی نہ سلطان مظفر کے لشکر میں سے اس کا کوئی بھی سالار سورج مل کے ساتھ انفرادی مقابلے کرنے کے لیے نہیں نکل رہا۔ میرا دل کہتا ہے.....!!“

یہاں تک کہتے کہتے راج کماری کو شلیا کو روک جانا پڑا اس لیے عین اسی لمحہ لشکر کے اندر سے قیصر خاں نکلا حسب سابق اس نے اپنے خود کے نقاب سے اپنا چہرہ ڈھانپا ہوا تھا اور گھوڑے کو ایڑ پراڑ لگا ہوا میدان جنگ کی وسطی حصے کی طرف بڑھا تھا جوں ہی راج کماری کو شلیا نے اسے دیکھا وہ دنگ رہ گئی پریشان ہو گئی رانا ساٹنگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”پتا جی یہ جو مسلمانوں کے لشکر سے نکل کر سوار انفرادی مقابلے کے لیے آ رہا ہے یہ تو کجرات کے سلطان مظفر کا وہی سالار جس کا نام قیصر خاں ہے گھوڑا

نہیں پتا جی اس بار مسلمانوں نے چاہا تو ہم مسلمانوں کو بدترین شکست دیں گے پتا جی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے مقدر میں کامیابی اور فتح مندی لکھی جا چکی ہوتی ہے اور وہ قیصر خاں جیسے ہوتے ہیں اب جب کہ وہ اس لشکر میں نہیں ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ ہماری کامیابی ہماری کارنامی جیتی ہے پتا جی آج رات دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے پڑاؤ کر کے انتظار کرتے ہیں کل صبح جنگ کا ابتدا کریں گے پہلے سورج مل کو انفرادی مقابلے کے لیے بھیجیں گے اور یہ مسلمانوں کے سالاروں کو لڑا کرے گا کہ جو بھی پسند کرے نتج زنی کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں نکلے۔ سورج مل جب انفرادی مقابلہ جیت کر نکلے گا تو ہمارے لشکریوں کے حوصلے بلند اور مسلمانوں کے لشکر نے ایک بددی چھا جائے گی کل صبح یہ بھی دیکھیں گے سورج مل کے مقابلے میں سلطان مظفر کے سالاروں میں سے کون نکلتا ہے اور کون اپنی گردن کٹاتا ہے۔“

راج کماری کو شلیا جب خاموش ہوئی تب ہلکی سی مسکراہٹ میں رانا ساٹنگا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”میری بیٹی تو ٹھیک کہتی ہے اور میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ سلطان مظفر کے آنے والے اس لشکر کی تعداد ہم سے بہت کم ہے اس کا مطلب ہم بہت جلد اس پر قابو پالیں گے ایک بار ہم مظفر کے کسی لشکر کو شکست دے لیں تو پھر اس کے خلاف ہم شکستوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیں گے پھر دیکھیں گے کہ سلطان مظفر کا کیسے کوئی اور لشکر ختم شو تک کہ ہمارے مقابل آتا ہے۔“

رانا ساٹنگا کے ان الفاظ پر اس کی راج کماری کو شلیا ہی نہیں وہاں کھڑے دوسرے سالار بھی خوش ہو گئے تھے اس کے بعد رانا ساٹنگا اپنے راج کماری کو شلیا کو لے کر لشکر کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا تھا اس طرح دونوں لشکریوں نے ایک شب ایک دوسرے کے سامنے پڑاؤ کر کے گزاری اور اگلے روز



ساتھ کھراؤ گئے تو یاد رکھنا میں تو تمہیں امیدوں کے صحرا میں در بدری کے آزار پھروں کے لمحات میں کالے تمدن کے عذاب میں مبتلا کر کے تیرے ذہن کو تیری نیت کو خراب تیرے ارادوں کو ناپاک اور تیرے مقاصد میں خباثتیں بھر کر رکھ دوں گا۔ سن قیصر خاں انفرادی مقابلے کے دوران جب میں گرم کھولتے لاوے کی طرح تجھ پر ضرب لگاؤں گا تو تیرے جسم و جان کی شادابی کو فکری کے قریب اور تیری جذباتی اتالی کو کرجی کرجی تیری خواہشوں کو تخت اور تیرے عزائم کو زخم زخم کر کے رکھ دوں گا۔“

سورج مل اس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس کی بات کاٹتے ہوئے قیصر خاں انتہائی غضبناک اور کھولتے ہوئے لہجے میں بول اٹھا۔

”سورج مل میرا نام قیصر خاں ہے میں تو تیرے جیسے شیطان کی ساری آرزوئیں مرگ کے طوفان خیز بگولوں ابلیس کے دل کی ساری خواہشیں روح کی تمام امیدیں فنا کی دہکتی آگ اور نبتی کے خوفناک جبر میں تبدیل کر کے رکھ دوں گا میرے حملے تیرے لیے قضا کے عذاب موت کے کرب ثابت ہوں گے سورج مل میں نے اس سے پہلے تیرے جیسے بھولتے کتے تیرے جیسے غراتے بھڑیے بہت دیکھ رکھے ہیں آج مجھے سے کھرا تو پھر دیکھ تیری حالت میں سیاسی ردحوں سلگتے لحوں سسکتی ویرانیوں دکھ کے اندھے کھام کرب کی کھوٹی آتش جیسی کرتا ہوں۔“

سورج مل مزید تاؤ کھا گیا تھا حرکت میں آیا فوراً لہو کی صلیبیں کھڑی کرتے وحشت کے بدترین گردباؤں اور احساس کے خیموں کو جلاتی کرب کی آتشیں آندھیوں کی طرح وہ قیصر خاں پر حملہ آور ہو گیا تھا جوابی کارروائی کرتے ہوئے قیصر خاں بھی بوندہ بوندہ کو ترستی صدیوں سے بھگتی پیاسی خون کی بارش کرتے نفرتوں کے المناک زہر زہین و دل کے رابطے منقطع کرتے ناکامیوں اور رسوائیوں بھرے خوف اور دلوں کی بیستوں کو ویران کرتے ان گنت بگولوں کی شدت کی طرح پڑھاتھا۔

یہاں تک کہ دونوں ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے پھر ایک موقع قیصر خاں نے اپنی تلوار کا ایک زوردار وار سورج مل پر کیا دونوں کی تلواریں آپس میں ٹکرائیں قیصر خاں نے اپنی تلوار کو ایک زوردار جھٹکا آگے کی سمت کو دیا طاقت سے بھرپور اس جھٹکے کو سورج مل برداشت نہ کر سکا اور اپنے گھوڑے سے گر گیا۔

آندھی اور طوفان کی طرح قیصر خاں بھی اپنے گھوڑے سے کودا اور جس وقت سورج مل اپنی تلوار اور ڈھال سنبھال کر کھڑا ہونے لگا قیصر خاں نے آگے بڑھ کر تلوار کی نوک سورج مل کی گردن پر رکھ دی تھی پھر انتہائی غصے میں کہنے لگا۔

”سورج مل انفرادی مقابلے کی ابتدا سے پہلے تو قلعہ موں کے قزاقوں کی طرح بھونکتا تھا اور راستوں کے رہنروں کی طرح دھمکیاں دیتا تھا اب تیرا سب کچھ کہاں گیا سن ہم اللہ کا لشکر ہیں ظلم کو منافی روشنی کا سلاب ہیں میرے پاس وقت نہیں کہ میں تجھے پھر اٹھ کر مقابلہ کرنے کا دوسرا موقع دے سکوں۔“ اس کے ساتھ ہی قیصر خاں نے اپنی تلوار بلند کر کے گرائی اور سورج مل کی اس نے گردن کاٹ کر رکھ دی تھی پھر سورج مل کا گھوڑا لے کر وہ واپس اپنے لشکر کی طرف چلا گیا تھا سورج مل کے مارے جانے کے بعد رانا سانگا نے حملہ آور ہونے میں دیر نہیں کی اس لیے کہ وہ جانتا تھا دیر کرنے کی صورت میں اس کے لشکر کے حوصلے سورج مل کے مارے جانے سے پست ہو جائیں گے لہذا وہ فوراً حرکت میں آیا اور اس نے نظام الملک صفدر خاں اور نصرت خاں کے لشکر پر مقدرمندی بدنامی اور عریانی پیلے پتوں کے بے پان خروش زندگی کی مضطرب کراہوں اور خوفناک سپنے بقی لہروں کی طرح حملہ کر دیا تھا۔

جوابی کارروائی کرتے ہوئے نظام الملک صفدر خاں اور نصرت خاں بھی زیر و زبر کر دینے والی سیال آتش چمکن چمکن کرنی خونی آندھیوں کے بگولوں اور تخت تخت صداؤں میں موت کے مثلاً جزیروں کی

طرح حملہ آور ہو گئے تھے دونوں لشکریوں کو ٹکرائے اس کی سڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک اپنے لشکر کے کچھ ہی رہتے ہوئے پڑاؤ میں سے قیصر خاں اور اتحاد خاں دونوں اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ آگے گئے اور پھر رانا سانگا کے لشکر کے ایک پہلو پر وہ دونوں جبر کی دھول اڑاتے مشیت کے کارکنان وقت کی چادر سکینے سے دروید یار کو شکست تہذیب کے خیموں کو بوسیدہ کرتے بے زنجیر خونی طوفانوں اور خونی لٹائیں ڈال کر عاصیوں کے بیچ تک کھول دینے والے فنا جزیروں کے خروج قیامت خیز ہنگاموں طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

رانا سانگا کی بد قسمتی جس سمت سے اس کے لشکر پر قیصر خاں اور اتحاد خاں حملہ آور ہوئے تھے راج کماری کو شلیا جنگ میں حصہ لیتے ہوئے اپنے لشکر یوں کو وہیں لٹا کر رہتی تھی یہ صورت حال دیکھتے ہوئے چند دستوں کے ساتھ قیصر خاں آندھی اور طوفان کی طرح آگے بڑھا اس وقت راج کماری کو شلیا کی پشت اس کی طرف تھی اس کے لشکر یوں کو کاٹتے ہوئے وہ اس کے قریب گیا پھر اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ بندی ہوئی کندھوں کی اور اسے اس انداز سے اور ایسی ہنرمندی سے جھٹکا کہ کندر راج کماری کو شلیا پر جا کر گر گئی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ قیصر خاں نے اپنی کندھ کو کھینچا تو راج کماری کو شلیا اپنے گھوڑے سے نیچے گر گئی قیصر خاں نے قہور آسا اپنی طرف کھینچا پھر ساتھ اپنے دوستوں کو لے کر گردلڑتے رانا سانگا کے لشکر یوں پر ایک ایسا طوفان حملہ کیا کہ انہیں پسپا کر دیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر قیصر خاں نے آگے بڑھ کر راج کماری کو شلیا پر نظر ڈالی پھر ہاتھ کے اشارے سے اپنے چھوٹے سالار کو بلایا جب وہ قریب آیا تب قیصر خاں اسے غلام کر کے کہنے لگا۔

”جنگ اس وقت زوروں پر آ گئی ہے میں اتحاد خاں کے ساتھ مل کر حملہ آور ہونے کا پہلو بدلنے لگا ہوں یہ رانا سانگا کی راج کماری ہے اپنے چند

لشکریوں کے ساتھ اسے اپنے پڑاؤ لے جاؤ ایک خیمہ میں رکھو اور خیمے پر پھر لگا دو تاکہ یہ بھاگنے نہ پائے۔“ اس کے ساتھ ہی راج کماری کو شلیا کو اپنی گرفت میں لے کر وہ چھوٹا سالار اور چند لشکری اپنے پڑاؤ کی طرف چلے گئے تھے ان کے جانے کے بعد قیصر خاں نے اتحاد خاں کے ساتھ حملہ آور ہونے کا رخ بدلا پھر وہ رانا سانگا کے لشکر کے انتہائی پشتی حصے کی طرف بڑھا اور اس حصے پر اس نے دہکتی آگ کی بے جہت جھوٹ دکھ کر لہروں درد کے بھنور کھڑے کرتے وحشی لحوں کیوں کی مٹھاس راحتوں کے خواب چھین لینے والی زست کی اذیت ناک یوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

اس طرح سامنے اور پشت دونوں جانب سے رانا سانگا کے لشکر کی حالت بڑی تیزی سے ابتر ہونے لگی تھی اس کے لشکر کی تلواروں کا شکار ہو کر دم توڑ رہے تھے اور پھر آہستہ آہستہ اسے لشکر کی حالت بڑی تیزی سے دم توڑتی سکینوں سبھی وادیوں اجڑے کوہستانوں کی پہلی رتوں کے زہر چلتے پینوں اور کندھ کے خشک پھولوں سی ہونا شروع ہوئی تھی یہاں تک کہ رانا سانگا نے اندازہ لگا لیا کہ اب اس کی شکست یقینی لہذا بچے بچے لشکر کو سمیٹا اور اپنے مرکزی شہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا مونیمن کا کہنا ہے کہ شکست اٹھانے کے بعد رانا سانگا کا داماد راج مل بچا نگر کے قیصر خاں اور اتحاد خاں نے نظام الملک اور دوسرے سالاروں نے رانا سانگا کا تعاقب کیا پھر وہ واپس میدان جنگ میں آئے اور رانا سانگا کے پڑاؤ کی ہر چیز کو انہوں نے سمیٹا شروع کر دیا تھا۔

﴿.....﴾

اس تاریخی داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

﴿.....﴾



دیار غیر سے..... ایک حساس وجد بابتی تحریر

ایک مقام پر دونوں الگ ہو گئے سامنے ایک اندرونی لان پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دونوں طرف راستے تھے۔ لان میں پھول لگے ہوئے تھے۔ اس لان میں کئی قیدی کام کر رہے تھے ان کا انچارج ایک ایسا قیدی تھا جس کی موت کے سزا معاف کر دی گئی تھی۔ کوڈرے کو دیکھ کر وہ کیاری چھوڑ کر اٹھ پڑا۔

اس شارے کے لیے..... ایک دلچسپ تحریر

**گرائنٹ** کوڈرے صبح کو بستر سے اٹھ کر کھڑکی کھولی اور سب سے پہلے یہ دیکھا کہ آج موسم کیسا ہے۔ یہ موسم بہار کی ایک سہانی سی صبح تھی۔ کوڈرے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اچھے موسم میں یہ کام ایک مسئلہ بن جاتا تھا۔ گھرے ہوئے بادل تیز ہوا میں کھرا آلودگی یا بارش وغیرہ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ احتجاج کرنے والوں کی تعداد کم ہو جاتی تھی جس سے اس کی مشکلات بھی گھٹ جاتی تھیں۔

پھر ایک اور پریشان کن خیال نے سر ابھارا۔ آج کی صبح ناشتے کی میز پر گڑ بڑ کا امکان تھا آج کے دن اس کی بیٹی زندگی کے سفر پر اپنے متعین کردہ راستے پر نکلنے والی تھی جبکہ اس کی ماں یعنی اس کی بیوی اس فیصلے کی شدید مخالف تھی۔ بیٹی اور ماں کے درمیان تناؤ بہت بڑا بڑھا ہوا تھا۔

کوڈرے نے سوچا مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی جبکہ اچھی باتیں خشک سالی میں ایک دو بوند کی برسات جیسی ہوتی ہیں۔

باتھ روم میں کوڈرے شیو کرتے ہوئے ریڈیو سن رہا تھا۔

”بارہ گھنٹے کے اندر اندر.....“ براڈ کاسٹر خبر سن رہا تھا۔

”اگر کوئی حکم اوپر سے موصول نہ ہوا تو قتل

موڈ بگڑا ہوا تھا۔ میز پر ٹوسٹ اور کافی موجود تھی۔ مگر صرف دو افراد کے لیے۔

”کیا سون چلی گئی؟“ میز کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”نہیں..... وہ اپنے کپڑے کار میں رکھ رہی ہے کہہ رہی تھی اسے بھوک نہیں۔“

اٹھ بے تنے کے بعد ایلین نے انہیں پلیٹ میں ڈال کر میز پر رکھ دیا۔

”دیکھو یہ ساری خرابی تمہاری وجہ سے ہوئی ہے۔“ وہ بالاخر بولی۔

”وہ کیسے؟“ کوڈرے نے پوچھا۔

”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے انجان مت بنو وہ یہ سب کچھ تمہاری شہ پر کر رہی ہے۔“

”تم مجھے بلاوجہ الزام دے رہی ہو۔ سون اب اکیس برس کی ہو چکی ہے۔ عامل اور بالغ ہے۔ وہ اپنے فیصلے خود کر رہی ہے۔“

”گرائنٹ..... اگر تم چاہتے تو اسے روک سکتے تھے۔“ اس کی بیوی نے بھناتے ہوئے کہا۔

”تم نے اسے سرچھا رکھا ہے تم کہو گے تو وہ دست بردار ہو کر پھر سے تعلیم جاری کر سکتی ہے ایک سال بعد اسے ڈگری مل جائے گی۔“

”اس کے بعد کیا ہوگا؟“ کوڈرے نے بے

پولیس کے درمیان کو لیوں کا تبادلہ ہوا جس میں پولیس کا ایک آدمی ہلاک ہو گیا۔ یہ جوڑا بہر حال کسی طرح بچ لگا۔ راستے میں انہوں نے ایک پادری کو انوا کیا اور پستول کی نوک پر اسے مجبور کیا کہ وہ ان دونوں کا کلاچ کر دے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی گھوڑے سوئے اسٹور لوئے۔ اس میں ایک اسٹور کے ملازم کی جان بھی گئی۔ جبکہ نے مزاحمت پر اسے گولی مار دی تھی۔

ادھر جج کا باپ گولی سے مرانہ تھا۔ مگر جب ان دونوں مشق زدوں کو گرفتار کیا گیا تو ان پر پولیس والے اور اسٹور ملازم کے قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ عدالت نے ان دونوں کو موت کی سزا سنائی اور اب دس سال بعد ان کو جو علیحدہ علیحدہ جیلوں میں تھے پھانسی دی جانے والی تھی۔

شیو کرنے اور نہانے کے بعد کوڈرے ٹیلی منول پر آیا تاکہ گھر بیلو مسائل کا سامنا کر سکے اس کے بعد اسے ان مسائل سے بھی نمٹنا تھا جو اس کے پیشے سے متعلق تھے۔ کچن میں پہنچتے ہی اس نے بیوی کے چہرے کو دیکھا اور جان گیا کہ صورت حال خاصی خراب ہے۔ اس کی بیوی اٹھ بے تل رہی تھی۔ اس نے شوہر کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کا





تو جی سے کہا۔ ”تمہاری طرح کسی پرائمری اسکول میں بچہ لگ جائے گی۔ اس کے بعد ماسٹر کی ڈگری اور تمہاری طرح کسی ہائی اسکول میں نوکری کر لے گی یا تمہاری طرح کسی اسکول میں وائس پرنسپل بن جائے گی۔“

”تو اس میں کیا برائی ہے۔“ اس کی بیوی نے چیلنج کیا۔

وہ ایک خوش شکل عورت تھی اور خاص سنجیدہ فطرت والی تھی۔ مگر اس وقت اس کا موڈ بہت خراب ہو رہا تھا۔

”اس میں کوئی برائی نہیں۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”لیکن وہ تمہارا فیصلہ تھا یہ سون کا ہے۔ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنے بارے میں فیصلہ کرے۔“

”کون سا فیصلہ۔“ دروازے سے ایک آواز ابھری اور ان کی بیٹی اندر آ گئی۔ سون اپنی ماں کی طرح نازک نقوش والی لڑکی تھی بلکہ اس میں اپنے باپ کی شاہت تھی اس کے جڑوں اور شہوئی سے سختی اور ضد کا پتہ چلتا تھا۔ ”اچھا آپ دونوں بحث بند کر دیں۔“ اس نے تیسری کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اپنے باپ کی پلیٹ سے ایک سلاخ اٹھا لیا اور کھانے لگی۔

”یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہو رہا ہے۔“ اس کی ماں نے جھلا کر کہا۔ ”تم اپنی زندگی برباد کر دو گی۔“

”کرتے دیں۔“ لڑکی نے سکون سے کہا۔ ”دیکھو۔“ ایلین نے شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”کیا تم اسے منع نہیں کر سکتے۔“

”نہیں بھئی! آئی ایم سوری۔“

”گڈ۔۔۔۔۔“ سون جیسی اس نے رومال سے منہ صاف کیا اور اٹھ گئی۔ ذرا دیر بعد گھر کے فرنٹ ڈور کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر باہر کوئی کار آنے کی آواز سنائی دی۔

”ڈیڈی بہت شکریہ اب میں چلتی ہوں۔“ رک کر سون نے کہا۔ ”ویسے کیا میں کوئی غلط کام کر رہی ہوں۔“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”دیکھا ہوگا تم نے فیصلہ کیا ہے تو پھر کوشش کرو۔ دوسروں کی فکر کی ضرورت نہیں۔“

”شکریہ ڈیڈی! میں چلی۔“ سون نے کہا۔ ”آج پہلا دن ہے ذرا جلدی پہنچنا اچھا ہوگا۔“

”ٹھیک خیال ہے۔“ سون چلی گئی۔

کوڈرے نے اپنی کافی ختم کی۔ اسے یاد آ رہا تھا۔ جب نوجوانی میں اس نے اپنی زندگی کا راستہ طے کیا تھا تو اس کے احساسات کیا تھے۔ یہ اسے امید تھی اس کی بیٹی بھی معاملات کو سنبھال لے گی۔

بیالہ میز پر رکھ کر پھر وہ بھی باہر چل دیا۔ ذرا دیر بعد اس کی کار بھی گھر سے نکل رہی تھی۔

☆☆

اسکرب اسٹیٹ پر نیون نامی جیل میں جیک ٹائم اپنی کوٹھری میں آگے پیچھے ہل رہا تھا۔ رک کر اس نے باہر کھڑے گاڑے سے پوچھا۔

”کچھ معلوم ہے تمہیں۔“ عورتوں کی جیل سے ججز یہاں کب لائی جائے گی۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ گاڑے نے کہا۔

”کیا مجھے اس سے ملنے دیا جائے گا۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”پھر تمہیں کیا معلوم ہے۔“ جیک نے بھنا کر اسے دیکھا۔

”پھر تو میں اتنا معلوم ہے کہ کل شاید میں تو یہاں ہوں گا مگر تم نہیں ہو گے۔“ گاڑے نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

”میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔“ جیک نے غصے سے کہا۔ ”تمہیں میری موت پر تبصرے کا کوئی حق نہیں۔“

دونوں آنے سے سامنے کھڑے تھے ایک سلاخوں کے ادھر تھا دوسرا باہر تھا۔ ان کی ظاہری حالت میں بہت بڑا فرق تھا۔ ڈیڈہ اسکوڈا کارکن گاڑا ایک کھر درے نقوش کا مضبوط جوان تھا جس کے بال گھنے تھے جبکہ جیک کا سر گنجا ہو چلا تھا اس کا

بہر بھی زرد تھا اور اس کا جسم دس سال سے جیل میں رہنے کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا۔

جیک اس وقت جس کوٹھری میں تھا وہ پھانسی پکیر سے ٹیسٹ کی دوری پر تھی اس میں لوہے کا ایک ونگ بنا ہوا تھا جس پر نیا میٹرس بڑا تھا، فرش پر دھکی کا ایک ڈبا رکھا تھا۔ جس میں خطوط کا ایک ہڈل اور کچھ دوسرے قانونی کاغذات رکھے تھے۔ جیک کا وکیل گورنر سے رابطہ کیے ہوئے تھا تاکہ اس کی سزائے موت کو تبدیل کر سکے۔ اس کی اپیل زیر غور تھی۔

جیک نے پھر ٹھلنا شروع کر دیا۔ وہ ججز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے اسے دس برسوں سے نہیں دیکھا تھا۔ دس سال پہلے وکیل کے کہنے پر اس نے عدالت میں بیان دیا تھا کہ لڑکی کو اس نے پتول کی نوک پر اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا تھا۔ وکیل نے کہا تھا کہ اس بیان سے لڑکی موت کی سزا سے بچ جائے گی مگر ایسا ہوا نہ تھا کیونکہ مرنے والے اسٹور ملازم کا پتول لڑکی کے پاس سے برآمد ہوا تھا اور کیمبر شہادتوں سے بھی ثابت ہو گیا تھا کہ وہ گلے گلے تک جیک کے ساتھ ملوث تھی۔ اس طرح عدالت نے اسے بھی سزائے موت سنا دی تھی۔ اخباروں نے لکھا تھا اگر اس سزا پر عمل ہوا تو یہ ملکی تاریخ میں پچھلے پچاس برسوں میں پہلی عورت ہوگی جو جیل کی کرسی پر بیٹھے گی۔

وہ ججز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس سے اس کے تعلقات اس وقت سے تھے جب اس کی عمر سترہ سال تھی وہ سوچ رہا تھا ججز کے ساتھ گزارے لمحات کتنے اچھے تھے۔ ان لمحات کی وہ جو قیمت نکالنے جا رہا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھی۔

☆☆

گرائٹ کوڈرے میل بھر دوری سے ہی اس لمحہ کو دیکھ سکتا تھا جو ہائی وے کے آخری سرے پر واقع اس بجز وادی میں جمع ہو رہا تھا اس کا رب پائلن ٹیل جہاں واقع تھی۔ یہاں بہت اور کاریں

بھی موجود تھیں جس وقت وہ جنگلے کے دروازے پر پہنچا اسے وہ سائن بورڈ نظر آنے لگے جنہیں لوگوں میں ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے ان پر لکھا تھا۔

جیک اور ججز کو بچایا جائے۔

برقی کرسی ختم کی جائے۔

موت کی سزا اٹل کے برابر ہے۔

وغیرہ یہاں ایک چھوٹی سی بھیڑ اور بھی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں بھی پلے کارڈ دے ہوئے تھے جن پر کچھ اس طرح کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔

”جیک کو پھانسی دو آنکھ کے بدلے آنکھ۔“

وغیرہ۔

ویسے فی الحال ادھر کوئی ہل بازی نہیں ہو رہی تھی لیکن کوڈرے کو معلوم تھا کہ گھنٹے بھر کے اندر اندر یہ جمع بڑھنے والا ہے اور پھر ہل بازی بھی ہونی تھی۔

گیٹ پر جوں ہی کوڈرے کی کار رکی۔ وہاں موجود آفیسر نے اسے سلامی دی۔

”مارٹنک۔“ کوڈرے نے جواباً کہا اور پوچھا۔

”کوئی مسئلہ۔“

”نوسر۔“ آفیسر نے فوجیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”ان لوگوں نے صورت حال کنٹرول کر رکھی ہے۔“

”دوپہر میں میں مزید ملک بلوالوں گا۔“

کوڈرے نے کہا۔

اسی وقت ایک پولیس آفیسر قریب کھڑی پولیس کار سے اترا اس نے کوڈرے کو سلام کیا۔

کوڈرے نے اس سے پوچھا۔ ”ہاں لیفٹیننٹ جمع قابو میں ہے۔“

”فی الحال تو ہے۔“ لیفٹیننٹ نے کہا۔

”ٹھیک میں مزید آدمی بلواتا ہوں۔“

کوڈرے اپنی کار لے کر گیٹ کے اندر آ گئے بڑھ گیا۔ وہ ایک اور جنگلے سے گزرا یہ جنگلہ خصوصی تھا اس میں بجلی دوڑ رہی تھی۔ اس کے اندر کوئی سوگڑ کی دوری پر جیل کی ادھکی دیوار تھی اس کے سامنے



ایک وسیع پارکنگ لائٹ تھی ایک طرف ملاقاتیوں کی کار کے لیے جگہ تھی دوسری طرف جیل کے حکام کے لیے جگہ تھی۔ یہاں ایک جانب قطار میں دفاتر بنے ہوئے تھے جن پر لکھا تھا وارڈن ڈپٹی وارڈن کنسٹوڈی ڈپٹی وارڈن ایڈمنسٹریشن۔ وغیرہ۔ کوڈرے نے اپنی کار درمیانی جگہ پر روک دی۔ اس کا آفس جیل کی دیوار کے اندر تھا۔ جس وقت وہ راہ داری میں چلا اسے خیال آیا کہ اس سے گزرتے یہاں اس کی آدمی عمر بیت چکی ہے چوبیس سال پہلے یہاں ایک ٹرینی آفیسر کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا۔ پھر وہ گیٹ آفیسر بنا تھا۔ پھر سر جیٹ پھر لیفٹیننٹ پھر کیپٹن اور اب وہ یہاں ڈپٹی وارڈن تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ وارڈن نہیں بن سکتا کیونکہ یہ عہدہ ایڈمنسٹریشن کا تھا۔ جبکہ وہ صرف قوانین قواعد اور سزاؤں کا آدمی تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جوں جوں وہ پچیس سال کا ہوا وہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لے گا اور کسی بھی سکوریٹی فرم میں ملازم ہو جائے گا۔ آفس میں داخل ہوتے ہی اس کی سیکرٹری نے اس کا استقبال کیا۔ ”ہر چیز ٹھیک ہے نا۔“ کوڈرے نے دریافت کیا۔ ”بالکل۔“ سکرٹری نے جس کا ملڈرڈ نام تھا جواب دیا۔ ملڈرڈ کی عمر پچاس سال ہو رہی تھی وہ ریٹائرمنٹ کا سوچ رہی تھی وہ اس جیل میں برسوں سے ملازمت کر رہی تھی اس کا شوہر اور اس کے دو بیٹے تینوں پولیس فورس میں تھے اور جیل میں ہونے والی ایک بغاوت میں ان تینوں کو مار دیا گیا تھا۔ کوڈرے اس وقت اپنی نوکری کے بارہویں سال میں تھا۔ خیال یہی تھا کہ ملڈرڈ اب جیل میں نہیں رہے گی مگر اس نے سروس نہیں چھوڑی تھی اس کا کہنا تھا کہ یہ جگہ اس کے لیے ایسی ہے جیسے وہ اپنے پیاروں کے پاس ہو۔ ”کوئی اور بات۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ سوائے اس کے کہ جیک کی خواہش ہے کہ اسے جبر سے ملے دیا جائے۔“ ”یہ پالیسی کی خلاف ورزی ہے۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”صرف خونی رشٹوں سے ملاقات کی اجازت ہے مگر میاں بیوی کی نہیں اور پھر وہ کدھر کی بیوی ہے اس کی اس نے تو پادری سے جبر پر شادی کرائی تھی۔“ ”ہاں یہ بات تو ہے۔“ ”جبر کے لیے کیا کیا گیا ہے۔“ ”دو آفیسر اسے لیتے کے لیے دیوڑی جیل گئے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔ پوری جیل صرف عورتوں کے لیے تھی اور وہ یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر تھی۔“ ”اوکے۔۔۔۔۔۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”ذرا پھانسی کے عملے کے ممبروں کے ساتھ میری میٹنگ کا انتظام کرو۔“

☆☆

کوڈرے کے کمرے میں پھانسی کا عملہ جو چار آفیسروں پر مشتمل تھا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ چاروں مختلف عمروں کے لیے سب کے پاس سزا کا شیڈول کی کاپیاں تھیں۔ ”اگر کوئی آرڈر نہیں آیا تو جیک کو چھ بجے شام کو اور جبر کو سات بجے کرسی پر بٹھا دیا جائے گا۔۔۔۔۔۔“ کوڈرے نے ابتدا کی۔ ”لوئی کو یہاں کے ہسپتال میں رکھا جائے گا اور وہ لیفٹیننٹ گیری کے چارج میں ہوگی۔ جیک کی پھانسی کے بعد اسے ڈیوڈ واچ ہولڈنگ سیل میں لایا جائے گا۔ فیملی وزٹ کا انتظام اس طرح ہوگا کہ یہ کام بس دو گھنٹے میں ہو جائے۔ ایک وقت صرف دو افراد مل سکیں گے۔“ رک کر اس نے کہا۔ ”وزیٹرز روم میں پڑی میز کے گرد صرف تین کرسیاں ہوں گی۔ دروازے پر دو گارڈ ہوں گے۔ وزیٹرز کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد ہی انہیں قیدی سے ملنے دیا جائے گا۔ کوئی سگریٹ نہیں پئے گا۔ چار بجے کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔“

لیفٹیننٹ پوسٹم اس کی نگرانی کرو گے۔“ اس نے لیفٹیننٹ کی سمت دیکھا۔ ”لیس سر۔“ ”آخری کھانے کا کیا بندوبست ہے۔“ کوڈرے نے پوچھا۔ ”اس کا آرڈر نوٹ کر لیا گیا ہے۔ یہ سب جیل میں جیک کو چار بجے پیش کی جائیں گی۔ دیوڑی جیل سے جبر کا آرڈر بھی ہمیں مل چکا ہے فون پر۔ اس کی ذمہ داری لیفٹیننٹ گیری کے سپرد ہے۔“ لیفٹیننٹ گیری نے بھی سر ہلایا۔۔۔۔۔۔ اور بولا۔ ”انتظامات ہو چکے ہیں۔“ ”شیو اور غسل۔“ کوڈرے نے پوچھا۔ ”پانچ بج کر پندرہ منٹ پر اس سے مل ایک قیام اس کے جسم کے بال بھی مونڈے گا۔“ ”اس کا پورا سر مونڈنا ہوگا۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”ناکرا لیکٹروڈ سے آگ نہ لگے۔“ ”اور جبر کے بارے میں۔“ لیفٹیننٹ نے پوچھا۔ ”پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر شاور۔ اطلاع ملی ہے کہ اس کے جسم پر بہت بال ہیں۔ اس کا سر بھی مونڈا جائے گا۔“ کوڈرے نے کہا۔ اس کی ماتحتوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ تب اس نے کہا۔ ”فون پر بتایا گیا ہے کہ لوئی چاہتی ہے اسے ایک انٹرویو پینے رہنے کی اجازت دی جائے۔“ کوڈرے نے سوچتے ہوئے انگلیاں تھکا تھکیں اس کے ذہن میں اس کی اپنی بیٹی سوسن ابھر آئی تھی۔ ”اوکے۔“ اس نے کہا۔ ”مگر یہ بات خفیہ رکھنا۔“ ”پھر وہ لیفٹیننٹ گیری کی سمت مڑا۔“ ”اور پادری کا معاملہ۔“ ”اس کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔“ ”گواہ۔“ لیفٹیننٹ گیری جو اس کا انچارج تھا بولا۔ ”دی ریوائنگ روم میں کرسیاں رکھ دی گئی

ہیں۔ طرمان کے لوہٹنن اس کی کمرے میں دوسری طرف بیٹھیں گے۔ میڈیا کے ممبروں کو کمرے کے وسط میں بٹھایا جائے گا۔“ اسی وقت کمرے میں سیکرٹری نے جھانکا اور کہا۔ ”وہ لڑکی جبر آگئی ہے۔“ ”ٹھیک ہے دس منٹ بعد میں اس سے ملوں گا۔“ کارڈرے نے کہا پھر وہ آفیسروں سے بولا۔ ”آپ لوگ جائیں سارا کام اچھی طرح ہوتا چاہیے۔ چھ اور سات بجے میں ڈپٹی یوب کے ساتھ مونچ پر موجود رہوں گا۔“ اس کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔

☆☆

افسروں کے ڈائینگ روم میں کوڈرے نے وہ میز پسند کی جس پر لیفٹیننٹ گیری بیٹھی ہوئی یہ ایک چوڑے شانوں والی عورت تھی اس نے ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا اس کے جسم پر پولیس کی وردی خوب بچ رہی تھی۔ ”تم لوئی کو آرام سے لے آئیں۔“ کوڈرے نے پوچھا۔ ”لیس سر۔“ ”کیسی ہے وہ۔“ لیفٹیننٹ گیری شانے اچھالے۔ ”اچھی ہے۔“ ”ویسے میرا خیال ہے اسے توخ نہیں تھی کہ اسے پھانسی ہوگی۔“ ”میں نے اس کی خواہش کے مطابق ایک زیرجامہ پہننے کی اجازت دے دی ہے۔“ ”مجھے معلوم ہے آپ خصوصی رعایت دے رہے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”اس کے سر کے بال مونڈے گئے تو خدشہ ہے یہ آگ پکڑ لیں گے۔“ ”آپ اس سے کب ملیں گے۔“ لیفٹیننٹ نے پوچھا۔ ”فیملی وزٹ سے پہلے۔“ ”مسکراتے ہوئے گیری نے پوچھا۔ ”سوسن



کے بارے میں آپ کی بیگم کا رد عمل کیسا رہا۔“  
”اوہ وہ بہت برا وہ تو مجھی کو الزام دے رہی تھی۔“

”مگر آپ نے تو اسے اسکا نہیں تھا۔“  
”ہاں لیکن میں مخالفت بھی نہیں کی تھی۔“  
”تم کیا کرتی تھیں۔“

”میں۔“ گیری نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔  
”مجھ سے مت پوچھیں میں دو شادیاں ناکام ہو چکی ہیں میں عقل مند نہیں ہوں۔“

”اس شخص کا کیا رہا۔۔۔۔۔ وہ ڈان نامی ایجنٹ جس سے تم شادی کرنے والی تھیں۔“

”وہ معاملہ ختم ہو گیا۔ ڈان ترقی کرتا ہوا کمپنی کا وائس پریذیڈنٹ بن گیا تھا۔ کہتا تھا میں یہ نوکری چھوڑ دوں۔ میں نوکری چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ بس قصہ ختم ہو گیا۔“

”مجھے افسوس ہوا۔“ کوڈرے نے کہا۔

اسی وقت کوڈرے کا ڈپٹی جو اب اندر آ گیا۔

”جناب وارڈن آپ کو بلا رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”باہر جمع بہت بڑھ گیا ہے اور ہمارے آدی آئیں کنٹرول کرنے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“

ادھر قیدیوں نے بھی گڑبڑ شروع کر دی ہے۔

”اچھا۔ یہ قیدی کیا کر رہے ہیں۔“

”فی الحال تو شور مچا رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم فوری طور پر چھ آدی گیٹ پر بھجوادو۔ میں وارڈن کے پاس جا رہا ہوں۔“

”میں ان قیدیوں کو دیکھتی ہوں۔“ لیفٹیننٹ گیری نے کہا۔

پھر تینوں کمرے سے نکل گئے۔

ڈپٹی وارڈن ایڈمنسٹریشن کوڈرے کا ہم منصب مارٹن ایڈی وارڈن کے آفس میں پہلے سے موجود تھا۔ یہ آفس دوسری منزل پر تھا۔

”ہر کام شیڈول کے مطابق ہو رہا ہے۔“

وارڈن نے کوڈرے سے پوچھا۔

”ابھی تک تو ہو رہا ہے۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”میں جمع کا کیا معاملہ ہے۔“ اس کے ہم منصب مارٹن نے پوچھا۔

”میں نے اندر آتے ہوئے دیکھا تھا بروبر انچارج میرے لیے گیٹ تک کا راستہ صاف نہیں کر پا رہا تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے میں یہ بھیڑ دنگنی ہو گئی ہے۔ سب پریشان ہیں آخر گواہوں اور ملاقاتیوں کو اندر آنے کا راستہ کیسے ملے گا۔“

کوڈرے اٹھ کر کھڑکی کی طرف گیا۔ اس نے پردہ سر کا کر اس دور بین سے دیکھا جو ہیں دیوار پر ہر وقت لگی رہتی تھی۔

دوری پر گیٹ کے سامنے جو دو قطاروں والی روڈ تھی آدھیوں سے بھری ہوئی تھی جس سے ٹریفک کے لیے راستہ بند ہو گیا تھا۔

”کیا صورت ہے۔“ وارڈن نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے ہمارے آدی کم پڑیں گے ہمیں نیشنل گارڈ کو بھی بلانا ہو گا۔“

”ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔“ ڈپٹی مارٹن نے تائید کی۔

”دن کے عملے کو گھر جانا ہے اور رات کے عملے کو اندر آنا ہے۔ راستہ تو بہت ضروری ہے۔“

”گویا میں گورنر سے کہوں کہ نیشنل گارڈ فوراً بھیجے جائیں۔“ وارڈن نے پوچھا۔

”کہنا ہی ہو گا۔“ کوڈرے نے کہا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ گیا۔

”میں روکی طرف جا رہا ہوں۔ سم نے بتایا ہے کہ کچھ قیدی ہلڑ بازی کر رہے ہیں۔“

”ہاں جاؤ اندر تو اسن رکھنا ہی ہو گا۔“

وارڈن نے کہا۔ پھر اس نے فون اٹھایا۔

مارٹن اور کوڈرے باہر چلے گئے۔ راستے میں مارٹن نے پوچھا۔

”تم جبر سے ملے۔“

”نہیں ابھی ملوں گا۔“

ایک مقام پر دونوں الگ ہو گئے سامنے ایک اندرونی لان پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دونوں طرف راستے تھے۔ لان میں پھول لگے ہوئے تھے۔

لان میں کئی قیدی کام کر رہے تھے ان کا انچارج ابا

الہادی تھا جس کی موت کے سزا معاف کر دی گئی تھی۔ کوڈرے کو دیکھ کر وہ کیاری چھوڑ کر اٹھ پڑا۔

”مارٹن مسٹر کوڈرے۔“ اس نے کہا۔

”ہاں فریک کیسے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ کوڈرے نے کہا۔

”مگر مجھے ان پھولوں سے بڑا انس ہو گیا ہے۔ کیا تم موت کی کوٹھری کی سمت جا رہے ہو۔“

”ہاں ادھر کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔“

”ابھی تو یہ اور بڑھ گئی۔“ قیدی نے سنجیدگی سے کہا۔

کوڈرے نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا

مگر وجہ نہیں پوچھی۔ وہ چاہتا تھا کہ قیدی خود ہی بتائے۔

”قیدی نے کچھ تذبذب کے بعد کہا۔“ میں نہیں بتا رہا ہوں۔ ہوشیار رہنا ٹھیک ساڑھے چار بجے جب جیک کھانا کھا چکا ہو گا ایک بڑا ہنگامہ ہو گا لوگ روکو توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دراصل یہ

جبر کی پھانسی رکوانا چاہتے ہیں اس سے چیک کو خود نو دفائدہ پہنچے گا۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ کوڈرے نے کہا۔

”مگر وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔“ پھر اس نے قیدی کا

دھمکیاں ادا کیا اور کہا۔ ”جب تم کام بدلتا جا ہو مجھے بتا دینا میں تمہیں کوئی اور کام سپرد کر دوں گا۔۔۔۔۔ اور

”میں اپنی جاب فروخت کرنا چاہتا ہوں۔“

قیدی نے کہا۔ ”جیل میں اچھی جاب قیدیوں کے درمیان بکتی رہتی تھیں۔“

”ٹھیک ہے مگر وہ آدی کام کا ہونا چاہیے۔“

کوڈرے مسکرایا۔

جس وقت کوڈرے جیل کے اس حصے میں

گیا جہاں موت کے سزایافتہ قیدی رکھے جاتے تھے وہ دیکھ کر کہتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے لاک

کی طرف گیا جہاں ایک آہنی دروازہ تھا۔ اس کا صرف ایک ایک پٹ ایک وقت میں کھولا جاسکتا تھا۔ اسے دو آفسر اسٹینڈ کرتے تھے جوں ہی وہ اندرونی دروازے کی سمت کھولا اسے کچھ شور مٹائی دیا۔ ڈے

واچ روکنا ڈر لفٹیننٹ بارڈن نے اس کا استقبال کیا۔

”کیا جیک کی سزا تبدیل ہو گئی۔“ لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”یہ شخص ہمارے لیے دردِ سر بن گیا ہے۔“

کوڈرے اسے لے کر آفس میں چلا گیا۔

کمانڈر کے آفس میں بیٹھ کر اس نے آفسر سے کہا۔

”دیکھو یہاں ساڑھے چار بجے کوئی ہنگامہ ہو سکتا ہے ہمیں چوکس رہنا ہو گا۔“

”کیا یہ درست اطلاع ہے۔“

”ہاں۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”تم اپنے فائر ہوز کھول کر رکھ لو۔“

”یہ ایک اور مسئلہ ہوا۔ میں تو آج ذرا جلدی

گھر جانا چاہتا تھا۔ باہر کی بھیڑ بھی معہ بن رہی ہے۔“

”ہاں۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”تم دن کے عملے کو جانے نہ دینا جب تک رات کا عملہ نہ آ جائے ممکن ہے ہمیں قیدیوں کو پھانسی کے بعد بھی دونوں

اوقات کے عملے کو روکے رکھنا پڑے۔“

”بہتر ہے۔“ کمانڈر نے کہا۔

”اور سنو۔۔۔۔۔ کرس کو فون کر کے معلوم کر دیا

وہ جلدی آ سکتا ہے۔“

لیفٹیننٹ کرس ڈیوڈ روکا رات کے عملے کا

واچ کمانڈر تھا۔ ”وہ اگر آجائے تو تم چلے جانا مجھے کوئی اعتراض نہیں وہ اگر آجائے تو اسے بتانا کہ

سہ پہر میں اس جگہ ہونے والی گڑبڑ سے نمٹنے کے لیے وہ اچھی طرح تیار ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ شکر یہ سر۔“

جب کوڈرے جانے لگا تو کمانڈر نے پوچھا۔

53



”آپ جبر سے ملے۔“  
”نہیں۔“

”وہ لی وی پر بہت اچھی نظر آئی تھی۔ کیا آپ اجازت دیں گے کہ وہ جیک سے مل لے۔“  
”نہیں۔“

”یہ اچھا فیصلہ ہے۔ وہ سو اس کے مستحق نہیں۔“

کوڈرے نے چلتے ہوئے کہا۔ ”میں چار بجے معلومات لینے پھر آؤں گا۔“

☆☆

جبر ابھی تیس سال کی نہیں تھی۔ وہ سرخ بالوں والی لڑکی تھی۔ مسلسل جیل میں رہنے کی وجہ سے اس کا جسم بھرا ہوا گیا تھا۔ وہاں لیفٹیننٹ گیری کے علاوہ دو عورتیں اور بھی تھیں۔ انہوں نے ڈپٹی وارڈن کوڈرے کا استقبال کیا۔ گیری نے قیدی عورت سے اس کا تعارف کرایا۔

کوڈرے نے نوٹ کیا کہ لڑکی ذرا بھی نروس نہیں۔

”تمہاری کوئی خواہش ہے۔“ کوڈرے نے جبر سے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ سزا یافتہ جبر نے کہا۔

”اور اپنا ایک ہاتھ کوڈرے کے شانے پر رکھ دیا۔

تینوں آفیسر عورتوں نے اسے سختی سے گھورا۔ یہ بات قوانین کے خلاف تھی۔ لیفٹیننٹ گیری نے بڑھ کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”فکری ضرورت نہیں۔“ جبر نے کہا۔

”میں یہ کہنا چاہتی تھی۔ کہ میرے بال موٹے جانے والے ہیں۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں بس میں چاہتی ہوں کہ انہیں میری فیملی کے ملنے تک نہ کاٹا جائے۔“

”ٹھیک ہے۔“ کوڈرے نے منظوری دے دی اور کہا۔ ”تمہیں اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو تم لیفٹیننٹ گیری سے کہہ دینا۔“ پھر وہ گیری سے مخاطب ہوا۔ ”ضرورت ہو تو تم مجھ سے رابطہ قائم

کر سکتی ہو۔“

”کہ مجھے جیک سے ملنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ میں اسے الوداع کہنا چاہتی ہوں۔“ قیدی عورت نے پوچھا۔

کوڈرے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں قانون میں اس کی اجازت نہیں ہم نے کوئی رعایت دی تو مستقبل میں مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”جیک سے بتا دینا۔ میں نے اسے الوداع کہی ہے۔“

”یہ کام کر دیا جائے گا۔“

پھر کوڈرے گیری کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے قیدی عورت کے پیٹروں کے بارے میں پوچھا جو وہ پہننا چاہتی تھی۔

”آپ فکر نہ کریں آپ کے کہنے کے مطابق اسے اجازت دے دی گئی ہے۔ وہ جیل کے لباس کے ساتھ اسے بھی نہیں لے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ کوڈرے نے ہنکاری بھری اور سوچتا ہوا چل دیا کہ اس وقت وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کسی آرمی کرنل جیسا کردار ہے جسے میدانی جنگ میں صرف فتح اور شکست کی فکر ہوتی ہے کسی کے مرنے یا جینے سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

☆☆

سہ پہر کو دو سے چار بجے کے درمیان دونوں مزایافتہ مجرموں کے اہل خانہ ملنے آئے۔

جبر نے اپنے باپ ماں اور دو بھائیوں سے ملاقات کی یہ ملاقات اسپتال کے حصے میں جہاں جبر کو رکھا گیا تھا ہوئی۔ کوڈرے نے چار افراد کو ایک ساتھ ملنے کی اجازت دے دی تھی تاکہ وقت بچایا جاسکے۔ ملاقات کمرے میں لمبی سی میز کے گرد یا گرسیاں بڑی تھیں۔ جبر کے دائیں بائیں دو گارڈ عورتیں کھڑی تھیں۔

بینک کے ملاقاتی بھی آئے تھے مگر ان کا تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس ایک بوڑھا بابا آیا تھا اور اس کی ایک شادی شدہ بہن۔

☆☆

جس وقت ملاقاتی آئے تھے نیشنل گارڈ کا ایک دستہ گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے راستہ بنادیا تھا۔

کوڈرے نے وارڈن کو مطلع کر دیا کہ گیٹ پر حالات کنٹرول میں ہیں ملاقاتوں کا مرحلہ بخیر و خوبی گزر گیا۔ البتہ جیک کا انٹرویو کے ساتھ الجھا ہوا تھا وہ مصر تھا کہ اس کی ملاقات جبر سے کرائی جائے۔ مگر پھر اس کے وکیل نے معاملہ ختم کر دیا تھا۔ اب اس کے آخری کھانے کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔

کوڈرے نے اس موقع پر ڈیوٹی بھروسہ کماؤ کو فون کیا تو اسے جواب میں لیفٹیننٹ کرس کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ انچارج چلا گیا ہے۔

”غوب تو تم جلدی آ گئے۔ تمہیں شام کی صورت حال کے بارے میں تمہارے ساتھی نے بتا دیا ہے۔“

”میں سر۔“

”اب کیا صورت حال ہے۔“

”شور و غل کی تیاری ہو رہی ہے۔ سنئے۔“

کمانڈر کرس نے کہا۔ کوڈرے کے کان میں ہلکے ہلکے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ جسے کچھ لوگ لگ کر گارے تھے۔ پیالیاں اور جھپٹے بج رہے تھے۔

”الائیں بجائی جا رہی ہیں۔ کچھ غرے بھی لگ رہے تھے۔“

”بھلی کی کرسی ختم کی جائے۔“

”موت کی سزا نہیں چلے گی۔“

”سنا۔“ کرس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”ہوز تیار ہیں۔“

”میں سر کنکشن بھی ہو چکا ہے۔“

”کوئی کوٹھری بھی جلانی جائے تو آپریشن کر دینا۔ کوٹھریوں کو پانی سے بھر دینا۔ رعایت کی ضرورت نہیں۔“

”ٹھیک۔۔۔۔۔ کیا دن کی شفٹ کو روکنا ہوگا۔“

”ہاں جب تک دوسرا آرڈر نہ دوں روکے

رکھنا۔“

آفس میں کوڈرے کا ڈپٹی اس کا منتظر تھا۔

”میڈیا کو اندر بلا لیا گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”دلی انہیں اینڈ کر رہا ہے۔“ دلی ان کا پی آرا تھا۔

”ان پر نگرانی لگا دو کسی کو ادھر ادھر گھومنے کی اجازت نہیں۔“ کوڈرے نے کہا۔

”جیک کا وکیل کہاں ہے۔“

”وہ گورنر سے رابطے میں لگا ہوا ہے۔“

”گواہ۔؟“

”آجے ہیں۔“

”کتنے ہیں۔؟“

”تیرہ۔۔۔۔۔ ایک بیوہ عورت ہے جس کے دو بچے بھی ساتھ ہیں۔ مرنے والا پولیس آفیسر کے دونوں بھائی بھی ہیں۔ مرنے والے کلرک کی بیوی بھی ہے۔ اس کے تین لڑکے بھی ہیں اور اس کے پوتے پوتیاں بھی ہیں۔“

”ان کی عمریں کیا ہیں۔؟“

”لڑکا انیس سال کا ہے۔ لڑکی تین سال کی۔“

کوڈرے نے سکون کا سانس لیا۔ ان کی عمریں کم ہوتیں تو وہ انہیں پھانسی کا منظر دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

”میڈیا سے کون ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”پریس کے دو آدمی ہیں۔ اسٹیٹ لائف انشورنس منٹ کے دو آدمی ہیں۔ لی وی اور ریڈیو کے بھی دو آدمی ہیں۔“

”اوکے۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”چھ بج کر پانچ منٹ پر جبر کو ہسپتال سے نکال لایا جائے۔ خیال رکھنا جب لائشیں بنائی جا رہی ہوں تو کوئی ان کی تصویر نہ بنائے۔ جیک کی لاش تابوت میں ڈالتے ہی روانہ کر دینا۔“

اسی وقت کرس کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ تین کوٹھریوں سے اشیاء جلا کر کھینچی جا رہی ہیں۔



57



کوڈرے نے آفیسر سے فون لے لیا اور بولا۔

”لیس سر۔“ ایک وقفہ ہوا پھر اس نے کہا۔

”لیس سر میں سمجھ گیا۔“ کوڈرے نے فون رکھ دیا۔ ہر آنکھ اب اسے دیکھ رہی تھی۔ جیک کسی پاگل کی طرف دانت گھوسے مسکرا رہا تھا۔

”کھولو مجھے۔“ وہ دوبارہ چیخا۔

”چلو اب اس کے سر میں بھی الیکٹروڈ لگا دو۔“ کوڈرے نے کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے آفیسر سے کہا۔

”کیا..... کیا کہہ رہے ہو۔“ جیک تب زور سے چیخا۔

آفسر نے جیک کے گٹھے ہوئے سر پر بھی الیکٹروڈ لگا دیا۔

”کیا کر رہے ہو۔“ جیک حلق کے بل چیخا۔

”تمہیں پروگرام کے مطابق پھانسی دی جا رہی ہے۔“ کوڈرے نے اسے بتایا۔ پھر وہ آفیسر سے بولا۔

”فیڈر بھی منسلک کر دو۔“

”مگر یہ کال۔“ تب ہڈیانی لہجے میں جیک نے پوچھا۔

”یہ تمہارے بارے میں نہیں تھی۔“

کوڈرے نے آہستہ سے کہا تاکہ صرف وہی سن سکے۔ ”یہ جبر کے متعلق تھی۔ گورنر نے اس کی سزا کو عمر قید میں بدل دیا ہے۔“

”کیا..... مگر کیسے۔“

انہوں نے جیک کے چہرے پر ماسک چڑھا دیا۔

”مگر یہ تو ظلم ہے۔ سارے کام اسی نے سوچے تھے۔ ہم دونوں جرم میں برابر کے شریک تھے۔“

”اچھا جیک۔“ الوداع۔“ کوڈرے نے کہا اور دروازے کی سمت چلا۔

”سنو..... سنو میری بات سنو۔ ڈپٹی شریف کو اسی نے گولی ماری تھی۔ میں اس وقت کار چلا رہا تھا۔“

کسی نے جیک کی نہیں سنی۔ ایک آفیسر نے اپنی دروازے کو حرکت دی۔

”ایک منٹ..... پلیز ایک منٹ.....“ جیک کی آواز دروازہ بند ہوتے ہی معدوم ہو گئی۔

کوڈرے ان آفیسروں کی سمت مڑا۔ جوتین تھے اور ایک برقی پینٹل کے پاس کھڑے تھے جس میں تین بٹن لگے ہوئے تھے جو کوڈرے نے اثبات میں سر ہلا کر اشارہ دیا۔ تینوں نے ایک ایک بٹن دبا دیا۔ اس میں سے صرف ایک سوچ جزیئر سے جڑا ہوا تھا اور کسی آفیسر کو نہیں معلوم تھا کہ کس کا بٹن کام کرنے والا ہے۔

جزیئر کے اندر چوبیس سو واٹ کی برقی رو جیک ٹائم کے جسم میں داخل ہوئی سر کے ذریعے..... اور پھر پورے ایک منٹ تک بدن میں رہنے کے بعد وہ غٹھے کے راستے سے باہر نکل گئی۔ وہ چار سیکنڈ کے لیے بے ہوش رہا اسے درد کا احساس بھی نہیں ہوا ہوگا تاہم اس کا جسم پڑکا تھا مگر وہ بندھا ہوا تھا۔

منٹ بھر بعد ڈاکٹر نے لمبے آگے کے کمرے سے اس کے دل کی دھڑکن سنی اور بولا۔ ”دل اضطراب میں ہے، دس سیکنڈ بعد اس نے ایک کرنٹ لے لیا۔ اسے پوری طرح نہیں پکڑا۔“

کوڈرے نے ان تینوں افسروں کو دیکھا انہوں نے اک ساتھ پھر بٹن دبائے..... اور یہ برقی جھٹکا دہرا ہوا گیا۔

ایک منٹ بعد ڈاکٹر نے پھر آگے سے دھڑکن سنی اور بولا۔ ”دل بند ہو چکا ہے۔“

”وقت نوٹ کرو۔“ کوڈرے نے کہا۔

”چھن کر گیارہ منٹ۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

جب پردہ گرایا جا رہا تھا۔ کوڈرے واپس ہو گیا۔ اس نے اپنے ڈپٹی سے پوچھا۔

”اگر کہاں ہے۔“

”الائی جا رہی ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔“ کوڈرے نے کہا۔

”میں دارڈن کے پاس جا رہا ہوں۔“

☆☆

میں گئے بعد کوڈرے کی ملاقات لیفٹیننٹ ایل گیری سے ہوئی وہ بھی اب ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہی تھی دونوں ایک ساتھ پارکنگ لاٹ کی طرف چلے۔

”تم نے جبر کو دیورلی پہنچا دیا۔“ کوڈرے نے پوچھا۔

”ہاں..... اسے اس کا پرانا کمرادے دیا گیا۔“

”بے جباری گٹھے ہوئے سر کے ساتھ بہت لمبے وقت رہی اور جیک کا کیا ہوا۔“

”کیری اب خاصی بے لکھی سے بول رہی تھی۔“

”موتے ہوئے جی رہا تھا کہ اس کے ساتھ تا اس سال ہوئی ہے۔“ کوڈرے نے خشک لہجے میں کہا۔

”جبر میں جبر کو لے جا رہی تھی۔ کاش تم نے اس کے جبر کو دیکھا ہوتا۔ یہ دن زندان کی فتح کا تھا نہ۔“

”جبر کا۔ احتجاج کرنے والے اور حمایت کرنے والے دونوں جیسے ایک ڈل ہو گئے تھے۔“

”میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ کل پولیس اور جی ایس ایس کھانی کس طرح آئے گی۔“ کوڈرے نے کہا۔

”میرے لڑکے کو پھانسی اور امیر لڑکی کے لڑکے کو..... گورنر نے ایک دہائی جیم پھینکا ہے۔ پتا نہیں اس کے کیا اثرات ہوں گے۔“

”میری ایک دادی ہیں جو ایک جانب سے لڑائی میں ہیں۔“ کیری نے کہا۔ ”ان کا قول ہے کہ ان میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آدمی کے اہام میں غلبہ کیوں نہیں ہوتا سارا

معاملہ خون کے فتور کا ہوتا ہے ہم سب کو اپنے آبا اور اجداد سے خون کا ایک راستہ ملتا ہے یہی خونی راستہ ہمیں ایک منزل پر پہنچاتا ہے چاہے ہم کچھ کریں یا نہ کریں۔“

”خون کا راستہ۔“ کوڈرے نے دہرایا۔

”دلچسپ فلسفہ ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم کسی جانب سے ریڈ اٹھیں بھی ہو۔“

”تمہیں میرے بارے میں اور بھی بہت کچھ نہیں معلوم ہے گرائنٹ۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

پھر وہ دونوں کوڈرے کی کار کے پاس رک گئے۔ رائیل نے اسے الوداع کہنا چاہا۔ مگر کوڈرے نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے آگے بڑھاتا ہوا اس کی کار کی طرف چل دیا۔ کار کے پاس پہنچ کر کوڈرے نے اس کی ہاتھ سے کار کی بجلی لے لی۔ اپنے ہاتھ سے اس کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔

جب وہ پھل کے سامنے بیٹھ گئی تو اس نے کار کی بجلی اسے دے دی۔

”ویک اینڈ پرتیم فری ہوگی۔“ اس نے کیری سے پوچھا۔

”ہاں..... کیا کوئی پروگرام ہے۔“

”ہاں ساحل کی طرف چلیں گے۔ میری ایک کشتی وہاں ہے۔ کچھ پھیلیوں کا ذخار کر سکیں گے۔“

”اچھا تو تم اور ایلین سمندر میں بھی گھومتے ہو۔“

”نہیں..... ایلین کشتی میں نہیں بیٹھتی اسے پانی سے خوف آتا ہے۔“

”تو کیا..... اکیلے جاتے ہو۔“

”ہاں۔“ کوڈرے نے کہا۔ ”تمہیں تو سمندر برا نہیں لگتا۔“

”میں نے کبھی آزمایا نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر تم میرے ساتھ چلو۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں ملیں اور ان میں ایک ایسا رنگ ابھرا جو پہلے کبھی نہیں نظر آیا تھا۔ حالانکہ ان کا ساتھ خاصا



پراتا تھا۔  
”ٹھیک ہے۔ تم نے ساحلی راستے پر پرس  
نامی کافی ہاؤس دیکھا ہے۔“ بالآخر کوڑے نے  
پوچھا۔

”ہاں۔“  
”بس ہم اسی جگہ ناشتے کے وقت ملیں گے۔  
اپنی کار وہیں چھوڑیں گے اور ساحل تک پیدل  
جائیں گے۔ ساحل قریب ہی ہے۔“

”ٹھیک۔“  
”تو پھر کل صبح چھ بجے۔“  
”اوکے۔“

کوڑے نے اس کی کار کا دروازہ بند کر دیا۔

☆☆

جب کوڑے گھر پہنچا۔ اس کی بیٹی پورچ پر  
بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی منتظر تھی۔ اس وقت اس  
کے جسم پر ٹرینی آفسرز کی وردی تھی۔ آج اس نے  
اپنی جاب کا پہلا دن گزارا تھا۔ وہ عورتوں کی جیل  
ویورلی پرنٹون پر متعین کی گئی تھی۔  
”ڈیڈی.....“ وہ پوپ کو دیکھ کر اچھلی۔

”بتائیں میں وردی میں کیسی لگ رہی ہوں۔“  
”بہت اچھی۔“ کوڑے نے کہا۔ ”دن کیسا  
گزرا۔“

”بہت ہی اچھا۔“ وہ چمکی۔ ”وہاں سبھی مجھے  
جان گئے ہیں کہ میں ڈپٹی وارڈن کسٹوڈی کی اکلونی  
بنی ہوں۔ وہ مجھے اپنے خاندان کی فرد کی طرح  
سمجھنے لگے ہیں۔ ڈیڈی یہ جاب بڑے مزے کی ہے  
وہاں جیل کے اندر تو ایک اور ہی دنیا بسی ہوئی  
ہے۔“

”ہاں..... اور یہ دنیا تمہیں کیسی لگی۔“  
”بہت دلچسپ۔“ لڑکی نے سر اٹھا کر مکان  
کی دوسری منزل کی سمت دیکھا۔ اس کی ماں کے  
کمرے کی روشنی ابھی بھی تھی۔

”تم فکر نہ کرو۔“ کوڑے نے اسے تسلی  
دی۔ ”تمہاری ماں جلد ہی مان جائے گی ہم سب

ایک ہی نظام کا حصہ ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ اس  
حصے میں ہے جو دنیا کو تعلیم کے ذریعے بہتر بنا رہا  
ہے۔ جبکہ ہم اور تم اس حصے میں ہیں جو دنیا کو خراب  
لوگوں سے چھکارا دلا کر اسے اچھا بنانے کی سعی کر  
رہا ہے۔ ہمارا کام بھی اس کے کام کا ہم رتبہ ہے۔  
بلکہ ہمارا کام اس سے زیادہ بڑھا ہوا ہے ان کے  
بغیر تو ہم زندہ رہ سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے  
ہمارے بغیر ان کا جینا بہت مشکل ہوگا۔ زیادہ  
پڑھے لکھے لوگ اس تھیوری کو سمجھ نہیں پاتے مگر ہم  
اسے خوب سمجھتے ہیں۔“ کوڑے نے اپنی بیٹی کی  
پیشانی کو بوسہ دیا۔ ”آفسر ہم اپنی ٹیم میں تمہیں  
خوش آمدید کہتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

پھر وہ وہیں بیٹی کے ساتھ بیٹھ گیا۔  
”ویورلی میں ججری واپسی سب کے لیے  
بہت تعجب چیز تھی سوسن نے بتایا۔ اس کا سر تک موٹا  
جاچکا تھا۔ آپ اس کے شوہر کا احوال بتائیں۔“  
”اس کا مسئلہ بخیر خوبی حل ہو گیا تھا۔“  
”ڈیڈی کسی کو پچھانی دینے کا کام کیسا لگتا  
ہے۔“

”اچھا لگتا ہے۔“ کوڑے نے کہا۔ ”ایسا  
ہی جیسے کسی استاد کو نیا شاگرد اچھا لگتا ہے۔ تمہاری  
ماں لوگوں کو تعلیم دے کر انہیں اچھا انسان بناتی ہے  
جبکہ میں معاشرے میں موجود خراب افراد کو کھرتے  
کا کام کرتا ہوں تاکہ یہ دنیا زیادہ اچھی ہو سکے۔“  
سوسن باپ سے چپکتے ہوئے بولی۔ ”میں  
آپ کی طرح بنوں گی۔ کسی دن کسی جیل کی ڈپٹی  
وارڈن کسٹوڈی۔“

”میری دعا تمہارے ساتھ ہے۔“ کوڑے  
نے کہا۔ اس وقت اسے رائفل گیری کی دادی والی  
بات یاد آ گئی تھی جو آدمی کے خون میں موجود  
راستوں سے متعلق تھی۔



## ایک جذباتی تحریر

دورا خیال ڈیڈی کی طرف گیا تو میں سسک پڑی..... آپ کا  
جہاز بھی کسی خوف ناک حادثے کا شکار ہو جائے..... طیارے  
کا ہر خطہ از جاتیں لیکن تمام مسافر زندہ بچ جائیں..... مگر  
آپ نہ بچیں۔ آخر ہمیں جی کر کرنا کیا ہے۔ ڈیڈی..... جھولی  
تو خالی ہو گئی ہے۔ میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتی  
رہی اور دل کے زخم میں ٹیسس اٹھنے لگی تھیں۔

## ہمارے معاشرے کی عکاس..... ایک حساس و جذباتی تحریر

بغیر کتاب نکال لینا چاہتی تھی۔ میری پشت دروازے  
کی جانب تھی۔ مجھے دفعتاً یوں محسوس ہوا کہ کوئی چپکے  
سے کمرے میں گھسا ہے۔ اس کا یہ انداز بے حد محتاط  
اور پراسرار سا تھا جو کوئی بھی میرے کمرے میں میری  
موجودگی اور اکیلا پا کر داخل ہوا تھا۔ اس کے ارادے  
تیک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میرے دل کے کسی  
کونے میں اس شخص نے کسی زہریلے ناگ کی طرح  
سراٹھایا۔ سن سناہٹ کی ایک لہر میری رپڑھ کی ہڈی کو  
چھوئی ہوئی میرے پیروں میں اتر گئی۔ میں اس لیے  
ایسی پوزیشن میں تھی اور اس طرح سے کھڑی ہوئی تھی

میں بنوں کے بل کھڑی ہو کر دوپٹے سے  
ہمارا الماری کے سب سے اوپر والے خانے اپنے  
پاندلی ایک کتاب نکال رہی تھی جو بہت ساری  
کتابوں کے درمیان اس بری طرح چھپی ہوئی تھی  
تھی اسے بہت ساری کتابوں نے بد معاشرے کی  
طرح مل کر اپنی حصار میں ہی قید کر رکھا ہو۔ اس  
کتاب کو باہر نکالنے میں اس لیے دشواری پیش آرہی  
تھی کہ وہ خانہ قدرے اوپر تھا۔ ہاتھ بہ مشکل پہنچ پا  
رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں اسٹول یا کرسی کی مدد  
کے بغیر ہی کتاب نکال لوں گی لیکن میں ان پر چڑھ





کہ فوری طور پر اپنی گردن گھما کر اپنے شے کی تصدیق بھی نہیں کر سکتی تھی۔ معا میرے پیروں نے اس کے قدموں کی دھمک صاف طور پر محسوس کر لی تھی۔ وہ اپنے سینے میں اپنا تنفس روکے ہوئے بے آواز قدموں سے میری طرف تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ اس قدر محتاط ہو کر اپنا ایک ایک قدم اٹھا رہا تھا کہ کمرے میں جو گہرا سکوت طاری تھا وہ ٹوٹ نہ سکا۔ اس کی قدموں کی چاپ برائے نام تھی کون ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ میں نے ایک پل کے ہزارویں حصے میں وحشت زدہ ہو کر سوچا۔۔۔۔۔ وہ جو کوئی بھی تھا میرے لیے کسی زہر لیے سانپ کی طرح خطرے کا پیش خیمہ تھا۔۔۔۔۔ اس نامعلوم اندیشے کا احساس کر کے خوف اس لیے اور بھی شدید ہو گیا تھا کہ میں نہ صرف اپنے کمرے میں بلکہ پورے گھر میں اکیلی تھی۔۔۔۔۔ اور ڈیڈی بھی نہیں تھے۔ بوڑھا ملازم بھی کسی چیز کی خریداری کے لیے بازار گیا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے گیا تھا اور اس کی واپسی میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی دیر تھی۔ وہ کہہ کر گیا تھا کہ اتنی دیر ہوئی۔ میں سر اسے اور حد درجہ خائف ہو گئی اور پوری قوت سے چیخ کر پوچھنا چاہتی تھی کہ کون ہے۔۔۔۔۔ مگر میری قوت گویائی جیسے جواب دے چکی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے خوف نے میری زبان تالو سے چکا دی ہے۔ اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ پلٹ کر دیکھ سکوں۔ میں پتھر کے جسمے کی مانند کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

دفعتاً مجھے ہاشم کا خیال آیا جو اکثر موقع ملنے پر تنگ کرنے اور چپکے سے پیچھے آ کر ڈرانے مجھے ڈرانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسا لگتا تو چونکا نہیں تھا۔ وہ کسی کو نہ کھدے میں بھی چپک کر مجھے بری طرح ڈرایا کرتا تھا۔ میرے خوف زدہ ہو کر اچھل جانے پر اسے عجیب سا لطف آتا تھا۔ پھر وہ مجھے پھیرتا اور طنز کرتا تھا۔

”پوسی کیٹ۔۔۔۔۔ تم کیا خاک شکاری بنو گی۔۔۔۔۔ بندوق چلانا سیکھ لینا اور نشانہ بازی میں پہلا انعام حاصل کر لینا کافی نہیں ہوتا ہے۔ جنگل میں جو شکار

کرنے جاتے ہیں ان کے سینے میں فولاد لیے ہوتے ہیں۔ اگر تم بھولے سے شکار پر نکلے تو تیرا بقیہا ہمارے قتل ہو جائے گا۔ لہذا اپنی بندوق بچ چوڑیاں خرید کر پہن لو۔“

”وہ کس لیے۔۔۔۔۔ کیا میں اتنی بزدل یا کمزور ہوں کہ تم جو طنز کر رہے ہو۔۔۔۔۔ میں جل پوچھتی۔“

”یہ تمہارا وہم ہے۔ وقت آئے گا تو تم دیکھو میں درندوں کا کیسا شکار کرتا ہوں۔“

اس پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا۔ میں اس کی صورت دیکھنے لگتی۔ پھر وہ ہنسی روک کر کہتا۔

”تم ایک انسان کے اچانک سامنے آ جانے ڈر جاتی ہو۔ اگر اس طرح کوئی جنگلی جانور یا شیر آ تو بچ بچ بتاؤ کہ تمہارا کیا حال ہوگا۔۔۔۔۔ کیا سب پہلے بندوق چھوٹ کر ہاتھ سے نہیں گر جائے گی اور پھر۔۔۔۔۔“

میرا دل اور میری آنکھیں ہر جگہ صرف انہیں ڈھونڈ

رہی تھیں۔۔۔۔۔

”یہ تمہارا وہم ہے۔ وقت آئے گا تو تم دیکھو میں درندوں کا کیسا شکار کرتا ہوں۔“

اس پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا۔ میں اس کی صورت دیکھنے لگتی۔ پھر وہ ہنسی روک کر کہتا۔

”تم ایک انسان کے اچانک سامنے آ جانے ڈر جاتی ہو۔ اگر اس طرح کوئی جنگلی جانور یا شیر آ تو بچ بچ بتاؤ کہ تمہارا کیا حال ہوگا۔۔۔۔۔ کیا سب پہلے بندوق چھوٹ کر ہاتھ سے نہیں گر جائے گی اور پھر۔۔۔۔۔“

میرا دل اور میری آنکھیں ہر جگہ صرف انہیں ڈھونڈ

رہی تھیں۔۔۔۔۔

وہ ایک دم سے اس طرح اچھل پڑے جیسے کسی غضب ناک ناگن نے اپنا پھن لہرایا۔ انہوں نے مجھے جو دیکھا تو انہیں جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ ان کے چہرے کا رنگ کیا اڑا وہ سفید دھلی چادر کی طرح ہو گیا۔ ان کا چہری مردے کی طرح لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے جسم میں ابھی ایک بوند بھی نہ رہی ہو۔ افشائے راز کی دہشت نے انہیں جیسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔۔۔۔۔ اب اس ڈرامے کا جو پردہ اٹھا تو جو نہ جانے کب سے یہ پھیل ہو رہا تھا اس وحشت ناک منظر نے ان کی جیسے جان نکال دی تھی۔ ان کی اس حرکت تحنط کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ راز کی برسوں سے پردے میں چھپا ہوا تھا۔

افشائے راز اور دکھ کے بے رحم لہر نے کتنی سفاکی اور درندگی سے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔ میرے ذہن میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ سر چکرایا تو ایسا لگا جیسے ساری دنیا تاریک ہو گئی ہو اور وہ ڈول رہی ہو۔۔۔۔۔ کانپ رہی ہو۔۔۔۔۔ اور مجھ سے جیسے کوئی نادیہ ہنسی کہہ رہی تھی کہ۔۔۔۔۔ انجم! مگر پروہ دن ہے جو بھی نہیں مٹ سکتا۔۔۔۔۔ اور تم اس ماں کی بیٹی ہو جس نے ماں کا سر نچا اور چہرہ داغ دار کر دیا۔۔۔۔۔ کاش! یہ غلط ہو۔۔۔۔۔ مگر انجم یہ سچ ہے۔ ایک بھیا تک حقیقت جیسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔۔۔۔۔ کیوں کہ یہ گروا سچ ہے۔

انکل ریحان کو جیسے جلد ہی ہوش آ گیا۔ وہ چونکے اور غالباً بڑی جدوجہد سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

”معاف کرنا بیٹے!۔۔۔۔۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ بھابھی کھڑی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔ تمہاری مٹی کہاں ہیں۔۔۔۔۔“

انکل ریحان نے جیسے میری سماعت پر تڑ سے ایک اور پتھر دے مارا۔ وہ آگینے دل پر جیسے جا لگا جس کی کرچیاں میرے وجود میں زہر لیے نوکیلے ڈنکوں کی طرح پیوست ہو گئیں۔۔۔۔۔ کس بے حیائی کے







میں قدم نہیں رکھ سکتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ ماں ہیں اور دو جوان بچوں کی ماں۔۔۔۔۔ انکل ریحان میں ایسی جرات کیسے پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ میری ماں سے اس قدر قریب ہو جائیں کہ کوئی فاصلہ اور دیوار نہ رہے۔۔۔۔۔ مجھے پشیمانی ہونے لگی۔۔۔۔۔ میں نے انکل ریحان کو اپنی زندگی میں پہلی بار جس لب و لہجہ میں اور جن الفاظ میں مخاطب کیا تھا مجھے اس پر تاسف محسوس ہونے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور میرا بدن پسینے میں بھیلتا گیا۔ میں ایک بار پھر سو گئی۔

جسب میں بیدار ہوئی تو مٹی مجھ پر بھگی ہوئی تھیں اور کمرے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے پوری طرح بیدار ہونے سے پہلے محسوس کیا تھا کہ وہ بڑی نرمی اور آہستگی سے میرا شانہ ہلا کر مجھے پکار رہی تھی۔ ”انجم۔۔۔۔۔ انجم۔۔۔۔۔ اٹھو۔“

ان کی آواز میں اتنی محبت اتنا رس اور ایسی چاہت تھی کہ جیسے ممتا کی روح آواز میں رچ بس گئی ہو۔ میری نظر ان کے چہرے پر پڑی جو ممتا کے جذبے کی تصویر بنا ہوا تھا اور اس پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ مٹی سے جیسے ہی میری نظریں ملیں میرے دل میں نفرت کی شدید لہر اٹھی۔ میں نے بستر میں سٹ کر انہیں سہی ہوئی نظروں سے دیکھا۔۔۔۔۔ جیسے وہ عورت نہیں۔۔۔۔۔ میری ماں نہیں بلکہ کوئی زہریلی ناگن ہوں جو مجھے ڈس لینا چاہتی ہیں۔ وہ اس گھر کو ڈس چکی ہیں۔ یہ وہ زہر تھا جو غیر محسوس انداز میں سیرایت کرتا رہا تھا۔ عیب کی بات بھی سونے سے پہلے میرا دل ان سے صاف ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ مگر اب میں پھر پہلی ایسی شدید نفرت سے دوچار ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کہ میرا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔ میری نفرت محسوس نہ کر لیں۔

وہ میرے قریب سرک آئیں۔ ”کیا بات ہے بیٹی! یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔۔۔“

دوسرے لمحے انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر

میرے چہرے کا رخ اپنی طرف کر لیا۔ ”یہ تم اندھیرے میں کیوں سو رہی ہو اور اتنی جلدی۔۔۔۔۔ تمہارا منہ بھی آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ کیا بات ہے۔“

میں نے ان کا ہاتھ غیر محسوس انداز میں جھٹک دیا۔ ”میری ایک سہیلی کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔“

”آئی ام سوری۔۔۔۔۔“ میں نے منہ پھیر کر بے رخی سے جواب دیا۔ ”وہ جرنی میں تھی۔ آج میری ایک سہیلی نے ٹیلی فون پر مجھے اس کی موت کی اطلاع دی۔“

”واقعی بڑی افسوسناک خبر ہے۔ کیا وہ شادی شدہ تھی اور۔۔۔۔۔ اور بچے۔ کیا بچے بھی تھے اس کے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ میں بولی۔ ”وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ اسے شوہر کے ہر جانی پن نے موت سے ہم کنار کر دیا اور نہ شاید وہ نہ مرنے۔“

”شوہر کے ہر جانی پن نے۔۔۔۔۔“ وہ چونک کر بولیں۔ ان کے چہرے پر سایہ سا گزر گیا۔ ”کیا اس کا شوہر بد کردار تھا۔“

”ہاں مٹی۔۔۔۔۔“ میں نے اپنا چہرہ پوری طرح ان کی طرف پھیر لیا اور ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس لمحے ان کی آنکھیں کسی سوچ سے بھر گئی تھیں۔ وہ کھوس گئی تھیں۔ ان کا چہرہ پر زردی سی گئی۔ میں نے چہرے سے ان کی دلی کیفیت بھانپ لی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے دل میں کوئی جرم بھی سی اترتی جا رہی ہو۔۔۔۔۔ میرے دل کے کسی کونے میں چھپی ہوئی نفرتیں ایک جھوٹی کہانی بنا کر ان کے سینے میں غلغلہ کا جحر پیوست کرنا چاہتی تھیں تاکہ ان کا چین و قرار اور سکون لٹ جائے اور وہ مائی بے آب کی طرح تر پڑی رہیں۔

”وہ کمینہ شخص ایک مقامی شادی شدہ عورت کے چکر میں پڑ گیا تھا۔“ میں زہر خند کہنے لگی۔ ”اس نے نہ صرف اپنا ہرا بھرا گھر بلکہ عورت کا مرد کا گھر بھی اجاڑ دیا اور اس نے میری سہیلی کو ایک دیکھتے جہنم میں

دھکیل دیا۔۔۔۔۔ اور وہ عذاب سہہ نہ سکی اور آخر سر کی۔۔۔۔۔ مرنے کی! اسے شاید قبر میں بھی چین نہیں ملا اور کین مٹی۔۔۔۔۔ مرد اتنے ذلیل خود غرض اور وحشی کیوں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اسے ایک عورت اور اس کی ممتا پر۔۔۔۔۔ اور بچوں پر ترس کیوں نہیں آیا۔ کیا ایک مرد اور درندے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔“

”آں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔“ ان کا ذہن جیسے تھکا ہوا تھا۔ وہ بے خیال سے جواب دے رہی تھیں۔ شاید وہ میرے دکھائے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔۔ پھر وہ ایک دم سے چونکیں اور جھلیں۔ ”کیا معلوم اس میں تصور کس کا ہو تم اس قدر جذباتی کیوں ہو رہی ہو۔“

”آخر میں جذباتی کیوں نہ ہوں۔۔۔۔۔ وہ میری عزیز ترین اور مخلص اور بے لوث محبت کرنے والی مٹی اور پھر کیا اس کی موت کا صدمہ میرے دل کو لٹل ہوگا۔ وہ میری عزیز ترین اور مخلص اور بے لوث محبت کرنے والی تھی اور پھر کیا اس کی موت کا صدمہ میرے دل کو نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ ایک پا تو بلی اور کتے کا بچہ بھی مر جاتا ہے تو کتنا دکھ اور صدمہ ہوتا ہے۔“ میں ہڈیاں لیجے میں کہنے لگی۔ ”کس کا تصور ہے۔ کیا آپ کو محسوس نہیں ہو رہا ہے مٹی۔۔۔۔۔ آپ تو ایک عورت ہیں۔ کیا ایک عورت۔۔۔۔۔ عورت کے دکھ کو سمجھ نہیں سکتی۔ کیا وہ مقامی عورت۔۔۔۔۔ عورت نہیں ہوگی۔ کیا ہر خطے کی عورت ماں اور اس کی ممتا الگ الگ ہوتی ہے۔ مٹی! وہ صورت کیا قابل معافی ہے جو کوئی اجاڑ دے۔ کیا اسے بچوں اور ممتا کے تقدس کا خیال بھی نہیں آتا۔۔۔۔۔ عورت یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ وہ ایک مرد کی بیوی اور بچوں کی ماں بھی ہے۔“

میں جذبات کی شدت سے اتنی مغلوب ہو گئی تھی کہ مجھے خود علم نہیں تھا کہ میں کیا بول رہی ہوں۔۔۔۔۔ میں تو در پردہ ان کے خلاف زہر اگل رہی تھی۔ مٹی نے مجھے شدید حیرانی سے دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں شک کی پرچائیاں اتر آئی تھیں۔

میں نے اپنے قدموں کی چاپ سنی۔

کوئی میرے کمرے کی جانب آ رہا تھا۔ میں نے اس

”تم اس قدر جذباتی کیوں ہو رہی ہو۔۔۔۔۔ تم نے اپنی سہیلی کی موت کا اتنا شدید اثر کیاں لے لیا ہے۔ موت سے کوئی بچ نہیں سکتا بیٹی۔“

”مٹی!۔۔۔۔۔ اس لیے کہ وہ صرف میری سہیلی ہی نہیں تھی بلکہ ایک عورت بھی تھی۔ ایک مرد کی مذموم حرکت نے میرے دل میں مردوں کے خلاف زہر بکھر دیا ہے۔۔۔۔۔ میرا بس چلے تو میں ان مردوں کو بھون کر رکھ دوں جو غیر مردوں کی بیویوں پر نظر رکھتے ہیں۔“

مٹی نے کھبرا کر میرا ماتھا چھوا اور اگلے پر ہاتھ لگا کر تشویش سے بولیں۔

”تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ ایک سو چار پانچ ٹمپریچر ہوگا۔“

”مٹی!۔۔۔۔۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں مٹی!“ میں نے جواب دیا۔ ”میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ یہ نفرت غصے اور صدمے کا سبب ہے۔ پلیز! مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ اس کمرے کی روشنی بجھا دیں۔ میں ٹھیک جاؤں گی۔ مجھے نیند بھی آ رہی ہے۔“

مٹی نے میرے بدن پر چادر پھیلا دی۔ کمرے میں اور میری زندگی میں اندھیرا کر کے چلی گئیں۔

میں آنکھیں کھولنے کی تاریکی میں لیٹی تھی۔ یہی تاریکی میری تم گسار اور میری دوست بن گئی تھی۔ اب میرا غصہ کسی حد تک سرد پڑ گیا تھا۔ میں ایک حقیقت پسند لڑکی کی طرح سوچنے لگی۔ ایک نادیہ آواز میرے دل کے نہاں خانے میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ کہ کل کہیں اپنی اس کوتاہی پر پچھتاہٹا نہ پڑے۔

زہر نفرتیں اور تکلیاں کھول دے گی۔ پیار بھرا گھر بار بار بسایا نہیں جاتا اپنی آنکھیں کھول لو اور کانونوں میں انگلیاں ٹھونس لو۔ یہ پردوں کے آشیانے کی طرح ہوتا ہے۔ لہذا اس واقعہ کو بھیا تک خواب سمجھ کر بھلا دو۔

میں نے دفعت زینے پر قدموں کی چاپ سنی۔

کوئی میرے کمرے کی جانب آ رہا تھا۔ میں نے اس

67



سے اندازہ کر لیا کہ ہاشم آ رہا ہے..... میں نے اس  
پل سوچا کہ کیا ہاشم کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا  
دوں..... دوسرے ہی لمحے خیال آیا کہ ہاشم مرد  
ہے..... مرد ایسی ماں نہیں اور بیوی کو کسی قیمت پر  
برداشت نہیں کر سکتا۔ پہلے وہ می گوئی کا نشانہ بنائے  
گا اور پھر..... میں اس سے زیادہ سوچ نہ سکی۔

کرتے۔“ وہ میرے پاس بیٹھ کر پیار سے بال  
 سہلانے لگیں۔ ”میں تمہارے لیے دودھ لے آئی  
 ہوں۔“  
 ”تم دودھ پی کر سو جانا.....“ پھر انہوں نے  
 جھک کر میری پیشانی چوم لی۔

اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میں نے اپنے کوتلی  
دی۔ وہ اپنے گھر کے فرد کی طرح تو ہیں..... وہ ڈیڈی  
کے دیرینہ اور گہرے دوست تھے۔ ملازمت کے  
دوران ان کی دوستی پروان چڑھتی رہی۔ وہ دونوں  
ایک سے دوست تھے کہ ان کی دوستی میں ذرہ برابر بھی  
فرق نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں ایک غیر ملکی فضا کی کمپنی  
میں پائلٹ کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے۔  
ڈیڈی نے شادی کر لی تھی لیکن انکل ریحان نے  
شادی نہیں کی تھی۔ عمر گزشتہ کی کوئی کوتاہی آج بھی  
ان کے لیے چھٹاؤ سے کا سبب بنی ہوئی تھی۔ انہوں  
نے بھی اپنے سینے کے داغ نہیں دکھائے تھے۔ مٹی  
اور ڈیڈی نے بہت کوشش کی کہ وہ شادی کر لیں مگر وہ  
سمانے..... وہ اپنے آپ کو ساری زندگی سزا دینے پر  
تلقے ہوئے تھے۔

نہ آیا۔ میں بستر سے نکلی اور بے آواز قدموں سے کمرے کی دہلیز کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ نیچے والا کمرہ انشت کا تھا۔ وہ تاریکی اور سائے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو ہیولے می کے کمرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جب وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے تو میں بڑی احتیاط اور بے قدموں سے نیچے آ گئی۔ میں دروازے کے قریب پہنچ کر دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے کا دروازہ بجڑا ہوا تھا..... اور پھر وہ کسی قدر سرکا ہوا تھا۔ دروازے اور پردے کے درمیان ایک جھری سی تھی جس میں سے ٹکمرے کی روشنی بھاگ رہی تھی۔ میں اپنی سانسوں کو سینے میں قابو کیے کھڑی ہوئی تھی۔ مگر میرا دل نا معلوم خوف سے تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ میرے کانوں میں اگل ریحان کی آواز گونجی۔



اوقات دودھ اپنے ہاتھوں سے پلاتی تھیں۔ وہ اس وقت تک نہیں لگتی تھیں۔ جب تک ہم دودھ پی کر خالی گلاس واپس نہیں رکھ دیتے تھے۔ ڈیڈی بھی تو دودھ پیا کرتے تھے۔ اکثر میں نے محسوس کیا تھا کہ مئی جس رات دودھ پلاتی تھیں اس کے دوسرے دن صبح جلد آکھ نہیں مل پاتی تھی۔ آج دودھ کا معاملہ حل ہو گیا تھا۔ اگر آج میں دودھ پی لیتی تو ساری زندگی یہ معما حل نہ ہوتا۔ میں سن ہو کر رہ گئی۔ میں آج حیرت اور صدمے کی ایسی کیفیت سے دوچار ہو رہی تھی کہ اس کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ میرے اندر نفرت اور غصے کی شدید لہر اٹھی۔ دل میں خیال آیا کہ دندناتی ہوئی اندر چلی جاؤں۔ مگر کسی احساس نے میرے پیروں میں مصلحت کی زنجیریں پھنسا دیں۔

انکل ریحان مئی کو آج کا واقعہ سناتے لگے تو میں کھڑی کھڑی رہ گئی جیسے فرش کا کوئی حصہ ہوں۔ وقت کی نبض جیسے رک گئی تھی۔ انکل ریحان نے اپنی بات ختم بھی نہیں کی مئی کے منہ سے تیر زدہ سی آواز نکلی۔

”یہ تو بہت برا ہوا ریحان!“ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”تمہیں احتیاط برتنا چاہیے۔ مجھے دیکھو۔ میں کوئی پس برس سے احتیاط کا دائرہ تمام کر کے قدر سنبھال سنبھال کر چل رہی ہوں۔ کبھی کسی نے مجھ پر شک نہیں کیا۔ لیکن آج تم نے ان باتیں برسوں کی احتیاط کو جلد بازی سے مٹی کی نذر کر دیا۔ میرے چہرے پر کالی لکیریں سچا دیں۔ بتاؤ میں اپنا یہ کٹاؤنا چہرہ بچوں کو کیسے دکھاؤں۔ کاش۔“

”مجھے اس قدر شرمندگی دکھ اور عنایت ہے کہ کیا بتاؤں۔“ انکل ریحان خفت سے پول رہے تھے لیکن میرے وجود میں تو اک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ”تم دونوں میں اس قدر مشابہت ہے کہ میں دھوکا کھا گیا اور اس نے وہ لباس پہن رکھا تھا جیسا تمہارے پاس بھی ہے۔“

”ہیں کیا کوئی اور ہوتا تو وہ بھی دھوکا کھا جاتا۔“

”کس لیے تھی۔“ مئی بولیں۔

”کیا انجمن نے تم سے اس واقعہ کا ذکر کیا تھا۔“

انکل ریحان نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں وہ کوئی نادان اور نا سمجھ بچی نہیں ہے۔“ مئی کی آواز میں عجیب سی وحشت تھی۔ وہ تفصیل سے میرے اور اپنی درمیان ہونے والی گفتگو بتانے لگیں۔

جب مئی نے اپنی بات ختم کی تو انکل ریحان نے ٹھہر ٹھہر کر کہا شروع کیا۔

”اب نہیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں کچھ دنوں کے لیے آنا جانا بند کئے دیتا ہوں۔ مجھے جس روز آنا ہوگا تمہیں فون پر اطلاع دے دوں گا۔ اب تم انجمن سے نہ لجننا۔ اگر انجمن نے بھی کل کر اس واقعہ کا ذکر کیا تو اسے بے تکلفانہ مذاق کہہ کر اڑا دیتا۔“

”لیکن میں ڈرتی ہوں کہ کہیں یہ واقعہ ہاشم کے علم میں نہ آجائے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کیا سرکش اور تیز مزاج لڑکا ہے۔“

”تم اطمینان رکھو۔۔۔۔۔ یہ بات کبھی انجمن۔۔۔۔۔ ہاشم سے نہیں کہہ سکتی۔“ انکل ریحان نے دلاسا دیا۔

”کیوں نہیں کہے گی۔“ مئی نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ”وہ دونوں بہن بھائی آپس میں بڑی محبت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دوست بھی ہیں۔“

”انجمن نہ صرف ذہین بلکہ سمجھ دار اور دور اندیش لڑکی ہے۔“ انکل ریحان نے کہا۔ ”وہ ایسا نہیں کر سکتی۔“

مئی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شاید کچھ سوچنے لگی تھیں۔ میں انکل ریحان کے انداز سے پر دست رہ گئی۔ انہوں نے میرے بارے میں سچ اندازہ قائم کیا تھا۔

”فرخندہ! تم کیا سوچنے لگیں۔“ انکل ریحان کہنے لگے۔ ”انجمن سے صفائی پیش کر دو گی تو وہ یقین کر لے گی۔“

”سوچ رہی ہوں کہ آخر ہمارا انجام کیا ہوگا۔“ ان کی آواز مرعش سی تھی۔ ”اب تو مجھے اپنے آپ سے ہی خوف آ رہا ہے۔“

”یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے فرخندہ! تمہاری ایک جلد بازی اور غلط فہمی نے آج یہ دن دکھایا ہے۔“

”اس سے مجھے کب انکار ہے۔۔۔۔۔“ مئی نے بڑی اداسی سے کہا۔ ”میں یقیناً تمہاری زندگی تھی۔ مگر۔۔۔۔۔“

”سوچو۔۔۔۔۔ تم نے خود کیا کیا۔ جانا کہ سراسر میری غلط فہمی تھی لیکن تم میری آنکھیں تو کھول سکتے تھے۔“

”خیر جو ہو سو ہوا۔ اگر یہ غلط فہمی دور ہو جاتی تو ہم یورپ سے آئے ہی کیوں۔۔۔۔۔ یورپ میں ہی رہتے۔ پھر۔۔۔۔۔“

”مجھ سے خالہ شادی نہ کرتا۔ خالہ نے شادی کی تو اس نے یہ تک نہیں پوچھا کہ تمہارا پہلا شوہر کون تھا۔ کیا نام تھا اس کا۔۔۔۔۔ اس نے تم سے کس لیے طلاق لی تھی۔ میں تو یہ بھی سمجھتی تھی کہ میرے پہلے شوہر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ خالہ بھی جان جائے گا۔“

”شاید وہ جان جاتا اگر وہ اپنے وطن منتقل نہ ہو جاتا۔ پھر تم بھی پیچھے پیچھے آ گئے۔ خالہ کی مہنی میں ملازمت کی اس سے دوستی کی اور پھر مجھ تک پہنچ گئے۔“

”تو کیا ڈیڈی سے مئی کی دوسری شادی ہے جو آج بھی راز میں ہے۔ میں دنگ رہ گئی۔“

”مگر تم نے تو اپنے آپ کو ایک بیوی ایک عورت اور ایک ماں کے خول میں بند کر لیا۔ میں تمہارے پاس رہ کر بھی بہت دور رہا۔ تم میری دسترس سے دور رہیں۔ تم مجھے آج تک باتوں اور خوابوں پہلائی ہی آ رہی ہو۔ میں تمہیں بیس برسوں سے بانے کے لیے بے تاب ہو رہا ہوں۔ بتاؤ کب تک میں انتظار کرتا رہوں۔ بیس برس بہت ہوتے ہیں فرخندہ۔“

وہ دونوں ورق ورق اپنی ماضی کی کتاب پڑھ رہے تھے اور میں سن رہی تھی۔

”درست ہے۔“ مئی بولیں۔ ”میں نے تو سوچا تھا کہ۔۔۔۔۔ خالہ میری محبت بن جائے گا۔ وہ اپنی بیوی

اور عورت کو دل کے نہاں خانوں میں بٹھائے گا۔ عزت عورت کو شوہر ہی سے ملتی ہے۔ مگر اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔۔۔۔۔ مجھے ڈیکوریشن نہیں بنا دیا۔ اسی دنیا کو دکھانے کے لیے ایک حسین عورت کی ضرورت تھی۔ اسے بچے چاہیے تھے۔ اس نے آزمائشیں تو دے دیں لیکن محبت نہ دے سکا۔ عورت محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی لیے میں نے صرف تم سے محبت کی۔۔۔۔۔ اور ایک بیوی عورت اور ماں کے تقدس پر دھبا آنے نہیں دیا۔ تم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لیے میں نے صرف محبت کی راہ میں تمہارا ہاتھ تھام لیا۔“

”تم نے تو کہا تھا کہ خالہ سے جلد کیا چٹھرا لوں گی۔۔۔۔۔ آخر وہ دن کب آئے گا۔ خواب کب پورا ہوگا۔ کیا خواب خواب ہی رہے گا۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ انجمن کے علم میں ہماری محبت کا راز آ گیا ہے۔ خدا معلوم وہ اس پائیزہ محبت کیا نتیجہ اخذ کرے گی۔ اسے تو بہت ساری باتوں کا علم بھی نہیں ہے۔ اس کی محبت حقارت اور نفرت میں بدل جائے گی۔ میں اس کی تحقیر آمیز نگاہوں کی تاب نہ لا سکوں گا۔۔۔۔۔ میں اب اس گھر میں ایک مجرم کی طرح آنا نہیں چاہتا۔ یہ گھر اب مجھے کاٹ کھانے کو دوڑے گا۔۔۔۔۔ ابھی تمہیں ہر قیمت پر اس گھر اور خالہ کی زندگی سے نکل آنا ہوگا۔“

”تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میرا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔“ مئی کہنے لگیں یہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ پہلے تو مجھے انجمن کو نہیں مٹی میں لینا ہوگا۔ پھر میں اسے اعتاد میں لے کر بتاؤں گی کہ یہ واقعہ محض ایک مذاق تھا۔ اسے تم دل پر مت لو۔ جذباتی نہ بنو۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اب میں چلتا ہوں۔ فرخندہ! صبح میری فلائٹ ہے میں تمہیں یہی بتانے کے لیے انجمن کو ہماری محبت کی خبر ہو چکی ہے۔ میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب اتنی دور نکل آیا ہوں کہ واپس نہیں جاسکتا۔ جس جہنم میں ہمیں حالات نے جھونک دیا

71

عمران ڈائجسٹ جنوری 2012



ہے اب میں اس جہنم میں جل نہیں سکتا۔ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا..... میں۔“

میں انکل ریحان کی پوری بات سننا نہیں چاہتی تھی اس لیے ان کی بات نہیں سنی اور وہاں سے جھٹ گئی۔ وہ شاید جذباتی انداز سے مئی سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ میں ایک بیتی ہونے کے ناتے یہ گفتگو کیسے سن سکتی تھی اور پھر شاید وہ کسی لمحے کرب سے نکلنے والے تھے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا ان دونوں سے آمنا سامنا ہو۔ میں تیزی سے برابر والے کمرے میں داخل ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ دونوں داخلی دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔ بڑے غلط انداز سے..... چوروں کی طرح۔

میرے وجود میں آتش فشاں دھک اٹھا تھا۔ سینے میں نفرت اور غصے کا لاوا ابل رہا تھا۔ میں چند لمحے ایک بت کی طرح جسے وحشت کھڑی رہی۔ پھر میں نے مشتعل ہو کر مٹیاں پھینچ لیں۔ میں نے سوچا کہ اس داغ کو مٹانا ہوگا..... پھر خیال آیا کہ اس داغ کو مٹانے سے کیا میرے دل کا زخم بھر جائے گا..... میں نے جو کچھ ساتھ وہ میرے دل میں کاچ کی کرچیوں کی طرح جھپٹے لگا۔ مئی نے نہ صرف اپنے چہرے پر بلکہ ہم سب کے چہرے پر سیاہی مل دی تھی۔ کیا ہوا اسے پہلے ان کا رشتہ مئی سے تھا۔ آج تو وہ اس گھر اور ڈیڈی کی تھیں۔

پھر میں اس کمرے سے نکل کر مئی کے کمرے میں آ گئی۔ وہ دونوں برآمدے میں تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال سا آیا کہ کیوں نہ میں اس ڈرامے کا ڈراما بین کر دوں..... میں کسی قیمت پر نہیں چاہتی تھی کہ انکل ریحان اس گھر میں پھر قدم رکھیں۔ مئی کو میں آئینہ دکھانا چاہتی تھی۔ میں نے کمرے کی تمام بتیاں جلا دیں۔ گہرا دھن ہو گیا لیکن میرے سینے میں تو رات تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ کر مئی کا انتظار کرنے لگی۔ اذیت ناک انتظار کے بعد مئی آئیں۔ وہ کمرے میں روشنی دیکھ کر حیران اور پریشان سی ہو رہی تھیں۔ مجھ دیکھتے ہی اچھل پڑیں۔

”انجم!..... تم۔“ وہ مدح و تحسین ہی ہو کر بولیں اور مزید اس لیے نہ بول سکیں کہ آواز طلق میں جیسے شخص رہی تھی۔

”مجھے نیند نہیں آرہی تھی..... میں نے باتوں کی آواز سنی تو چلی آئی۔“ میں نے توقف کر کے ان کی آنکھوں میں جھانکا تو جرم کے احساس نے نظریں نیچے کر دیں۔ ”اتنی رات کون آیا تھا مئی..... میں آپ کو کمرے میں نہ پا کر بھی کہ آپ واش روم میں ہوں گی لیکن آپ تو شاید کسی کو رخصت کر کے آ رہی ہیں۔“

مئی میرے الفاظ کے ڈنک سہہ نہ سکیں۔ ان کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ دفعتاً گہرے سناٹے میں انکل ریحان کی گاڑی کے انجن اشارت ہونے کی آواز سنا دی۔ میں نے کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکا۔ انکل ریحان کی گاڑی جاتی ہوئی دکھائی دی۔

میں نے سرعت سے پلٹ کر کہا۔ ”یہ تو انکل ریحان کی گاڑی ہے۔ انکل ریحان آئے تھے اتنی رات گئے۔“ شاید وہ سمجھ گئی تھیں کہ میں انجان بن کر اپنے ترکش کے زہریلے تیر ایک ایک کر کے ان کے دل میں اتار رہی ہوں۔ غالباً وہ اپنی سراسیمگی پر قابو پانے کی شدید جدوجہد کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے عیاں ہو رہا تھا۔

انہوں نے جلدی ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ بولیں تو ان کی آوازیں حلق میں انگ رہی تھیں۔ انہوں نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

”کیا تم نے دودھ نہیں پیا.....“ میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ پیار سے بولیں۔ ”خالی پیٹ سونے سے نیند نہیں آتی..... چکن میں جا کر تم کچھ کھانی لو..... چکن بروسٹ اور کلب سینڈوچز بھی ہیں۔“

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا مئی!“ میں نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

”آخر تمہیں اپنی بات کا جواب کس لیے چاہیے۔“ انہوں نے الجھ کر جواب دیا۔ ”آخر تم اپنی

”انجم!..... تم۔“ وہ مدح و تحسین ہی ہو کر بولیں اور مزید اس لیے نہ بول سکیں کہ آواز طلق میں جیسے شخص رہی تھی۔

”اس لیے مئی کہ اتنی رات گئے انکل ریحان کا دل کی لہر موجودی میں چوروں کی طرح آنا اور ہانا آپ کو ذلیل اور سراسر کا سکتا ہے۔“ وہ سیدھی زبان پر قدم اٹھاتی ہوئیں کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس اور اس کے پٹ کھول کر تاریکی میں جھانکنے لگیں۔

”آخر تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہے۔“ ان کی آواز جاٹ اور سرد تھی۔

”اس لیے کہ آپ اس گھر کی عزت اور وقار ہیں۔“ میں نے بلا جھجک جواب دیا۔ ”ایک عورت اور وہی ہی نہیں ماں بھی ہیں۔“

وہ میری طرف گھوم گئیں۔ اب ان کے چہرے پر راز پر ابھری تھی۔ وہ بے حد سرد اور جذبات سے عاری لہجے میں کہنے لگیں۔

”انجم!..... جس رشتے کو میں نے میں برس لیا ہے سینے میں چھپا کر رکھا۔ آج ریحان کی ایک راسی لٹکی نے اسے تو ظاہر کر دیا۔ کاش! تم اس آواز سے بے خبر ہو تیں۔“ وہ سانس لیتے رکیں ان کے سینے میں سانسوں کا مد و جزر اٹھ رہا تھا۔ ”میں ماں بن کر نہیں صرف عورت کے ناتے یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں ریحان کو کتنا چاہتی ہوں..... اس کی حد اور گہرائی کیا ہے۔“

”آپ اس ناپاک رشتے کو محبت کا نام دے رہی ہیں۔“ میں ایک تخت بھڑک اٹھی۔

”تم کیا جانو محبت اور اس کا رشتہ ہوتا ہے لیکن میں اس موضوع پر بحث کرنا نہیں چاہتی ہوں..... میں نہیں ایک اور راز کی بات بتانا چاہتی ہوں جو کسی دہ سے تمہیں ہاشم اور دنیا والوں کو نہیں بتاتی۔ جب میں اپنے والدین کے ساتھ لندن میں تھی میری شادی ریحان سے ہو گئی تھی۔ یہ محبت کی شادی تھی..... ایک غلط فہمی نے برسوں کا رشتہ کسی کچے دھاکے کی مانند توڑ دیا۔ خالد کو آج تک اس بات کا علم نہیں ہے کہ ریحان میرا پہلا شوہر ہے۔ اس نے

کبھی یہ جاننے اور پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔ اسے جان کر کرنا بھی کیا تھا..... جب میرے اور ریحان کے درمیان غلط فہمی دور ہو گئی تو ہم دونوں کو کچھ بتا دیا ہوا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کمان سے نکلا تیر واپس نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے محض ضد میں آ کر ریحان سے طلاق لے لی۔ پھر میں نے خالد سے شادی کر لی۔ پھر خالد کے ساتھ مستقل طور پر وطن واپس آ گئی۔ وطن سے میرے والدین نے برسوں پہلے ہی رشتہ ناتا توڑ لیا تھا۔ پھر خالد کی خواہش تھی کہ میں اپنے ماضی کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ جب ریحان بھی آ گیا تو میری پہلی محبت جاگ اٹھی۔ محبت کا رشتہ گہرا اور پاکیزہ ہی رہا۔ ہم دونوں نے بھی محبت برداغ لگتے نہیں دیا۔ خالد کی آنکھوں میں دھول جھونکنا مشکل نہیں تھا۔“

”آپ کچھ بھی کہہ لیں مئی!..... میں اسے محبت کا نام نہیں دے سکتی..... انکل انسان نہیں ہیں۔ وہ۔“ میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”تم کیا جانو کہ ریحان کیا ہے اور وہ مجھے کتنا چاہتا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولیں۔

”پھر آپ کو شادی نہیں کرنی تھی۔“ میں تڑپ سے کہا۔ ”جب آپ نے شادی کر لی ہے تو پھر آپ میرے باب کو دھوکا کیوں دے رہی ہیں۔“

”غلط فہمی ہو گئی.....“ ان کے لہجے میں یاسیت تھی۔ ”حالات نے مجھے خالد سے وابستہ کر دیا اور نہ میں شادی نہ کرتی..... میں نے اس لیے بھی یہ سوچ کر خالد سے شادی کر لی تھی کہ وہ میری محبت نہ پانے پر شاید طلاق دے اور میں علیحدہ ہو جاؤں گی لیکن میں نے جو سوچا تھا۔ وہ نہ ہو سکا تھا۔ خالد طلاق دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے میری رکی اور غیر جذباتی زندگی کو برداشت کر لیا۔“

”بہر حال آپ حالات سے سمجھو تا کر لیں۔“ میں نے ملامت کے سے انداز میں کہا۔ ”اس عمر میں



ایک ماں کو یہ سب کچھ زیب نہیں دیتا۔  
”سمجھوتا۔۔۔۔۔“ ان کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔  
”حالات سے اس وقت سمجھوتا کرنی جب خالد مجھے  
ایک عورت سمجھتا۔“

”ڈیڈی۔۔۔۔۔ آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔“ میں  
نے الجھ کر پوچھا۔ مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آیا۔  
”ڈیڈیشن پیس۔۔۔۔۔ جو گھر کو سجانے اور زندگی  
کو ظاہری طور پر ضروری ہوتا ہے۔“ ممی کے لہجے میں  
کئی بھری ہوئی تھی۔

”آپ محبت کے اندھے جنوں میں میرے  
باپ پر کوئی الزام نہ لگائیں۔“ میں جذباتی ہو کر پھٹ  
پڑی۔ ”میرے باپ نے آپ کو کیا کچھ نہیں دیا۔۔۔۔۔  
دولت انہوں نے دنیا کی تمام راحیں اور آسائشیں  
آپ کی جھولی میں ڈال دیں۔۔۔۔۔ جائیداد آپ کے  
نام لکھ دی۔ اور کیا چاہیے۔۔۔۔۔ دنیا کی ہر عورت اس  
کی طلب گار ہوتی ہے اور خواب دیکھتی ہے جو قسمت  
سے ہی ملتا ہے۔“

”ایک عورت ان چیزوں کی نہیں بلکہ محبت کی  
بھوکی ہوتی ہے۔ محبت ہی اس کے لیے سب کچھ ہوتا  
ہے۔“ ممی بولیں۔ ”محبت تو مجھے صرف ایمان نے  
دی۔“

”آپ مجھے محبت کے نام پر فریب نہیں دے  
سکتیں۔“ میں نے ہذیبی انداز میں جج کر کہا۔ ”جسے  
آپ محبت کا نام دے رہی ہیں۔ وہ محض ایک گھناؤنا  
رشتہ ہے۔ محبت کا پاکیزہ تصور صرف کتابوں اور  
کہانیوں میں ہوتا ہے۔“

”بکواس بند کرو انجم!“ وہ سنجیدہ لہجے میں  
بولیں تو ان کا جسم غصے سے کانپنے لگا۔

”پلیز!۔۔۔۔۔ ممی!“ میں نے لجاجت سے کہا۔  
”آپ اپنے ہاتھوں اس بچے بے اور ہرے بھرے  
گھر کو آگ نہ لگائیں۔۔۔۔۔ یہ گھر۔۔۔۔۔ ممی۔۔۔۔۔ اور  
دلوں کی دنیا میں برسوں سے کمی ہوئی ہے۔ آپ  
پلٹ کر دیکھیں اس میں کیسے جذبے۔۔۔۔۔ محبتیں اور  
سننے چھپے ہوئے ہیں۔“

ممی پر میری ان جذباتی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔  
ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بے رحمی سے بولیں۔  
”تم آئندہ میرے ذاتی معاملات میں اپنی  
زبان بند رکھو گی۔“

”میں اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ اگر میں  
نے ایسا کیا تو پھر آپ اس گھر کو آگ لگا دیں گی۔“  
میں نے تیز لہجے میں کہا۔  
”کان کھول کر سن لو انجم!“ وہ غرائیں۔ ”میں  
ریحان کو کسی قیمت پر دل سے نکال نہیں سکتی۔ آخری  
سائس تک وہ میرے دل میں رہے گا۔“

”آپ دل میں بسا کر رکھ لیں لیکن میری یہ  
بات بھی سن لیں کہ اب وہ بھی اس گھر میں قدم نہیں  
رکھیں گے۔“ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔  
”اگر ریحان آیا تو تم کیا کرو گی۔“ وہ چونک  
اور گھبرا کر بولیں۔

”میں دنیا والوں کو یہ بتا دینے پر مجبور ہو جاؤں  
گی کہ آپ کا اصل چہرہ کیا ہے۔“

”کون۔۔۔۔۔ تم۔“ انہوں نے غصہ ناک ہو کر  
مجھے گھورا۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔  
”تم۔۔۔۔۔ تم مجھے زمانے سے ڈرا رہی ہو۔ جاؤ۔۔۔۔۔

ابھی جاؤ۔۔۔۔۔ اسی وقت جاؤ۔۔۔۔۔ اس کام میں مجھے بھر  
کی بھی دیر نہ کرو۔ دنیا والوں کو میرا کردہ چہرہ دکھا  
دو۔ ان سے کہہ دو کہ۔۔۔۔۔ یہ عورت اپنے شوہر سے  
نہیں غیر شخص سے محبت کرتی ہے۔ لیکن تم جانتی ہو  
اس کے بعد کیا ہوگا۔۔۔۔۔ یہ لوگ پتھر ماریں گے۔۔۔۔۔

تھوکیں گے۔ انگلیاں اٹھیں گی۔۔۔۔۔ صرف مجھے پر  
نہیں۔۔۔۔۔ تم پر ہاشم اور خالد پر بھی۔ دنیا کہے گی۔  
یہ فرخندہ کی بیٹی انجم ہے۔ ہاشم اس عورت کا بیٹا ہے۔  
یہ بے غیرت اور بے حیا خالہ کی بیوی ہے۔ پھر بتاؤ  
کہ تم گھر سے نکل سکو گی۔ اپنی سہیلیوں کو اپنا چہرہ دکھا  
سکو گی۔“

”آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں۔“ میں سن ہو  
کر رہ گئی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ ممی اتنی سنجیدہ اور  
جذباتی ہو جائیں گی۔

”تم جو چاہے سمجھ لو۔۔۔۔۔“ وہ صوفے پر بیٹھ  
گئیں۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب سی وحشت تھی۔  
میں اپنے کمرے میں آئی تو اپنے ہوش و حواس  
میں نہیں تھی۔ ”مجھ پر بیچانی سی کیفیت طاری تھی۔ میرا  
بدن لرزنے لگا تو میں بستر پر گر کر بچوں کی طرح  
رونے لگی۔ جب میرے آنسو ختم گئے۔ میں نے دل  
سوزی سے سوچا کہ کیا کروں۔۔۔۔۔ گھر کا ماحول مجھے  
اُسنے لگا۔۔۔۔۔ میں کس کے پاس جاؤں۔۔۔۔۔ کون ہے  
جو میرے آنسو خشک کرے گا۔۔۔۔۔ کسے اپنا غم  
بتاؤں۔۔۔۔۔ یہ کہانی ایسی تھی کہ میں کسی کو بھی سنائیں  
سکتی تھی۔

انگل ریحان تین دن نہیں آئے تھے۔ میرے  
حساب سے وہ فلائٹ لے کر واپس آ چکے تھے۔ وہ  
دن مجھ پر بڑے سوگوار اور اذیت ناک گزرے اور  
پھر مجھے ہاشم کے سامنے بہت سنبھل سنبھل کر رہنا پڑا  
جو سوہان روح سے کم نہ تھا اور میں نے اس کے  
سامنے زیادہ رہنے کی بجائے اپنا زیادہ تر وقت  
”ہیلپوں کے ہال ان کی معیت میں کاٹے۔ شامیں  
اولوں کی نذر ہوتی رہیں۔ اس مصروفیت سے مجھے  
قدرے سکون سا ہوا۔

چوتھے دن ممی میرے کمرے میں دودھ کا گلاس  
رکھ کر اس انداز سے چلی گئیں۔ جیسے یہ ان کے  
”معدلات میں شامل ہو۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں سمجھ گئی  
رات انگل ریحان آئیں گے۔ میں نے سارا دودھ  
”سٹل خانے کے واش بین میں بہا دیا اور خالی گلاس  
واپس اسی جگہ رکھ دیا۔ ممی کے قدموں کی چاپ زینے  
پر اُٹھنے لگی میں آنکھیں موندے لیٹی رہی۔ میں  
گہرے گہرے سانس لے کر یہ تاثر دیتی رہی کہ سوچی  
ہوں۔ وہ خالی گلاس لیے چند لمحوں تک کھڑی رہیں۔  
ان کی نظریں شاید اپنا اطمینان کر رہی تھیں۔ وہ اپنا  
”ایمان ان کے چلی گئیں تو میں اٹھ بیٹھی۔

کوئی دو گھنٹے کے اذیت ناک انتظار کے بعد  
رات کے گہرے سکوت میں کار کے انجن کی آواز  
”خالی دی اور وہ وہی مخصوص انداز کی دستک۔۔۔۔۔ پھر

بلکی بلکی چاپوں کی گونج۔۔۔۔۔ میں نے دونوں کمرے کے  
کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو میرے اندر نفرت  
کی لہر اٹھی اور گردھے سے انگارے دھکنے لگے۔  
میں جس وقت بے آواز قدموں سے ممی کے  
کمرے کے پاس پہنچی تو ان کی آواز کمرے کی  
خاموش فضا میں گونج رہی تھی۔

”سنو ریحان!۔۔۔۔۔ اب ہر بات اختیار سے  
باہر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ اب ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔“  
”راستہ۔۔۔۔۔ کون سا راستہ فرخندہ!“ انگل  
ریحان نے ساٹھ سے لہجے میں پوچھا۔

”اب خالد کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔“ سرگوشی  
میں ممی نے جواب دیا۔ ”یہ راستہ ہے۔“

”تم خالد سے طلاق کیوں نہیں لے لیتیں۔“  
انگل ریحان نے کہا۔ ”اس سے آسان سیدھا اور  
بہتر راستہ کوئی نہیں ہے۔“

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ مجھے طلاق دے دے  
گا۔“ ممی تنک کر بولیں۔ ”اور پھر اس کا بچوں پر کیا اثر  
ہوگا۔۔۔۔۔ یہ تم نے سوچا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔۔۔“ انگل ریحان نے  
تائیدی لہجے میں کہا۔ ”میں نے اس پہلو پر غور نہیں  
کیا۔ تم مجھے سوچنے کی مہلت دو۔“

”مہلت۔۔۔۔۔ ممی کی آواز تیز ہو گئی۔ ”تم  
آج سے نہیں بیس برسوں سے سوچ رہے ہو۔ کیا اب  
پھر بیس برس کی مزید مہلت چاہیے۔“

”میں کسی ایسے سنہرے موقع کی تلاش میں  
ہوں کہ خالد کی موت حادثاتی معلوم ہو۔ ہمیں بہت  
سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ غلبت بازی اور ناقص  
منصوبہ بندی سے کہیں ایسا نہ ہو کہ کل میں کہیں پانے  
کی بجائے کھودوں۔۔۔۔۔ پچھائی کے پھندے پر ٹنگ  
جاؤں۔“

”اگر تم اس طرح سوچتے رہو گے اور موقع کی  
تلاش میں رہو گے تو میں جلد ہی تمہارے ہاتھ سے  
نکل جاؤں گی۔“ ممی کے لہجے میں تشویش تھی۔ اس  
لیے بھی انجم سنگین خطرہ بن کر سروں پر منڈلانے لگی



ہے۔ میں ایک اور بات بتاؤں۔ وہ ہمارے خلاف سازش تیار کر رہی ہے۔“

”سازش..... کیسی سازش.....“ انکل ریحان نے چونک کر شدید حیرت سے کہا۔ ”تمہیں اس سازش کا علم کیسے ہوا۔“

”اس کی آنکھیں میرے خلاف کا جال بنتی آئی ہیں۔“ مئی کہنے لگیں۔ ”جب وہ باتیں کرنی ہے تو اس کا ذہن نہیں اور ہوتا ہے۔ مجھے اس سے ایک انجانا خوف آنے لگا ہے۔“ مئی کی آواز سے خوف صاف ظاہر ہونے لگا۔ یہ اس کی آنکھوں سے عجیب قسم کی سفاکی جھانکنے لگتی ہے۔ وہ جانتی ہے بلکہ اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تم اس گھر میں نہ آؤ۔“

”تم گھبراؤ نہیں اور نہ ہی دہشت زدہ ہو.....“ انکل ریحان نے دلاسا دیا۔ ”میرے ذہن میں ایک منصوبہ تو ہے۔ مگر اس کے لیے تمہیں خالد کا انتظار کرنا ہوگا۔ پریشان اور متفکر نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”خالد کل آ رہا ہے.....“ مئی نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ تو سہی کہ منصوبہ کیا ہے۔“

”منصوبہ ایسا زبردست ہے کہ تم سنو گی تو حیرت اور خوشی سے اچھل پڑو گی۔“ انکل ریحان نے تکبرانہ لہجے میں کہا۔

میں اپنا دلی مضبوط کر کے..... خود بر قابو پا کر ڈیڑی کے خلاف کل کا منصوبہ سنتی رہی۔ انکل ریحان کے سازشی ذہن نے جو منصوبہ بنایا تھا..... وہ اس قدر جامع اور عمدہ تھا کہ میں حیران رہ گئی۔ اس میں کوئی جھول اور عیب نہیں تھا اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی خافی نظر آئی تھی۔ ان پر آج آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

منصوبہ بن کر مئی کا لہجہ..... ان کی آواز لہجہ اور ایک ایک لفظ فرط خوشی کا ثبوت تھا۔ میں اب وہاں زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے میں اپنے کمرے میں آئی۔ کئی ہی دیر تک میں کرسی پر

بٹ کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ وہ منصوبہ مسلسل میرے ذہن پر مسلسل ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح اس قاتلانہ حملے کو ناکام بنایا جا سکتا ہے۔ اپنا اجڑا تا گھر بسایا جا سکتا ہے۔ ڈیڑی کی زندگی کے لیے مجھے ماں کی زندگی لینا مجھے منظور تھا۔ میں ماں کے بغیر ساری زندگی گزارنے کے لیے وہی طور پر تیار ہو چکی تھی۔

سوچتے سوچتے میرے ذہن میں بجلی کا ایک کوندا ایسا لپکا کہ میں اچھل پڑی۔ میرے ذہن میں ایسی تدبیر آئی کہ سناپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے..... سچ کا ایک راستہ نکل آیا تھا۔ انکل ریحان کی موت سے ایک کاٹنا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل سکتا تھا۔ مئی میرے ڈیڑی کی زندگی اور اس گھر کو اجاڑ نہیں سکتی تھی۔ یہ کھرچ سکتا تھا۔ انکل ریحان جو ڈیڑی کے لیے گڑھا کھودنے جا رہے تھے وہ گڑھا خود ان کے لیے قبر بن سکتا تھا اور مئی دو آنسو بہا کر ان کی موت کا صدمہ برداشت کر لیتیں۔

دوسرے روز ڈیڑی آگئے تو میں نے ان کا بڑا پر جوش استقبال کیا جیسے وہ برسوں کے بعد لوٹے ہوں۔ وہ میری یہ گرم جوشی دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے کچھ حیران اور قدرے پریشان سے دکھائی دیے۔ میں نے اپنے بسترے کی بات اور حرکات و سکنات سے یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ میرے اور امی کے درمیان کوئی پرخاص ہے اور ان کی غیر حاضری میں کسی بھی یار بخش نے جنم لیا ہے۔ میں معمول کے مطابق گھر کے کاموں میں مصروف رہی۔ مئی نے میرے اس رویے سے سکون کا سانس لیا تھا۔

اس روز رات کے وقت ہمارے عقب والی گلی میں واقع کوٹھی میں ڈیکٹی کی دلیرانہ واردات ہوئی تو ہم سب خوف زدہ اور پریشان ہو گئے۔ اس واقعے سے ہمارے دلوں میں کچھ ایسی ہیبت بیٹھ گئی کہ دوسرے روز ہم نے گھر اندر سے منتقل کر لیا تھا۔ میں نے اپنی بندوبست کمرے میں رکھ لی تاکہ بروقت کام آسکے۔ اب مجھے کسی ڈاکو سے کوئی خطرہ نہ تھا۔

اس واقعہ کی دہشت اور خوف اس لیے تھا کہ انہوں نے فائرنگ کی تھی جس سے دربان زخمی ہو گیا تھا۔ انہوں نے اہل خانہ کو اسلحہ کے زور پر پریشان بنایا تھا..... بیگم صاحبہ ایک اعلیٰ افصر کی دوسری بیوی تھیں۔ انہیں حسین تھیں اتنی ہی مشرور اور اپنے حسن پر نازاں..... ہر کسی کو حقیر سمجھتی تھیں۔ اپنے آپ کو ہانے کیا سمجھتی تھیں۔ صاحب اسلام آباد آگئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان لٹیروں سے جو بیس سے بائیس برس کے تھے انہیں گالیاں اور دھمکیاں دیں اور مزاحمت کی تو ان چار لٹیروں نے نہ صرف ان کے ساتھ زیادتی کی اور بلکہ ان کے ہر زاویے سے تشدد میں بھی اتار کر لے گئے۔ دربان نے ان کے ہاتھ وقت ان پر حملہ کیا تو انہوں نے زخمی کر دیا۔ یہ سارا گھناؤنا اور شرم ناک کھیل دربان کی موجودگی میں ہوا تھا۔ اس کی مکھلیں بندھی ہوئی تھیں۔ اخیر وقت وہ اپنی کوشش اور جدوجہد سے آزاد ہوا لیکن وہ لا حاصل رہا۔ لٹیروں نے نہ صرف بیگم صاحبہ کی عزت دس لاکھ روپے نہیں لاکھ کے طلائی زیورات لوٹ کر لے گئے۔ وہاں بھی لے گئے تھے۔

میں بے حد چوکی اور ہشیار رہنے لگی تھی میری کڑی نظروں کی گرفت میں رہنے لگیں۔ میں برابر ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے ہوئی تھی۔ تین دن گزر گئے اور ایسی کوئی بات نہ ہوئی جو خطرے کا باعث ہو۔ سینے میں دل شور مچاتا رہتا تھا کہ جیسے کسی لمحے مجھے ہونے والا ہو میری ذرا سی غفلت سے کوئی لٹہ ڈیڑی کی موت کا شاخسانہ بن سکتا تھا اس بات کا تو ہی امکان تھا کہ انکل ایمان میں وقت پر اپنا منصوبہ تبدیل کر دیتے۔ مجھے بڑی بے تابی سے اس قدر دن اور وقت کا انتظار تھا جب دونوں اپنے منصوبے کا آغاز کریں کسی وجہ سے ان کے منصوبے اس تاخیر ہو رہی تھی۔

پچھلے روز ڈیڑی کو اپنی فلائٹ لے کر بنگاک ہوا تھا۔ اس روز انکل ایمان اپنی فلائٹ لے کر لندن جا رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ

انکل ریحان کو کوئی حادثہ پیش آجائے کہ وہ دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ واپس نہ آسکیں۔ رات دس بجے فون کی گھنٹی بجی۔ ہاشم اپنے کمرے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ مئی غسل خانے میں تھیں۔ میں نشست گاہ میں بیٹھی ٹی وی پر ایک انگریزی فلم دیکھ رہی تھی۔ فون مجھے اٹھانا پڑا۔ مئی نے بے رحمی سے پوچھا۔ ”کس کا ٹیلی فون تھا۔“

”ڈیڑی کا.....“ میں نے بھی سر دلچے میں جواب دیا۔ ان کا یہ انداز ناگوار لگا۔ ”ڈیڑی کا.....“ مئی کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ انہوں نے حیرت اور بے یقینی سے میری شکل دیکھی۔ ”وہ کیا کہہ رہے تھے۔“

”ان کی فلائٹ مینسل ہو گئی ہے اور وہ ایک گھنٹے میں واپس آ رہے ہیں۔“ میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”اس لیے فون کیا تھا۔“

کسی خیال کے زیر اثر مئی کا چہرہ دک اٹھا اور آنکھوں میں ہیرے کی سی چمک کود نکلی۔ جیسے انہوں نے کوئی جتنی چیز پالی ہو۔ پھر وہ چمن کی جانب برقی رفتار سے بڑھ گئیں..... میں نے زندگی میں پہلی بار یہ بات محسوس کی تھی وہ ڈیڑی کے گھر آنے کی خبر سن کر اتنی خوش ہو گئی تھیں۔ میں حیران سی ٹیلی ویژن بند کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ یہ بات کچھ میری سمجھ میں نہیں آئی۔

چند لمحوں کے بعد زینے پر ان کے قدموں کی چاپیں گونجیں۔ وہ خاموشی سے اندر داخل ہوئیں۔ دودھ کا گلاس میز پر رکھ کر واپس جاتے دیواری کینڈر پر ان کی نظر پڑی تو وہ ٹھٹھک کر رہیں اور میری طرف ٹھوم کر بولیں۔



کی لرزتی آواز میرے کان میں سرگوشی کر رہی تھی۔  
”انجم..... انجم اٹھو۔“

مجھ پر گہرا انش چھایا ہوا تھا۔ جیسے دودھ میں گھی ہوئی بے ہوشی کی دو اپنا اثر دکھا رہی ہو..... چند لمحوں کے بعد میں ڈوٹی ہوئی شہتی کی مانند مگی کا سہارا لیے کھڑی ہو گئی۔ مگی کے دوسرے ہاتھ میں میری بندوق تھی۔ انہوں نے پھر میرے کان کے پاس اپنا منہ لا کر سرگوشی کی۔ ”انجم ڈاکو آگئے ہیں۔ وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں..... تم جلدی سے ان پر فائر کرو۔ وہ فائرنگ سے بھاگ جائیں گے۔“

”کہاں ہیں وہ ڈاکو۔ خونی لٹیرے۔“  
میں نے گہرے نشے کے عالم میں چونک کر جیسے ہوش میں آنے کی کوشش کی پھر سینہ تان کر ادھر ادھر دیکھا اور چاروں طرف چکر کھانے لگی۔

مگی نے میری کلائی پکڑ لی۔ ”ڈاکو چلی منزل پر ہیں۔“ مگی نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔

”اب آپ انہیں اوپر بلا لیں گی!“ میں نے مدھوشی کے عالم میں کہا۔ ”ان سے کہیں تکلف نہ کریں اوپر جائیں۔“

”اوپر بلاؤں۔ وہ کس لیے۔ تم ہوش میں تو آؤ انجم!“ وہ حیرت سے بولیں۔ ”وہ ڈاکو ہیں۔ مہمان نہیں۔“

”اس لیے کہ میں انہیں سامنے قطار میں کھڑا کر کے گولی مارنا چاہتی ہوں۔“

”نہیں..... نہیں۔“ مگی نے ہڈیانی لہجے میں مگر آہستہ سے کہا۔ ”گولی تو تمہیں نیچے چل کر مارنا ہے۔“

”آپ خود بھی تو انہیں گولی مار سکتی ہیں!..... آپ کو بھی تو بندوق چلانا آتی ہے۔“ میں نے اپنی تھوڑی ان کی پیشانی پر ٹکادی۔ میری آنکھیں غنودگی سے بار بار بند ہوئی جا رہی تھیں۔ مگی نے میرا سر اپنے شانے سے بٹھایا اور میری کلائی پکڑ کے مجھے بڑی بے رحمی سے پھینکی ہوئی زینے کی جانب لگیں۔

تیزی سے چلتے ہوئے انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی توان کی آواز میں ارعاش تھا۔  
”میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ہاتھ پیر برف ہو رہے ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ بندوق میں پکڑ سکوں۔“  
مگی نے مجھے نشست گاہ میں لے جا کر ایک ایسی جگہ کھڑا کر دیا جہاں سے میں دروازے اور تمام کھڑکیوں کو نشانے کی زد میں لے سکتی تھی۔ مگی نے میرے ہاتھ میں بندوق تھما دی۔ ”ادھر دیکھو۔“ مگی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے میرے چہرے کا رخ ایک کھڑکی کی جانب کر دیا۔  
”وہ رہا ڈاکو۔“ ان کے لہجے سے نفرت اٹل رہی تھی۔ ”اسے فوراً شوت کرو۔“  
میں نے اس سمت دیکھا ادھر ایک کھڑکی تھی جو برآمدے میں کھلی تھی۔ اس کے شیشے پر ایک آدمی کا عکس پڑ رہا تھا۔ برآمدے کی روشنی میں اس کی مخصوص وردی اور کپ واضح تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔  
”مگی!..... یہ تو میرے ڈیڈی ہیں۔“  
”نہیں..... نہیں..... تمہاری نظروں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ تم..... تم ہوش میں نہیں ہو۔“ مگی نے حواس باختہ ہو کر میرا شانہ ہلایا۔ ”تمہارے ڈیڈی خوب پی کر کمرے میں مدھوش پڑے ہوئے ہیں۔“  
آج انہوں نے ضرورت سے زیادہ پی لی ہے وہ مدھوش نہ ہوتے تو انہیں تمہاری جگہ نہ لے آتی۔“ ان کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔  
میں نے ان کی بات پر فوری رد عمل ظاہر نہیں کیا تو وہ ہڈیانی انداز میں بولیں۔  
”یہ تم کا سوا سونے لگی ہو۔ جلدی کرو۔ اگر یہ شخص اندر داخل ہو گیا تو ہم سب کو ایک ایک کر کے قتل کر دے گا۔“  
”ہم سب کو قتل کر دے گا۔“ میں نے بندوق فضا میں لپٹائی۔ ”نہیں..... اس کی یہ جرات..... میں اسے قتل کر دوں گی مگی!..... میں ہر اس شخص کو

قتل کر سکتی ہوں جو میرے گھر کو تباہ کرنے والا ہو۔“  
میں نے بندوق اپنے کندھے پر رکھ لی۔ وہ ڈاکو اس کھڑکی کے پٹ گواندر کی جانب دھکیل کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کھڑکی میں گرل لگی ہوئی نہیں تھی۔ وہ چاہتا تو شیشہ توڑ کر بھی اندر آ سکتا تھا۔ مگر اس نے شیشہ توڑنے کی کوشش نہیں کی..... میں نے شت باندھ کر گولی چلا دی۔ گولی سناتی ہوئی اور اپنی ہر راہ کی رکاوٹ کو دور کرتی ہوئی اس کے سینے میں بیہوش ہو گئی۔ چشم زدن میں اس کا جسم ٹوٹی طرح ٹھوٹ گیا۔ ایک دل خراش چیخ فضا کے ہول ناک سکوت کو چیر گئی۔ میں نے دوسری گولی بھی اس کے جسم پر داغ دی۔ اگر اس بندوق میں ہزار گولیاں بھی ہوئیں تو میں اس کے جسم کے ہر حصے میں بے دریغ اتار دیتی..... میں نفرت اور طیش کے عالم میں کانپ رہی تھی۔ میرا شانہ بھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے رائفل کلب کے سالانہ نشانہ بازی مقابلوں میں تین برس تک مسلسل پہلا انعام اور ثرائی حاصل کی تھی۔

مگی مجھے وہیں چھوڑ کر بجلی کی سی تیزی سے دروازے کی جانب پھٹی ہوئی گئیں۔ پھر انہوں نے اپنی گرا کر دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ انہیں برآمدے میں جھانکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ اٹنے پاؤں میرے پاس آئیں۔ میں نے دانستہ بندوق فرش پر پھینک دی تھی۔ مگی کے پیروں کو بندوق کی ٹھوک لگی تو وہ گرتے گرتے پھینیں۔ پھر انہوں نے جھک کر بندوق اٹھائی اور اسے میز پر رکھنے لگیں تو نا معلوم کیسے ان کے ہاتھ کی انگلی لمبی کے ریکٹ میں پھنس گئی۔ انہوں نے جھلا کر انگلی نکالی۔ پھر وہ ہڈیانی انداز سے چیخ کر بولیں۔  
”انجم..... یہ تم نے کیا کیا..... تم نے اپنے ڈیڈی کو گولی مار دی۔“  
”میں نے ڈیڈی کو نہیں بلکہ ڈاکو کو گولی مار کر ہلاک کیا ہے۔“ میں نے چونک کر جواب دیا۔ ”میں ہلاک ڈیڈی کو گولی کیوں مارنے لگی۔“

”اس لیے کہ تمہارے کمرے سے ایک جوان لڑکا نکل کر بھاگ رہا تھا اور تمہارے ڈیڈی اسے پکڑنے کے لیے تعاقب کر رہے تھے۔ تم سے یہ سب کچھ دیکھنا نہ گیا اور تم نے اپنے عاشق کو بچانے اور گولی مار دی۔ ذلیل کیسینی۔“  
”مگی!“ میں بل بھر کے لیے بھونچکی ہو گئی اور دوسرے بل چیخ اٹھی۔ مجھے جیسے دھکتے انگاروں پر کھڑا کر دیا گیا تھا میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری مگی اس لمحے سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر ایسی تہمت اور اتنا بڑا بہتان لگا دیں گی..... انہیں شاید میرے آئینے جیسے صاف و شفاف چہرے میں اپنے گھٹاؤ نہ مکر وہ چہرے کا عکس دکھائی دے گیا تھا۔ وہ اس قتل کا جواز پیش کر رہی تھیں۔ وہ مجھ پر شرناک الزام لگا کر اپنے جرم کی پردہ پوشی کرنا چاہتی تھیں۔ میں دھم سے کرسی پر گر پڑی۔  
”مگی..... آپ نے تو کہا تھا کہ ڈیڈی کمرے میں نشے کی حالت میں پڑے ہیں..... کیا آپ مجھ پر جھوٹا الزام نہیں لگا رہی ہیں۔“  
”یہ تو تمہیں پولیس آ کر بتائے گی کہ تم نے قتل کیا ہے۔“ وہ کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی بجلی فون کے پاس پہنچیں..... پھر ریسپور اٹھا کر تیزی سے نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ ”تم قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے سیاہ اعمال کو چھپانے کیسکتیں۔“  
”تو کیا آپ اپنی بیٹی کو قانون کے حوالے کر دیں گی۔“ میں نے دکھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ کو اپنی بیٹی پر ترس نہیں آ رہا۔“  
”ہاں..... میں تمہیں قانون کے حوالے کر رہی ہوں۔“ وہ خشونت سے بولیں۔ ”مجھے ایک بدکار بیٹی نہیں چاہیے۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔“ پھر ان کا رابطہ بجلی فون پر دوسری جانب قائم ہو گیا اور وہ ادھر متوجہ ہو گئیں۔  
”کون انپکٹر صاحب!“ مگی کی آواز میں

”اس لیے کہ تمہارے کمرے سے ایک جوان لڑکا نکل کر بھاگ رہا تھا اور تمہارے ڈیڈی اسے پکڑنے کے لیے تعاقب کر رہے تھے۔ تم سے یہ سب کچھ دیکھنا نہ گیا اور تم نے اپنے عاشق کو بچانے اور گولی مار دی۔ ذلیل کیسینی۔“

”مگی!“ میں بل بھر کے لیے بھونچکی ہو گئی اور دوسرے بل چیخ اٹھی۔ مجھے جیسے دھکتے انگاروں پر کھڑا کر دیا گیا تھا میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری مگی اس لمحے سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر ایسی تہمت اور اتنا بڑا بہتان لگا دیں گی..... انہیں شاید میرے آئینے جیسے صاف و شفاف چہرے میں اپنے گھٹاؤ نہ مکر وہ چہرے کا عکس دکھائی دے گیا تھا۔ وہ اس قتل کا جواز پیش کر رہی تھیں۔ وہ مجھ پر شرناک الزام لگا کر اپنے جرم کی پردہ پوشی کرنا چاہتی تھیں۔ میں دھم سے کرسی پر گر پڑی۔

”مگی..... آپ نے تو کہا تھا کہ ڈیڈی کمرے میں نشے کی حالت میں پڑے ہیں..... کیا آپ مجھ پر جھوٹا الزام نہیں لگا رہی ہیں۔“  
”یہ تو تمہیں پولیس آ کر بتائے گی کہ تم نے قتل کیا ہے۔“ وہ کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی بجلی فون کے پاس پہنچیں..... پھر ریسپور اٹھا کر تیزی سے نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ ”تم قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے سیاہ اعمال کو چھپانے کیسکتیں۔“  
”تو کیا آپ اپنی بیٹی کو قانون کے حوالے کر دیں گی۔“ میں نے دکھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ کو اپنی بیٹی پر ترس نہیں آ رہا۔“

”ہاں..... میں تمہیں قانون کے حوالے کر رہی ہوں۔“ وہ خشونت سے بولیں۔ ”مجھے ایک بدکار بیٹی نہیں چاہیے۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔“ پھر ان کا رابطہ بجلی فون پر دوسری جانب قائم ہو گیا اور وہ ادھر متوجہ ہو گئیں۔  
”کون انپکٹر صاحب!“ مگی کی آواز میں

”کون انپکٹر صاحب!“ مگی کی آواز میں



ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ ”آپ یہاں فوراً پہنچیں۔ میرے شوہر کو قتل کر دیا گیا ہے۔“ وہ توقف کر کے بلکنے لگیں۔ پھر انہوں نے اپنا نام دیتا کھوا دیا۔

میں نے دل میں مسکراتے ہوئے سوچا کہ وہ مجھ پر قتل کا الزام کیسے ثابت کریں گی..... ان کے پاس میرے خلاف ثبوت کیا ہے۔ یعنی گواہ کہاں ہے..... ان کے عینی گواہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ قانون ٹھوس ثبوت مانگتا ہے..... وہ شاید یہ بھول گئیں کہ ان کی بیٹی اتنی احمق نہیں ہے۔ جس وقت فائرنگ ہوئی گی اور وہ دروازے کی جانب برقی سرعت سے پلکیں بھی میں نے برق رفتاری سے ان کی نظریں بچا کر بندوق پر سے اپنی انگلیوں اور ہاتھوں کے نشان ٹھیس کے دامن سے صاف کر دیے تھے۔ فرش پر میں نے اس لیے بندوق پھینک دی تھی کہ میری یقیناً اسے اٹھا کر کہیں رکھیں گی تو اس پر ان کی انگلیوں کے نشان آ جائیں گے۔ وہی کچھ ہوا جو میں چاہتی تھی۔ میں اپنا جرم آسانی سے ان کے سر منڈھ سکتی تھی۔

مجھے ایسی ماں کی کوئی ضرورت نہیں تھی جو متاثر بدنام داغ ہو..... میری کو قاتل ثابت کرنے کے لیے میرے پاس ثبوت اور جواز بھی موجود تھا..... سب سے پہلا ثبوت دودھ تھا جس میں خواب آ دردوا گھول دی گئی تھی تاکہ وہ اپنے شوہر کو قتل کر سکیں۔ دودھ مجھے اور ہاشم کو پلایا گیا تھا۔ میں نے اسے پیا نہیں تھا بلکہ غسل خانے میں جوگ رکھا تھا اس میں محفوظ کر لیا تھا..... ہاشم نے بے خبری میں لی لیا تھا اس لیے وہ گہری نیند سو رہا تھا اور فائرنگ کی آواز پر جاگا بھی نہیں تھا۔

میں نے دودھ اس لیے نہیں پیا تھا کہ قتل کے منصوبے کی جھنک میرے کان میں پڑ گئی تھی..... پھر میں باوجود کوشش کے اس منصوبے کو ناکام نہ بنا سکی تھی۔ اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ جب میں نے گولیوں کے چیلنے کا شور سنا تو نیچے بھاگی ہوئی آئی۔ میری اپنا کام دکھا چکی تھیں۔ اس بندوق پر میری کی

انگلیوں کے نشان موجود ہیں۔ میری پولیس کے سامنے میرا بیان سن کر سکتے میں آجائیں گی۔ تب انہیں اس بات کا احساس ہوگا کہ ان سے کیسی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ میری نے شاید کبھی بھولے سے بھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ ان کی بیٹی جسے وہ بے وقف بھتی آئی ہیں انہیں اپنی ذہانت سے مات بھی دے سکتی ہے..... وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گئی تھیں۔ میری نے ٹیلی فون پر پولیس کو اپنا پتا لکھوانے کے بعد کریڈل پر ریورسنگ دیا۔ پھر وہ میری جانب گھوم گئیں۔

”انجم!“ ان کا لہجہ اس قدر سفاک اور بے رحم تھا کہ میں دنگ رہ گئی۔ ”آخر تم نے اپنی ڈیڈی کو اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دیا۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا..... اب تمہارا اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دینا ہی زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح تم قانون کی نظروں میں شاید کسی رعایت کی مستحق بن جاؤ۔ قانون تمہارے اعتراف جرم کم عمری اور نو جوانی پر رحم کھا کر کم سے کم سزا دے گا۔“

”آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ.....“ میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔ ”ڈیڈی کی موت سے کیا آپ خوش نہیں ہوئیں۔“

”ہاں..... بہت خوش ہوں۔ کتنی خوش ہوں بتا نہیں سکتی۔ اس لیے کہ مجھے میرا ریحان مل جائے گا۔ میں برس کے طویل اور کرب ناک انتظار کے بعد میری محبت کی منزل مل گئی۔ اچھا ہوا خالد نے مجھے آزاد کر دیا۔“

”تو کیا آپ اتنی خود غرض ہو گئی ہیں اور یہ بات بھول رہی ہیں کہ آپ کی بیٹی کو ناکردہ گناہوں کی سزا ملنے والی ہے۔“

”کیا..... یہ ناکردہ گناہ تھا۔“ میری نے غصے سے چیخ کر کہا۔ ”کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تم نے بندوق چلائی۔“ میری نے بندوق اٹھا کر فضا میں لہرائی تو میں اور خوش ہو گئی۔ انہیں اپنی اس احمقانہ حرکت کا احساس نہیں ہوا۔ ”تم اپنے باپ کی قاتل ہو۔“

”ایک بیوی اپنے شوہر کو قتل کر سکتی ہے.....“

”ایک بیوی ایسا بھی تک اور اتنا گھناؤنا جرم نہیں کر سکتی۔“ میرے لبوں پر ایک غیر اختیاری معنی خیز مسکراہٹ بھر گئی۔ ”آپ اس لاش پر ایک نظر ڈال کر تو آئیں۔ وہ ڈیڈی نہیں انکل ریحان ہیں۔“

”تم شاید نشے میں ہو.....“ میری نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔ ”ریحان تو فلائٹ کے لئے لندن گیا ہوا ہے۔“

”میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں ہوں میری!“ میں نے بڑی حقارت سے جواب دیا۔ ”ڈیڈی کی نہیں بلکہ انکل ریحان کی فلائٹ کینسل ہوئی تھی۔“ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ایئر پورٹ سے جو فون آیا تھا وہ ڈیڈی کا نہیں بلکہ انکل ریحان کا تھا۔ میں نے ان سے فرخندہ بن کر بات کی تھی..... آپ یہ کیوں بھول گئیں کہ ہماری آوازیں بھی ملتی جلتی ہیں۔ ہاشم اور ڈیڈی بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس درد انکل ریحان میرے سراپا سے دھوکا کھا گئے تھے اور آج میری آوازیں انہیں قریب دے کر قتل کے لیے قتل میں پہنچ لائی تھی..... اس گڑھے میں وہ خود گر گئے تھے جو انہوں نے میرے کھودا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں دو ایک گھنٹے پہنچوں گا تم بچوں کو دودھ پلا کر سلا دیتا۔“

انتا کہہ کر میں نے میری کا چہرہ دیکھا۔ وہ سفید پڑا چلا گیا۔

وہ صوفے پر دم سے بیٹھ نہ گئی ہوتیں تو شاید اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہوتا میں۔ میری کا جسم یک بارگی کاٹنے لگا اور وہ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے جا رہی تھیں۔ ان پر سکتے کی سی ایسی کیفیت طاری تھی جیسے ان پر کوئی بجلی آ گری ہو۔

”آپ دونوں نے ڈیڈی کو قتل کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ میں نے سن لیا تھا..... میں آپ کے اس منصوبے سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ قدرت نے میری دلی آرزو پوری کر دی..... میں آپ کو بتا دوں کہ میں نشے میں نہیں تھی بلکہ اداکاری کر رہی تھی۔ آپ جو دودھ لے کر آئی تھیں مجھے پلانے کے لیے وہ

غسل خانے میں موجود ہے۔“

میری کچھ دیر کی بے جان لاش کے مانند بے حس و حرکت بیٹھی رہیں۔ پھر ایک لذت ایک جھکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے پیر کا پ رہے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر صوفے کی پشت کا سہارا لیا۔ پھر غائب انہوں نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا..... مگر ان کی آنکھوں سے ایسی دردندگی ایسی نفرت اور ایسا غیظ و غضب جھانک رہا تھا کہ میں سر اسیمے کی ہو گئی۔ ان کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ مجھے قتل کرنے پر تل گئی ہیں۔ انہوں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”انجم!..... تم نے دانستہ ریحان کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا.....“ ان کی آواز گلے میں رندھ رہی تھی۔ ”اگر خالد اس قابل ہوتا کہ وہ ایک عورت کو وہ سب کچھ دے سکتا جو ایک عورت چاہتی ہے۔ تو میں ریحان کو ایک کتے کی طرح دھتکار دیتی..... اس کے منہ پر تھوک دیتی..... ایک عورت ساری زندگی محبت اور ایسے گھر کو ترستی ہے جو سدا ہمہکار ہے۔ وہ اس کی خاطر اپنی پہلی محبت کا کلا گھونٹ سکتی ہے..... اس نے مجھے دولت کے عوض اس لیے خریدا تھا کہ معاشرے میں عزت دار کہلائے۔ اس نے ایک بیوی ایک عورت اور ماں کو ہی نہیں بچوں کو بھی خریدا تھا اور سوچا تھا کہ کبھی خالد سے چھٹکارا پالوں گی۔ مگر خالد نے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ ایک عورت کی مجبور یوں سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ تم جسے آج تک اپنا باپ بھتی رہی ہو وہ تمہارا باپ نہیں ہے۔ خالد صاحب اولاد نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہارا اور ہاشم کا باپ ریحان تھا..... نقد پر کی ستم ظریفی دیکھو کہ ایک باپ اپنی بیٹی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ دل میں یہ حسرت لیے مر گیا کہ تم دونوں کو اپنی اولاد کہہ کر سینے سے لگا سکتا۔“

وہ سسک پڑی۔ ”میں نہیں آج..... آج میں نے اور تم نے بازیاں ہار دیں۔“

❖ ❖ ❖



مگر میرے خیالات اب بالکل بدل چکے تھے۔ میں اس کو آوارہ اور لوفر لڑکی تصور کرنے لگا۔ چند عرصہ ایسے ہی گزرا۔ میں نے اس دوران میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کر لیا اور کالج میں پری انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔

ان لوگوں کے لیے جو محبت کا جذبہ رکھتے ہیں

پوچھا۔

”ظفر۔“

”لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر لے کر بھاگے تھے۔“ نواز نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ظفر آہستگی سے بولا۔

”تو پھر تمہیں سزا کیسے ہوئی۔“ نواز حیرت سے بولا۔

”کیا کرو گے سن کر۔“ ظفر نے جواب دیا۔

”کہتے ہیں کہ دکھ دوسروں کو بتانے سے کم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے بتانے سے تمہارے دل کا بوجھ کم ہو جائے۔“

”بوجھ.....“ ظفر بولا۔ ”قسمت کہو۔“

ظفر نے آنکھیں بند کر لی۔ کچھ دیر بعد اس کے لب ہلے۔

”مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب ہم گاؤں

چھوڑ کر شہر آئے تھے۔ میرے والد اور بھائی لاہور

میں فرنیچر کا کام کرتے تھے۔“ ظفر کی آنکھیں بند

تھیں لیکن زبان ہل رہی تھی۔ ”میری عمر اس وقت

سولہ سال تھی۔ مجھے میرے والد نے قریبی پائی اسکول

میں داخل کر دیا۔ گاؤں کی زندگی اور شہر کی زندگی

میں بڑا فرق تھا۔ یہاں کے لڑکے بہت ہوشیار اور

چالاک تھے۔ جب کہ میں ان کے مقابلے میں ناتوا

انتا چالاک تھا اور نا ہی ہوشیار اسی لیے میرا زیادہ تر

وقت گھر میں ہی گزرتا۔

سنٹرل جیل کا پھانک کھلا۔ پولیس وین

اندرا داخل ہوئی اور تھوڑی دور جا کر رک گئی۔ دو پولیس

والے ایک لڑکے کو وین سے اتار کر جیل سپرنٹنڈنٹ

کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد وین

جیل سے واپس چلے گئی۔ لڑکے کو ایک کوشری میں بند

کر دیا گیا۔

”حوالدار صاحب کس چکر میں آیا ہے۔“

ساتھ والی کوشری میں سے آواز آئی۔

”لڑکی کے کس میں۔“ حوالدار بولا۔

”کتنی سزا ہوئی۔“ کوشری میں سے پھر آواز

آئی۔

”سات سال۔“ حوالدار جاتے ہوئے بولا۔

”کس جرم میں آئے ہو۔“ اسی کوشری میں

سے آواز آئی۔

لڑکے نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کوشری میں اس

کے علاوہ ایک آدمی بھی تھا۔

”کس جرم میں آئے ہو بھائی۔“ آدمی دوبارہ

بولا۔

”لڑکی کو گھر سے بھگایا تھا۔“ لڑکے نے آہ بھر

کر کہا۔

”کتنی سزا ہوئی۔“

”سات سال۔“

”میرا نام نواز ہے اور تمہارا.....؟“ آدمی نے



تمام حسرتیں اور امیدیں خاک میں مل گئیں۔ مجھے

آہستہ آہستہ اس سے نفرت ہونے لگی۔ ناجانے

کیوں۔ ان کی گلی کے سامنے ایک پارک بھی تھا جہاں

ہم لوگ تقریباً روزانہ کھیلا کرتے تھے۔ آٹھ نو ماہ بعد

مجھے پتہ چلا کہ جس لڑکے سے وہ غبر کرتی تھی اس

کے خطوط پکڑے گئے اور ان کا اخیر اب ختم ہو گیا ہے۔

مگر میرے خیالات اب بالکل بدل چکے

تھے۔ میں اس کو آوارہ اور لوفر لڑکی تصور کرنے لگا۔

چند عرصہ ایسے ہی گزرا۔ میں نے اس دوران میٹرک

اچھے نمبروں سے پاس کر لیا اور کالج میں پری

انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔“

ظفر آنکھیں کھول کر سامنے دیوار پر دیکھنے لگا۔

”میرے سامنے بڑا مستقبل تھا کتنی منزلیں تھیں۔

والدین کی کئی امیدیں ہمارے گھر میں پڑھائی کے

لیے کوئی خاص کمرہ نہ تھا۔ لہذا میں چھت پر پڑھا کرتا۔

میرا دوست اقبال بھی میرے پاس آ جاتا کرتا تھا۔ اس

کے ساتھ ساتھ میں اپنی ٹیوشن کے لیے ریس کلب میں

اتوار اور جمعرات کو سیکوریٹی کی ڈیوٹی کرنے جایا کرتا

تھا۔ جب ہم چھت پر پڑھا کرتے تھے تو وہی لڑکی اور

اس کی بہن ایسے گھر کی چھت پر باقاعدگی سے آتیں

اور طرح طرح کے اشارے کر کے چلی جاتیں۔ میں تو

ان کی طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن میرا دوست اس کی بڑی

وقت گزرتا رہا۔ آہستہ آہستہ میری دوستی ایک

دو لڑکوں سے ہو گئی اور میں یہاں کے ماحول میں بھی

رہنے لگا۔ ایک دن میں چھت پر بیٹھا پڑھ رہا تھا

کہ.....“ ظفر چپ ہو گیا۔

”پھر کیا ہوا۔“ نواز نے پوچھا۔

ظفر نے گہری سانس لی اور پھر بولنا شروع کر دیا۔

”ایک دن میں چھت پر بیٹھا تھا کہ اچانک

ہماری سامنے والی گلی کے مکان کی چھت سے ایک

غوب صورت چہرہ نمودار ہوا اور چند لمحوں بعد غائب

ہو گیا مگر میرے دل میں دوبارہ دیکھنے کی حسرت چھوڑ

گیا۔ مجھے اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے زیادہ جستجو نہ

کرنی پڑی۔ کیونکہ اسی گلی کے دو تین لڑکے میرے

کلاس فیلو تھے اور میرے دوست بھی۔ میں صبح شام

اس گلی میں رہتا۔ اس دوران کئی دفعہ اس حسین

پہرے کا دیدار ہوا۔ تھوڑی بہت ٹوک جھوک بھی

شروع ہو گئی۔ مگر کامیاب کوئی اور ہو گیا۔“ ظفر ایک

مرتبہ پھر چپ ہو گیا۔

خاموشی کو پھر اسی نے توڑا۔

”احمد عرف اچھو ایک لڑکا تھا اسی محلے کا..... وہ

اس کے ساتھ پیار کرنے لگی۔ شروع میں تو مجھے یقین نہ

آتا۔ مگر جب میرے دوستوں نے ان دونوں کو آپس

میں باتیں کرتے دیکھا تو میرے ہوش اڑ گئے اور میری



بہن کے چکر میں تھا۔ وہ اس کی ضد تھی اور وہ مجھے اکثر کہا کرتا کہ میں اسے ضرور حاصل کروں گا۔ چاہے مجھے کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔ اس کا نام بشری تھا۔ اتفاقاً سے ان دنوں اقبال ان کے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں رہ رہا تھا جو انہوں نے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ ہم لوگ شام کو ٹیوشن بھی ان کے گھر میں ہی ایک ٹیوٹر سے پڑھا کرتے تھے۔

”وہ شام.....“ ظفر کہتے کہتے رک گیا۔ چند لمحے بعد ظفر کی آواز پھر کوشری میں گونجنے لگی۔

”وہ شام مجھے آج تک نہیں بھولی جس وقت سے میرے اصل پیار.....“ ظفر نے لمبی سانس لی۔ ”کی بر بادی کا آغاز ہوا۔ میں ٹیوشن کے لیے ایک دوست اقبال کے گھر کے سامنے اس کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک ساتھ والے گھر کی کھڑکی سے آواز آئی۔ پہلو بہت سردی لگ رہی ہے۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو دوبارہ آواز آئی۔ جناب ادھر کھڑکی میں دیکھئے۔ خیر جان پہچان تو پہلے بھی تھی اور ساتھ ہی اس نے مجھے دوستی کی آفر کی۔ میں نے دو چار جملی کئی سنائیں۔ مگر جواب میں اس نے کہا کہ تم نے مجھے لفٹ نہیں کرائی تو میں نے کسی اور سے دوستی کر لی۔ مگر وہ بے وفا نکلا۔ مجھے معاف کر دو پلیز اور ساتھ ہی اس نے خط لکھنے کے لیے کہا۔ خط و کتابت شروع ہوئی۔ پھر سلسلہ ملاقاتوں تک پہنچ گیا۔“

کوشری کے روشن دان سے ڈوبتا سورج صاف نظر آرہا تھا۔ ظفر نے ایک نظر ڈوبتے سورج پر ڈالی۔ ”ان کا گھر ڈیل اسٹوری پر مشتمل تھا۔ اوپر والی اسٹوری میں اس کے والدین اور اس کا چھوٹا بھائی احسن جس کی عمر تقریباً سات یا آٹھ برس تھی وہ سوتے تھے اور نیچے دونوں بچیں سویا کرتی تھیں۔ ان کا والد پولیس کا ریٹائرڈ آفیسر تھا اور ساتھ ساتھ اپنے گھر کی چھت پر لٹن بنایا کرتا تھا جو کہ سائیکل کے پیچر وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی ایک بڑی بہن بھی تھی جس کی میرن ہو چکی تھی اور وہ دونوں

لڑکیاں بھی اسی طرح کے خیال کی حامل تھیں۔ حالانکہ سعدیہ کی ممتی بھی ہو چکی تھی اس کے پھوپھو کے لڑکے سہیل کے ساتھ گردہ اس سے سخت نفرت کرتی تھی۔ جس کی کئی وجوہات اس نے مجھے بتائیں۔“

”پھر کیا ہوا۔“ نواز نے بے باتی سے پوچھا۔ ”شروع شروع میں تو ہماری ملاقاتیں کھڑکیوں میں اور پھر ڈرائنگ روم میں ہونے لگی۔ اسی دوران اقبال کی دوستی اس کی بڑی بہن سے ہو گئی جس کی تمام تر جدوجہد اس کی چھوٹی بہن سعدیہ اور میں نے کی۔ ہم لوگ بڑا چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ ہمارے گھر کی چھت پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں میں سویا کرتا اور اقبال بھی پڑھائی کے بہانے ادھر ہی آ جایا کرتا تھا۔ وہاں سے ہم تقریباً دس گیارہ بجے نکلے اور ان کے گھر کے سامنے دو بکن مرتبہ شور مچاتے اور دروازہ کھل جاتا۔ ہم اچھی طرح سلی کر کے ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے اندر چلے جاتے۔ ملاقاتوں کا یہ وقت اتنی جلدی سے گزرتا کہ ہمیں اندازہ ہی نہ ہوتا۔ یہاں تک کہ صبح کے تین چار بج جاتے اور ہم اسی طرح چھپتے چھپاتے واپس آ کر سو جاتے۔

ایک مرتبہ میں دو تین ہفتوں کے لیے گاؤں چلا گیا اور کافی عرصے کے بعد ملاقات کے لیے گیا۔ تو دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پوچھنے لگی کہ تم نے اتنے دن کیوں لگائے اور مجھے اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے گئی۔ پہلے جب ہم لوگ ملا کرتے تھے تو وہ ہمیشہ مذاق کرتی رہتی اور ہنستے کھیلتے وقت گزر جاتا لیکن اس دن وہ بہت سنجیدہ تھی اس نے میری گود میں سر رکھا ہوا تھا اور میں اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کرتا رہا اور اس کے بال جو غسل کی وجہ سے ابھی گیلے تھے سمجھانے لگا۔

اس دن اس نے مجھے اپنے تمام تر حالات اور مجبوریات بتائیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ واقعی ایک مظلوم لڑکی ہے اور مجھے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کروایا اور کہا کہ تم میرے آئیڈیل ہو اور میں تم سے

شادی کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میں نے اس سے شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا لیکن میں نے انکار نہ کیا اور کہا کہ ابھی اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی ہماری عمریں شادی کے قابل نہیں۔ پھر ہم لوگ ایک دوسرے کے پیار میں گم ہو گئے۔

اس طرح کی ملاقاتیں تقریباً دوسرے تیسرے دن ہوا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ہم نے وہ قدم نہ اٹھایا جس کی وجہ سے ہماری محبت یا ہمارے پیار میں کوئی داغ لگتا۔“

ظفر نے نوازی کی طرف دیکھا جو مسلسل اسے گھور رہا تھا۔ ”ہم لوگ ملاقات کرتے ہوئے کئی دفعہ پھنستے پھنستے بچ کر اس روز جب ہم چاروں میں اقبال بشری اور سعدیہ بیٹھے خوش گپوں میں مشغول تھے کہ اچانک کسی کے بیڑھیاں اترنے کی آواز سنائی دی۔ اقبال اور بشری۔ بشری کے بیڈ روم میں جا کر چھپ گئے اور میں سعدیہ کے بیڈ کے نیچے ہنس گیا۔ سعدیہ کے بیڈ روم کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ سعدیہ نے پوچھا۔ ”کون.....“ جواب میں اس کی امی کی آواز سنائی دی کہ دروازہ کھولو۔ سعدیہ نے پہلے تو بہت حیلے بہانے کیے مگر اس کی امی دروازہ کھولنے پر یقین تھی وہ ہماری آوازیں سن چکی تھی اور کہہ رہی تھی کہ میں نے مردانہ آوازیں سنیں ہیں۔ سعدیہ نے دروازہ کھول دیا اور کہا کہ آپ کو خواہ مخواہ شک ہوا ہے یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو چیک کر لیں۔ میرا بیڈ روم کے نیچے برا حال ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی والدہ نے بیڈ کی چادر اوپر کی اور مجھے کہا کہ باہر آ جاؤ بد قسمتی سے میری جوتی اس کے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ میں بیڈ کے نیچے سے نکلا اور چپ چاپ اس کی والدہ کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا کہ نہ جانے کون سی سزا سنائی دی۔

اس کی والدہ نے مجھ سے ایک ہی زبان میں دو گنا سوال کر دیے کہ کون ہو۔ کہاں سے آؤ ہو۔ تمہارا نام کیا ہے۔ میں ابھی کسی بھی سوال کا جواب نہ دے سکا تھا کہ سعدیہ نے جواب دیا کہ اسے میں نے بلایا تھا کہ اس کی والدہ نے کہا کہ دفعہ ہو جاؤ اور آئندہ

کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ میں وہاں سے نکل کر سیدھا اپنے گھر آ کر سو گیا اور اقبال بیچ گیا۔

مگر اس واقع کے بعد ہماری ملاقاتیں ختم ہو گئیں کیونکہ ان پر بھی پابندی لگ گئی اور ساتھ ساتھ ہم لوگ بھی مٹھکوں ہو گئے۔ چونکہ میں کافی ڈر گیا تھا اس لیے میں ان سے بالکل قطع تعلیق ہو گیا لیکن اقبال چونکہ انہی کی نگاہ میں رہتا تھا۔ لہذا اس کی تھوڑی بہت ملاقات اور خط و کتابت جاری رہی اس نے مجھے سعدیہ کے کئی خطوط لاکر دیے۔ مگر میں نے کسی خط کا جواب نہ دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نو بدنامی ایک لڑکا جو کہ اسی گلی میں دو بچوں کو ایک گھر میں ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا اس نے مجھے بتایا کہ جس لڑکی سے تم محبت کرتے ہو وہ تو ہر کسی کو لفٹ کرواتی ہے اس کے ساتھ تو میرا بھی آفیسر چل چکا ہے اور ایک دو خط ہم نے بھی ایک دوسرے کو دیے ہیں لہذا میں نے اور بے رحمی اختیار کر لی اور یہی بہتر سمجھا کہ ایسی لڑکی کو بھول جانا ہی بہتر ہوگا۔ گردہ مجھے یہی یقین دلانی رہی کہ میں ان تمام لڑکوں کو بھول چکی ہوں اور اب میں صرف اور صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہارے بغیر میں جی نہیں سکتی۔“

ادھر اقبال اپنی جدوجہد اور کوششوں میں مصروف تھا ایک مرتبہ وہ اور اس کی والدہ قریشی کے گھر گئے۔ ”یہ قریشی کون تھا۔“ نواز نے پوچھا۔

”عجاز حسین قریشی لڑکیوں کے والد کا نام تھا۔“ ظفر نے جواب دیا۔

ظفر نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”اقبال کی والدہ نے قریشی سے رشتے کی درخواست کی مگر اس کے والد نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ تمہارا بیٹا اس قابل نہیں کہ میں اپنی بیٹی اس کے ساتھ بیاہ دوں حالانکہ میری بیٹی بھی یہی چاہتی ہے کہ میں اس کی تمہارے بیٹے کے ساتھ شادی کر دوں مگر تمہارا بیٹا تو ہر وقت کھیل کود میں لگا رہتا ہے۔ یہ میری بیٹی کو کہاں سے کھلانے گا۔

اس کے بعد لڑکیوں کے والد نے ان پر مزید پابندیاں سخت کر دیں۔ پھر ان لڑکیوں کے خطوط آنے لگے کہ خدا کے لیے ہماری ہمارے سنگدل باپ



سے جان چھڑاؤ۔ ہم چاروں یہاں سے نکل جاتے ہیں اور آپس میں شادیاں کر لیتے ہیں۔

میں نے انہیں صاف انکار کر دیا کہ میں اس طرح کا کام نہیں کروں گا۔ میں نے سعدیہ کو خط لکھا کہ اگر تم واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو تو صحیح طریقے سے وقت کا انتظار کرو لیکن ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ ہم اب اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی ہمارے یہاں سے نکلنے میں تم اگر ہماری ایک انسان ہونے کے ناطے مدد کر دو تو یہ تمہارا احسان ہوگا۔ ان کے گھر چھوڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے والد بہت سنگدل تھا اور وہ ان پر بلاوجہ ظلم کرتا رہتا۔ اقبال نے مجھ سے پوچھا کہ کیا خیال ہے۔ میرا جواب انکار میں تھا اس کے علاوہ ہم نے ایک دو لوگوں سے بھی مشورہ لیا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ بہت غلط اور خطرناک کام ہو سکتا ہے۔ مگر اقبال کی بات چیت اور بحث و مباحثہ چل رہا اور اقبال نے ایک بہانہ یہ بھی لگایا کہ ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے تو جواب میں انہوں نے کہا کہ پیسوں کو بندوبست ہم کر لیں گی۔ تم ہمیں فلیٹ لے دو اور ہمارا ساتھ دو لہذا اقبال نے ان کی ہاں میں ہاں کر دی اور قریبی علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر لیا اور ان کے ساتھ نکل جانے کا ناظم مقرر کر لیا۔ اس واقعے سے ایک دن پہلے اقبال مجھ سے ملا اور مجھے یہ سب باتیں بتائیں اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا کہ آخر تم بھی تو سعدیہ سے محبت کرتے ہو۔ وہ بھی تمہارے لیے جان دیتی ہے لیکن تم اس کی ذرا بھی مدد کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے بہت انکار کیا تو اس نے ایک بات مجھے بتائی کہ اگر تم نہیں جاؤ گے تو تمہارے چھٹنے کے چانس زیادہ ہیں کیونکہ میں تو اس سے شادی کرنے کے بعد کراچی چلا جاؤں گا۔ (کراچی میں اقبال کے والد کا کاروبار تھا اور وہاں اس کے رشتے دار بھی رہتے تھے) بعد میں پولیس جنہیں تنگ کرے گی۔ مجبوراً میں نے بھی حامی بھر لی کہ ٹھیک ہے میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

”پھر کیا ہوا۔ کیا تم بھی ان کے ساتھ گھر سے

بھاگ گئے۔“ نواز نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ظفر ادا سے بولا۔ ”گلی صبح میں چھ بجے گھر سے نکلا اور مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے اقبال نے دونوں لڑکیوں کے بیان اچھ گشتہ سنے لکھوائے تھے اور ان کے انگوٹھے بھی لگ چکے تھے۔ وہ بیان اس طرح کے تھے کہ ہم اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر آئی ہیں اور اپنے ساتھ کوئی زیور یا پیسے لے کر نہیں آئیں اور بالغ و عاقل ہیں اور ان لڑکوں سے اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔“

”لیکن تم تو کہتے تھے کہ وہ پیسے لائی تھی۔“ نواز نے ٹوک دیا۔

”ہاں وہ تیس ہزار نقد اور بیس ہزار کے زیور لے کر آئی تھیں۔ ان بیانات کے بعد اقبال نے مولوی کا پتہ کیا مگر پتہ چلا کہ مولوی صاحب ایک بچے ملیں گے اس وجہ سے ہم نے فلیٹ کا رخ کیا اور ایک بچے کا انتظار کرنے لگے۔“

”ایک بچہ کیا۔“ ظفر آہستگی سے بولا۔ اقبال نے کہا کہ آؤ مولوی کے پاس چلتے ہیں اور نکاح کروا کر رنج کراچی نکل جائیں گے۔ میرا دل شادی کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم بڑے ہوتے دو دنوں کو رو آؤ ہماری ابھی خیر ہے۔ ہم لوگ بعد میں کروالیں گے وہ دو دن چلے گئے۔ بعد میں سعدیہ میرے پاس بھی بڑے عرصے بعد تہذیب میں ملاقات کا موقع ملا۔ بہت سی باتیں ہوئیں میں نے اسے سمجھایا کہ ہم نے بہت غلط قدم اٹھایا ہے تو اس نے بچوں کی طرح مسکرا کر جواب دیا کہ اب تو قدم اٹھ چکا ہے اب کیا ہو سکتا ہے۔

ظفر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بہت خوب صورت اور معصوم تھی میں اکثر اس کی معصومیت کے دھوکے میں آ کر اپنے ہوش گنوا بیٹھتا تھا میرا اس کے ساتھ جانا بھی ایسی معصوم چہرے اور جھیل سی گہری آنکھوں کی کشش تھی۔

اقبال اور بشری واپس آ گئے اور کہا کہ مولوی نے ہمیں لہذا چھوڑ دیا ہے اور اب ہم کسی اور مسجد کے مولوی کے پاس چار بجے جائیں گے لیکن چار بجے بھی

وہاں کام واپس آ گئے۔ رات کو اقبال نے اپنے دوست کے کمر فون کر کے اپنی امی کو بلوایا اور پوچھا کہ محلے میں کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ اس کی امی نے جواب دیا کہ نہیں۔ اقبال نے دوبارہ کہا کہ ہم لوگ آج رات اپنے دوست کے ہاں بڑھائی میں مصروف ہیں۔ لہذا گھر نہ کرنا اور ظفر کے گھر بھی اطلاع دے دینا۔

رات ہم نے یونہی باتیں وغیرہ کر کے نکال دی اور اقبال نے مجھے بتایا کہ مولوی گواہ مانگتے ہیں میں نے فلیٹ میں چند آدمیوں سے بات کی ہے انہوں نے مجھے کہا ہے کہ ہم گواہی دے دیں گے لہذا ہم صبح نکاح کر کے کراچی نکل جائیں گے۔

انہوں نے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے کر پوچھا کہ کیا مجھ پر اسے اور ساتھ یہ تسلی بھی دی کہ میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔ میں انہیں فلیٹ لے گیا۔

وہاں سے بھائی جان ہم سب کو اپنے ایک دوست کے گھر لے گئے۔ اس کے بعد قریبی سے ملاقات کی۔

قریبی کے ساتھ ہمارے دور کے رشتے دار بھی تھے جن کو لوہار کہتے تھے جو کہ قریبی کے بھائی بنے ہوئے تھے۔ وہ بھی اس معاملے میں شریک ہو گئے۔

پھر بھائی نے لڑکیاں بھی ان کے حوالے کر دیں اور تمام زیور اور پیسے بھی ان کے حوالے کر دیے۔ قریبی میرے بھائی کے قدموں میں گر پڑا اور کہنے لگا کہ تم جو کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔ وہ اپنی لڑکیوں کو لے کر گھر چلا گیا۔ مگر دونوں لڑکیوں نے شور مچا دیا کہ ہم گھر نہیں جائیں گی۔ وہ بھاگ کر میرے گھر کے سامنے آ کر شور مچانے لگی۔ اقبال بھی ان کے ساتھ تھا۔ محلے کے بزرگوں نے بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ ان کی آپس میں شادی کر دی جائے جس پر قریبی بھی رضامند ہو گیا اور طے پایا کہ سات بجے مولوی کو بلا کر ان کا نکاح کر دیا جائے۔ اسی دوران اقبال کی والدہ قریبی کے گھر گئی اور قریبی سے کہا کہ تم مجھے لڑکی تو

ایک اسٹوری مجھ دے دو۔“

اس نے چند لوگوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ تم کتنے بے وقوف ہو ایک تو تم لڑکی دے رہے ہو اور دوسرا امکان بھی کل کو دوسرا دام بھی مطالبہ کرے گا تو تم تو فقیر ہو جاؤ گے۔ انہوں نے قریبی کو بیڑی بڑھائی اور سات بجے مولوی کی بجائے پولیس آ گئی۔ قریبی نے ہمارے خلاف انخواہ زنا اور چوری کا پرچہ کٹوایا تھا۔ لڑکیوں کے بار بار کہنے کے باوجود کہ ہم اپنی مرضی کے ساتھ گئی تھیں۔ پولیس نے ہمیں قصور وار ٹھہرایا۔“

ظفر کی آنکھوں میں سے آنسو گر رہے تھے۔ اس کی زبان چب تھی مگر آنسو مسلسل گر رہے تھے۔

”تمہارے گھر والوں نے کچھ نہیں کیا۔“ نواز بولا۔

”اگر کچھ کیا ہوتا تو شاید میں یہاں نہ ہوتا۔“

ظفر آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ انٹر میڈیٹ کے پیپر زدے رہا ہوتا۔ آج پہلا پیپر ز تھا۔“ ظفر بولا۔

”تمہارے بھائی نے بھی کچھ نہ کیا۔“ نواز نے دوبارہ پوچھا۔

ظفر مسکراتے لگا۔ ”میرا بھائی میرا کیس شروع ہوتے ہی ملک سے باہر چلا گیا۔ میرے ماں باپ جو کچھ کر سکتے تھے انہوں نے کیا لیکن بے سود۔“

ظفر نے آنکھیں بند کر لی۔ وہ سوچنے لگ پڑا کہ سات سال کیسے گزریں گے۔ ان سات سالوں میں دنیا کہاں سے کہاں چلے جائے گی جب کہ وہ یہ سات سال اس کوٹھری میں گزارے گا۔ کاش وہ تمام قدم نہ اٹھاتا جس کی وجہ سے وہ یہاں ہے۔

لیکن اب سوچنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ تمام قدم تو وہ اٹھا چکا تھا۔ ان قدموں نے اس سے اس کی جوانی کے سات سال ضائع کر دیے تھے۔ وہ سات سال جن میں اس نے اپنے ماں باپ کی امیدوں کو ان کے خوابوں کو پورا کرنا تھا۔ مگر ایک چھوٹی سی غلطی نے اسے کہاں لاکر کھڑا کر دیا۔

ہر کام کا انجام سوچ کر کیا جائے تو کوئی برباد اور تباہ نہ ہو۔



وہ حسین تھی..... معصوم تھی..... اس میں جو حیرت انگیز صلاحیتیں تھیں ان کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کے والدین بھی نہیں..... جنہوں نے اسے پیدا کیا تھا..... اور جہاں اس نے پرورش پائی تھی۔ وہ دیوتاؤں اور دیویوں جیسے حسن کی مالک تھی..... اس کو ناجانے کون کون سی شکستیاں حاصل تھیں..... بڑے بڑے پنڈت اور مہان شکتی مان اس کے آگے جھک جاتے تھے..... اس کے آگے ان کی کوئی حیثیت نہ تھی..... لیکن ایک خواہش اس کے من میں موجود تھی..... جس کے لیے وہ بہت آگے جانا چاہتی تھی..... عمران ڈائجسٹ کا امتیاز..... ایک ایسا سنسنی خیز سلسلہ..... جس کے بارے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ قارئین اس کا بے چینی سے انتظار کریں گے۔

حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک ایک حسین و معصوم کی داستان





”بھلا وہ کیا کام۔“  
 ”تم نے میرے ہاتھ کے بنے ہوئے گوجے کھائے تھے۔“  
 ”اچھا..... اچھا..... وہ تو بہت ہی اچھے تھے۔“  
 ”اور کھاؤ گے؟“  
 ”کیا مطلب؟“  
 ”تمہیں اچھے لگے تھے نا۔“  
 ”بہت زیادہ۔“  
 ”تو میں آج بھی تمہارے لیے گوجے بنا کر لائی ہوں۔“  
 ”آج بھی۔“  
 ”ہاں..... آج بھی۔“  
 ”تو لاؤ نا پھر..... جلدی سے کھاؤ وہ گوجے تو بہت اچھے تھے۔“ ماسکی راج نے کہا اور بھونگنی نے تھوڑے فاصلے پر موجود ایک درخت کی شاخ سے ایک پوٹلی کھولی اور لاکر ماسکی راج کے سامنے رکھ دی۔  
 ماسکی راج نے پوٹلی کی گراہ کھول کر اس میں سے گوجے نکالے اور اپنے ہاتھ سے بھونگنی کو کھلانے لگا۔ آدھا گوجا اسے کھلانے کے بعد اس نے باقی گوجا اپنے منہ میں رکھ لیا تھا۔ بھونگنی حیران رہ گئی تھی۔ وہ چٹنی چٹنی آنکھوں سے ماسکی راج کو دیکھ رہی تھی ماسکی راج نے اسے دیکھا اور بولا۔  
 ”کیوں..... کیا ہوا۔“  
 ”تم نے ہمارا جھوٹا بھائی کھالیا ماسکی راج۔“  
 ”ہاں کیوں نہیں۔ اب میں تم سے الگ کب ہوں۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں سارے سنار میں سب سے زیادہ تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہارے لیے یہ سنار چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر تم مجھے نہ ملیں تو بھگوان کی سوگندہ میں آتم چھٹیا کر لوں گا۔ اب میں تمہارے بنا نہیں جی سکتا تمہیں۔ اب میں بھونگنی کی حالت بری ہوگئی۔ اس کا رنگ

سرسوں کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا، بڑی مشکل سے اس نے کہا۔  
 ”م..... مہاراج، ماسکی..... ماسکی..... میں تو اچھوت ہوں۔“  
 ”تو..... تم اچھوت ہوں گی، مگر سنار کی نظروں میں میرے لیے تم میرا جیون ہوا اور پھر میں تو اچھوتوں برہمنوں کو مانتا ہی نہیں۔ سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ ہم سب ایک جیسے ہیں اور ہم سب کو ایک دوسرے سے پریم کرنے کا حق ہے۔ ہمیں کوئی بھی ہمارے حق سے نہیں روک سکتا۔“  
 ماسکی راج جذباتی لہجے میں بول رہا تھا اور بھونگنی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ پھر وہ آہستہ سے جھکی اور اس نے اپنا سر ماسکی راج کے سینے پر رکھ دیا۔  
 ”سنار ہمیں ایک ہونے دے گا۔“  
 ”ہاں..... ہم نے اس سنار کا کچھ نہیں بگاڑا، سمجھیں، ہم نے اس سنار کا کچھ نہیں بگاڑا۔“  
 بھونگنی، ماسکی راج کے وجود میں تحلیل ہوگئی۔ نہ جانے کب تک وہ ایک دوسرے کے لمس سے آشنا رہے۔ سسے گزرتا رہا، چاند آہستہ آہستہ ابھرتا آ رہا تھا، جب پورا چاند نکل آیا تو ماسکی راج اس بے قوفی سے چونکا۔  
 ”بھونگنی تمہیں دیر تو نہیں ہو رہی۔“  
 ”ایں.....“ بھونگنی چونک پڑی۔ پھر اس کی نگاہیں آکاش پر نکلے چند رما پر پڑیں اور وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔  
 ”ہائے رام اتنی راست بیت گئی۔“  
 ”کیوں تم پریشان ہو گئیں۔“  
 ”ہاں..... میں نے بتائی کہ اسے اتنی دیر کے لیے تھوڑا ہی کہا تھا۔ اگر میں بھی اپنی سکھیوں کے پاس جاتی بھی ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے اور پھر واپس آ جاتی۔“  
 ”اب کیا ہوگا، بھونگنی۔“

”تم چتا مت کرو، میں سب ٹھیک کر لوں گی۔“  
 ”چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“  
 ”نہیں میں چلی جاؤں گی کوئی تمہیں دیکھ نہ لے، ہاؤ بھگوان تمہاری رکھشا کرے۔“ بھونگنی نے کہا اور ماسکی راج اسے دیکھنے لگا۔  
 ”پہلے تم جاؤ، جب تم میری نگاہوں سے اہل ہو جاؤں گی تب میں یہاں سے واپس آ جاؤں گا۔“  
 ”نہیں تم پہلے جاؤ۔“  
 ”نہیں بھونگنی پہلے تم جاؤ۔“ ماسکی راج ضد کرنے لگا۔ بھونگنی نے سکرا کر اسے دیکھا اور پھر اس سے واپس چل پڑی۔  
 ☆ ☆  
 دیپ راج بہت پریشان تھا۔ جب بھونگنی واپس آئی تو اس نے سخت جھجک میں کہا۔  
 ”کہاں تھی تو۔“ بھونگنی کو باپ کے اس لہجے پر رانی ہوئی تھی۔  
 ”کیا ہوا بابا۔“  
 ”میں پوچھتا ہوں کہاں تھی تو۔“  
 ”اپنی سکھی کے پاس گئی تھی۔“  
 ”جھوٹ بول رہی ہے۔“  
 ”نہیں بابا۔ میں جھوٹ نہیں بھول رہی۔“  
 ”دیکھ بھونگنی تیرا پتا ہوں، میں تیرا راج اور ہوس جانتا ہوں، مجھے صاف صاف بتا وہ کون ہے۔“  
 ”کون بابا۔“ بھونگنی خوف زدہ لہجے میں بولی۔  
 ”جس کے پاس تو گئی تھی۔“  
 ”م..... مگر بابا..... میں تو..... میں تو۔“  
 ”دیکھ بھونگنی تیرے سوا اس سنار میں میرا دل ہی نہیں ہے، بہت پریم کرتا ہوں میں تجھ سے، اسی عزت ہی کون سی ہے اچھوت ہیں ہم بھلا، اہلوں کی بھی عزت ہوتی ہے۔ زمانے

والوں نے ہماری عزت کو کھلونا بنا رکھا ہے، پر بھونگنی ہمارے اپنے من میں جو ہماری عزت ہے اسے تو باقی رہنے دے تو کیوں اس بچی کی عزت کو بھی ہم سے چھین لیتا چاہتی ہے۔ تو بتائیے کہاں گئی تھی۔“  
 ”میں کسی خراب جگہ نہیں گئی بابا۔“  
 ”کیا یہ فیصلہ کرنا تیرا کام ہے، بڑی ہوگئی ہے تیری عقل جی بڑھ گئی ہے کیا مجھے بتا، میں نے سنار دیکھا ہے۔ میں تیرے ساتھ کوئی حتی نہیں کروں گا۔ میں تو بس یہ جانتا چاہتا ہوں کہ جس نے تجھے باپ سے جھوٹ بولنا سکھا یا ہے وہ کون ہے، کیا کرتا ہے کہاں رہتا ہے، کیا حیثیت ہے اس کی یہ ساری باتیں تو مجھے بتا دے اور تو یہ بھی سن لے کہ اگر یہ سب کچھ نہ بتایا تو نے تو یا تو میں تجھے جان سے مار دوں گا یا خود آتما تھیا کر لوں گا۔ مجھے میری بات کا جواب دے۔“  
 ”بابا.....“ بھونگنی نے سر جھکا لیا۔  
 ”کون ہے وہ بتا دے، بتا دے مجھے۔“  
 دیپ راج کی آواز ابھری۔  
 ”آپ سن کر حیران ہوں گے بابا۔“  
 ”مجھے جتنا حیران ہونا تھا وہ میں نے ہو لیا۔ اب تو مجھے اس کا نام بتا دے۔“  
 ”مہاراج، ماسکی راج، بدری راج کا بیٹا۔“  
 بھونگنی نے کہا اور بوڑھے کا پورا بدن لرز گیا۔  
 اس کا منہ کھلے کھلا رہ گیا اور اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹ گئیں، دھڑکنے لگا رہا تھا۔  
 ”جھ..... جھ..... جھوٹ بول رہی ہے مجھ سے۔“ وہ بولا۔  
 ”نہیں بابا، بھگوان کی سوگندہ جھوٹ نہیں بول رہی۔“  
 ”راج کمار۔ وہ یہاں کیسے آ گیا۔“  
 ”پہلے ہی آیا تھا بابا۔“  
 ”کب۔“  
 ”پچھلی رات۔“  
 ”میں کہاں تھا۔“



”تم گئے ہوئے تھے۔“  
”تو وہ یہاں میرے گھر آیا تھا۔“  
”ہاں۔۔۔۔۔ بابا۔“  
”پھر کیا ہوا۔ کب گیا وہ۔“

”وہ یہاں آیا تھا ہماری خبر لینے اور کافی دیر بیٹھا رہا۔“  
”پاگل تھے کوئی دھوکہ تو نہیں ہوا کسی نے تجھے بے وقوف تو نہیں بنایا راج کمازماگھی راج اور پاپا کر کے ہماری اچھوتوں کی بستی میں آئیں نہ بنانا برہمن اسے جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ خود بھی برہمن کا بیٹا ہے وہ بھلا کیوں آئے گا ناممکن ناممکن۔“

”میں کہہ رہی ہوں نا بابا وہ یہاں آئے تھے۔“  
”کیوں۔۔۔۔۔ آخر کیوں۔“  
”انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ ان کے سپاہیوں کے ذریعے ہمیں نقصان پہنچا ہے۔ وہ تم سے معافی مانگنے آئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں دیپ ناتھ سے بہت شرمندہ ہوں۔“  
”میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا۔“  
”جب پھر تم خود اس سے مل لینا کل وہ پھر یہاں آئیں گے۔“  
”نچوگنی نے بڑے اعتماد سے کہا۔“  
”پھر آئے گا یہاں۔“  
”ہاں۔“

”یہاں اس نے تجھ سے کیا بات کی۔“  
”بس بابا وہ کہنے لگے کہ وہ آپ کے پاس آیا ہے۔ وہ آپ سے اس ظلم کی معافی مانگنے کا جو ہمارے اوپر ہوا ہے۔ بابا اچھوت برہمن چھتری سب ایک ذات ہوتے ہیں سب انسان ہوتے ہیں۔ کوئی انسان کسی سے کم نہیں ہوتا۔ یہ تفریق صرف برہمنوں نے پیدا کی ہوئی ہے۔“  
”ارے پاگل بنا دیا ہوگا تجھے۔ مذاق کر رہا ہوگا یہ راج کمار لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں۔“

غریبوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور ان سے ان کا سب کچھ چھین لیتے ہیں۔“  
”بابا۔۔۔۔۔ وہ ایسا نہیں ہے۔“  
”تجھے کیا معلوم پلنگی تجھے کیا معلوم۔ میں تو سیدھی بات سوچ رہا ہوں کہ اگر وہ تیری سندرتا پر مر مٹا ہے تو اب کیا ہوگا۔ وہ تجھے بے عزت کرے گا اور پھر تیری لاش کسی کنویں میں پڑی ہوگی یا کسی دریا میں بہہ رہی ہوگی۔“  
”وہ ایسا نہیں ہے بابا وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔“

”تو کیا جانے پاگل تجھے کیا پتا۔“  
”سب پتا ہے مجھے بابا میں سب جانتی ہوں۔“  
”مجھے پتا تو نے کبھی دیکھا ہے کہ یہ راج کمار لوگ کیسے ہوتے ہیں کیا کرتے ہیں۔“  
”بابا۔۔۔۔۔ اس نے ہمارے گھر میں بیٹھ کر میرے ہاتھ کے بنے ہوئے کوچے کھائے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ برہمنوں اور اچھوتوں کا فرق مٹانا چاہتا تھا۔“  
”کیا۔۔۔۔۔ کیا کچھ۔“  
”تمہاری سوگندہ بابا۔ تمہاری سوگندہ۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہی۔“  
”دیپ راج کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ نچوگنی سندرتا اور ماگھی راج نوجوان من ہار بیٹھا ہوگا پگلا کہیں کا جوان جو ٹھہری۔“

مگر اس کا انجام کیا ہوگا۔ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اچھوتوں کی کسی کو پھونک دیا جائے گا۔ ان کا نام ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جائے گا اور کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو وہ بھی نہیں سکتا کہ بددی ناتھ راج کمار کی اس حرکت کو قبول کر لیں اور پھر یہ حرکت راج کمار کی بھی ہی نہیں جائے گی۔ سارا دوش تو اچھوتوں کو ہی دیا جائے گا۔ یہ ہی کہا جائے گا کہ اچھوتوں نے سازش کر کے برہمنوں کا دھرم ٹٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن نچوگنی کو کس طرح سمجھانا اگر ماگھی

راج نے اس کے ہاں بیٹھ کر اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا ہے تو اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اپنے کبے میں مخلص ہے لیکن اس کے خلوص سے کیا ادا ہے۔ وہ نچوگنی سے اور کوئی بات نہیں کہہ سکا۔  
”کہانی میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہا جائے۔“  
”پھر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔“  
”نچوگنی یہ آگ کا کھیل ہے بیٹا تو سوچ لے آگ کا کھیل ہے۔“

”اری پاگل اب میں تجھے کیا بتاؤں برہمن اور اچھوت زمین اور آسمان کی طرح ہیں۔ یہ دھرتی اٹھ کر آسمان سے مل سکتی ہے پر یہ دونوں نہیں مل سکتے۔“  
”لے بابا یہ دھرتی اٹھ کر آسمان ملی تو یہ سارے کے سارے منٹ منٹ میں پس نہ جائیں گے۔“

”بالکل یہی بات ہے۔“  
”کیا بات ہے میں تو نہیں سمجھی۔“  
”اگر دھرتی نے اٹھا کر آسمان سے ملنے کی کوشش کی تو اس کے پیچ میں جتنے منٹ ہیں پس جائیں گے۔ دھرتی تو ہے اور آکاش راج کمار تو نے اگر راج کمار سے ناتا کرنے کی کوشش کی تو تو جانتی ہے تیرے اور راج کمار کے درمیان کون پے گا۔“  
”نہیں بابا۔“

”اچھوت ہماری ساری برادری۔“  
”لو۔۔۔۔۔ بابا ہم دونوں کے پیچ اتنی بڑی برادری کیسے پس جائے گی۔“  
”نچوگنی مصحوبیت سے بولی اور دیپ راج سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔  
”بہت دیر کے بعد اس کے ذہن میں ایک کپ آئی۔ اس نے سوچا کہ نچوگنی تو مصحوب ہے نا اگر ماگھی راج کو سمجھا جائے تو وہ ضرور اس کی بات کو مان لے گا۔ چنانچہ اس نے طے کیا کہ وہ اگلی رات سے مل کر اس سے بات کرے گا۔ البتہ اس نے اتنا ضرور سوچا تھا کہ نچوگنی کو کچھ بتانا اس بات سے اس نے سوچا۔“

”کب آئے گا وہ۔“  
”کل رات کو بابا۔“  
”کہاں۔؟“  
”گھاٹ پر۔“  
”ضرور آئے گا۔؟“

”ہاں بابا وعدہ کر کے گیا ہے ضرور آئے گا۔“  
”نچوگنی نے گردن ہلائی اور دیپ راج خاموش ہو گیا۔“

نچوگنی البتہ غر ہو گئی تھی۔ بابا کو معلوم ہو گیا تو اب بھلا پریشانی کس بات کی۔ اس دن اس نے ماگھی راج کے لیے کچھ چیزیں بھی پکاائیں جب رات ہو گئی تو پوٹلی باندھ کر خاموشی سے نکل پڑی۔  
”دیپ راج آپ بھی گھر میں نہیں تھے لیکن اب اسے مانتا بھی نہیں تھی۔ وہ گھاٹ کی طرف جارہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بڑا ہی اچھا ہے میرا بابا آخر کار وہ گھاٹ پہنچ گئی۔ آج بھی اس کے پیچھے کے فوراً ہی بعد ماگھی راج بھی آ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی آج بھی اس کے ساتھ تھے اور وہ بے چارے مصحوبت میں پھنس چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب یہ راز کھلے گا تو ان کی گردنیں کاٹ دی جائیں گی لیکن اب جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ دوستی بھی گئی اور وقاداری بھی وہ اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور ماگھی راج مسکراتا ہوا نچوگنی کے پاس پہنچ گیا۔“

”تم آ گئے۔“ وہ بولی۔  
”ہاں۔۔۔۔۔ تم کب سے انتظار کر رہی تھیں۔“  
”سدا سے۔“  
”نچوگنی نے جواب دیا۔  
”بڑی باتیں بنانا آگئی ہی نہیں تو۔“  
”تم سے باتیں جو کرنا ہوتی ہیں۔“  
”نچوگنی ناز بھرے انداز میں بولی۔  
”آؤ بیٹھیں۔“  
”چلو۔۔۔۔۔“  
”دونوں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔“  
”ہاں۔۔۔۔۔ تم بتاؤ میرا کہاں تک ساتھ دوگی تم۔“  
”ماگھی راج نے کہا۔“



94







”میں نے کہا تا دیپ چند جی مہاراج کو یہ بات ماننا ہوگی اور اگر وہ یہ بات نہیں مانیں گے تو میں یہ سب کچھ اس سے کروں گا۔ جب میں اس ریاست کا راجہ بنوں گا اور راجہ بننے کے بعد میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرا پہلا اعلان یہ ہی ہوگا کہ راجہ دربار میں اچھوتوں کو ان کا مقام دیا جائے۔ ان کے جائز مسائل سننے جائیں اور راجہ کمار ہونے کی حیثیت سے بھی میں آکے لیے ہر وہ کام کر سکتا ہوں جس کی آپ کو ضرورت ہو۔“

”اگر یہ بات ہے مامی راج جی تو ایک کام ضرور کر دیں آپ ہمارے لیے۔“ دیپ چند نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”کیسے دیپ چند جی۔“ مامی راج نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”اچھوتوں کے لیے کوئی عبادت گاہ نہیں ہے کیا یہاں کوئی مندر نہیں بن سکتا؟ ہم یہ مندر اپنے پیسے اپنی محنت سے بنائیں گے۔ بس ہمیں اس کی آگیا دے دی جائے۔ ہم دریا پار کر کے اتنی دور عبادت کرنے جاتے ہیں اور پھر مندر کی عمارت سے بہت دور کھڑے رہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے بڑی دکھ کی بات ہے۔ بہرہ تو بھی وہ اشوک نہیں سن سکے جو ہمارے دل کو روکن کرتے ہیں تو اگر ہمارا ایک مندر بنوا دیا جائے تو ہم فوراً ہی اس میں سارے انتظامات کر لیں گے اور اپنی پوجا پاٹ کرنے لگیں گے۔“ دیپ چند نے کہا اور راج کمار مامی راج گردن ہلانے لگا۔

”مندرن بن جائے گا دیپ چند جی! لیکن ابھی ایک بات کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا۔“

”کس بات کا مہاراج۔“

”یہ کہ کوئی برہمن پجاری یہاں آ کر رہے گا۔“

”ہمیں اس کی چٹا نہیں ہے مامی راج جی۔ ہم بھگوان کی مورتیاں بنا کر ان کے درشن کر لیا کریں گے۔ یہ ہی ہماری پوجا ہوگی۔ یہ ہی ہماری

عبادت ہوگی، کم از کم ہماری آنکھوں کو بھگوان کو دیکھنے کی آگیا تو ضرور مل جائے گی۔ ابھی تو ہم بھگوان کو بھی چھپ چھپ کر دیکھتے ہیں۔“ دیپ چند نے بے بسی کے عالم میں کہا اور مامی راج کا دل دھل کر رہ گیا۔

”کتنے ظالم ہیں یہ برہمن چھتری! جنہوں نے اچھوتوں سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا ہے۔ ان لوگوں کو زندگی کی ہر آسائش سے محروم کر دیا ہے۔ ان کا کوئی برہمن حال نہیں ہے۔ کوئی ان پر ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج کرنے والا نہیں ہے۔“ اس نے دیپ چند کی طرف دیکھا جو بے بسی کی تصویر بنا کر کھڑا تھا اور بولا۔

”ٹھیک ہے دیپ چند جی! مندر بن جائے گا۔ یہ مامی راج کا دچن ہے مگر مجھے ایک بات کا یقین دلائیں۔“

”کون سی بات مامی راج مہاراج۔“

”نچوگنی میری ہو جائے گی۔“ مامی راج نے پوچھا۔

”نچوگنی کو اگر آپ کے چرنوں کی دھول بن جانے کا موقع مل جائے تو یہ اس کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہوگی۔ نہ صرف اس کی بلکہ پوری اچھوت برادری کی میں سوگندھ کھاتا ہوں۔ بھگوان کی کہ اگر آپ نے نچوگنی کو اپنی جتنی بنانے کے لیے میرے پاس سندیس بھیجا تو میں اسے آپ کے پاس لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی موت اور نچوگنی کے بڑھاپے تک انتظار کرنا پڑے گا۔“

”آپ دچن دے رہے دیپ چند جی۔“

”جی ہاں میں دچن دیتا ہوں اگر اچھوت کا دچن کوئی حیثیت رکھتا ہے تو میں تمہیں دچن دیتا ہوں مامی راج جی۔“

”میں آپ کا بہت بہت شکر گزار ہوں ہاں ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور مامی راج! ضرور کرو۔“

”کیا میں نچوگنی سے مل سکتا ہوں۔“

”رات کے اندھیرے میں یا دن کی روشنی میں۔“

”اس کے لیے فی الحال رات کے اندھیرے میں مناسب ہیں۔“ مامی راج نے کہا۔

”ٹھیک ہے مجھے اس راج کمار پر دوشاں ہے جو اپنے من میں انسان کا دکھ رکھتا ہے مجھے یہ دوشاں ہے کہ اس کو مل لڑکی کو خود کشی کرنے کے لیے اور نہیں کیا جائے گا۔“ دیپ چند نے کہا اور مامی راج نے جھک کر اس کے چرن چھو لیے۔

”آپ میرے بزرگ ہیں دیپ چند جی! بھگوان کی سوگندھ آپ کی سوگندھ میں بھی شرافت اور انسانیت کے دائرے سے باہر نہیں جاؤں گا۔ اس لمحے تک جب تک نچوگنی میری دھرم پتی نہیں بن پائی۔“

”ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔“ دیپ چند نے کہا اور گردن جھکا کر واپس چلا گیا۔

نچوگنی درخت کے چھچھے چھپی ہوئی ان لوگوں کی تمام باتیں سن رہی تھی۔ لیکن ان کی باتیں سن کر اس کا من خوشی سے لرز رہا تھا۔ بدن کا پ رہا تھا۔ اس کا سارے کا سارا اور جب دیپ چند جی کا دل دور چلے گئے تو وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے راج کمار مامی راج کے چرنوں میں سر رکھ دیا۔

مامی راج نے تڑپ کر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا تھا۔

☆☆

نچوگنی کو آج گھر پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ بلکہ وہ اپنے بابا کے بارے میں جان گئی تھی۔ راج کمار مامی راج نے ہی اسے بھیجا تھا اور جب کہ وہ چلی گئی وہ اسے کھڑا دیکھتا رہا تھا۔

”رام سروپ میں دچن دے چکا ہوں اور یہ ایک راج کمار کا دچن ہے۔ کسی گھسیارے کا نہیں! مندر ضرور بنے گا۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں آپ کی تم سے یہ کہتا ہوں کہ اگر چاہو تو اس سلسلے

میں میرا ساتھ مت دو میں تمہیں اس سلسلے میں مجبور نہیں کروں گا اور نہ ہی میں تمہارے لیے کوئی پریشانی چاہتا ہوں۔“

”ارے کس پاپی کو اپنی جان کی فکر ہے مہاراج! پر یہ بھی تو سوچیں مندر کی بات کس طرح چھپی رہ سکے گی۔“

”مگر مجھے ہے۔“ رام سروپ نے جواب دیا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رام سروپ! وہ ہر صورت میں کرتا ہے اور میں ضرور کروں گا۔ اب میں تم سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کہوں گا۔ ہاں کل دن کی روشنی میں مزدور وہاں پہنچ جائیں گے۔ مندر کی جگہ کا یقین کریں گے اور پھر تعمیر کار سامان بھی وہاں پہنچ جائے گا۔“

”جیسی آپ کی مرضی راج کمار۔“ رام سروپ گردن ہلا کر بولا اور پھر خاموش ہو گیا۔ لیکن مامی راج کا عزم پختہ تھا۔ اس نے نہ جانے کہاں کہاں سے اور کن کن لوگوں کے ذریعے پچاس مزدوروں کا بندوبست کیا۔ شاہی خزانے سے انہیں بڑی رقم دلوائی اور دریا پر پہنچا دیا۔ اس نے مندر کی تعمیر کا حکم دے دیا تھا۔

اور جب مندر کی بنیاد رکھی گئی تو اچھوتوں نے ایک عظیم الشان جشن منایا۔ رات بھر وہ لوگ ناچتے گاتے رہے تھے اور مامی راج نے ان کے ساتھ جشن میں شریک رہا تھا اور نچوگنی اس کے نزدیک ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر مامی راج کی خواہش پر نچوگنی نے محبت کا رقص پیش کیا اور مامی راج اس کی ایک ادا پر پاگل ہوتا رہا تھا۔

وہ محبت بھری نگاہوں سے نچوگنی کو دیکھ رہا تھا۔ جو آئندہ اس کی جتنی بننے والی تھی! اس کا عزم تھا کہ اچھوتوں کو کسی طور اچھوت نہ رہنے دے گا۔

لیکن یہ بات زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکی۔ جب مندر کے خدو خال اجاگر ہونے لگے تو کسی اونچی ذات والے برہمن نے دریا پار سے اسے دیکھ لیا



اور آن کی آن میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی کہ اچھوتوں کی ہستی میں مندر تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ دیکھنے والوں نے تصدیق کی اور حکومت کے اہلکاروں تک یہ اطلاع پہنچا دی گئی۔ حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آ گئی اور حکومت کے اہلکاروں نے بھی دریا کے دوسرے کنارے سے زمین پر ابھرتے ہوئے مندر کو دیکھا اور دست بستہ راجہ بدری راج کے پاس پہنچ گئے۔

راج کمار بدری راج اس وقت راج پاٹ کے کاموں میں مصروف تھا۔ مہا پجاری سنگرام داس بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آنے والوں نے پہلے کچھ کہنے کی اجازت لی اور اجازت لینے کے بعد یہ روح فرسا خبر راجہ بدری راج کو سنائی گئی۔

”مہاراج اچھوتوں کی ہستی میں ایک بہت بڑا مندر تعمیر ہو رہا ہے۔ اچھوتوں نے ہماری روایات کی خلاف ورزی کی ہے۔ اچھوتوں نے برہمنوں کا مذاق اڑایا ہے۔ کیا مندر کی تعمیر کی آگیا مہاراج نے دی ہے یا اچھوتوں نے باغی ہونے کا اعلان کیا ہے۔“

راجہ بدری راج یہ سن کر غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے آنے والوں کو گھور کر دیکھا اور کرخت لہجے میں بولا۔

”تم لوگ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ تم سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے، کیا بکواس کر رہے ہو تم لوگ کس کی مجال ہے کہ دریا پار مندر تعمیر کرے۔“ راجہ بدری راج نے نفرت سے کہا۔

”یہ تو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا مہاراج کہ یہ مجال کس نے کی ہے پر مندر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں محل کی بلند یوں سے دریا پار کا نظارہ صاف نظر آ سکتا ہے۔“ آنے والوں نے کہا اور بدری راج غصے سے کھڑا ہو گیا۔

”سنگرام داس جی! کیا کہتے ہیں آپ اس

سلسلے میں۔“

”دھیرج بدری راج دھیرج۔“

”یہ دھیرج کی بات تو نہیں ہے سنگرام داس جی۔“

”دھیرج رکھنا پڑے گا بدری راج جو ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی کارن بھی ہوتا ہے پہلے کارن دیکھو پھر کام کرؤ غصہ مار کے بات پوچھو یہ ہی منٹ کی کامیابی کا راز ہے۔“

”مگر سنگرام داس جی! یہ خبر جھوٹی معلوم نہیں ہوتی۔“ راجہ بدری راج نے تیزی سے ٹپکتے ہوئے کہا۔

”تو ہم کب کہتے ہیں بالک کہ یہ خبر جھوٹی ہے؟ کب کیا ہم نے پر اس بات کا فیصلہ بھرے دربار میں نہیں ہو سکتا۔ میں چلتا ہوں اگر تمہارا من چاہے تو میرے پاس آ جانا۔ سنگرام داس کا یہ ہی کہنا ہے پہلے کارن پھر بات۔“ سنگرام داس نے کہا اور لکڑی کے کھڑاؤں کو کھٹ کھٹ کرتا ہوا دربار سے باہر نکل گیا۔

بدری راج انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ بری حالت میں اس کی لیکن سنگرام داس جو کہہ کر گیا تھا اس پر عمل کرنا انتہائی ضروری تھا۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سنگرام داس سے مشورہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گرو دیو کی بات پیچھے رہ جائے اور کوئی نقصان اٹھانا پڑے۔ چنانچہ اس نے پنڈتوں کی جانب دیکھ کر کہا۔

”خاموشی اختیار کرؤ جیسا مشورہ گرو دیو دیں گے وہی مانیں ہمیں کرنا پڑے گا ان کی مرضی کے بغیر میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

”تو مہاراج اچھوتوں کو اس تعمیر سے نہ روکا جائے۔“ آنے والوں نے پوچھا۔

”نہیں ابھی جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو سنگرام داس سے بھی ابھی تھوڑی دیر بعد ملاقات کروں گا۔ ان سے پوچھوں گا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اگر انہوں نے کوئی صحیح مشورہ دیا تو ٹھیک ہے

اس بات کی چھتا تم بالکل مت کرؤ اچھوت کسی مندر تعمیر نہیں کر سکتے۔ وہ بھی ہماری برابری نہیں کر سکتے۔“ راجہ بدری راج نے کہا اور آنے والے واپس لوٹ گئے۔

بدری راج دربار پر براہ راست کر کے محل واپس آ گیا اور پریشانی سے ادھر ادھر ٹھٹھنے لگا۔ جب کوئی بات نہ بن سکی تو وہ اپنی بیٹی کے پاس پہنچ گیا۔ شکاری باندیوں میں گھری بیٹھی ہوئی تھی۔ بدری راج کی آمد کی اطلاع یا کروہ جلدی سے اس کے سواگت کے لیے باہر نکل آئی۔ لیکن بدری راج کا چہرہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

”کیا بات ہے مہاراج۔ پریشان ہیں کیا ہو گیا کیا کسی دشمن نے حملہ کر دیا۔“

”نہیں..... نہیں شکاری کسی دشمن نے حملہ نہیں کیا۔ بس پریشان ہوں بہت پریشان ہوں۔“

”پر اس پریشانی کا کوئی کارن تو ہوگا مہاراج۔“

”ہاں..... کارن ہے اچھوتوں کو ان کی موت نے پکارا ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی ریاست سے ان کا ناپاک وجود ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں اور انہوں نے اس کی ابتدا کر دی ہے۔“

”کیا کیا ہے اچھوتوں نے۔“

”بغاوت۔“

”کیسی بغاوت۔“ رانی شکاری نے تعجب سے پوچھا۔

”بس ریاست سے بغاوت برہمنوں سے بغاوت انہوں نے وہ کام کیا ہے جو صدیوں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔“

”پر کیا ہوا ہے مہاراج کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔“ رانی شکاری نے پوچھا۔

”مندر تعمیر کر رہے ہیں شہر کہیں کے مندر۔ ابھی نہیں ہوگا شکاری۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ کبھی اپنی ذات والوں کی طرح مندر تعمیر نہیں کر سکتے۔“

”پر انہیں سوچی کیا ہے۔“ شکاری نے

پوچھا۔

”بھگوان جانے میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد سنگرام داس کے پاس جاؤں گا ان سے اس بارے میں بات کروں گا۔“

”ہاں..... ہاں..... ضرور کریں سنگرام داس ہی آپ کو سچ بات بتا سکیں گے۔“ رانی شکاری نے کہا۔ ”ویسے تعجب کی بات ہے اچھوتوں کو یہ ہمت کیسے ہوئی۔“

”سنگرام داس جی کا کہنا ہے کہ اس کا بھی کوئی کارن ہے۔“ راجہ بدری راج نے کہا۔

”پر کیا کارن ہو سکتا ہے۔“

”میرے من میں ایک ہی خوف ہے شکاری ایک ہی خوف۔“

”وہ کیا؟“

”کہیں اس میں ماگھی راج کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔“

”ماگھی راج کا..... ماگھی راج کا ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رانی شکاری حیرت سے بولیں۔

”شاید تمہیں پتا نہیں ہے شکاری۔ ماگھی راج ایک اچھوت لڑکی پر مر مٹا ہے جو بہت ہی سندر ہے۔“

”اوہ..... یہ کیسے ہوا۔ ماگھی راج اس لڑکی تک کیسے پہنچ گیا مہاراج۔“ رانی شکاری پریشانی سے بولیں۔

”شکاری اس واقعہ کو کافی دن گزر گئے ہیں ہوا یوں تھا کہ ماگھی راج ایک دن سیر کرنے کے لیے رتھ میں سوار ہوا۔ اچانک ایک جگہ ایک شہر لڑکا ماگھی راج کے رتھ کے سامنے آ گیا۔ سپاہیوں نے اس لڑکے کو مار ڈالا اسی وقت ایک خوب صورت لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے ہمارے خلاف اور راجدھانی کے خلاف ماگھی راج کے خلاف بہت کچھ کیا اور اسی لڑکی کے کارن ماگھی راج نے پھرے دربار میں کھڑے ہو کر ایسی ایسی باتیں کی تھیں کہ میرا سر ندامت سے جھک گیا تھا۔ وہ



شودروں اور برہمنوں کے فرق کو مٹانا چاہ رہا تھا۔  
اب مجھے شبہ ہے کہ کہیں اچھوتوں کی بستی میں مندر  
کی تعمیر ماحی راج ہی نہ کروا رہا ہو۔“

”اوہ..... اوہ..... تو یہ بات ہے لیکن مہا  
راج آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا کہ ماحی راج  
اس لڑکی پر مرنا ہے۔“

”میں اچھوتوں کی بستی میں جا کر دیکھا چکا  
ہوں شکاری میں راجہ ہوں پاگل نہیں ہوں راجہ اپنی  
ریت کا اگر خیال نہ رکھیں تو پھر اسے راج گدی پر  
بٹھنے کا حق نہیں ہوتا۔“

”تو آپ..... تو آج مہا راج اچھوتوں کی  
بستی میں گئے تھے۔“

”ہاں..... میں کیا تھا۔“  
”کیوں؟“

”میں نے وہاں جا کر بھوکے کو دیکھا تھا۔“  
”بھوکے کون۔“

”ارے وہی لڑکی جس کے بارے میں میں  
کہہ چکا ہوں کہ بڑی سندر ہے جب ماحی راج نے  
اچھوتوں کو برابری کا درجہ دینے کا اعلان کیا اور  
مطالبہ کیا تو مجھے اتنا ہی غصہ آیا تھا جتنا اس وقت  
لیکن سنگرام داس نے کہا کہ میں دھرج رکھوں یوں  
لگتا ہے جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہو اور خاص بات  
کے کھوج کے لیے اہم اچھوتوں کی بستی میں گئے  
تھے۔ وہاں ہم نے بھوکے کو دیکھا۔ بڑی ہی سندر  
لڑکی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں ماحی راج اس کے  
پریم کے جال میں نہ پھنس گیا ہو۔ اگر ماحی راج  
اس کے پریم میں پھنس گیا تو یوں سمجھو شکاری ہمیں یہ  
راج پاٹ چھوڑنا پڑے گا اور ہماری جو درگت ہوگی  
اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

”مم..... مگر مہا راج..... ماحی راج ایسی  
حرکت کیسے کر سکتا ہے۔ میرا بیٹا اتنا بے وقوف تو  
نہیں ہے۔“

”بے وقوف ہی نہ ہوتا سراسر تو بھرے دربار  
میں ایسی بات ہی نہ کرتا۔ خیر تم آرام کرو میں سنگرام

داس کے پاس جا رہا ہوں۔“  
راجہ نے کہا اور شکاری سے رخصت ہو کر  
سنگرام داس کے مندر کی جانب پڑا۔

☆☆☆  
ساری ریاست میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ بڑا  
سوگ پھیل گیا تھا چاروں طرف راجہ درشت راج  
طول عرصے سے حکومت کر رہا تھا۔ گو وہ زیادہ اچھا  
آدی نہیں تھا لیکن اتنا برا بھی نہیں تھا کہ اس کی  
ریاست کے لوگ اس سے نالاں ہوتے۔ وہ باہر  
کے لوگوں کے لیے برا تھا لیکن اپنی ریاست کے  
لوگوں کے لیے اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا۔  
جس سے اس کی ریاست کے لوگ اس کے خلاف  
ہو جاتے۔

راجہ درشت کے قتل ہونے کی خبر آنا فانا پوری  
ریاست میں پھیل گئی تھی۔ جس نے بھی سنا دانتوں  
میں انگلی دالی۔ سارے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گئی  
تھی کہ راجہ درشت کو اس کی بھانجی شینی نے قتل کیا  
تھا۔ شینی کو خون آلود خنجر کے ساتھ جائے واردات  
سے پکڑا گیا تھا اور اس سازش میں شینی کی ماں یعنی  
راجہ درشت کی بہن شانتی بھی شریک تھی۔

قانون بنانے والے افراد نے شینی کو قاتل  
تسلیم کر لیا تھا اور اب اس میں کسی قسم کے شک و شبہ  
کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ساری بات سامنے  
تھی۔ دربار میں مسلسل اجلاس ہو رہے تھے۔ دھرم  
راج کی حالت خراب تھی۔ راجہ درشت کی موت  
نے اس کے اوپر بہت برا اثر ڈالا تھا اور وہ کمرے  
میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔

دھرم راج کی اس حالت کے پیش نظر ویدوں  
نے منتری جی کو یہ بات بتادی تھی کہ راج کمار دھرم  
راج کو پریشان نہ کیا جائے۔ کسی کو ان سے ملنے نہ  
دیا جائے اور ان پر پہرہ لگا دیا جائے۔ چنانچہ منتری  
جی نے اس بات پر ممتی سے عمل کیا۔

اجلاس اب بھی جاری تھا اور اس میں یہ طے  
کیا جا رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔

”سب سے بڑی بات یہ ہے منتری جی! مہا  
راج کہ راج کمار دھرم راج کی بھی حالت خراب  
ہے۔ راجہ درشت مہا راج کی موت کا ان پر جو اثر  
پڑا وہ کہیں ان کی جان ہی نہ لے لے۔ اس  
لئے انہیں اس سلسلے میں پریشان نہ کیا جاسکتا۔  
راجہ درشت ابھی ان کے سر پر نہیں رکھا جاسکتا۔  
اس لیے ان کی صحت ٹھیک ہو جانے کا انتظار کرنا  
پڑے گا۔“ سالار کرن داس نے کہا۔

”ہاں..... کرن داس جی دھرم راج مہا راج  
اور راجہ درشت سے بہت پریم کرتے تھے لیکن  
وال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست بغیر راجہ کے تین  
روز سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ اس بارے میں کیا کیا  
جائے۔“ مہا منتری نے کہا۔

”اس کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے مہا راج۔“  
راجہ نے کہا۔

”وہ کیا شرمانند۔“ مہا منتری نے پوچھا۔

”ایک عارضی راج بنا دیا جائے جس میں  
راج پاٹ کے گھرانے کی حیثیت سے سارے  
اطلاعات سنبھال لیں اور جب حالات ٹھیک  
ہو جائیں راج کمار دھرم راج کی حالت بہتر  
ہو جائے تو پھر راج گدی ان کے سپرد کر دی جائے  
اور راج کٹ ان کے سر پر رکھ دیا جائے۔“ شرمانند  
نے کہا اور منتری جی گردن ہلاتے لگے پھر چاروں  
طرف دیکھ کر بولے۔

”بھائیو! شرمانند نے جو کہا ہے وہ آپ نے  
سنا ہوا گا۔ اس سلسلے میں آپ لوگوں کی کیا رائے  
ہے۔“ منتری نے پوچھا اور سب نے اس رائے  
پر اتفاق میں فیصلہ دے دیا۔

”ٹھیک ہے ریاست کے بڑے راج کٹ  
راجہ درشت کے خالی تخت پر رکھا ہوا ہے۔ آج سے  
مہا راج راج کمار دھرم راج کے نام پر ریاست کی  
حکمرانی طے کی۔ اس سے تک جب تک کہ دھرم  
راج کی اس تخت پر آ کر نہیں بیٹھ جاتے میں اس  
کا اعزاز پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر ریاست کے

کاموں کو اسی طرح چلاتا رہوں گا۔ جس طرح مہا  
راج درشت چلایا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ میرا فرض  
ہے۔“ مہا منتری کے نام کی جے جے کار کو بجھائی  
اور تاج خالی تخت پر رکھ دیا گیا۔

راجہ درشت کی ارٹھی تو بہت پہلے چلائی جا چکی  
تھی۔ شانتی اور شینی ایک قید خانے میں بند کر دی گئی  
تھی اور ان کے بارے میں اب تک کسی اجلاس  
میں کوئی بحث نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ دوسرے مسائل  
ہی اتنے شدید تھے۔

دوسری طرف شانتی اور شینی دونوں ہی حیران  
تھیں کہ ابھی تک وہ قید خانے میں کیوں ہیں۔ پوجا  
نے شانتی کو یہ بتایا تھا کہ راج کمار دھرم راج  
کمزور دل کا آدمی تھا۔ وہ پہنچ تو گیا تھا راجہ درشت  
کی خواب گاہ میں۔ مگر خون دیکھ کر برداشت نہ کر سکا  
اور بے ہوش ہو گیا۔ شانتی البتہ کسی پریشانی اور  
گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ انہیں قید ہونے  
آج تیسرا دن تھا۔

ان تینوں دنوں میں ان کے ساتھ بہت سخت  
سلوک کیا گیا تھا۔ ایک دن تو ان دونوں کو کھانے  
پینے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ اور دونوں ماں  
بیٹیوں کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ دوسرے دن صبح  
سایہوں نے انہیں جو کچھ کھانے کے لیے دیا وہ ایسا  
تھا کہ ان سے کھایا ہی نہیں گیا تھا۔  
شانتی نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو سپاہی نفرت  
سے منہ سکڑ کر چلے گئے۔

ان کی یہ کیفیت دیکھ کر شانتی کے حواس ساتھ  
چھوڑنے لگے۔ پھر ان کے ساتھ یہ ہی سلوک  
جاری رہا اور چوتھی رات کی صبح شانتی کے حواس  
پاکل جواب دے گئے۔ وہ فرش پر لمبی لمبی لیٹ گئی  
تھی۔ شینی اس کی یہ حالت دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔

”کیا بات ہے ماں تاجی کچھ طبیعت خراب ہے  
بیار ہو رہی ہو تم اس قید خانے میں۔“

”نہیں تو اور کیا۔ امرت اتر رہا ہے میرے  
شریر میں پھنس گئے تھیں یوں لگتا ہے جیسے ہماری



چالیں لائی ہو گئی ہیں۔“ شانتی نے کہا۔  
 ”کیسی باتیں کر رہی ہیں ماما جی۔ میں نہیں  
 مانتی کہ ہماری کوئی چال لائی ہو گئی ہے۔“  
 ”نہ مان شنتی، پر میرا من یہ ہی کہہ رہا ہے، میرا  
 من یہ ہی کہہ رہا ہے کہ ہم مصیبت میں پھنس گئے  
 ہیں اور اب اس مصیبت سے چھٹکارا بڑا ہی مشکل  
 ہے بڑا ہی مشکل ہے۔“  
 ”پر ماما جی تمہارا دشواش کیسے ڈول رہا  
 ہے۔“  
 ”حالات ہی ایسے ہیں شنتی، تین روز ہو گئے  
 ہیں ہمیں اس قید خانے میں بڑے ہوئے کسی نے  
 ہماری خبر لی۔ آخر دھرم راج کہاں مر گیا۔ کہاں رہ  
 گیا وہ۔“  
 ”تم..... ماما جی، تم دھرم راج کے لیے ایسی  
 بات کہہ رہی ہو۔“  
 ”تو تو پاگل ہے شنتی، بالکل بے وقوف، دھرم  
 راج اگر ہمارا دوست ہوتا تو ہمیں اتنے روز اس قید  
 خانے میں بڑا رہنے دیتا، لیکن یہاں تو آثار ہی  
 اٹلے نظر آ رہے ہیں۔“  
 ”تو اس کا مطلب ہے ماما جی، گرو سیوکھ لعل  
 کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ یہ آگیا تو انہوں نے  
 ہمیں دی تھی۔ پھر ان کو کیا ہوا۔ وہ ہماری سہانتا  
 کیوں نہیں کرتے۔“  
 ”مجھے کیا پتا شنتی، بھگوان جانے نہ جانے کیا  
 سے کیا ہو گیا۔ یہاں تو حالات ہی اٹلے ہو گئے تو  
 مجھے ساری باتیں بتا شنتی، تو مجھے پھر سے ساری  
 باتیں بتا، ورنہ میں تو بے موت ہی مر جاؤں گی۔“  
 ”کون سی باتیں بتاؤں۔“  
 ”کیا مجھے دشواش ہے کہ دھرم راج تیرے  
 پریم جال میں پھنس چکا ہے۔“  
 ”پوری طرح دشواش ہے ماما جی۔“  
 ”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ دھرم راج جی  
 میرے بنا کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے  
 گا۔“ شنتی نے جواب دیا۔

”مگر اسے ہوا کیا۔ تو نے اس سے یہ بات  
 کہہ دی تھی۔ تاکہ تو درشت راج کو قتل کرنے جا رہی  
 ہے۔“  
 ”ہاں..... ماما جی میں نے اس سے یہ بات  
 کہہ دی تھی۔“  
 ”پھر آخر وہ لوگ وہاں کیسے پہنچ گئے۔“  
 ”یہ ہی بات تو مجھے بھی پریشان کرتی ہے۔  
 ماما جی کہ تم از کم دھرم راج کو کوئی چال چلتی چاہیے  
 تھی۔ ان لوگوں کو وہاں نہ لانا چاہیے تھا۔ مگر یوں  
 لگتا ہے جیسے دھرم راج بھی بے وقوفی میں یہ حرکت  
 کر گیا۔“  
 ”بے وقوفی میں کیوں۔“  
 ”اس نے سوچا ماما جی کہ میں اپنا کام کر کے  
 واپس جا چکی ہوں گی اور اب میدان صاف ہوگا۔  
 وہ منتری اور سالار کو مہاراج کی موت کے بارے  
 میں بتا دے گا۔ تھوڑی دیر تک یہ ہنگامہ چلے گا کہ  
 درشت راج کو کس نے قتل کیا اور اس کے بعد کے  
 حالات تھوڑے عرصے کے بعد ٹھیک ہو جائیں  
 گے۔ کوئی خاص پریشانی بھی نہیں ہوگی۔“  
 ”نہیں شنتی مجھے یہ بات سچ نظر نہیں آتی۔“  
 ”کیوں ماما جی۔“  
 ”دھرم راج اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ اسے  
 یہ معلوم ہو کہ درشت راج کو قتل کر دیا گیا ہے اور وہ  
 منتری اور سپہ سالار کو لے کر وہاں پہنچ جائے، وہاں  
 پہنچنے کا تو ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے۔“  
 ”کیا ماما جی۔“  
 ”یہ ہی کہ دھرم راج رنگے ہاتھوں جے  
 پکڑا دانا چاہتا تھا۔“  
 ”نہیں ماما جی، غلط ہے۔“  
 ”تو پھر بتا مجھے شنتی ان دونوں کو لے کر آ  
 وہ وہاں کیوں پہنچا تھا۔“  
 ”میں نے بتایا ماما جی وہ یہ چاہتا ہوگا کہ  
 راجہ درشت راج کے قتل پر لوگ اس پر یا مجھ پر شبہ  
 کریں اور وہ کسی بھانے منتری اور سالار کو لے

لے آیا ہوگا کہ انہیں یہ شک نہ ہو کہ قتل دھرم  
 راج نے کیا ہے۔ وہ سمجھا ہوگا کہ میں راجہ درشت کو  
 قتل کرنے کے جا چکی ہوں گی۔ اب یہ میری بدبختی تھی  
 اسی کہ مجھے وہاں اتنی دیر لگ گئی اور میں رنگے  
 ہاتھوں پکڑا دانا چاہتا تھا۔“  
 ”نہیں شنتی میں تو بالکل بے وقوف ہے۔ یہ  
 تو کسی بھی طور دل کو ہی نہیں لگتی۔ اگر وہ اتنا ہی  
 بے وقوف ہوتا تو خود ہی اپنے ہاتھوں سے راجہ  
 درشت کو قتل کرنے پر کیوں نہ تیار ہو جاتا۔ تیرے  
 ہاتھوں سے اس نے قتل کرایا اور پھر ان دونوں کو  
 لے کر وہاں پہنچ گیا یہ اس کی چالاکی نہیں تو اور کیا  
 اس سے یہ ہی پتا چلتا ہے کہ وہ مجھے رنگے  
 ہاتھوں پکڑا دانا چاہتا تھا۔“  
 ”نہیں ماما جی! میرا دل نہیں مانتا۔“  
 ”اری دیکھتی رہ دیکھتی رہ ابھی تو تین دن  
 گزرے ہیں، آج تو چھ روز بے کچھ دن بعد یہ  
 مجھے خود سمجھ آ جائے گی تو خود کہہ گی پگلی۔“  
 ”اس نے نفرت سے کہا اور شنتی کسی گہری سوچ میں  
 اپ گئی۔“  
 اس کی آنکھوں میں اب کسی خوف و ہراس کا  
 آثار ہونے لگا تھا۔ ماں کے پنج جملوں نے اسے  
 بوڑھ کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ دل ہی دل میں دھرم  
 راج کی شخصیت کے بارے میں کچھ سوچ رہی  
 تھی۔ کائی دیر کے بعد اس نے کہا۔  
 ”ماما جی تمہاری باتیں دل کو لگتی ہیں۔ مگر.....  
 مجھے تجب ہے دھرم راج نے ایسا کیوں کیا۔“  
 ”بھگوان جانے ری بھگوان جانے اور اب تو  
 اسی کا اگر ایسی ہی بات ہے تو اب تو ہمیں جیتا  
 دانا پکڑا دانا چاہئے گا۔ ہم تو مارے گئے، شنتی ہم تو  
 مارے گئے۔“  
 ”اس میں میرا دوش نہیں ہے ماما جی۔ تم نے  
 اس کو قتل کیا، ساری باتیں کیوں نہیں کی  
 تھیں۔ آخر سیوکھ لعل جی کو یہ دشواش کیسے تھا کہ  
 دھرم راج ہمارے جال میں پھنس جائے گا۔ انہوں

نے ہی تو ہمیں بتا کر یہاں بھیجا تھا کہ ہم ایسا کریں،  
 اب وہ آکر ہماری سہانتا کیوں نہیں کرتے۔“  
 ”پتا نہیں رہی پتا نہیں۔“ شانتی نے خوف  
 زدہ لہجے میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ شنتی بھی  
 اب پریشان ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے دھرم راج سے  
 کی ہوئی ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ مگر کہیں بھی  
 اسے کسی کھوٹ کی بات نہیں مل سکی تھی۔ اگر دھرم  
 راج نے ان سے اس طرح چھٹکارا پانے کی کوشش  
 کیوں کی۔  
 اس کا ذہن بہت کچھ سوچ رہا تھا لیکن کوئی بھی  
 بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ البتہ دوسری جانب  
 ان دونوں کے خلاف پہلی بار دربار میں آواز اٹھی  
 تھی۔ کیونکہ وقت کے سب سے بڑے جرم یہی  
 دونوں تھیں۔  
 مہا منتری کی اجازت سے اس قتل کے  
 مقدمے کو اٹھایا گیا تھا اور مہاراج درشت راج کے  
 قاتلوں کے بارے میں گفتگو کی گئی، اس سے پہلے  
 کے مہا منتری راج کمار دھرم راج سے مل چکے  
 تھے۔ جن کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی۔ وہ بات  
 چیت کر سکتے تھے۔ مہا منتری جی سے اپنا پتا درشت  
 درج کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو  
 بہنے لگتے تھے۔  
 ”ہاں..... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا  
 تھا۔ مہا منتری جی اس کجنت ناگن نے میرے پتا  
 جی کو قتل کر دیا۔“  
 ”کیوں آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔“ مہا  
 منتری جی نے تشویش سے پوچھا۔  
 ”میں اس کی وجہ آپ کو بتا چکا ہوں، میں واقعی  
 شنتی سے پریم کرتا تھا اور وہ بھی مجھے جانتی تھی۔  
 میں اسے دھرم جی بنانا چاہتا تھا۔ مگر اب میں اس  
 عورت کو اپنی دھرم جی کیسے بنا سکتا ہوں۔ جو میرے  
 پتا جی کی قاتل ہو۔“ دھرم راج نے کہا۔ آنسو اب  
 بھی اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔  
 ”دن داد دھرم راج! دھن داد۔ تم چھتا مت



کرو قاتلوں کو سزا ضروری دی جائے گی۔“  
”منتری جی دھرم راج سے یہ وعدہ کر کے آئے تھے۔“ اور جب وہ واپس ملٹ کر چلے گئے تو دھرم راج کے ہونٹوں پر پرسکون مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

اور اس وقت منتری جی دھرم راج کی اجازت سے اس مقدمہ کا فیصلہ کرنے جا رہے تھے۔

سپاہی دونوں ماں بیٹوں کو لینے قید خانے کی طرف جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر تک انتظار ہوتا رہا پھر ہشتی اور شانی کو کھینٹ کر دربار میں لے آیا گیا۔ دونوں کو اس جگہ کھڑا کر دیا گیا جہاں مجرموں کو کھڑا کیا جاتا ہے۔

منتری سالار کرن داس جی اور دوسرے تمام لوگ قہر آلود نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ تب پیش کار نے مقدمہ پیش کیا۔

”ان دونوں ناگوں نے مہاراج درشت راج کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھا لیا ہے۔ ان دونوں عورتوں نے ہمارے ساتھ وشواش گھاٹ کیا ہے۔ مہاراج درشت کا۔ انہوں نے اپنی ہوس میں مست ہو کر ایسا گھٹاؤ ناجرم کیا ہے۔ منتری جی کہ ان کے گلے لگائے کر کے کتوں کے سامنے ڈال دیے جانے چاہئیں۔ یہ شانتی اور یہ اس کی بیٹی ہشتی ہے اور شانی راجہ درشت کی بہن تھی۔ حالات سے ثبوت مل چکا ہے۔ مہاراج منتری کی شانتی اپنے من میں ایک کالا ارادہ لے کر ریاست میں داخل ہوئی تھی اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیٹی ہشتی کو مہاراج دھرم راج کے ساتھ بیاہ دے اور اس طرح اپنی بیٹی کو اس ریاست کی رانی بنادے۔“

”جب اس نے دواہ کرنے کا یہ اظہار مہاراج درشت سے کیا تو انہوں نے بہن ہونے کے ناطے اس سے صاف صاف بات کر لی اور کہا کہ ان کے پتر کی شادی کہیں اور ہوگی کسی راج کمار سے یا کسی ایسی جگہ جہاں سے دھرم راج مہاراج

کو ریاست وسیع کرنے میں مدد مل سکے۔ جب مہاراج درشت نے ان ماں بیٹیوں کو نراش کر دیا تو ان کے دل میں انتقام کی آگ سلگ اُٹھی۔

انہوں نے سوچا کہ دھرم راج کو راجہ بننے کا موقع دیا جائے۔ مہاراج درشت کو قتل کر دیا جائے۔ اس طرح کام بن جائے گا۔ اس سے پہلے ہشتی دھرم راج مہاراج پر اپنا پریم جال ڈالتی رہی تھی اور یہ بات بھی میں تمام درباریوں کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ دھرم راج مہاراج بھی اس لڑکی سے پریم کرنے لگے تھے۔ وہ بھی اس سے دواہ کرنا چاہتے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنے چند دوستوں سے کر دیا تھا لیکن ہشتی نے جلد بازی سے کام لیا اور اس گھٹاؤ نے جرم کا ارتکاب کیا۔

ہشتی کو سخت ترین سزا دی جائے اور شانی بھی اس کے ساتھ ہی سزا ملنی چاہیے۔ کیونکہ شانی ان ساری حرکات میں ہشتی کے ساتھ شریک تھی۔“

پیش کار خاموش ہو گیا۔  
سارا دربار ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ شانتی چہرہ زرد تھا اور ہشتی خوف سے تھر تھرا رہی تھی۔ پھر اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”دھرم راج مہاراج کہاں ہیں۔“  
”اپنے ناپاک ہونٹوں سے راجہ دھرم راج نام نہ لے تو اس قاتل نہیں ہے کہ اپنے منہ سے اس نام لے سکے بدکار لڑکی میں نے تجھے اپنی آنکھوں سے مہاراج درشت راج پر وار کرتے دیکھا ہے تو اب کسے کسے بے وقوف بنائے گی۔“

”میں پوچھتی ہوں دھرم راج مہاراج کہاں ہیں۔“  
”اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو انہیں کیوں پوچھ رہی ہے۔“ مہاراج منتری نے کہا۔ ”اس لیے کہ انہیں اپنے پریم جال میں پھانس کر پھر ایسا کوئی کام کرائے جس سے تیرا جیون بچ جائے۔ مگر یہ ناممکن ہے قطعی ناممکن۔ دھرم راج بھی یہ پسند نہیں کریں گے۔ وہ اپنے پتا کی قاتل سے شادی کریں۔ وہ

سے پریم ضرور کرتے تھے لیکن ان کے من میں کبھی یہ احساس نہیں جاگتا تھا کہ تو ان کے پتا کو قتل کر دے اور اس کے بعد وہ تجھ سے دواہ رچائیں۔ یہ تیری ہول ہی ہشتی، یہ تیری بھول تھی۔“ مہاراج منتری نے کہا۔

”پھر بھی تم میرے لیے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے مہاراج منتری جی۔ دھرم راج جی کو بلاؤ۔ وہی میرا فیصلہ کریں گے۔“

”میں صرف تیرے لیے ایک فیصلہ کر سکتا ہوں ہشتی کہ کل صبح تجھے اور تیرے ماں کو بیچ میدان میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ آج کی رات تم لوگ گڑا لڑکھنڈ کل صبح تم دونوں کو تمہاری کرنی کا پھل مل جائے گا۔ تمہارے کالے کروتوں کا پھل۔“

مہاراج منتری جی! نے فیصلہ سنا دیا اور پوچھا چیخے لگی۔ ”نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ پانی کتنے تم ایسا نہیں کر سکتے۔ دھرم راج دھرم راج تم کہاں ہو؟ کہاں ہو دھرم راج مجھے اس پانی سے بچاؤ دیکھو انہوں نے تمہاری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر سارا کھیل ہی بدل دیا ہے۔“ ہشتی چیخ رہی لیکن فیصلہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ سپاہی اسے کھینٹ کر لے جانے لگے۔

”اے کتو! چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو میں کہتی ہوں چھوڑ دو مجھے تم سب بے وقوف ہو پاگل ہو دھرم راج دھرم راج نہیں بلکہ جگندر راج اس کا نام جگندر ہے اور مہاراج درشت کو میں نے اسی کے کہنے سے قتل کیا ہے۔ سنو مجھے چھوڑ دو پہلے مجھے دھرم راج کے پاس لے چلو۔ مجھے چھوڑ دو چھوڑ دو۔ ورنہ میں تم سب کو پھانسی پر لٹکوا دوں گی میں! تم سب کو مار ڈالوں گی۔“ وہ بری طرح چیخ رہی لیکن سپاہیوں نے اس کی چیخ کو دیکھا کہ وہ توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اسے کھینٹے رہے اور پھر ان دونوں کو قید خانے میں لے جا کر قید کر دیا گیا۔ ان کی ایک بیٹی سنی گئی تھی اور اب وہ دونوں زار و قطار رو رہی تھیں لیکن اب رونے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ چال الٹی ہو گئی

تھی۔ اس بار سکرگرم داس کا منصوبہ ناکام رہا تھا اور اس کے بعد دوسری صبح ان دونوں کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔

سولی کی طرح جاتے ہوئے ہشتی ہڈیاں بک رہی تھی لیکن اسے ایک پاگل کی ہواس سمجھا گیا۔ جو موت کے خوف سے دیوانہ ہو گیا ہو۔ یہاں تک کہ ان دونوں کی گردنیں لمبی ہو گئیں اور زبائیں باہر نکل پڑیں۔

☆☆

سکرگرم داس کے مکروہ ہونٹوں پر وہی مکروہ اور شیطانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو ان کے چہرے کا خاصا تھی۔

جسے دیکھ کر سب لوگ خوف زدہ ہو جاتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی شیطانی انداز میں مسکرا رہا تھا اور بدری راج اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ”آپ میری پریشانی کا اندازہ نہیں کر سکتے سکرگرم داس مہاراج میں سخت پریشان ہوں۔“

”محل میں گئے تھے بدری راج۔“  
”ہاں مہاراج گیا تھا۔“  
”ماگھی راج سے ملاقات ہوئی تھی۔“  
”نہیں مہاراج۔“

”اس کی ماں شکر کی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔“  
”شکر کی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“  
”کس بارے میں بدری راج۔“

”آپ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں سکرگرم داس مہاراج۔“

”کچھ نہیں کچھ نہیں بیٹھ جاؤ۔ جل پلاؤں تمہیں۔“ سکرگرم داس نے اس سے پوچھا۔  
”نہیں مہاراج میرے من کو شانتی دے دو میرے من کو شانت کر دیجئے۔ میں اب سے پہلے کبھی اتنا پریشان نہیں تھا۔ بھگوان کی سونگندھ میرا من بڑا ہی بے گل ہو رہا ہے مہاراج۔“

”ہوں..... تو تم آتما کی شانتی چاہتے ہو۔“  
”ہاں..... مہاراج۔“



”میں تمہارے بارے میں کیا گیان کر رہا تھا بدری راج“ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ کشت تمہارے اوپر کیسے آیا۔ بہت بڑا کشت ہے۔ بدری راج بہت ہی بڑا کشت کیا تم اس بات پر یقین کر سکتے ہو کہ وہ مندر اچھوتوں کی ہمت سے نہیں بنا، بلکہ انہیں ہمت دلائی گئی ہے۔“

”کس نے ہمت دلائی گئی ہے۔“  
”ایک ہی ہو سکتا ہے اور کون ہو سکتا ہے جو اس ریاست میں اتنی بڑی ہمت کر سکے۔“

”کون۔“ بدری راج نے پوچھا۔  
”ماگھی راج تمہارا بیٹا اس ریاست کا ولی عہد ہونے والا حکمران راج کمار ماگھی راج جسے اپنے اوپر بڑا ہی مان ہے۔ جو خود کو بڑا ہی مہمان سمجھتا ہے اور اس نے اچھوتوں کو برہمنوں کے ساتھ لا کھڑا کرنے کا عزم کیا ہے۔ وجہ دیا ہے اچھوتوں کو کہ انہیں ان کا مقام دیا جائے گا۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ مہاراج۔“  
”دیکھو..... بدری راج! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کو غلط مت سمجھنا۔ یہ میرے گیان کا اظہار ہوگا۔“

”نہیں مہاراج نہیں۔ بھگوان کی سونگدھ میں آپ کے گیان کا اظہار کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ مگر جو کچھ آپ کر رہے ہیں کیا یہ سب کچھ سچ ہے اگر یہ سچ ہے مہاراج تو پھر کیا ہوگا۔ ہم کیا کریں گے۔ مہاراج ہم کیا کریں گے۔“

”دھرج، دھرج، بدری راج دھرج، جو کچھ کرو پہلے سوچ لو یہ بھی سوچ لو کہ اگر ماگھی راج نے تمہاری مخالفت کی تو کیا ہوگا۔“

”کس سلسلے میں مہاراج، وہ میری مخالفت کس سلسلے میں کر سکے گا۔“

”تم مجھ سے مشورہ کرنے آئے ہونا۔“  
”جی مہاراج۔“

”میں تمہیں جو مشورہ دوں گا اس پر عمل بھی کر سکو گے۔“ سنگرام داس نے مسکراتے ہوئے

پوچھا۔

”ہاں مہاراج آپ میرا آخری سہارا ہیں۔ آپ اس سلسلے میں مجھے جو بھی مشورہ دیں گے وہ میرے لیے کارآمد ہوگا اور میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ بدری راج نے جواب دیا۔

”اور اگر تمہارے بیٹے نے تمہیں وہ سب کرنے سے روکا جو میں کروں گا، تب تم کیا کرو گے۔“

”آپ..... آپ مجھے آگیا دیں، مہاراج کہ میں اس کشت سے کسے نکل سکتا ہوں۔“

”تو پھر سنو۔“ سنگرام داس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ”سپاہیوں کو لے کر جاؤ اور دریا پار اچھوتوں کے بنائے ہوئے مندر کو گردو۔ جو اس میں رکاوٹ بنے اسے موت کے گھاٹ اتار دو یہ تمہارا پہلا کام ہے۔ اس کے بعد کا مشورہ میں تمہیں بعد ہی میں دوں گا۔“ سنگرام داس نے کہا اور بدری راج نے گردن جھکا لی۔

”ایسا ہی کروں گا مہاراج، ایسا ہی کروں گا“ لیکن اگر آپ آگیا دیں تو اس سے پہلے یہ بات معلوم کر لوں کہ مندر کی تعمیر کے پیچھے ماگھی راج کا ہاتھ ہے بھی یا نہیں۔“

”ہاں..... ہاں..... ضرور معلوم کرو ضرور معلوم کرو لیکن کچھ کرنے سے پہلے سوچنا ضروری ہے جاؤ جاؤ، معلوم کر لو۔“ سنگرام داس نے کہا اور بدری راج ان کے چرن چھو کر باہر نکل آیا لیکن وہ سخت ذہنی انتشار میں مبتلا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کھٹنا اس کے اپنے ہی بیٹے اس کے اپنے ہی خون کی لائی ہوئی ہے۔

رام سروپ نے گہرائے ہوئے انداز میں ماگھی راج کو اس خوف ناک عزم کا قصہ سنایا۔

”ہاں..... مہاراج، بدری راج نے اپنے ایک خاص آدمی کو یہ حکم دیا ہے کہ پچاس سوار لے کر دریا پار جائے اور اچھوتوں کا مندر گرا دیا جائے۔ جتنے اچھوت ہاتھ لگیں انہیں گرفتار کر لیا جائے جو

لوگ مندر گرانے میں رکاوٹ بنیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ کل صبح سے یہ کام شروع ہو جائے گا۔“  
”تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی۔“ ماگھی راج نے سرد لہجے میں پوچھا۔ اس کے چہرے پر گہرے فکر کے سائے تھے۔

”بس مجھے اطلاع مل گئی ہے اب آپ بتائیں اس سلسلے میں آپ کو کیا کرنا ہے۔“

”یہ کام نہیں ہو سکے گا رام سروپ، مندر ضرور بنے گا، مندر ضرور بنے گا میں مندر کی رکھشا کروں گا۔ مہاراج، بدری راج کے برکارے مندر کو نہیں گرا سکیں گے۔“ ماگھی راج نے کہا اور رام سروپ پریشانی سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

”پر مجھے تو بتادیں مہاراج کہ آپ کیا کریں گے، کیا سوچ رکھا ہے آپ نے اس سلسلے میں۔“  
”یہ بات کل صبح ہی گویا چل سکے کی کہ میں کیا کروں گا، ہاں تمہیں میں حکم دیتا ہوں کہ کل مجھ سے دور ہی رہنا۔ میرے قریب آنے کی ضرورت نہیں ہے جو کچھ کرنا ہوگا میں خود کروں گا۔“ ماگھی راج نے کہا۔

”جو آگیا مہاراج کی۔“ رام سروپ نے جواب دیا اور پھر دبے دبے لہجے میں بولا۔ ”لیکن مہاراج آپ کیا کریں گے۔ مجھے تو بتادیں۔“  
”نہیں بالکل نہیں، رام سروپ، بس اب تم جاؤ۔“ ماگھی راج نے کہا اور رام سروپ گردن جھکائے وہاں سے واپس چلا آیا۔

دوسری صبح راجندر سنگھ پچاس سپاہیوں کے ساتھ دریا میں اتر گیا۔ آج سورج بھی سہا سہا تھا۔ ہادلوں کے گلڑے اس پر چھائے ہوئے تھے۔ دھوپ بھی نیچے جھانکتی اور پھر خوف سے آنکھیں موند بیٹھی۔ موسم بہت اچھا تھا۔ دریا پار مندر کی تعمیر جاری تھی۔ مزدور اینٹ پر اینٹ رکھ رہے تھے اور اچھوتوں کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ ہوں، جوں مندر تعمیر ہو رہا تھا ان کی آنکھیں امید کی کرنوں سے جگمگا رہی تھیں۔

اب وہ اپنی بستی میں پوجا کریں گے۔ اب ان کا بھی ایک مقام ہوگا۔ یہ سوچ انہیں خوشی سے پاگل کر رہی تھی۔

مندر کی تعمیر میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے دیپ چند جی تھے۔ وہ سارا سارا دن ایک جگہ کھڑے ہو کر مندر کی تعمیر دیکھتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے۔ ماگھی راج کے لیے ان کے دل سے نہ جانے کتنی دعائیں نکلی تھیں۔

نچو گئی سے میل جول میں انہوں نے ماگھی راج کو کبھی نہیں روکا تھا۔ انہیں اس کے کھرے خون پر اعتماد تھا۔ اس وقت بھی وہی سب سے پہلے مندر کی طرف آئے تھے اور اپنی نگرانی میں انہوں نے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ تب ہی بلندی پر بندھی ہوئی باڑھ پر بیٹھے ہوئے مزدور چیخ پڑے اور دیپ چند گھبرا گئے تھے۔

”دیپ چند جی، دیپ چند جی، وہ وہ دیکھئے دریا پار دیکھئے۔“ اور دیپ چند چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگے پھر بولے۔

”کیا ہے اے کیوں شور مچا رہے ہو۔“

”دیپ چند جی۔ دیپ چند جی، کوئی خطرہ ہے کوئی خطرہ ضرور ہے، دیپ چند جی۔“  
”ارے مگر کیا خطرہ ہے، کیا دکھ رہا ہے تجھے۔ تو اتنی اوپر سے بیٹھ کر دیکھ رہا ہے۔ پر مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔ مجھے بتا تو سہی آخر کیا بات ہے۔“

”وہ دیپ چند جی فوج آ رہی ہے۔“

”فوج.....“ دیپ چند حیرت سے بولا۔

”ہاں..... دیپ چند جی فوج آ رہی ہے، فوجی گھوڑے سوار ادھر ہی وہ دریا پار کر رہے ہیں۔ وہ دریا میں گھوڑے اتار چکے ہیں اور اب دریا پار کر رہے ہیں۔“

”مگر کیوں، کیوں۔ کیا بدری راج، مہاراج کو اس مندر کی تعمیر کی خبر ہوئی۔“ دیپ چند نے جیسے خود سے سوال کیا۔

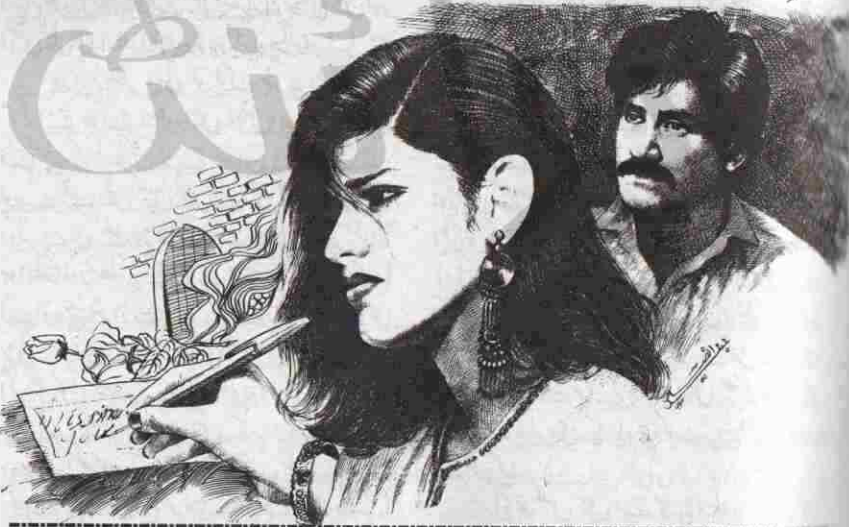


سگار خاصے قیمتی تھے مگر کیمپ کو وہ خریدنا ہی پڑے۔ اس نے ایک ایک سگار اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ اسے اس بے وجہ خریداری کا بالکل ملال نہیں ہوا مگر یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی کہ بوڑھے نیٹ نے اسے شکست دے دی تھی۔ اس نے سگار جلا کر ہلکا سا کش لیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں آنکھیں جھپکا کر بولا۔ ”بہت خوب مسٹر نیٹ! آپ نے ہماری پسندیدہ چیز ہمیں دے دی۔ مگر.....!!“

### ایک شخص کی کہانی، جس نے ایک انوکھی پیش کش کی تھی

والوں کی وجہ سے یہاں اکثر دنگا داور ہڑ بونگ بج جاتی تھی۔ اس قصبے میں یوں تو بہت سی چیزیں دوسرے قصبات سے آنے والوں کی توجہ کا مرکز تھیں مگر ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور قابل توجہ آنکشی نیل پی بارٹلٹ نامی جنرل اسٹور تھا۔ یہ اسٹور اس علاقے میں اپنی نوعیت کا واحد جنرل اسٹور تھا۔ اس جنرل اسٹور کے مالک نیٹ بارٹلٹس

**ویلو** لائن کے ساتھ ساتھ آباد تمام قصبوں میں ساؤتھ گس کو اپنی خوب صورتی، مویشیوں اور دیگر اشیائے ضرورت کا تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ یہ قصبہ جتنا خوب صورت تھا۔ یہاں کے باشندے بھی اسی قدر خوش اخلاق، منساہ اور امن پسند تھے۔ البتہ دوسرے قصبوں سے خریداری وغیرہ کے لیے آنے



جائے۔“

”نہیں مہاراج میں اکیلا نہیں جاؤں گا“ آپ نے ان سپاہیوں سے کیا نہیں گے۔“ ”جو کچھ چاہوں گا کہہ لوں گا، لیکن اگر آپ یہاں موجود رہے تو شاید کوئی بری ہی بات ہو جائے۔“

”میں پیچھے ہٹا جاتا ہوں، لیکن میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا“ مامی راج جی! میں آپ کو کسی بھی طور اکیلا نہیں چھوڑ سکتا آخر میرا بھی آپ سے کوئی سمبندھ ہے۔“

”اچھا آپ پیچھے چلے جائے“ ”مکھی راج نے راستے سے آتے سپاہیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔“

اس نے گھوڑے سے اتر کر تلواریں سونپ لی تھیں اور پھر اس نے تلوار کی نوک زمین میں دبائی اور خود سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے گھوڑے کی باگ پکڑی ہوئی تھی۔

راجہ کا بھیجا ہوا کارندہ مامی راج کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ تمام سپاہی احتراماً گھوڑے سے نیچے اتر آئے تھے۔ کارندہ حیرت سے مامی راج کو دیکھتا رہا جو مندر کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔ تب اس نے پرہیز کیا اور اپنی تلوار نکال کر نیچے رکھ دی۔ ”مامی راج کی ہے۔ آپ یہاں کیسے نظر آ رہے ہی مہاراج۔“ کارندے نے دست بستہ عرض کیا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو۔“ مامی راج نے سنگین لہجے میں اس سے پوچھا۔

اس داستان کے باقی واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

”ہوگئی ہوگی“ دیپ چند جی، مگر اب ہم کیا کریں۔“ مزدور نے کہا اور خوف سے نیچے اترنے لگا۔ ”کیا تم مندر کی تعمیر جاری نہیں رکھو گے۔“ ”سوچ لیں دیپ چند جی، بڑا خون خرابہ ہو جائے گا۔“

”ہو جائے دو آخر ہمیں بھی تو اس کا حق ملنا چاہیے کہ ہم اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر سکیں۔“ دیپ چند نے کہا۔

”جیسا آپ کہیں دیپ چند جی، اگر جان ہی دینی ہے تو ٹھیک ہے جو جھگوان کی اچھا۔“ ”ہاں..... جان دینی ہے اگر مندر نہیں بنا تو موت زیادہ بہتر رہے گی۔“ دیپ چند نے کہا۔

چند لوگوں نے ان کی باتیں مائیں اور چند نے نہیں مائیں۔ کچھ لوگ برا بکرم کرتے رہے اور کچھ خوف سے اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔ فوجیں اب دریا کے اس کنارے تک پہنچ گئی تھیں اور آہستہ آہستہ سپاہی مندر کی جانب آرہے تھے۔ دیپ چند جی تھا کھڑے تھے لیکن چند ساعت کے بعد انہوں نے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنی، ایک گھوڑا کسی دوسری طرف سے اس طرف آ رہا تھا اور چند ساعت کے بعد وہ دیپ چند جی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

”راج کمار۔“ دیپ چند کے منہ سے نکلا۔ ”آپ واپس جائے دیپ چند جی۔“ راج کمار مامی راج نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مامی راج مہاراج، مامی راج، مہاراج“ فوجیں آ رہی ہیں سپاہی اسی طرف آرہے ہیں۔“ ”مم مگر کیوں آ رہے ہیں وہ۔“ ”مندر ڈھانے۔“

”رام..... رام..... کیا وہ یہ کام کر لیں گے۔“

”ہاں..... وہ کوشش کریں گے“ دیپ چند جی۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اپنے گھر



نے یہاں جو بورڈ لگا رکھا تھا۔ اس پر تحریر تھا کہ یہاں ضروریات زندگی کی ہر چیز مل سکتی ہے۔ مال کی بخش ہوتا ہے۔ پسند آنے پر واپس بھی کیا جاسکتا ہے۔ بورڈ کی تحریر دیکھ کر ابتداء میں قصبے کے لوگوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا تھا لیکن جب انہوں نے بوڑھے نیٹ کو آزمانے کے لیے اس سے عجیب عجیب چیزیں طلب کیں اور نیٹ نے انہیں ہر چیز فراہم کر دی تو آہستہ آہستہ نیٹ کا یہ جنرل اسٹور خوب مشہور ہو گیا اور ساؤتھ کس کے علاوہ دوسرے قصبات کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بھی بن گیا۔

جوانی میں ڈھیروں دولت کمانے کے بعد جب نیٹ عمر کے آخری حصے پر پہنچا تو اسے اپنے دادا کے الفاظ یاد آئے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ ”بڑھاپا گزارنے کے لیے جنرل اسٹور سے بہتر کوئی کاروبار نہیں ہے۔“

نیٹ کا خیال تھا کہ جنرل اسٹور کے لیے ساؤتھ کس ایک نہایت موزوں جگہ ہے۔ چنانچہ اس نے ساؤتھ کس کی مین اسٹریٹ پر ایک عمارت خریدی اس کا عقی حصہ رہائش کے لیے وقف کر کے باقی تمام کمروں میں ضروریات زندگی کی وہ تمام اشیاء بھر دیں جو مارکیٹ میں دستیاب ہو سکتی تھیں اور انہی میں بی بارٹلٹ کا بورڈ بٹوا کر اوپر لگوا دیا۔

بورڈ پر نظر پڑتی تو لوگ طنز پر انداز میں مسکراتے ہوئے اسٹور میں داخل ہوتے اور کسی ایسی چیز کی فرمائش کرتے جو ان کی دانست میں پورے قصبے میں کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ مگر جب دوسرے ہی لمحے بوڑھا نیٹ خندہ پیشانی سے مسکراتا ہوا اٹھتا اور مطلوبہ شے گاہک کو پیش کر دیتا تو مجبوراً اسے وہ چیز ضرورت نہ ہونے کے باوجود خریدنا ہی پڑتی۔ وہ اپنی دوکان سے کسی کو مایوس نہیں لوٹاتا تھا اگر بھی کوئی چیز اس کے پاس موجود نہ بھی ہوتی تو وہ یہ بھی نہیں کہتا تھا کہ یہ چیز اس کے پاس نہیں ہے بلکہ وہ بڑے اطمینان سے ادھر ادھر مختلف جگہوں پر تلاش کرنے کے بعد مسکرا کر کہتا۔ ”معاف کیجئے جناب!

مال ختم ہو گیا ہے ایک دروز کے بعد آئیے ضرور مل جائے گا۔“

پھر وہ شام کو وقت مقررہ پر اسٹور بند کر کے ٹیلیگراف آفس جاتا اور شہر کی بڑی فرم کو مطلوبہ چیز کا آرڈر دے کر واپس آ جاتا اور جب ایک دروز کے بعد گاہک پھر اس کے پاس پہنچتا تو وہ اس کی مطلوبہ شے اسے پیش کر دیتا۔

ایک بار گلدکس ریسٹوراں کے مالک ایل فوسٹر نے اس کی دوکان میں آ کر بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”مسٹر نیٹ! مجھے اپنی پتلون کے لیے بریس درکار ہیں۔“

نیٹ نے حسب عادت اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر ادھر ادھر چند الماریاں دیکھنے کے بعد کہا۔ ”کیا آپ کو کسی خاص ڈیزائن کے بریسز درکار ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ایل فوسٹر نے یہ سوچ کر کہ آج وہ نیٹ کو شرمندہ کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ مسکرا کر کہا۔ ”سرخ پٹیاں سفید بکسوں اور نیلے کر اس بیچ والے۔“

نیٹ نے ذرا دیر اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سوچا پھر مسکرا کر بولا۔ ”جی ہاں میرے پاس ایسے بریسز تھے مگر اس وقت ختم ہو چکے ہیں۔ آپ اگلے ہفتے آئیے ضرور مل جائیں گے۔“

اور اگلے ہفتے اس نے ایل فوسٹر کو اپنی دوکان کے سامنے سے گزرتا دیکھا تو اسے آواز دے کر بلایا اور اس کے مطلوبہ بریسز اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ایل فوسٹر حیران رہ گیا کیونکہ بریسز بالکل اس کے آرڈر کے مطابق تھے۔ نیٹ نے ایک فیکٹری سے اسٹیل آرڈر دے کر بنوائے تھے۔ ایل فوسٹر کو یہ اس قدر پسند آئے کہ اس نے وہیں کھڑے کھڑے کوٹ اتار کر پتلون سے پرانے بریسز نکال پھینکے اور نئے پہن کر شدید سردی کے باوجود کوٹ پہنے بغیر دوکان سے نکل گیا۔

ساؤتھ کس میں نیٹ کا یہ اسٹور کھلے ابھی

بشکل تین ماہ ہوئے تھے کہ کمپ اینکے نے پہلی بار یہ لوکا بورڈ دیکھا اور ٹھک کر رک گیا۔

کمپ اینکس کا رہنے والا ایک اجڑا اور تند مزاج لوجوان تھا۔ وہ گھڑ سواری میں ماہر تھا اور تلاش معاش میں گھر سے نکل کر اس علاقے میں پہنچا تھا۔ یہاں اس نے گھڑ سواری اور کھنڈ پھینکنے کے ایک مقابلے میں حصہ لیا اور مقابلہ جیت کر ہزاروں ڈالر کا مالک بن گیا پھر اس نے اعلیٰ نسل کی گائیں خرید کر پالنے اور فروخت کرنے کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس کا موسیقی باڈہ ساؤتھ کس سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا اور اب وہ اس علاقے کا سب سے بڑا موسیقی باڈہ مانا جاتا تھا۔ کمپ اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ پورا کاروبار چلا رہا تھا۔ اس کے یہ چاروں ساتھی کام، کھیل، گھڑ سواری غرض ہر جگہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔

وہ اپنی گائیں ساؤتھ کس لانے کے بجائے ریلوے لائن کے کسی بھی ایک قصبے میں لے جا کر فروخت کرتا اور پھر رقم لے کر ضروری اشیاء کی خریداری کے لیے ساؤتھ کس کا رخ کرتا جسے وہ اپنا شہر کہا کرتا تھا۔ اس بار بھی گردوغبار کے بادل اڑتا وہ اپنے ساتھیوں کے آگے آگے ساؤتھ کس میں داخل ہوا تھا اور مین اسٹریٹ پر پہنچ کر جب اس کی نظر نیٹ کی دوکان کے بورڈ پر پڑی تو وہ ٹھک گیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے گھوڑے کی لگا میں بھینچیں تو گھوڑا الف ہو کر پچھلے دو پہروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پیچھے آنے والے چاروں ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑے روک دیے۔ کمپ نے بورڈ پر نظر جمائے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”ڈچپ۔ دوستو! کیا یہ ایک دلچسپ مذاق نہیں ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے ہولسٹر سے پستول نکالا اور تیزی سے سائن بورڈ کا نشانہ لینے کے لیے اٹھ اٹھایا تھا کہ اس کی نظر بوڑھے نیٹ پر پڑی۔ اس نے اپنی دونوں بندوق سے کمپ کا نشانہ لیا تھا وہ

دوکان کے دروازے سے ٹپک لگائے کھڑا تھا اور بندوق کے دونوں کلب اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسی حرکت ہرگز نہ کرتا۔“

نیٹ نے بار بار آب واز میں کہا۔

کمپ کا ریوالور والا ہاتھ اٹھا رہ گیا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا تمہاری بندوق بھری ہوئی ہے۔“

”اگر یہ خالی ہوتی تو میں تمہارے سامنے اس طرح نہ کھڑا ہوتا۔“ نیٹ نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں بہت دور سے آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔“

”ہوں۔“ کمپ نے آہستہ سے ہاتھ نیچے کر کے ریوالور ہولسٹر میں لگاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اس بورڈ کی تحریر میں بہت بڑا دعویٰ کیا ہے۔ تمہیں اس قسم کا مذاق کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم نے زندگی میں کبھی کوئی محقول رقم نہیں کمائی ہے۔“

”بہت کمایا ہے۔ اتنا کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہو۔ میں بھی کوئی جھوٹا دعویٰ نہیں کرتا۔ اگر تمہیں میرے دعوے پر شک ہے تو تم اسے آزما سکتے ہو۔ میں نے زندگی میں بہت کچھ سکھا ہے۔“

”اچھا تو تم اپنے دعوے کو کچ ثابت کرنے کے لیے ثبوت دے سکتے ہو۔“ کمپ نے محسوس کیا کہ دوکان کے دروازے سے ٹپک لگائے کھڑے اس بوڑھے سے الجھنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے حیرانہ سانے ساتھیوں سے کہا۔ ”اچھا دوستو! ہم اس بورڈ کو بالکل نہیں چھیڑیں گے۔“ اس نے اپنے گھوڑے کو کھینکی دی اور دوسری گلی میں شراب خانے کی طرف مڑ گیا۔

خوب جی بھر کر شراب نوشی کے بعد وہ کھانا کھانے کے لیے ایل فوسٹر کے ریسٹوران میں جا گئے۔ کھانے کے دوران کمپ کے ذہن میں پھر نیٹ کی دوکان کا بورڈ سر ابھارنے لگا۔ ”کتنا چالاک بوڑھا ہے۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”ضروریات زندگی کی ہر چیز مل سکتی ہے۔ کس قدر نمایاں الفاظ



میں لکھا ہے۔ میں بھی اسے بچی کا تاج نچا کر رہوں گا۔“ اس نے پانی کا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”آؤ دوستو! اب ذرا چل کر اس بوڑھے کو دیکھیں کہ وہ اپنے دعوے میں کس قدر سچا ہے۔“

نیٹ ابھی دوکان بند کرنے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ مویشی پالنے والوں کا یہ گروہ اس کی دوکان میں آگسا۔ وہ انہیں دیکھتے ہی دوسری مصروفیات چھوڑ کر کاؤنٹر کی دوسری طرف اپنی مخصوص جگہ آ کر کھڑا ہو گیا۔

”پہلے جو کچھ ہو چکا ہے اسے دل سے نکال دو۔“ ٹیمپ نے اسے مخاطب کیا۔ ”اور مجھے بتاؤ کہ کیا تم بوڑھے پر لکھے ہوئے دعوے میں حق بجانب ہو۔“ ”کیوں نہیں۔ بالکل سورج کی طرح یقینی طور پر۔“ نیٹ نے کہا۔ ”میں اپنے بوڑھے پر لکھے ایک ایک لفظ کا پابند ہوں۔“

ٹیمپ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اچھا تو پھر میں اور میرے ساتھی ایک ایک ڈالر والے اصلی سگار خریدنا چاہتے ہیں۔ خیال رہے ایک سگار بھی اس سے کم قیمت والا نہ ہو۔“

نیٹ نے اپنے مخصوص انداز میں سوچتے ہوئے پیشانی تھپتھپائی۔ ”میرا خیال ہے ایک ڈالر والے سگار تو ختم ہو چکے ہیں۔ مگر شاید ان کے بجائے یہ سگار تمہیں پسند آجائیں۔“ اس نے کاؤنٹر کے نیچے کی دراز سے ایک سگار کا ڈبہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ جس میں خوب صورتی کے ساتھ سنہرے ورق میں لپٹے ہوئے سگار رکھے تھے اور ان پر لکھا تھا۔ ”سپرائیکٹر اپنا کلاڈی کس۔ ایک سگار ایک ڈالر چھپس سینٹ۔“

”اوہ کمپ! اس نے تو تمہارے دانت کھٹے کر دیے۔“ اس کا ایک ساتھی بولا۔ ”اب یہ سگار تمہیں خریدنا پڑیں گے۔“ سگار خالص قیمتی تھے مگر کمپ کو وہ خریدنا ہی پڑے۔ اس نے ایک ایک سگار اپنے ساتھیوں میں

تقسیم کر دیا۔ اسے اس بے وجہ خریداری کا بالکل ملال نہیں ہوا مگر یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی کہ بوڑھے نیٹ نے اسے شکست دے دی تھی۔ اس نے سگار جلا کر ہلکا سا کش لیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں آنکھیں چمکا کر بولا۔ ”بہت خوب مسٹر نیٹ! آپ نے ہماری پسندیدہ چیز ہمیں دے دی۔ مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ اگر آج مجھے اور میرے ساتھیوں کو کاؤس بار کھانے کو بل جائے تو لطف آجائے۔“

”کیا تمہیں واقعی اس کی ضرورت ہے۔“ نیٹ نے پوچھا۔ ”یہ مشائی کمزور دل والوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے دوست!“ نیٹ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دکھائی دی۔ مگر اس کی باتوں اور حرکات سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ تذبذب کا شکار ہو۔

”ہاں ہاں میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں۔“ ٹیمپ نے کہا۔ ”اگر وہ تمہارے پاس موجود ہو تو جتنی تمہارے پاس ہے سب دے دو لیکن مجھے یقین ہے وہ تمہارے پاس نہیں ہوگی۔“

نیٹ نے پیچھے مڑ کر الماری کھولی اور سامنے کا سامان ایک طرف کر کے لکڑی کا ایک چوڑا سا بسکٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ ”اس میں چوبیس ڈبے ہیں۔ یہ لو میں نے تمہاری یہ فرمائش بھی پوری کر دی ہے۔“ نیٹ نے بسکٹ اس کے آگے سرکا کر کہا۔ ”اس کی قیمت بہتر ڈالر ہے۔“

”وہ مارا، نیٹ زندہ باد۔“ دروازے میں کھڑے ایل فو لسنر نے نعرہ مارا جو خاموش کھڑا کافی دیر سے اس دلچسپ خریداری کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ”کمپ پر خردوار تم نیٹ کو بچا نہیں دکھا سکتے۔ تمہیں ہر بار منہ کی کھانے پڑے گی۔ بہتر یہی ہے کہ اس سے مت الجھو۔ باز آؤ۔“

”ابھی تو میں شروع ہوا ہوں مسٹر ایل!“ ٹیمپ نے کہا۔ ”ابھی سے کیسے باز آؤ۔“ وہ کچھ دیر فکر مند انداز میں اپنی ٹھوڑی کھجاتا

رہا۔ پھر نیٹ کی طرف انگلی سیدھی کر کے بولا۔ ”اچھا مسٹر نیٹ! اب مجھے وہ خوب صورت بیٹیوں والی ہالون چاہیے جو مشرقی باشندے پہنتے ہیں اور جسے ماہن کر وہ عورتوں کے سامنے اٹھایا کرتے پھرتے ہیں اور ہیروں کے ٹین اور۔“

”اور ایک ٹاپ ہیٹ۔“ نیٹ نے اس کی بات کاٹی۔

”ہاں۔ ایک ٹاپ ہیٹ اور ایک سونے کی مٹھ والی چٹری اور۔“

”اور سنو۔“ نیٹ نے پھر اس کی بات اچک لی۔ ”میں تمہیں بتا دوں کہ ان میں سے ہر چیز میرے پاس موجود ہے اور اس قدر قیمتی اور اچھی ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہو لیکن میں یہ چیزیں تمہارے ہاتھ فروخت نہیں کروں گا کیونکہ تمہیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں پہن کر تم بالکل کارٹون بن جاؤ گے۔ یہ لباس تمہارے جسم پر بالکل گدھے کی جھولی معلوم ہوگا۔ مذاق اور تفریح کو بس تفریح ہی رہنے دو اور اب ہٹ جاؤ۔ میرا دوکان بند کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔“ پھر اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں کمپ کی آنکھوں میں ڈال کر کہا۔ ”تم مجھے مات نہیں دے سکو گے بیٹے! یہ خیال دل سے نکال۔“

اس کے بعد تو نیٹ اور کمپ میں باقاعدہ ٹھن گئی۔ وہ ہر روز شام کو دوکان پر ایک زلزلے کی طرح آتی جاتا اور لوگ اپنے تمام کام چھوڑ کر دوکان کے سامنے جمع ہو جاتے۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ بوڑھی کمپ نیٹ کے ساتھ کسی قسم کی شرط لگانا اطلاق حماقت ہے۔ لی لوگوں نے کمپ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر وہ اپنی ضد پراڑا رہا۔ وہ ہر بار ایک نئی فرمائش کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جنگل میں مویشی چراتے ہوئے ایک اسے کوئی خاص اور انوشی چیز یاد آتی اور وہ اس وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ گھوڑا دوڑاتا ہوا نیٹ کو دوکان پر جا بیٹھتا وہ دوکان میں داخل ہوتے ہی

کہتا۔ ”مسٹر نیٹ! کیا آپ اب بھی بوڑھے پر لکھے ہوئے الفاظ کے پابند ہیں۔“ ”بے شک۔“ میں اس کے ایک ایک لفظ کا پابند ہوں۔“ نیٹ جواب دیتا۔

پھر کمپ فرمائش کرتا اور نیٹ فوراً اس کی فرمائش پوری کر دیتا یا اس کا کہ میں موجود نہیں ہے کہہ کر اس کا آرڈر بک کر لیتا اور وقت مقررہ پر وہ چیز اس کے حوالے کر دیتا۔ ایک بار کمپ نے ایک ایسے در آمد شدہ کلاک کی فرمائش کی جس پر ایک پرندہ بیضا ہر گھنٹے بعد وقت بتانے کے لیے اپنی چونچ سے موجودہ وقت کے حساب سے گولیاں ایک خانے میں گرا دیتا ہے یہ قیمتی کلاک نیٹ نے شکاگو سے منگوا کر پانچ دن بعد کمپ کے حوالے کر دیا۔ ایک بار اس نے ایک ایسے بندر کی فرمائش کی جو زندہ رہنے کے لیے صرف ناریل کھاتا ہے۔ نیٹ کو یہ بندر فراہم کرنے میں بہت دشواری ہوئی لیکن ادھر ادھر بہت سے ٹپا کر ام دینے کے بعد آخر اس نے مطلوبہ بندر حاصل کر کے تین ہفتے بعد بندر کا بیجرہ اور ناریل کا ایک کریمٹ کمپ کے حوالے کر ہی دیا۔

اس بار تو کمپ کو پختہ یقین تھا کہ وہ بوڑھے نیٹ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گا جب اس نے دوکان میں داخل ہوتے ہی ایک ریلوے انجن کا آرڈر دیا۔ اس نے کہا۔ ”مسٹر نیٹ! انجن وہی ہو جو لائن پر ریل گاڑی کھینچتا ہے۔“ نیٹ نے لاپرواہی سے کہا۔ ”اٹھ بیہوں والا یاد اس بیہوں والا۔“

جواب میں کمپ کو بھی کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا چنانچہ اس نے کہا۔ ”دس بیہوں والا۔“ جواب میں نیٹ نے اسے مخصوص انداز میں کہا۔ ”دس بیہوں والے انجن ختم ہو چکے ہیں مگر بہت جلد آپ کو انجن مہیا کر دیا جائے گا۔“ پانچ ہفتے بعد لوگوں نے دیکھا کہ دس بیہوں والا ایک دیو بیکل ریلوے انجن نیٹ کے اسٹور کے پیچھے کھڑا ہے۔ یہ انجن اس نے ریلوے کمپنی سے



اس کی اصل قیمت سے زیادہ رقم دے کر خریدا تھا۔ کمپنی نے انجن کھول کر کئی کھوڑا گاڑیوں کے ذریعے ساؤتھ کس پمپنا تھا اور یہاں پر پھر کمپنی کے انجینروں نے اسے جوڑ کر کھڑا کر دیا تھا۔ کیپ کو اپنے مویشیوں کا ریوڑ نیلام کر کے یہ انجن خریدا پڑا تھا۔ گو بعد میں اس انجن کو ریلوے کمپنی کو معقول داموں میں فروخت کر دیا تھا مگر ریوڑ نیلام کرنے سے اس کے کاروبار کو بہت نقصان پہنچا تھا۔

اس واقعے کے بعد تو جیسے وہ پاگل ہو گیا تھا ہر وقت سوچ میں ڈوبا رہتا اور آخر ایک روز وہ ایک بالکل انوکھی چیز دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا اس نے اس کے بارے میں کافی ٹھنڈے دل کے ساتھ ہر پہلو پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس بار وہ نیٹ کو دکھانے میں یقیناً کامیاب ہو جائے گا۔ مکمل اطمینان کرنے کے بعد وہ کھوڑے پر سوار ہوا اور اسے سرپٹ دوڑاتا ہوا ساؤتھ کس میں نیٹ کی دوکان پر جا پہنچا۔ اس نے کھوڑے سے اتر کر ایک نظر بورڈ کو دیکھا اور ہنستا ہوا دوکان میں داخل ہو کر نیٹ سے بولا۔ ”کیوں مسٹر نیٹ ہر چیز۔“

”ہاں ہر چیز۔“ نیٹ نے نہایت سنجیدگی سے کاروباری انداز میں کہا۔

”اچھا تو پھر۔“ اس نے بمشکل قہقہہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس بار تمہیں ایک عدد بیوی کا آرڈر دیئے آیا ہوں۔“

دو منٹ تک نیٹ حیرت سے کمپ کو ٹکٹا رہا۔ پھر اس نے جیسے چیخ بول کر کہتے ہوئے متانت سے کہا۔ ”میں نے زندگی میں بڑی دنیا دیکھی ہے اور تقریباً ہر طرح کے لوگوں میں رہا ہوں مگر یہ بات کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی کہ ایک مویشی پالنے والا سفید فام آدمی میرے پاس عورت کو بازاری جنس جان کر ایک پاچس کی ڈبیہ کی طرح خریدنے آئے گا۔ میں تمہیں انجیل مقدس کے حوالے سے بتا رہا ہوں کہ عورت کا درجہ۔“

نیٹ بولتا رہا۔ مگر کمپ اس کے سامنے کھڑا

بڑی مستقل مزاجی سے مسکراتا رہا اسے یقین تھا کہ اس بار نیٹ کو مات ہو چکی ہے اور یہ سب باتیں اپنی شکست سے بچنے کے لیے کر رہا ہے۔

”اور میں زندگی کے کچھ دن ریڈ انڈین قبائل میں بھی گزار چکا ہوں۔“ نیٹ کہہ رہا تھا۔ ”ان انتہائی پسماندہ اور قدامت پسند افسانوں میں عورتوں کی خرید و فروخت اب بھی ہوتی ہے مگر تم جاہل اور اجڈ ریڈ انڈین نہیں ہو۔ پھر تمہارے دماغ میں یہ سودا کیسے سما گیا۔ میرا خیال ہے اس بار تم مذاق کر رہے ہو۔“

کمپ نے نفی میں سر ہلا کر احساس فتح مندی سے لرزی آواز میں کہا۔ ”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں مسٹر نیٹ! مجھے بیوی چاہیے۔“

”اچھا۔“ نیٹ نے پھل اٹھائی اور آرڈر بک اپنے پاس رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہیں کوئی خاص قسم کی بیوی چاہیے۔“

کمپ کے دل کو اچانک ایک دیچکا سا لگا اسے نیٹ سے اس بات کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ لگا بیک وہ ہنس پڑا وہ تو اب یہ اپنی چالاکی سے کسی نہ کسی طرح معاملہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ”ہاں ہاں یقیناً ایک خاص قسم کی۔“ وہ طنز سے مسکرا کر بولا۔

”میں ایک ایسی عورت چاہتا ہوں جو ہڈیوں کا ڈھانچہ نہ ہو۔ اس کے جسم پر اتنا گوشت ہو کہ وہ گداز معلوم ہوتی ہے اس کے نشیب و فراز دلکش اور متوازن ہوں سرو قامت ہو چہرہ ایسا ہو جسے دیکھ کر لوگوں میں بھگدڑ نہ مچ جائے اور۔۔۔۔۔ اور۔“

”اور بال سرخ ہوں۔“ نیٹ نے بات کاٹ کر کہا۔

”کیوں۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ اگر تم کہتے ہو تو یہ بھی ٹھیک ہے۔“ کمپ نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ ”سرخ بال مجھے نہ تو خاص طور پر پسند ہیں اور نہ ہی بالکل ناپسند۔ مگر اتنی کم سن اور نا سمجھ نہ ہو کہ وہ یہ بھی نہ جانتی کہ۔“

”کیا۔ کیا نہ جانتی ہو۔“ نیٹ نے پھر اس کی

بات کاٹ دی۔

”یہی کہ وہ کس قسم کے آزاد منش اور خود مختار آدمی کی بیوی بن رہی ہے۔“ کمپ نے جواب دیا۔ ”وہ بے حد خوب صورت اور چاہے جانے کے قابل ہو۔“

اسے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اپنی فتح مندی کے یقین سے اسے جو مسرت ہو رہی تھی وہ اسے پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور بے تحاشا ہنسنے لگا۔ ”میں۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ مسٹر نیٹ! تمہارے اسٹاک میں یہ مال ختم ہو چکا ہے کوئی بات نہیں! میں پھر اگلے جتنے آؤں گا یا آپ نہیں تو اگلے مہینے یا اس وقت جب یہ زندگی ختم ہونے کے بعد دوبارہ جنم لے لوں۔ اگر ایسا ممکن ہو تو۔۔۔۔۔ وہ مسٹر نیٹ! آخر آپ شکست کھا ہی گئے تاکہ زیادہ مناسب الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ میں آپ کی درخواست کرنے میں کامیاب ہوئی گیا۔“ پھر ہیٹ پکڑ کر تھمتے لگا ہوا باہر نکل گیا۔ اس نے ایک بار مڑ کر ہیٹ اس کی دوکان پر لگے ہوئے بورڈ کو دیکھا اور پھل کر کھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اپنے مویشیوں کے باڑے کی طرف کھوڑا دوڑاتے ہوئے وہ بے حد خاموش تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب میں باڑے میں جا کر اپنے چاروں ساتھیوں کو اپنی آج کی فرمائش اور اسے سن کر نیٹ کی کیفیت کے بارے میں بتاؤں گا تو وہ لوگ میری اہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے وہ انہیں یہ کہی بتائے گا کہ نیٹ اس کی فرمائش سن کر سناتے ہیں رہ گیا تھا اور پھر کس طرح انجیل مقدس کے حوالے دیے کر مجھے اس فرمائش سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اسے ایک ایک کر کے وہ تمام چیزیں یاد آنے لگیں جو اب تک اس کی شکست کا باعث بنی رہی تھیں ایک ڈالر پچیس سینٹ والے گارنیشنل کلاک ناریل کھانے والا بندر اور ریڈ انجن۔ آج میں نے ان تمام شکستوں کا بدلہ لگا دیا ہے۔ اب بوڑھا نیٹ اور اچانک اس کی سوچ

کا پہرہ رک گیا۔ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا اور اسی تیزی کے ساتھ اس نے اپنے گھوڑے کا رخ پھر ساؤتھ کس کی طرف موڑ دیا۔ مگر جب وہ نیٹ کے اسٹور کے سامنے پہنچا تو اسٹور بند ہو چکا تھا دروازے پر بڑے بڑے تالے لک رہے تھے۔

ایل فوسٹر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کمپ نے اس سے پوچھا۔ ”یہ نیٹ کہاں چلا گیا مسٹر ایل۔“

”نیٹ۔“ ایل فوسٹر نے اپنے نیلے سرخ اور سفید بریسز تھپتھا کر کمپ کے سامنے ان کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ”اس نے تو اب کئی دنوں کے لیے اسٹور بند کر دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی وہ ایک کھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر کہیں گیا ہے۔“

☆ ☆

نیٹ کی اچانک روانگی پر قہسے میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں تھیں۔ لوگوں کو یقین تھا کہ اس بار کمپ نے کسی بہت ہی انوکھی چیز کی فرمائش کر دی ہے اور نیٹ اس کی تلاش میں ہی نہیں گیا ہے۔ اکثر لوگوں نے اس بات پر شرط بدلی کہ نیٹ اس بار بھی کمپ کی فرمائش پورے کرنے میں کامیاب ہو جائے گا پورے ساؤتھ کس میں کمپ کی اس عجیب و غریب فرمائش کے بارے میں چرچے ہونے لگے۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ نیٹ اسٹور بند کر کے کہیں باہر چلا گیا ہے کمپ کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت فکر مند اور بے چین رہنے لگا تھا۔ دن دن بھر اضطراب کے عالم میں باڑے کے گرد چکر لگاتا اور دانتوں سے اپنے ناخن کاٹتا رہتا تھا۔ اس کے ذہن پر یہ خوف بری طرح سوار ہو گیا تھا کہ نیٹ اس بار بھی اسے مات نہ دے دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو وہ اب کسی کوندے دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ وہ ہر روز اپنا ایک آدمی ساؤتھ کس بھیج کر معلوم کرتا رہتا کہ نیٹ واپس آیا یا نہیں۔

ایک سہ ماہ اس کا وہ آدمی جو ساؤتھ کس گیا ہوا تھا تیزی سے کھوڑا دوڑاتا ہوا واپس آیا اور



گھوڑے سے کود کر اس کی طرف دوڑتا ہوا بولا۔

”کیپ! نیٹ واپس آ گیا۔“

”اکیلا آیا ہے۔“ کیپ نے بوکھلائے ہوئے

انداز میں پوچھا۔

”اکیلا تو نہیں کہا جاسکتا۔“ اس نے جواب

دیا۔ ”کوئی متحرک چیز اس کے ساتھ تھی۔“

”کیا مطلب۔ کیا کوئی جاندار چیز تھی۔“

”ہاں کیوں وہ خود اپنے پیروں سے حرکت

کر رہی تھی۔“

”کیا کوئی عورت تھی۔“ کیپ کی آواز لرزنے

لگی تھی۔

”ممکن ہے عورت ہی ہو۔ مگر یقین سے نہیں

کہا جاسکتا کیونکہ نیٹ نے اسے اپنا لمبا کوٹ اور

ہیٹ پہنایا ہوا تھا اور اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا

تھا۔“

کیپ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے

ساتھی نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”بہت پر لطف مقابلہ ہے

مگر تمہیں ہمت نہیں ہارنا چاہیے کیپ! دل مضبوط

رکھو۔ نیٹ اہم سودے جلد نمٹانے کا عادی ہے اس

لئے وہ آج دیر تک تمہارے انتظار میں اسٹور کھلا

رکھے گا۔“

شام کو کیپ ساؤتھ کس پہنچا، مگر اس کی حالت

عجیب تھی۔ وہ یوں گردن جھکائے چل رہا تھا جیسے کسی

سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہو کسی عورت کے بلے پڑ

جانے کے خوف سے اسے طرح طرح کے بھیانک

خیالات نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے ساتھی اس کی

پریشان حالی کے پیش نظر اس سے بہت پیچھے چل

رہے تھے تاکہ ان کے چہروں پر کھیننے والی مسکراہٹ

کیپ کو مشتعل نہ کر دے۔

اسٹور کے سامنے پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا۔

اس نے دوکان کے بورڈ پر نظر ڈالی پھر اپنے ارد گرد

کا جائزہ لیا بے شمار لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں

اسے کوئی ایسی عورت نظر نہیں آئی جو اس کے لیے نئی

ہو۔ پھر اس نے دوکان کے اندر کاؤنٹر کے پیچھے

مطمئن بیٹھے ہوئے نیٹ کو دیکھا اور اندر داخل ہو کر

ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر نیٹ! میں

آ گیا ہوں۔“

”اچھا۔“ نیٹ نے جواب دیا۔ اس کے

چہرے پر حسب معمول متانت چھائی ہوئی تھی اور

آنکھیں اپنے مخصوص انداز میں چمک رہی تھیں۔

”مگر تمہارا چہرہ لٹکا ہوا اور رنگ زعفران ہو رہا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خوشی کے موقع پر تم

افردہ اور طول کیوں ہو رہے ہو۔ بہر حال اس سے

پہلے کہ تم اپنا مطلوبہ مال دیکھو کہ وہ تمہارے معیار

کے مطابق ہے یا نہیں۔ میں تمہیں بتا دوں کہ تمہاری

چیز کی تلاش میں میں پورے پندرہ دن تک سرگرداں

رہا ہوں اور اس دوران میں نے تمہیں جن الفاظ

سے نوازا ہے وہ اگر تمہاری ماں سن لے تو شرم سے

زمین میں گڑ جائے۔ تم اس بار میرے پاس جو

فرمائش لے کر آئے تھے اس کے اعتبار سے تم نے

اپنی دانست میں تو میرے ساتھ ایک نہایت شاندار

مذاق کیا تھا، مگر یہ بات اچھی طرح سن لو بیٹے! کہ

میں نے بھی تمہاری کسی فرمائش کو مذاق نہیں سمجھا اور

ہر بار تمہیں اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ میں اپنے

کاروباری معاملات میں کوئی مذاق برداشت نہیں

کرتا۔ میں تمہارا مال لے آیا ہوں اور مجھے یہ بھی

یقین ہے کہ وہ تمہارے معیار سے کسی طرح بھی کم

نہیں ہے۔ چنانچہ اب تمہارے نکاح کا انتظام بھی

میں خود ہی کروں گا۔“

وہ اٹھ کر عقیقہ دروازے پر گیا جو اس کی رہائش

گاہ کی طرف کھلتا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر کیپ

سے کہا۔ ”اب میں تمہیں اس سے متعارف کراتا

ہوں۔ اس کا نام مس باربرا لارنس ہے۔ میں اسے

سینٹ لائی سے لایا ہوں اور یہ میری بیٹی ہے۔“

پھر وہ اپنے ساتھ ایک سرتا یا قیامت کو لیے

باہر نکلا۔ سرخ بالوں، گہری نیلی آنکھوں، سرد قامت

اور نہایت گداز جسم والی اس لڑکی کو دیکھ کر کیپ پر

جیسے سکتے سا طاری ہو گیا۔ وہ حیرت سے آنکھیں

بھاڑے حسن و جمال کے اس نادر شاہکار کو مکتا رہ

گیا۔ اسے دیکھ کر وہاں موجود سبھی لوگوں کی تقریباً

ایک حالت ہوئی تھی اور عورتیں رشک و حسد کے طے

بلے انداز میں منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اچانک نیٹ کی آواز نے خاموشی اور حیرت کا

یہ طلسم توڑ دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اور اب میں چاہتا

ہوں کہ تم اپنا مال اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لو۔“ اس

نے کیپ کو لڑکی کے قریب جانے کا اشارہ کیا۔

”دیکھو میں نے تمہاری بتائی ہوئی تفصیلات کا پوری

طرح خیال رکھا ہے۔ میں تم سے کچھ دن بعد اس

سلسلے میں کوئی شکایت سننا پسند نہیں کروں گا۔ آگے

آؤ اور اچھی طرح ایک ایک چیز دیکھ کر اپنا اطمینان کر

لو کہ تمہارے معیار کے مطابق ہے یا نہیں۔“

کیپ یوں اچھل کر پیچھے ہٹا جیسے اسے کرنٹ

لگ گیا ہو۔ ”اوہ نہیں۔ وہ مجھے نہیں سے بہت اچھی

لگ رہی ہے۔ اس کی ہر چیز بہت نفیس اور اعلیٰ

درجے کی ہے۔“

”تمہیں اس کے جسم کی ساخت میں کوئی عیب

یا اس کے نشیب و فراز میں کوئی کمی تو نہیں نظر آئی۔“

”اوہ..... نہیں..... نہیں..... مسٹر نیٹ! دیکھیے

اب آپ حد سے آگے نہ بڑھیے۔“ وہ بری طرح

بوکھا گیا۔

”اگر تم اس سے خوفزدہ ہو کیپ! تو پیچھے ہٹ

جاؤ۔ یہ مال میں خرید لوں گا۔“ پیچھے سے اس کے

ایک ساتھی نے آواز لگائی۔

”اپنے مال کو خوب اچھی طرح دیکھ لو تسلی کر

لو۔“ نیٹ نے پھر کہا۔ ”نہیں اس کا چہرہ دیکھ کر

لوگوں میں بھگدڑ تو نہیں مچ جائے گی۔“

”اوہ..... مسٹر نیٹ! اب جب ہو جاؤ۔“ کیپ

لے بھینٹا کر کہا۔ ”کیا کوئی بھی شخص اس پر ی چیزہ

الزین کو دیکھ کر اس میں کوئی عیب نکال سکتا ہے۔

ان فضول باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بس میں اپنی

عاقبت کی وجہ سے بری طرح پھنس چکا ہوں۔“

”پری چہرہ۔“ پہلی بار باربرا کی آواز سنائی

دی۔ ”اچھا تو یہ محسوس کر رہا ہے کہ اب یہ شخص چکا

ہے۔ اگر ایسا ہے تو اب یہ سودا ایک طرف نہ ہوگا۔“ وہ

آگے بڑھی اور کیپ کے گرد گھوم..... کمر سے پیر

تک اس کا جائزہ لینے لگی۔ وہ گہری تنقیدی نظروں

سے اسے دیکھ رہی تھی اور کیپ حیرت سے گردن کھٹا

گھما کر اسے اپنے گرد چکر لگاتے دیکھ رہا تھا۔

”انکل نیٹ!“ وہ بولی۔ ”آپ نے تو کہا تھا

وہ بہت خوب صورت ہے۔ مگر خیر ممکن ہے میلا چٹ

ہونے کی وجہ سے بے ڈھنگا اور ہوتی معلوم ہو رہا

ہو۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کا ایک موبیشیوں کا

بازہ ہے اور یہ موبیشیوں کا بڑا تاجر ہے یہ مجھے ایک

اچھا مکان اور آسودہ زندگی کی سہولتیں فراہم کر سکتا

ہے لیکن اس کی موجودہ حالت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے

جیسے یہ گائے کے اس بیمار بچھڑے کی طرح ہے جو

مخض اس خیال سے سہا ہوا ہے کہ کوئی اسے بو بول کہہ

کر چکارنے نہ لگے۔“

کیپ ایک جھرجھری لے کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”اچھا تو میں تمہیں بیمار بچھڑا دکھائی دیتا ہوں۔ اگر یہ

بات ہے تو ذرا مجھے بو بول کہہ کر چکار دو تو سہی۔“

”بو بو..... بو بو..... بو بو۔“ باربرا نے فوراً

اسے چکارا۔

کیپ نے اپنا ہیٹ اتار کر غصے سے ایک طرف

پھینکا اور پھنکارنا ہوا باربرا کی طرف بڑھا۔ مگر نیٹ

فوراً ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ ”ہوں ہوں یہ کیا

کر رہے ہو تم لوگ۔ کیوں میرے کاروبار کا ناس

کرنے چلے ہو۔ یہ کاروبار ہے۔ تم لوگوں کو اس کا

خیال رکھنا چاہیے۔ حالانکہ یہ سودا بڑا عجیب ہے

ہمیشہ دوکاندار اور گاہک مال کے بارے میں بات

چیت کرتے ہیں۔ مگر اس سودے میں خود مال بھی

بول رہا ہے۔ مگر خیر میں اسے اس لیے گوارا کر رہا

ہوں کہ یہ دوطرفہ ہے۔“ پھر وہ باربرا سے مخاطب

ہوا۔ ”باربرا! تم اس کا اچھی طرح جائزہ لے چکی

ہو۔ مجھے بتاؤ کہ کیا اب بھی تم اس سے شادی کرنے

کے لیے تیار ہو۔“



”جو شخص بیوی کو ایک آنے کے بورے کی طرح دوکان سے خریدنا چاہتا ہو اس سے شادی کرنا ایک جواہی تو ہے۔“ بار برانے جواب دیا۔ پھر وہ کیپ کے جھینپ کر سینے کے انداز سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اس خیال سے کہ آپ کی دوکان کے بورے نے ہمارے خاندانی وقار کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ میں یہ جواہی کھینے کے لیے تیار ہوں۔“

”اچھا تو پھر کیپ!“ نیٹ نے کیپ کو مخاطب کیا۔ ”مال تمہارے آرڈر کے مطابق تمہارے سامنے موجود ہے اب تم کیا کہتے ہو۔“

”کیا قیت ہے اس کی۔“ کیپ نے پوچھا اور اپنی تجسس نگاہیں بار براکے جسم پر جمادیں جو اس کی زبانی اپنی قیت کے بارے میں سن کر غصے سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔

”اس کی قیت۔“ نیٹ نے جواب دیا۔

”اس کی قیت صرف تمہاری آزادی ہے۔ وہ آزادی جو تمہیں کنوارا ہونے کے باعث حاصل ہے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ کیپ ایک عورت کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

معاملات طے ہونے کے بعد کیپ اور بار براکو نظر لوگوں کے سامنے بے حد بے تکلفی سے ملتے تھے لیکن تنہائی میں وہ ایک دوسرے سے بچنے بچنے رہتے تھے اور بھی آپس میں بات چیت تک نہیں کرتے تھے۔ شادی کے سلسلے میں اہل فوسرنے اپنے ہوٹل میں ان دونوں کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تو وہاں بھی وہ ایک دوسرے سے آنکھ ملانے سے کتراتے رہے تھے۔ پھر جب وہ ایک گھوڑا گاڑی میں کیپ کے موٹیسی باڑے کی طرف جارہے تھے تو نیٹ اپنی دوکان کے دروازے پر کھڑا انہیں جاتا ہوا دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ گوا بھی تک یہ دونوں آپس میں کھل نہیں سکے ہیں مگر ممکن ہے مکمل تنہائی میں کچھ وقت ساتھ رہ کر ایک دوسرے

کے مزاج کو سمجھ لیں اور پھر یہ بات نہ رہے۔

چند دن بعد نیٹ ان سے ملنے کیپ کے گھر گیا تو اسے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ وہ دونوں ابھی تک روز اول کی طرح ہیں اور اس کی موجودگی کا خیال کئے بغیر چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑ رہے ہیں وہ جب وہاں سے واپس آیا تو بے حد اداس اور فکر مند تھا۔ اسے بار بار خیال آتا کہ اگر وہ دوکان سے پہلے ہی دن سو بھو بھو سے کام لیتا اور زیادہ پی نہ پیدا ہونے دیتا تو شاید آج یہ صورت حال نہ ہوتی۔

آہستہ آہستہ ان دونوں کے درمیان کشیدگی کی افواہیں پورے قصبے میں گشت کرنے لگیں اور اختلافات کی یہ تلخ آگنی بڑھتی گئی کہ اب وہ دونوں ایک دوسرے کی صورت سے بے زار نظر آنے لگے کیپ زیادہ تر گھر سے باہر ایک کوشری میں پڑا رہتا اور بار برامکان کے اندر اپنے کمرے میں بند رہتی۔

ایک دن نیٹ انہیں سمجھانے کے لیے ان کے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ بار براس کی دوکان میں داخل ہوئی۔ وہ بہت پریشان حال دکھائی دے رہی تھی اور اس کا لباس بے حد میلادور خستہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ ”انکل نیٹ!“ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں اس بے ہودہ آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی مجھے اس وحشی انسان سے شدید نفرت ہوگئی ہے۔“

نیٹ اس کی پریشان حالی دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے بولا۔ ”تو کیا تم اس سے علیحدگی حاصل کرنا چاہتی ہو۔“

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ وہ سسک پڑی۔ آنسو روانی کے ساتھ اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چمپا کر بولی۔ ”اس کے سب سامنے اس کے بے حد عزت کرتے ہیں لیکن وہ جب بھی میرے پاس آتا ہے مجھے ایک وحشی معلوم ہوتا ہے۔ بالکل جنگلی اس کے ذہن پر یہ بات ہر وقت مسلط رہتی ہے کہ اس نے مجھے دوکان سے خریدا

ہے۔“

ابھی نیٹ جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر دور سے آتے ہوئے کیپ پر پڑی۔ اس نے تیزی سے بار برامکان کے اندر دھکیل دیا اور دروازہ بند کر کے کاؤنٹر پر کھڑا ہو گیا کیپ اسٹور میں داخل ہوا تو بے حد افسردہ اور تھکا تھکا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نیٹ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر نیٹ!

میں آج بار براکو آزمانے کے لیے اپنے ساتھیوں کو لے کر باڑے سے کچھ دور چلا گیا تھا۔ وہ میری غیر موجودگی میں گھر سے نکل کر یہاں آگئی ہے۔ کیا یہ کوئی اچھی بات ہے۔ مجھے اس کے اس فعل سے بہت صدمہ ہوا ہے۔ وہ بورڈم نے اب بھی دوکان پر لگا رکھا ہے کیا اب بھی تم اس پر لکھے ہوئے الفاظ کی پابندی کرتے ہو۔“

”بے شک۔“ نیٹ نے جواب دیا۔

”اس پر کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جن پر میں نے پہلے غور ہی نہیں کیا تھا۔“

کیپ نے کہا۔ ”تم نے لکھا ہے کہ مال تسلی بخش ہونے کی گارنٹی دی جاتی ہے۔“

”تو کیا.....“ نیٹ ہٹکا گیا۔ ”تو کیا تمہارا یہ آخری سودا تسلی بخش نہیں ہے۔ کیا تم مال واپس کرنا چاہتے ہو۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ کیپ نے کہا۔ ”میں مال کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ وہ تم نے بالکل میری مرضی کے مطابق دیا ہے۔ مگر افسوس مسٹر نیٹ! وہ اپنی خاندانی وجاہت کی وجہ سے بے حد مغرور ہے اور میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔ حالانکہ اب میں پہلے کی طرح خود سر نہیں رہا ہوں۔ میں اس سے کچھ نہیں مانگتا۔ میری تو اس ایک ہی خواہش ہے کہ وہ زندگی بھر میرے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو جائے۔“

نیٹ نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ ”دیکھو کیپ! اگر تم مجھ سے کوئی مشین وغیرہ خریدتے تو سب سے

پہلے اسے چلانے کی ترکیب بھی معلوم کرتے ورنہ وہ مشین تم سے نہیں چل سکتی۔“

”ہاں یقیناً ایسا ہوتا اور اسے چلانے کا طریقہ مجھے اچھی طرح ذہن نشین کرنا پڑتا۔“ کیپ نے اتفاق کیا۔

”اب تم نے مجھ سے ایک بیوی تو خرید لی مگر تم اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزارنے کا طریقہ معلوم کیے بغیر اسے لے کر چلے گئے۔“

”ہاں۔ یہ واقعی میری غلطی تھی۔“ کیپ نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

”اب میں تمہیں بیوی کے ساتھ خوش گوار زندگی گزارنے کے چند اصول بتاتا ہوں انہیں اچھی طرح ذہن نشین کرو۔ بہت معمولی سی بات ہے۔ تم اسے ہر روز دن میں کم از کم تین بار مختلف طریقوں سے بتاؤ کہ تم اس سے بید محبت کرتے ہو۔ اس کے ساتھ ہی ہر روز تین مختلف انداز سے یہ سمجھانے کی کوشش کرو کہ تم بہت حسین ہو اور اس کا اور تمہارا جوڑا لوگوں کے لیے باعث رشک ہے۔ ہر بات بالکل صاف اور کھلے دل سے کہو اس میں جھوٹ یا عیاری شامل نہ ہو۔“ پھر اس نے چپکلے کرے کا دروازہ کھولا اور کیپ کو اندر دھکیل دیا اور دروازہ بند کر کے تھوڑی دیر دروازے سے کان لگائے کھڑا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک پرسکون مسکراہٹ ابھرا آئی اور وہ وہاں سے ہٹ کر کاؤنٹر پر آ گیا۔ ذرا دیر بعد اس نے اپنے حساب کتاب کے رجسٹر سے نظریں اٹھا کر دیکھا تو کیپ اور بار برامکان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے محبت سے مسکراتے ہوئے دوکان سے باہر جا رہے تھے۔ نیٹ مسکرا کر بڑبڑایا۔

”خدا کا شکر ہے۔ اب چند سال بعد میری دوکان میں ننھے ننھے بچے شرارتیں کرتے نظر آیا کریں گے۔“

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽

✽ ✽ ✽



کچھ دیر بعد ہی وہ جیل کی چار دیواری سے باہر نظر آ رہے تھے۔ ان کا رخ گھنے درختوں کی طرف تھا جن کے درمیان سے ایک پتلی سی سڑک گزرتی تھی اور وہ اپنی تمام تر جسمانی قوت کو ٹانگوں میں سمیٹے ہوئے دوڑ رہے تھے۔

### ایک شخص کا قصہ جو لالچ میں آ گیا تھا

”چوری کرنا بھی کوئی کارنامہ ہوا۔ خدا کے بندے اگر جیل ہی آنا تھا تو صحیح معنوں میں کوئی کارنامہ انجام دے کر آتے۔ دو چار کوئل ہی کر دیا ہوتا۔“

”قتل!“ شیدو کے حلق سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

”اور کیا“ اس سے کم تر درجے کے جرم میں جیل آنا قید خانے کی بھی تو بین ہے۔ مجھے دیکھو۔ انسانی جانوں کی اہمیت میری نظروں میں حقیر کیڑے مکوڑوں کے برابر بھی نہیں ہے۔ اب تک درجنوں کو مسل چکا ہوں۔ مگر اس کے باوجود کبھی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھا۔ اس دفعہ تو دراصل ستارے ہی گردش میں آ گئے تھے۔ ورنہ مگر خیر تم کیسے بد معاش ہو کر جرم کرنے بھی چلے تو ایک چوری کا اور وہ بھی راز نہ رہ سکی۔ شاید اس لائن میں سنے ہو۔“

”ہاں“ میں نے پہلے کبھی کوئی بڑی واردات نہیں کی۔“

”گویا گدھے ہو بالکل۔“ جنگل قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ چند لمحے تک ہنستا رہا پھر بولا۔ ”کیا چوری کی کوئی بڑی واردات کر کے آئے ہو

پولیس یہ پتہ چلانے میں کامیاب تو نہیں ہو سکی کہ شیدو نے مسروقہ مال کا کیا کیا۔ تاہم وہ عدالت میں اس پر جرم ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ لہذا عدالت نے شیدو کو سات سال کے لیے جیل بھیج دیا۔

جیل پہنچ کر شیدو کی ملاقات جن دوسرے مجرموں سے ہوئی ان میں جنگل بھی تھا۔ لہذا ”ملاقات و مکار اور پھر تیل۔ اسے قتل کے الزام میں سزا ہوئی تھی۔ شہر کے مشہور بد معاشوں میں سے تھا اور اس کی یہ بد معاشی جیل میں بھی چل رہی تھی۔ وارڈ کے سارے قیدیوں کا چوہدری بنا بیٹھا تھا۔

شیدو کو تسخیرانہ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”تمہارا نام کیا ہے دوست۔“

”رشید یا دوست شیدو کہتے ہیں۔“

”چوری کے جرم میں آئے ہو۔“

”ہاں۔“ شیدو نے اثبات میں جواب دیا

اور سر جھکا لیا۔

جنگل کے ہونٹوں پر مٹھکے خیز اور ملامت

آئینہ مسکراہٹ ابھری آئی۔

”لعنت ہو تم پر۔“ وہ منہ بتا کر بولا۔

”ت۔“

شیدو کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”میں جانتا کہ تم اسے بڑی واردات کہو گے یا کوئی لیکن میں نے اتنا بڑا ہاتھ کبھی نہیں مارا۔

”دس لاکھ کی مالیت کے ہیرے تھے۔“

”دس لاکھ کی مالیت کے!“ جنگل کی آنکھوں میں ایک تیز چمک جاگ اٹھی۔ ”کیا تم

کہہ رہے ہو دوست۔“

”سو فی صدیج۔ ان کی مالیت دس لاکھ سے کم نہیں ہو سکتی۔“ شیدو فخریہ انداز میں مسکرایا۔

”دس لاکھ بہت ہوتے ہیں مگر کیا تم نے پولیس کے حوالے کر دیا۔“

”بہشت! اگر تم پرانے گھاگ ہو تو میں نے

کبھی کو لیاں نہیں کھیلیں۔ میں بزدل ضرور ہوں

لیکن پولیس کی یار پیٹ میری زبان نہیں کھلوا سکتی۔

”اگر وہ مجھے قتل کرنے کو تیار ہو جاتے تو اور بات

کی مگر ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔“

”ہم۔“ جنگل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ

پھیلی آئی۔

شیدو کی جھجک اب بڑی حد تک دور ہو چکی

تھی۔ چنانچہ اس نے مزے لے لے کر اور بڑے فخر کے ساتھ جنگل کو اپنے کارنامے کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔ جنگل بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا مگر جب بات ہیروں کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچنے لگی تو شیدو پر اسرار طور پر خاموش ہو گیا۔

”خاموش کیوں ہو گئے۔“ جنگل بے چین ہو کر بولا۔ ”بیان جاری رکھو۔ پھر تم نے ان ہیروں

قیمت ہیروں کو کس جگہ پوشیدہ کیا۔“

”ایک خاص جگہ جس کے بارے میں مجھے

افسوس ہے کہ تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”کیوں۔“ جنگل نے تیوریاں چڑھا کر

پوچھا۔ ”تم مجھے بے ایمان سمجھتے ہو۔ تمہارا خیال

ہے کہ میں جیل سے فرار ہو کر ان ہیروں پر قبضہ کر

لوں گا اور دیکھتے رہ جاؤ گے۔“ خاموش ہو کر اس

نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”تم احمق ہو میرے دوست میں اس چار

دیواری سے اپنی مرضی کے مطابق فرار ضرور ہو

سکتا ہوں لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ شیر محض اپنے

کے ہوئے شکار سے ہی بھوک مٹانا پسند کرتا

ہے۔“ اس نے چند لمحوں کے لیے خاموشی اختیار

کر لی۔

جنگل قہقہہ مار کر

ہنس پڑا۔ چند لمحے تک ہنستا رہا پھر بولا۔ ”کیا

چوری کی کوئی بڑی واردات کر کے آئے ہو





کر لی پھر بولا۔ ”میں کوئی گھنیا درجے کا بد معاش نہیں ہوں۔ میرے میری کمزوری ضرور ہیں مگر ان کے حصول کی خاطر میں اپنی سچ سے نیچے آنا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ شیدو جنگل کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر نظریں چراتا ہوا بولا اور جنگل کے ہونٹوں پر خفیف سی عیارانہ مسکراہٹ ابھری آئی۔ شیدو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرم اور دوستانہ لہجے میں اس نے کہا۔

”اگر تمہارا یہ مطلب تھا تو بھی میں برا نہیں مانوں گا۔ ظاہر ہے کہ تم شیر جنگل کو نہیں جانتے کیا تمہارے دل میں ان ہیروں کے حصول کی خواہش نہیں جن کی مالیت بقول تمہارے دس لاکھ روپے ہے۔“

”میں انہیں حاصل کر چکا ہوں۔“ ایسی صورت میں تمہیں ان سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

”میں کئی بار سوچ چکا ہوں لیکن ظاہر ہے کہ فی الحال یہ ممکن نہیں۔ مجھے سات سال کی سزا ہوئی ہے۔ یہ مدت گزرنے کے بعد ہی کچھ کر سکتا ہوں۔“

”تم احمق ہو۔“ جنگل نے منہ بنایا۔ ”کیا مطلب۔“ شیدو نے اس کی طرف چونک کر دیکھا۔

”سات برس کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ دس لاکھ کی مالیت کے وہ ہیرے اس قدر طویل مدت تک محفوظ ہی رہیں ممکن ہے کوئی اس مدت سے پہلے ہی ان تک پہنچ جائے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اتنے دن زندہ نہ رہ سکو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اس سے پہلے نہیں مرو گے۔“

”موت کا کیا بھروسہ ہے۔ کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔“ شیدو نے کمزور لہجے میں جواب دیا اور اس کے چہرے پر تاریک پرچھائیاں لہرائے لگیں۔ جنگل نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”بالکل ٹھیک کہاتم نے موت کا کوئی بھروسہ نہیں چنانچہ عقلمند لوگ جو کچھ انہیں کرنا ہوتا ہے اس کی آمد سے پیشتر ہی گزرتے ہیں۔“

”لیکن جب تک سزا کی مدت پوری نہیں جاتی، میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”بہت کچھ کر سکتے ہو۔ مثلاً جیل سے فرار ہو سکتے ہو۔ اس کے بعد ہیروں کے حصول کی کوشش کر سکتے ہو اور پھر باقی زندگی کسی اور ملک میں بھی عزت و وقار کے ساتھ گزار سکتے ہو۔ آدی کہا نہیں کر سکتا۔ شرط یہ ہے کہ بزدل اور کم ہمت لوگوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیچارہ ہو اور مایوسیوں کو قریب نہ آنے دے۔“

شیدو کی آنکھوں میں ایک تیز چمک جاگ اٹھی۔ ”کیا جیل سے فرار ہونا آسان ہے۔“

”نہیں۔ بہت مشکل اور خطرناک کام ہے۔ مگر ناممکن ہرگز نہیں۔“

”میں مشکلوں اور خطرات کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے بتاؤ کہ اس مخفی چار دیواری سے کس طرح رہائی کی جاسکتی ہے۔“ شیدو نے بتائی کا مظاہرہ کیا۔ پھر اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اگر تم میرا یہ کام کر دو دوست، تو میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔ یہی نہیں بلکہ ایک چوتھائی مالیت کے ہیرے بھی تمہیں دے دوں گا۔ بولو کیا خیال ہے۔“

”میں سوچوں گا۔“

”اس طرح نہیں وعدہ کرو۔ تمہارے لیے جیل سے رہائی حاصل کرنا یقیناً کوئی بہت زیادہ مشکل کام نہیں ہو سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جب چاہوں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں۔ جیل کی دیواریں اور محافظ کم از کم مجھے فرار ہونے سے نہیں روک سکتے۔ مگر تمہارے ساتھ یہ کام خاصا مشکل ہوگا۔ تاہم گھبراؤ مت۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد تمہیں رہائی مل جائے گی۔“ جنگل نے مسکراتے ہوئے

دکھانا نہ چھپایا اور دوسری طرف مڑ گیا۔ آخر آٹھویں روز جنگل نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا پختہ فیصلہ کیا۔ وارڈ میں کام کرنے والے جیل کا سارا عملہ اسے بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔ سنتری اس سے بڑی دیر تک کپ کپ کرتے رہتے تھے۔ جنگل ان سے سگریٹ بھی کھانے کی لیا کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ انہیں جلی کی بوتلی سنا دیا کرتا تھا اور سنتری محض دانتوں کی آواز کے رہ جاتے تھے اس لیے بھی کہ جنگل نے کوآنے والے سارے شہر کے چھپے ہوئے معاش ہوا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ ان سے انہیں خاصی موٹی موٹی رقمیں وصول ہوتی تھیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جیل میں جنگل کی مراہٹ قیدیوں کے علاوہ عملے کے چھوٹے افراد پر بھی چلی تھی۔

اس رات وارڈ کے سنتری نصف شب کے بعد ہی راؤنڈ پر نکلے اس نے ان کے جمدار کے کمرے پر کڑکڑاتے ہوئے آگے بڑھ کر جیل جمدار سے باتیں کرنے لگا۔ چند منٹ کے بعد جب سنتری اس جگہ سے کافی آگے نکل گئے، اس نے جمدار سے سگریٹ طلب کیا۔ اس نے راتقل سلاخوں سے نکال کر کھڑکی کی اور اس میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ ٹولنے لگا۔ جنگل کو اس کی موقع کی تلاش تھی۔ اس نے سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر ایک ہاتھ سے جمدار کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگی پر ایک طاقتور گھونہ رسید کر دیا۔ یہ سارا کام ایسا ہی چچا حلقا تھا کہ جمدار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے بیک وقت ساتوں رنگ نکلنے لگے اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن ایک جھٹکا سے ٹکڑی ہو گئی۔

جنگل کے ہونٹوں پر بے حد زہریلی اور مسکراہٹ تیز رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے

جمدار کو سلاخوں سے نکال کر ایک ہاتھ سے جمدار کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگی پر ایک طاقتور گھونہ رسید کر دیا۔ یہ سارا کام ایسا ہی چچا حلقا تھا کہ جمدار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے بیک وقت ساتوں رنگ نکلنے لگے اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن ایک جھٹکا سے ٹکڑی ہو گئی۔

جنگل کے ہونٹوں پر بے حد زہریلی اور مسکراہٹ تیز رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے

جمدار کو سلاخوں سے نکال کر ایک ہاتھ سے جمدار کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگی پر ایک طاقتور گھونہ رسید کر دیا۔ یہ سارا کام ایسا ہی چچا حلقا تھا کہ جمدار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے بیک وقت ساتوں رنگ نکلنے لگے اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن ایک جھٹکا سے ٹکڑی ہو گئی۔

جنگل کے ہونٹوں پر بے حد زہریلی اور مسکراہٹ تیز رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے

جمدار کو سلاخوں سے نکال کر ایک ہاتھ سے جمدار کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگی پر ایک طاقتور گھونہ رسید کر دیا۔ یہ سارا کام ایسا ہی چچا حلقا تھا کہ جمدار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے بیک وقت ساتوں رنگ نکلنے لگے اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن ایک جھٹکا سے ٹکڑی ہو گئی۔

جمدار کو سنبھالے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کی چٹنی کو ٹٹولنا شروع کیا اور اس کا ہاتھ جلد ہی چابیوں کے پچھے تک پہنچ گیا۔ چابیاں حاصل کر کے اس نے جمدار کا بے ہوش جسم چھوڑ دیا اور کچھے میں اس چابی کو تلاش کرنے لگا جس کی مدد سے اس کی کھڑکی کا دروازہ کھولنا ممکن تھا۔ جنگل کے باہر دونوں ہاتھ نکال کر اسے تالا کھولنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ وہ کھڑکی سے باہر نکلا اور سنتریوں کی نظروں سے بچتا ہوا تیزی کے ساتھ شیدو کی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اس کے انتظار میں بڑی بے چینی کے ساتھ جاگ رہا تھا۔ جبکہ اس کے تینوں ساتھی نیند میں غرق تھے۔ جنگل نے دوسرے چابی کی مدد سے شیدو کی کھڑکی کا دروازہ کھولا اس کے نکلنے کے بعد دوبارہ تالا لگایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگا۔

وہ اس طرف پہنچے جدھر عملے کو کارڈر تھے۔ اس طرف کے دروازے پر کل دو سنتری راقطیں سنبھالے اونگھ رہے تھے۔ وہ محتاط انداز میں چلتے ہوئے ان کی پشت پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد سنتریوں کو جھینسلے کا موقع نہ ملا۔ راقطیں اس سے پہلے ہی ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں اور وہ دروازے کے قریب ہی کھٹے ہوئے درختوں کی طرح ڈھیر ہو گئے۔

کچھ دیر بعد ہی وہ جیل کی چار دیواری سے باہر نظر آ رہے تھے۔ ان کا رخ کھٹے درختوں کی طرف تھا جن کے درمیان سے ایک پتلی سی سڑک گزرتی تھی اور وہ اپنی تمام تر جسمانی قوت کو ٹانگوں میں سیٹھے ہوئے دوڑ رہے تھے۔

چند منٹ بعد انہوں نے جیل کے سائرین کی آواز سنی۔ غالباً سنتریوں کو جمدار کا بے ہوش جسم مل گیا تھا اور ان کے فرار ہونے کی خبر جیل پھیل چکی تھی اور خطرے کا سائرہ بجا کر دوسروں کو بھی آگاہ کیا جا رہا تھا۔ چند لمحے بعد ہی جیل کے ٹاور

جنگل کے ہونٹوں پر بے حد زہریلی اور مسکراہٹ تیز رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے

جمدار کو سلاخوں سے نکال کر ایک ہاتھ سے جمدار کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگی پر ایک طاقتور گھونہ رسید کر دیا۔ یہ سارا کام ایسا ہی چچا حلقا تھا کہ جمدار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے بیک وقت ساتوں رنگ نکلنے لگے اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن ایک جھٹکا سے ٹکڑی ہو گئی۔

جنگل کے ہونٹوں پر بے حد زہریلی اور مسکراہٹ تیز رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے

جمدار کو سلاخوں سے نکال کر ایک ہاتھ سے جمدار کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگی پر ایک طاقتور گھونہ رسید کر دیا۔ یہ سارا کام ایسا ہی چچا حلقا تھا کہ جمدار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے بیک وقت ساتوں رنگ نکلنے لگے اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن ایک جھٹکا سے ٹکڑی ہو گئی۔

جنگل کے ہونٹوں پر بے حد زہریلی اور مسکراہٹ تیز رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے

جمدار کو سلاخوں سے نکال کر ایک ہاتھ سے جمدار کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگی پر ایک طاقتور گھونہ رسید کر دیا۔ یہ سارا کام ایسا ہی چچا حلقا تھا کہ جمدار کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے بیک وقت ساتوں رنگ نکلنے لگے اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن ایک جھٹکا سے ٹکڑی ہو گئی۔



پر لگی ہوئی سرچ لائٹس روشن کر دی گئیں اور آس پاس کا علاقہ تیز روشنی میں ڈوب گیا مگر جنگل اور شیدو اب اس جگہ سے کافی دور..... گھنے درختوں میں پہنچ چکے تھے اور انہیں تلاش کر لینا کوئی آسان کام نہیں رہ گیا تھا۔ جنگل کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔ جبکہ شیدو اس جگہ پہنچنے کے باوجود خاصا پریشان اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ ممکن ہے اس کی یہ وجہ رہی ہو کہ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے جیل نصیب ہوئی تھی اور پہلی ہی مرتبہ فرار ہونا پڑا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اچانک جنگل کو درختوں کے درمیان کی موڑ گاڑی کے ہینڈ لیمپس کی روشنی نظر آنے لگی اور پھر انہوں نے ایک ٹرک کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ مضامات کی طرف سے آ رہا تھا اور اس کا رخ شہر کی سمت تھا۔ ٹرک کو دیکھ کر شیدو کا چہرہ زرد پڑ گیا لیکن جنگل جانتا تھا کہ شہر دودھ پہنچانے والا کوئی ٹرک ہوگا اور اس کا یہ خیال سو فیصد درست تھا۔ ڈرائیور نے جیسے ہی ایک شخص کو ٹرک کے عین وسط میں کھڑا دیکھا۔ اس نے رفتار کم کی اور آخر کار ٹرک کھڑا کر دیا۔ ڈرائیور کے علاوہ ٹرک میں دو آدمی اور بھی تھے۔ دودھ اتارنے والے مگر اس سے پہلے کہ انہیں جنگل کے ارادوں کا علم ہوتا، ان میں سے ایک ہوش و حواس سے عاری ہو چکا تھا اور باقی دونوں اس کی اور شیدو کی گرفت سے رہائی حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ چند لمحے بعد ہی جدوجہد کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ان دونوں نے ان کے جسم گھسیٹ کر ایک درخت کے نیچے ڈال دیے اور جنگل ان کے کپڑے اتارنے لگا۔ شیدو ابھی تک گھبرایا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے بدحواسی جھانک رہی تھی۔ جنگل کی غراہٹ سن کر اس نے پھرتی کے ساتھ ایک شخص کے کپڑے پہن لیے اور جنگل کی اگلی ہدایت کا انتظار کرنے لگا۔

شیدو کا ہاتھ پکڑ کر ٹرک کی طرف بڑھ گیا۔ اس انجن ابھی تک حرکت میں تھا۔ جنگل اسٹرنگ ویل کے سامنے جا بیٹھا اور اگلے ہی لمحے ٹرک انہیں تیزی کے ساتھ شہر کی طرف لے جا رہا تھا۔ جیل سے کافی دور پہنچنے کے بعد جب جنگل یقین ہو گیا کہ وہ خطرے سے باہر ہو چکے ہیں اس نے ٹرک کھڑا کر دیا۔ شیدو پر مسکراتی ہوئی نظریں ڈالیں اور کہا۔

”اب ہم محفوظ ہیں اور اگر پولیس زندگی بھر جھک مارتی رہے تو بھی میری گردنوں میں پکائی ہوئی کپڑے اب بھی مجھے دس لاکھ کی مالیت کے ہیروں پتہ نہیں بتاؤ گے۔“

”ہیروں کا پتہ؟“ شیدو کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”ہاں“ میں جانتا جا رہا ہوں کہ تم نے انہیں کس جگہ چھپایا ہے۔ اس دفعہ انکار نہیں سنو گا۔“ جنگل کے حلق سے غراہٹ کی آواز نکلی اور شیدو لرز کر رہ گیا۔ اپنے سامنے کا چہرہ اس وقت اسے کچھ اتنا ہی بھیانک اور خوفناک نظر آ رہا تھا۔

”جلدی بولو۔“ جنگل نے اچانک اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ ”میرے وقت کا ایک لمحہ بے حد قیمتی ہے۔“

”لُل..... لیکن.....“ شیدو نے کھینچتی ہوئی آواز میں کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس کی بات مکمل نہ ہو سکی تھی کہ جڑے پر جنگل کا طاقتور گھونٹہ پڑا اور اس کی شدت سے اس کی پوری کھوپڑی لرز گئی پھر اس سے پہلے کہ وہ اس پہلے گونٹے سے ہاتھ پاتا جنگل نے دوسرا گھونٹہ اس کے منہ پر رسید کر کے ہونٹوں سے خون نکل آیا۔

”جواب دو!“ جنگل کے لہجے میں بلا سفاکی اور درندگی تھی۔

”خاموش رہے تو میں اسی طرح گھونٹنے مار کر تمہیں ہلاک کر دوں گا اور یہ تم جانتی ہی ہو طاقت میں میرا اور تمہارا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔“

”مم..... مم..... میں جانتا ہوں۔“ شیدو خون لکڑھٹا ہوا بمشکل بولا۔ ”میرے میرے ایک دوست کے پاس محفوظ ہیں۔ مم..... مگر تم نے کہا تھا کہ تم شیر کی طرح اپنے ہی شکار سے شکم سیر ہوتا ہا کہہ کرتے ہو۔“

”میں نے کہا تھا اور غلط نہیں کہا تھا۔ کیا تم میرے شکار نہیں ہو۔“

”لُل..... لیکن.....“

”بکواس نہیں۔“ وہ اس کے زخمی جڑے پر دوسرا گھونٹہ رسید کرتا ہوا غرایا۔ شیدو کے حلق سے ایک کریناک جھج نکلی اور خون اس کے منہ سے تیزی کے ساتھ بہنے لگا۔ جنگل اس کے لیے اس وقت کسی درندے سے زیادہ خونخوار اور خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے مار مار کر شیدو کو ادھ مو کر دیا۔ اس کے کپڑے خون سے سرخ ہو گئے اور اس میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہیں رہی مگر اس سے پہلے کہ اس پر بے ہوشی مسلط ہوئی، جنگل نے اس کے گلے پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”بتاؤ وہ میرے کہاں ہیں جواب دو ورنہ گا گھونٹ کر ختم کر دوں گا۔“

شیدو کی آنکھوں میں التجائیں تڑپ رہی تھیں۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے جنگل سے دم کی بیگ مانگی۔ چند لمحوں تک سانسیں درست کرتا رہا پھر خون تھوک کر بولا۔

”یقین کرو۔ وہ میرے ایک محفوظ مقام پر آ رہے ہیں اور اس جگہ کا نقشہ میرے ایک دوست کے پاس ہے۔“

”پھر جھوٹ۔“

”نہیں یہ حقیقت ہے۔ تمہیں یقین کر لینا۔“ شیدو لرز کر بولا۔ جنگل کی آنکھوں میں اس کے سامنے لہانے لگے۔ چند لمحے بغور دیکھنے کے چہرے اور آنکھوں کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

”ہو سکتا ہے کہ تمہارا کہنا درست ہو لیکن اس

کی کیا ضمانت ہے کہ میرے اب بھی محفوظ ہی ہوں گے۔“

”مم..... میں سمجھا نہیں۔“

”تمہارا دوست ظاہر ہے کہ فرشتہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے تمہاری غیر موجودگی سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہوگی۔“

”نہیں۔ وہ ایسی کسی کوشش کے قابل نہیں۔“

”کیا مطلب۔“

”وہ اپناج ہے۔ اس کی ٹانگیں ایک حادثے میں ضائع ہو چکی ہیں۔“

”اوہ۔“ جنگل کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ چند لمحے بعد بولا۔ ”اس کا پتہ بتاؤ۔“

شیدو نے پتہ بتانے سے پہلے پوچھا۔ ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کا پتہ معلوم کرنے کے بعد تم مجھے قتل نہیں کرو گے۔“

”بکومت۔“ جنگل اس کے خون آلود چہرے پر تھپڑ لگا کر غرایا۔

”اگر تم نے اپنے دوست کا پتہ نہیں بتایا تو اس جگہ تمہاری لاش ہی پڑی نظر آئے گی۔“

مزید دو چار تھپڑوں اور گھونٹوں نے شیدو کی طبیعت اچھی طرح صاف کر دی اور مجبوراً اس نے جنگل کو اپنے دوست کے پتے سے آگاہ کر دیا۔ جنگل چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں صداقت کی پرچھائیاں تلاش کرتا رہا، پھر اس کے ہاتھ دوبارہ شیدو کے گلے پر جم گئے۔ ان کا دباؤ اس کی گردن پر بڑھنے لگا۔ شیدو نے ان کی گرفت سے نجات حاصل کرنے کی بھرپور جدوجہد کی لیکن ہاتھ کا دباؤ اس کے جسم کے بے حس و حرکت ہونے سے پہلے ختم نہیں ہوا تھا۔

شیدو کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے دونوں ہاتھ جھاڑے اس کی لاش کو نیچے پھینکا اور ٹرک کو آگے بڑھانے کے لیے اسے کیمبر میں ڈالنے لگا۔ ہونٹوں پر ایک خطرناک اور سفاکانہ مسکراہٹ قفس کر رہی تھی۔



## حاصل مطالعہ

☆ شہر رسول خان جعفری ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے ان کے دوست فرید مانوس نے انہیں روکا اور یہ شعر سنایا اب ملے ہیں تو گفتگو کر لیں۔

پیاری بات روبرو کر لیں۔

☆ شہر رسول خان چوں کہ جلدی میں تھے اور بیٹھنا نہیں چاہتے تھے تو انہوں نے جواباً بڑبڑا کر کہا۔

اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں کیوں نہ اسے دوست ہم جدا ہو جائیں

☆

راہبندر ہاتھ نیگور میز پر جھکے بڑے انہماک سے کہہ رہے تھے۔ انہیں اس طرح بیٹھنے دیکھ کر ان کا ایک دوست بولا۔

”آپ کو اتنی تکلیف دہ حالت میں دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ آپ کے لیے بازار سے آرام دہ کرسیاں اور میزیں لا دوں آپ کو اس تکلیف میں کام کرنا پسند دیکھ کر بہت دکھ ہوا ہے اور فکس ہو رہا ہے۔

راہبندر ہاتھ نیگور اس کی بات سن کر مسکرائے اور بولے۔ ”دراصل صراحی میں پانی کم ہو گیا ہے اس لیے اس کو جھکانا ضروری ہو گیا ہے۔“

☆ ☆

کرنا۔ میں ٹانگوں سے معذور رہی لیکن میرا نشانہ اتنا اچھا ہے کہ اڑنی چڑیا کو اپنے پستول یا بندوق کی گولی سے نیچے گرا سکتا ہوں۔“

جگل کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ بوڑھا نعمانی اپنی گاڑی کو ایک ہاتھ کی مدد سے چلاتا ہوا ٹیلی فون کے قریب پہنچ گیا۔ ایک ہاتھ سے جگل کو نشانہ بناتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اتار کر میز پر رکھا اور اطمینان سے قریبی پولیس اسٹیشن کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆



کنٹرول وین سے فوراً ہی ان احکامات کو واپس لیکر نئی ہدایات دینی پڑیں۔ کیونکہ مسز کالمبر سڑک کو پار کر کے واپس آرہی تھی۔ وہ بھد بھد کرتی واپس آئی اور سڑک کے کنارے ایک جھاڑی کا معائنہ کرنے لگی۔ انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے یہ دیکھ بھال اس کے فرائض میں شامل رہی ہو۔

### ایک ہوشیار مجرم کا قصہ وہ چکما دینے میں کامیاب ہو گیا تھا

**بانت** روڈ کا دروازہ نمبر ۳۵ کھلا اور ایک درمیانی عمر کی موٹی اور درمیانے قد کی عورت باہر نکل آئی۔ اس نے خاکی رنگ کا کاروں والا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ جس کے ٹخن گردن تک بند کئے ہوئے تھے۔ سر پر ہلکے بھورے رنگ کا پیشانی پر خوب جھکا ہوا ہیٹ اور ہاتھوں میں خیالے رنگ کے دستانے تھے۔ اس کے شاندار جوئے موزے بڑا سا سوٹ کیس جسے اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا سب ہی چیزیں بھوری رنگت کی تھیں۔

وہ میٹھیوں کے قریب رک گئی۔ اس کی عمر کی عورتیں عموماً گزوری نگاہ کا شکار ہوتی ہیں لیکن اس عورت کی باہر کوٹنگی موٹی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان سے انتہائی ذہانت ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی محتاط نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔

بانڈ روڈ کوئی زیادہ مصروف سڑک نہیں تھی۔ اپریل کی اس سپاہی صبح تقریباً گیارہ بجے وہ قریب قریب ویران ہی تھی۔ ایک جھٹی گڑ صاف گرہا تھا۔ سبزی فروش لڑکا مضحکہ خیز انداز میں سر جھکارے اندھا دھند سائیکل چلاتا گزر رہا تھا۔ یا پھر ڈاکو جوج کے وقت عموماً اس سڑک سے گزرتا تھا دکھائی دیتا ہے۔

”ممکن ہے وہ ان چیزوں کو کسی مشین میں بند کر کے کہیں دبا دیتا ہو۔“

”یہ سب امکانات اپنی جگہ درست ہیں۔“

”کینال نے اپنی آنکھوں کو جھپٹ دیتے ہوئے کہا۔“

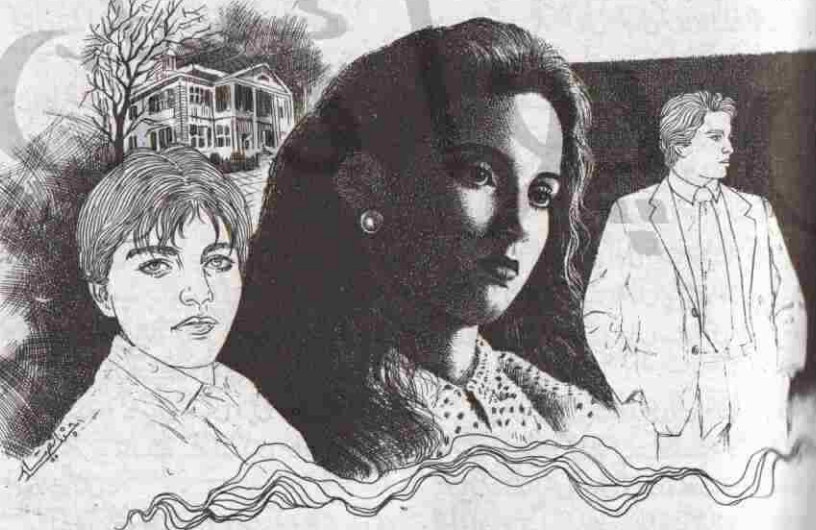
”اگر امکانات پر ہی غور کیا جائے تو میرے پاس ان کی ایک طویل فہرست پہلے سے موجود ہے۔“

”لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جب وہ چور مال سرقہ کو دوبارہ حاصل کرتا ہے تو بھی دکھائی نہیں دیتا۔“

”کسی نے تردید یا تائید کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

اب تک کئی انفارمر چور کے بارے میں اطلاعات دے چکے تھے لیکن پولیس اس پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ بڑی صفائی سے نقب زنی کا مال ہضم کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم چور کی نگرانی کریں۔ اس طرح خود چور اس سے مال وصول کرنے والا یا کوئی اور مددگار رکے ہاتھوں پولیس کے قبضے میں آجائے گا۔

”بالکل ٹھیک۔“ ایگزیکٹو نے کہا۔ ”تو پھر وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے۔“





”اس کا تعلق مسز کالمین سے ہے وہ اسے اطلاع دیتا ہے کہ اس نے چوری کا مال کہاں چھپایا ہے۔ لہذا مسز کالمین اس سے مطلوبہ جگہ کی جانی یا اگر کلوک روم میں ہو تو اس کا ٹکٹ لے کر مال کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ وہ ان تمام لوگوں سے بھی خوب واقف ہوگی جو اس مال کے خریدار ہو سکتے ہیں۔“

”وہ ان سے رقم وصول کر کے اپنا حصہ رکھنے کے بعد باقی اسے دے دیتی ہے۔“

”آخر یہ کس قسم کی عورت ہے۔“

”اس کے حالات بڑے عجیب ہیں۔“ کینال نے کہا۔ ”نہ جرمن نژاد ہے اگرچہ میں اسے چیک نہیں کر سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ مسز کالمین اور اس کا بھائی جرمن قیدی ہیں۔“

”گویا بہت ہی ہوشیار عورت ہے۔“ ایگزیکٹل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لب کشائی کی۔

”میرا خیال ہے اب تمہیں اس کام کے لیے بہت ہی کم آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ اب تم بتاؤ کہ اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تم نے کیا طریقہ کار سوچ رکھا ہے۔“

”اگرچہ یہ معاملہ کچھ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔“ کینال نے کہا۔ ”تاہم اس کی تفصیلات یہ ہیں۔“

”مسز کالمین گلی کے کونے پر رک گئی۔ سامنے میں روڈ تھا۔ غالباً وہ سواری کا انتخاب کرنے جا رہی تھی۔ کچھ دیر کھڑی وہ سوچتی رہی۔ اس کا بے شجاشا بھاری بھر کم جسم دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ چند قدم چلنا بھی اس کے لیے دشوار ثابت ہوتا ہوگا۔

سامنے ہی بس اسٹاپ تھا۔

بس اسٹاپ پر ایک آدمی اور ایک خویصورت نوخیز لڑکی کے درمیان متنی جبر گفتگو ہو رہی تھی۔ مخالف سمت میں دو کار گیر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ گلی کے ایک جانب دو نیکیاں دکھائی دیں جن کے گرے ہوئے میٹر پر بتا رہے تھے کہ انہیں سواری کی قطعاً ضرورت نہیں۔

ایک آپریشن گاڑی پرائیویٹ گیراج میں آدمی

کھسی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی یوں اوگھ رہا تھا۔ گویا بیچپن سے اس کی عادت رہی ہو۔ اس گیراج کا انتخاب بطور خاص کیا گیا۔ کیونکہ وہاں ٹیلی فون موجود تھا۔

تقریباً ہر بس اسٹاپ پر ایک جوڑا نوجوان گفتگو نظر آ رہا تھا۔

مسز کالمین نے خلاف توقع کوئی سواری لیے بغیر پرسکون انداز میں بانڈ روڈ کے انتہائی حصے کی جانب پیش قدمی جاری رکھی آگے چل کر وہ ٹریفک کے سنگٹھلنے کے انتظار میں کھڑی ہوئی اور پھر وہ اپنی بھدی تلخ جیسی چال چلتی ہوئی بانڈ روڈ کے مخالف رخ ایک اور سڑک پر جا گئی۔

نگرائی کرنے والوں نے تمام کام چھوڑ کر اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔

”ابھی تک مغرب کی طرف بڑھ رہی ہے۔“

”وین میں بیٹھے ہوئے کنٹرولر نے اشارہ کر دیا۔“

”میں اسے ہائی سائیڈ پارک کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ایک سے آٹھ تک..... اس سمت میں نگرانی جاری رکھی جائے۔“

کچھ دیر وہ اس طرف دیکھتا رہا۔ جدھر مسز کالمین بڑھ رہی تھی۔ پھر کنٹرول سنبھال کر بڑبڑانے لگا۔

”کار نمبر ایک لندن روڈ کی طرف رخ کر کے کھڑی ہو جائے۔ نمبر ۱۲ کے متوازی نمبر نو اور دس ہائی سائیڈ ٹیوب اسٹیشن تک کا راستہ کور کریں۔ اس کے علاوہ بس اسٹاپ پر موجود حضرات پہاڑی کی سمت۔“

مسز کالمین ہانپتی ہوئی ایک مرتبہ پھر دکھائی دی اور اس کی نگرانی کرنے والوں پر جیسے اوس پڑ گئی۔ وہ اس جانب بڑھ رہی تھی جہاں سے ابھی کچھ دیر پہلے روانہ ہوئی تھی۔

کنٹرول وین سے فوراً ہی ان احکامات کو واپس لیکر نئی ہدایات دینی پڑیں۔ کیونکہ مسز کالمین سڑک کو پار کر کے واپس آ رہی تھی۔ وہ بھد بھد کرنی واپس آئی اور سڑک کے کنارے ایک جھاڑی کا معائنہ

کرتے لگی۔ انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے یہ دیکھ بھال اس کے فرائض میں شامل رہی ہو۔

تعاقب کرنے والے آدمی سابقہ جگہوں پر پہنچ گئے اور ایک مرتبہ پھر انہی کاموں کا آغاز ہو گیا۔

انہیں وہ ادھر اور اچھوڑ کر چلے گئے تھے۔

مسز کالمین نے اطمینان سے ایک پھول توڑا اور اپنے کوٹ کے کنارے لٹائی ہوئی واپس مڑ گئی۔

اب اس کا رخ دوبارہ ٹیوب اسٹیشن کی جانب تھا۔

نو اور دس نمبر دو آدمیوں کے لیے مخصوص تھا۔

بیلڈ اسٹیشن کے اندر صبح سے موجود تھے اور غالباً ان کے پاس دن بھر کی گاڑیوں کے ٹکٹ بھی رہے ہوں گے۔

نو نمبر جاسوس سارجنٹ پیٹر اور دس نمبر سارجنٹ دانن کے لیے مخصوص تھا۔ وہ اس وقت انگریزی سیڑھیوں کے دروازے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

مسز کالمین اسٹیشن میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہاں زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اسٹیشن تقریباً خالی تھا اس نے بنگلہ کلرک سے ایویشن کے لیے ٹکٹ خریدا اور لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ پلیٹ فارم پر ابھی ایک مسافر فلوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

ایک کار تیز رفتاری سے آئی اور اسٹیشن کے دروازے کے سامنے رک گئی۔ ایک آدمی نچے اترتا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے بنگلہ کلرک سے گفتگو کی اور لڑکی سے واپس چلا گیا کار اس کے بیٹھے ہی روانہ ہوئی۔ گاڑی کا انتظار کرنے والوں میں ایک ادنی سوٹ والا نوجوان اور دوسرا فلیٹ لین کے سوٹ میں لباس تھا۔ دونوں مسز کالمین کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

مسز کالمین نے غالباً ایویشن پر اترنے کا ارادہ لای کر دیا تھا۔ گاڑی اس وقت ایویشن کے بعد پہنچی اسٹیشن پر رکنے کے لیے آہستہ ہو رہی تھی لیکن وہاں اسٹیشن پر بھی اترتی دکھائی نہیں دی البتہ اترنے والے والوں کا بغور جائزہ لیتی رہی آخر کار تقریباً

نصف گھنٹہ سفر میں گزارنے کے بعد وہ کیفام کا من اسٹیشن پر گاڑی سے اتر گئی۔ اس دوران اس نے سارجنٹ پیٹر یا دانن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بوڑھی کتنا۔ غالباً اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں بھی آنکھیں موجود ہیں۔ اس نے ہمیں پہچان لیا ہے کہ ہم اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ لہذا واپس جاؤ اور ہاں یہاں سے فون کر کے کسی اور کو اپنی جگہ بلاؤ۔“

مسز کالمین اطمینان سے گلی میں چلتی رہی۔ اس نے ایک مرتبہ دھڑکیاں یا پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی بات کی پروا نہ رہی ہو اور پھر وہ گلی کے آخر میں واضح ایک ہول میں گھس گئی۔

سارجنٹ پیٹر باہر ہی کھڑا رہا۔

وہ جانتا تھا کہ اس ہول کا کوئی بھی دروازہ ہے اور نہ ہی مین گیٹ کے علاوہ کوئی اور ایسا دروازہ ہے جسے راہ فرار بتایا جاسکے۔ وہ اطمینان سے باہر ہی کھڑا مسز کالمین کا انتظار کرنے لگا کیوں کہ اسے ہول میں دیکھ کر وہ معاملے کو بھانپ بھی سکتی تھی۔ اس لیے سارجنٹ نے اپنی دانست میں بڑا دشمنانہ فیصلہ لیا تھا۔

قریب ہی ٹیلی فون بوتھ تھا۔ فون کرتے وقت بھی وہ دروازے کی نگرانی کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ مطمئن سا ہوتھیں گھس گیا۔

”میرا خیال ہے۔ ہمیں اس بڑھیا کے گرد زیادہ ہجوم نہیں کرنا چاہیے۔“ اس نے رابطہ قائم ہوتے ہی کہا۔ ”کسی بھی ایک آدمی کو بھیج دو دانن کو نہیں کیونکہ وہ صبح سے کئی مرتبہ اسے دیکھ چکی ہے اور گلی کے آخر میں بھی کچھ آدمیوں کو متین کر دوتا کہ ہمیں فوراً ہی تعاقب نہ کرنا پڑے۔“

دوسری جانب سے اس رپورٹ کے مطابق کارروائی عمل میں لانے کا وعدہ کر لیا گیا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد سارجنٹ موتے دکھائی دیا۔

پیٹر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلا لیا۔

”کیا رپورٹ ہے پیٹر۔ کیا وہ بڑھیا ابھی تک



اندھے۔“موتے نے دریافت کیا۔

”ہاں اب تک ایک نوجوان آدمی اپنی گرل فرینڈ کیساتھ ایک ملاح جس کے کندھے سے بیگ جھول رہا تھا اور تین ایسے آدمی جو ہوٹل کے مالک کے ہمراہ باہر آئے مالک نے انہیں رخصت کیا۔ وہ ان سے اچھی طرح واقف دکھائی دیتا ہے رہی بڑھیا تو وہ ابھی اندر ہی ہے۔“

عین اسی وقت ہوٹل کا دروازہ بند ہو گیا اور چنٹی چڑھانے کی آواز سنائی دی تو پیٹر کے ساتھ خود موتے کی شکل بھی تصویر کھینچنے کے قابل ہوئی۔

”اے۔“موتے نے کہا۔ ”یہ کیا معاملہ ہے۔ کہاں چلی گئی۔“

”میرا خیال ہے بڑھیا مالک کا دل بہلانے کے لیے رک گئی ہے۔“ پیٹر نے جھلا کر جواب دیا پھر چونک پڑا۔ ”ابھی غالباً ایک گاہک اندر موجود ہے۔ یقیناً مسز کالین ہی ہوگی۔“

”چلو چل کر دیکھ لیں۔“

موتے نے شیشے سے اندر جھک کر دیکھا۔ ”ہاں کوئی عورت ہی ہے اور مالک اسے بھگانے کی تدبیریں کر رہا ہے۔“

دروازہ کھلا اور ایک ایسی عورت دکھائی دی جو مسز کالین کی ہم عمر تھی لیکن اس بڑھیا کا ہیٹ اور کوٹ قدرے مختلف رنگ کا تھا۔ کچھ دیر وہ دروازے کے سامنے کھڑی رہی یہاں تک کہ مالک نے دوبارہ کھڑکی لگائی اور روشنیاں بجھا دیں۔

پیٹر نے غور سے دیکھا۔ وہ مسز کالین نہیں تھی۔ اس عورت کے چہرے پر دبیجے تھے اور وہ شکل و صورت کے لحاظ سے مختلف تھی۔ وہ بظاہر کی مانند دائیں بائیں جھومتی ہوئی آگے بڑھ کر گلی کے درمیان میں پہنچی تو ایک دبلی پتلی عورت سے ٹکرائے گئے۔

”اندھی سمجھیں دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔“ دبلی پتلی عورت نے باہر آتے ہوئے کہا۔

”موتے نے دریافت کیا۔

”ہاں اب تک ایک نوجوان آدمی اپنی گرل فرینڈ کیساتھ ایک ملاح جس کے کندھے سے بیگ جھول رہا تھا اور تین ایسے آدمی جو ہوٹل کے مالک کے ہمراہ باہر آئے مالک نے انہیں رخصت کیا۔ وہ ان سے اچھی طرح واقف دکھائی دیتا ہے رہی بڑھیا تو وہ ابھی اندر ہی ہے۔“

عین اسی وقت ہوٹل کا دروازہ بند ہو گیا اور چنٹی چڑھانے کی آواز سنائی دی تو پیٹر کے ساتھ خود موتے کی شکل بھی تصویر کھینچنے کے قابل ہوئی۔

”اے۔“موتے نے کہا۔ ”یہ کیا معاملہ ہے۔ کہاں چلی گئی۔“

”میرا خیال ہے بڑھیا مالک کا دل بہلانے کے لیے رک گئی ہے۔“ پیٹر نے جھلا کر جواب دیا پھر چونک پڑا۔ ”ابھی غالباً ایک گاہک اندر موجود ہے۔ یقیناً مسز کالین ہی ہوگی۔“

”چلو چل کر دیکھ لیں۔“

موتے نے شیشے سے اندر جھک کر دیکھا۔ ”ہاں کوئی عورت ہی ہے اور مالک اسے بھگانے کی تدبیریں کر رہا ہے۔“

دروازہ کھلا اور ایک ایسی عورت دکھائی دی جو مسز کالین کی ہم عمر تھی لیکن اس بڑھیا کا ہیٹ اور کوٹ قدرے مختلف رنگ کا تھا۔ کچھ دیر وہ دروازے کے سامنے کھڑی رہی یہاں تک کہ مالک نے دوبارہ کھڑکی لگائی اور روشنیاں بجھا دیں۔

پیٹر نے غور سے دیکھا۔ وہ مسز کالین نہیں تھی۔ اس عورت کے چہرے پر دبیجے تھے اور وہ شکل و صورت کے لحاظ سے مختلف تھی۔ وہ بظاہر کی مانند دائیں بائیں جھومتی ہوئی آگے بڑھ کر گلی کے درمیان میں پہنچی تو ایک دبلی پتلی عورت سے ٹکرائے گئے۔

”اندھی سمجھیں دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔“ دبلی پتلی عورت نے باہر آتے ہوئے کہا۔

”موتے نے دریافت کیا۔

”ہاں اب تک ایک نوجوان آدمی اپنی گرل فرینڈ کیساتھ ایک ملاح جس کے کندھے سے بیگ جھول رہا تھا اور تین ایسے آدمی جو ہوٹل کے مالک کے ہمراہ باہر آئے مالک نے انہیں رخصت کیا۔ وہ ان سے اچھی طرح واقف دکھائی دیتا ہے رہی بڑھیا تو وہ ابھی اندر ہی ہے۔“

عین اسی وقت ہوٹل کا دروازہ بند ہو گیا اور چنٹی چڑھانے کی آواز سنائی دی تو پیٹر کے ساتھ خود موتے کی شکل بھی تصویر کھینچنے کے قابل ہوئی۔

”اے۔“موتے نے کہا۔ ”یہ کیا معاملہ ہے۔ کہاں چلی گئی۔“

”میرا خیال ہے بڑھیا مالک کا دل بہلانے کے لیے رک گئی ہے۔“ پیٹر نے جھلا کر جواب دیا پھر چونک پڑا۔ ”ابھی غالباً ایک گاہک اندر موجود ہے۔ یقیناً مسز کالین ہی ہوگی۔“

”چلو چل کر دیکھ لیں۔“

موتے نے شیشے سے اندر جھک کر دیکھا۔ ”ہاں کوئی عورت ہی ہے اور مالک اسے بھگانے کی تدبیریں کر رہا ہے۔“

دروازہ کھلا اور ایک ایسی عورت دکھائی دی جو مسز کالین کی ہم عمر تھی لیکن اس بڑھیا کا ہیٹ اور کوٹ قدرے مختلف رنگ کا تھا۔ کچھ دیر وہ دروازے کے سامنے کھڑی رہی یہاں تک کہ مالک نے دوبارہ کھڑکی لگائی اور روشنیاں بجھا دیں۔

پیٹر نے غور سے دیکھا۔ وہ مسز کالین نہیں تھی۔ اس عورت کے چہرے پر دبیجے تھے اور وہ شکل و صورت کے لحاظ سے مختلف تھی۔ وہ بظاہر کی مانند دائیں بائیں جھومتی ہوئی آگے بڑھ کر گلی کے درمیان میں پہنچی تو ایک دبلی پتلی عورت سے ٹکرائے گئے۔

”اندھی سمجھیں دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔“ دبلی پتلی عورت نے باہر آتے ہوئے کہا۔

”موتے نے دریافت کیا۔

”موتے نے دریافت کیا۔

”ہاں اب تک ایک نوجوان آدمی اپنی گرل فرینڈ کیساتھ ایک ملاح جس کے کندھے سے بیگ جھول رہا تھا اور تین ایسے آدمی جو ہوٹل کے مالک کے ہمراہ باہر آئے مالک نے انہیں رخصت کیا۔ وہ ان سے اچھی طرح واقف دکھائی دیتا ہے رہی بڑھیا تو وہ ابھی اندر ہی ہے۔“

عین اسی وقت ہوٹل کا دروازہ بند ہو گیا اور چنٹی چڑھانے کی آواز سنائی دی تو پیٹر کے ساتھ خود موتے کی شکل بھی تصویر کھینچنے کے قابل ہوئی۔

”اے۔“موتے نے کہا۔ ”یہ کیا معاملہ ہے۔ کہاں چلی گئی۔“

”میرا خیال ہے بڑھیا مالک کا دل بہلانے کے لیے رک گئی ہے۔“ پیٹر نے جھلا کر جواب دیا پھر چونک پڑا۔ ”ابھی غالباً ایک گاہک اندر موجود ہے۔ یقیناً مسز کالین ہی ہوگی۔“

”چلو چل کر دیکھ لیں۔“

موتے نے شیشے سے اندر جھک کر دیکھا۔ ”ہاں کوئی عورت ہی ہے اور مالک اسے بھگانے کی تدبیریں کر رہا ہے۔“

دروازہ کھلا اور ایک ایسی عورت دکھائی دی جو مسز کالین کی ہم عمر تھی لیکن اس بڑھیا کا ہیٹ اور کوٹ قدرے مختلف رنگ کا تھا۔ کچھ دیر وہ دروازے کے سامنے کھڑی رہی یہاں تک کہ مالک نے دوبارہ کھڑکی لگائی اور روشنیاں بجھا دیں۔

پیٹر نے غور سے دیکھا۔ وہ مسز کالین نہیں تھی۔ اس عورت کے چہرے پر دبیجے تھے اور وہ شکل و صورت کے لحاظ سے مختلف تھی۔ وہ بظاہر کی مانند دائیں بائیں جھومتی ہوئی آگے بڑھ کر گلی کے درمیان میں پہنچی تو ایک دبلی پتلی عورت سے ٹکرائے گئے۔

”اندھی سمجھیں دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔“ دبلی پتلی عورت نے باہر آتے ہوئے کہا۔

”موتے نے دریافت کیا۔

”موتے نے دریافت کیا۔



اس شمارے کے لیے ایک طویل تحریر

اسند چار بجے کے لگ بھگ پارکنگ گراؤنڈ کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس وقت دو افراد کارنر پر کھڑے ہوئے تھے۔ جب کہ موٹا شخص اپنی کار میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں افراد ایک دوسرے سے لاتعلقی نظر آ رہے تھے۔ وقت گزرتا رہا مگر پھر پندرہ منٹ بعد ایک ٹیکسی فلیٹ بلڈنگ کے سامنے آکر رکی ٹیکسی سے اترنے والا شخص اگرچہ زیادہ عمر کا نہیں تھا لیکن اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ وہ لنگڑا کر چلتا ہے۔ اس شخص کے بال گھنے اور سیاہ تھے اس کے چہرے کی رنگت سانسولی تھی اور چہرے سے پروقار نظر آ رہا تھا اس کو دیکھتے ہی موٹا آدمی پھرتی سے کار سے اتر گیا اور فلیٹ بلڈنگ کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران اس چھڑی والا شخص ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر دروازے کی طرف پلٹ رہا تھا۔

اس شمارے کے لیے سنسنی خیز و دلچسپ ناول کی تلخیص



پڑ اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اسے جاتے دیکھا لیکن اس وقت سبز کالمین کا تعاقب کرنا ان کے فرائض میں شامل نہیں تھا اس لیے وہ مطمئن بیٹھے رہے۔

اگلے اسٹیشن پر وہ گاڑی سے اترے اور متحرک سبزھیوں پر بھاگتے ہوئے اسٹیشن کی عمارت سے آگئے۔ سامنے ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ وہ لپکے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔

”میں اس وقت چوٹی کر چکا ہوں۔“ ڈرائیور نے اک شان بے نیازی سے کہا۔

”تمہاری ڈیوٹی دوبارہ شروع ہو رہی ہے۔“

سارجنٹ نے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔

”ہمیں جس قدر جلدی ممکن ہو پچھلے اسٹیشن پہنچا دو۔“

ٹیکسی ڈرائیور نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں

اور مزید کوئی عذر پیش کئے بغیر اس نے سارجنٹ کی

پدایت پر عمل کیا سارجنٹ کی نگاہیں گھڑی پر جمی ہوئی

تھیں۔

”اسے چار منٹ کا وقت مل گیا ہے۔“

سارجنٹ نے اسے ساتھیوں کے ہمراہ ٹیکسی سے

اترتے ہی کہا۔ ”تم لوگوں کو یاد ہو گا کہ کیا کرتا ہے۔“

اس علاقے کے ایک ایک شراب خانے میں جھانکتے

ہوئے آگے بڑھتے رہو۔“

”تیوں وہیں سے الگ الگ ہو گئے۔“

”لندن کے شمالی حصے میں شراب خانوں کی کی

نہیں تھی لیکن سارجنٹ پیٹر نے حساب لگایا کہ اگر

انہوں نے تیز رفتاری سے کام کیا تو جلد ہی اس کام

سے فارغ ہو جائیں گے۔ اگرچہ اس مرتبہ انہوں

نے طریقہ کار بدل کر چند خطرے بھی مول لیے تھے

لیکن ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ وہ تعاقب کر کے اسے

ہوشیار نہیں کرنا چاہتے تھے۔“



طور سے دن کی روشنی میں تو ناممکن ہے اور سبز کالمین تو ہر لحاظ سے ایک مکمل عورت ہے۔“

”عجیب بات ہے۔ اس معاملے میں تو اندھا بھی دھوکا نہیں کھا سکتا۔“

”جی ہاں۔ یہ تبدیلی کسی فلم میں ہی ممکن ہے۔ عملی دنیا میں نہیں۔“ پیٹر نے کہا۔

☆☆

سارجنٹ گراہم اور سبز کالمین بیک وقت

اسٹیشن پہنچے آخری لمحے میں سبز کالمین رک گئی لیکن

سارجنٹ گراہم ڈبے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس سے

قبل کہ وہ سبز کالمین کے ارادے سے آگاہ ہوتا

دروازہ بند ہو گیا اور گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ

گئی۔

سبز کالمین پلیٹ فارم کے ایک رخ پر بیٹھ گئی اور

پرسکون انداز میں دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔

اس مرتبہ پلیٹ فارم پر موجود مسافروں کی تعداد چار

تھی۔ ایک تو خود سبز کالمین اور باقی اسکول کی تین

طالبات۔ سبز کالمین گاڑی میں ان لڑکیوں کے

ساتھ ہی سوار ہو گئی۔

دو اسٹیشن بعد طالبات گاڑی سے اتر گئیں اور

سبز کالمین کھڑکی کے قریب بیٹھی بیٹھی سے ان کی

روائی کا منظر دیکھتی رہی۔

بعد ازاں جب گاڑی شمال کی سمت روانہ ہوئی

تو وہ گاڑی سے اترنے اور سوار ہونے والے مسافروں کا

بغور جائزہ لیتی رہی لیکن جن تین آدمیوں پر اس کی نگاہ

نہیں پڑی وہ سارجنٹ پیٹر سارجنٹ موتے اور ولیم

تھے۔

سارجنٹ پیٹر سب سے اگلے ڈبے میں تھا اور

باقی دونوں ایک عقبی ڈبے میں۔

بالہام اسٹیشن پر سبز کالمین گاڑی سے اتر گئی۔

اس کے ہمراہ دو عورتیں تھیں۔ جنہوں نے سودا سلف

خریدنے کے لیے ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ بھی

سبز کالمین کے ساتھ ہی ایک کھوڑا گاڑی میں سوار

ہو گئیں۔



**آئندہ** کو یقین تھا کہ اس مشن کی تکمیل کے بعد اس کا مستقبل سنور جائے گا۔ جو گندرسنگھ کے لیے وہ پہلے بھی کئی کام کر چکا تھا لیکن یہ نیا مشن بہت اہمیت کا حامل تھا۔ لہذا اس نے اس کے لیے خصوصی تیاریاں کیں، ایک نیا فوجی کوٹ خریداجس کی رنگت گہری نیلی تھی اس کے ساتھ سرخ رنگ کا ہیٹ لیا جس پر مور کا پر لگا ہوا تھا پھر جب اس نے تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔ وہ فوج کا افسری لگ رہا تھا جو گندرسنگھ کے آدمیوں نے اس کے سفر کے تمام ضروری انتظامات کر رکھے تھے اسے برسا سے بنگلہ دیش پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد اسے کلکتہ پہنچے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ڈھاکہ سے کلکتہ کی فلائٹ میں اس کا ہم نشست ایک ہندو تاجر تھا۔ اگلے روز وہ ٹھیک چھ بجے دہلی کے پالم ایئر پورٹ پر اتر رہا تھا۔ یہ فروری کی ایک خشک صبح تھی اسے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ اس کا قیام کس ہوٹل میں ہوگا لہذا وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا سی ہوٹل میں جا پہنچا جہاں اس کے نام سے ایک کمر ایک تھا۔ ان انتظامات کو دیکھتے ہوئے اسے یقین ہو گیا کہ اس بار کوئی بے حد اہم اور فوری نوہیت کا کام اسے سونپا جائے گا۔ اگلی وہ کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف ستیش بابو نامی کوئی شخص تھا اس نے آند کو بتایا کہ اسے کب کس جگہ اور کس انداز میں ملاقات کرنی ہے۔

آند نواب صلابت خان روڈ کے چوراہے پر واقع ریسٹوران میں داخل ہوا تو دو افراد ایک کونے والی میز پر دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق بارٹینڈر کو ایک مخصوص برائڈے کے مشروب کا آرڈر دے کر میز کے قریب والا کاؤنٹر اسٹول سنبھالیا۔ یہی مشروب ان دو میں سے ایک شخص پی رہا تھا لہذا آند کو فوراً علم ہو گیا کہ وہ کون ہے۔ آند وقت گزارنے کے لیے یارٹینڈر سے شہر کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بارٹینڈر کو بتایا کہ وہ سہ پہر کا وقت باب الہند پر گزرتا

چاہتا ہے۔

”باب الہند“ بارٹینڈر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا۔ ”آپ کی مراد انٹیم گیت سے ہے۔“ اس پر آند بھی ہنس پڑا اور جب اس نے ان دونوں کو ہوٹل سے نکلنے ہوئے دیکھا تو خود بھی ہل ادا کر کے عام سے انداز میں ٹھہلا تا ہا ہر آ گیا۔ نواب صلابت خان روڈ کی ایک دکان پر سگریٹ خریدتے ہوئے اس کی ملاقات ان میں سے ایک شخص سے ہوئی۔ یہ بوڑھا ستیش بابو تھا۔ اس نے آند کو ایک دروازے کی چھوٹی اور ایک بڑی چابی دیتے ہوئے کہا کہ کام جس حد تک جلد ممکن ہو سکے کر دیا جائے۔

”آج کی رات ایسے کام کے لیے بڑی سند ہے بالک۔“ ستیش بابو نے کھانتے ہوئے کہا۔ ”بھگوان کی کرپا سے تم ضرور کامیاب رہو گے۔“ ستیش بابو نے کام کرنے کے لیے بہت کم وقت دیا تھا حالانکہ آند دہلی کے نئے ہوٹلوں میں بہت کم وقت گزارنے کے علاوہ قدیم مقامات کی سیر بھی کر چاہتا تھا لیکن اب ستیش بابو کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سیر و تفریح کے لیے وقت نہیں ملے سکے گا پھر بھی وہ ستیش بابو سے چھٹکارا حاصل کر کے شام تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ پھر شام پانچ بجے وہ راجپور سبھا کی شاندار عمارت کا ایک چکر لگا کر اپنے ہوٹل واپس آ گیا اور ستیش بابو کے فون کا انتظار کرنے لگا۔

”مزید تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔“ ستیش بابو کا لہجہ بہت خوفناک تھا۔ ”سے بہت جیتی ہے۔ نکل چلو۔“ آند نے کوٹ اور ہیٹ پہن کر دستانے جب میں رکھے اور پھر اسی راستے پر چل پڑا جو اس نے ریسٹوران جانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ وہ اس فلیٹ کے سامنے سے گزرا جو ستیش بابو نے اس دکھایا تھا اور پھر رات کے گیارہ بج گئے اس دوران آند یہی دیکھتا رہا کہ کوئی اس فلیٹ میں آ جا تو نہیں رہا ہے۔ اس نے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیتے

کے بعد فلیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ فلیٹ چابی ہال پر تھا اور عمارت تیرہ منزلوں پر مشتمل تھی۔ عظمیٰ فلیٹ کا دروازہ بڑی چابی سے کھل گیا اور پہلی چابی اس نے بیڈروم کھولنے کے لیے استعمال کی۔ لائن آن کرنے سے قبل اس نے دستانے پہن کر درے گرائے اور پھر سوچ آن کر دیا۔ ستیش بابو کے بتائے ہوئے رہنما اصول اس کے کام آ رہے تھے اور وہ بالکل اسی قسم کے بیڈروم میں تھا اس کا ذکر ستیش بابو نے کیا تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لے کر ہر چیز ذہن نشین کی یہاں ایک بیڈ اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بیڈ کے ایک طرف ایک تھی اور اس کے ساتھ ہی چوٹا سا بک شیلف تھا۔ دروازہ ایک راہداری میں کھلتا تھا اور راہداری ایک کچن کی طرف جاری تھی۔ یہیں باتھ روم بھی تھا۔ بیڈروم میں ایئر انڈیا کی جانی پہنچائی یونیفارم لٹکی ہوئی تھی اور اس وردی کو دیکھتے ہی آند سمجھ گیا کہ فلیٹ کا مالک ہوا باز ہے۔ وہ بیڈروم سے ڈرائنگ روم میں واپس آیا۔ یہاں دو بڑے لیپ رکھے ہوئے تھے اور چھت پر قانون لٹکا ہوا تھا۔ بیڈروم میں بیڈ کے ساتھ دو چھوٹے لیپ تھے اس نے بیڈ روم میں واپس جا کر تمام سوچ آن مائے تو اسے علم ہو گیا کہ دونوں لیپوں کے سوچ الگ الگ ہیں اس نے دونوں لیپوں کے بلب نکال کر ایک طرف رکھ دیے پھر کچن میں واپس آ کر اس نے ستیش بابو کی ہدایت کے مطابق ایک دروازہ کھولی جس میں حسب توقع ریشمی رسی کا گچھا رکھا ہوا تھا۔ یہ گچھالے کر وہ بیڈروم میں واپس آیا اور بیڈروم کو گھورے نے لگا کر مطمئن انداز میں اس نے سر ہلاتے ہوئے بیڈ کی چاروں طرف پھینک دی وہ پھر کچن میں گیا وہاں اس نے چاقو نکالا اور بیڈ کے قریب لاکڑ ڈال دی۔ اس کے بعد اس نے دروازے کے قریب اور کمزور حال کا جائزہ لیا۔ اس پوزیشن سے وہ اندر آنے والے کسی بھی شخص کو بے خبری میں مار سکتا تھا۔ لیپ کھڑے ہو کر اس نے منصوبے کے تمام

پہلوؤں پر ایک بار پھر غور کیا۔ وہ ڈرای بھی غلطی کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ معمولی غلطی بھی جو گندرسنگھ کے قہر کو دعوت دے سکتی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کام سے فارغ ہو کر وہ بمبئی کی سیر ضرور کرے گا۔ مشن کی تکمیل کے بعد اسے بھاری رقم ملنے والی تھی اور پھر یہ بھی ممکن تھا کہ جو گندرسنگھ اسے بھارت ہی میں کوئی نیا مشن سونپ دے۔

وہ دیر تک کھڑا رہا اور ایک ایسے مستقبل کے سنے دیکھتا رہا جہاں اس کے پاس سرمائے کی کمی نہ ہو اور جہاں جو گندرسنگھ کے گروپ میں اسے اہم حیثیت حاصل ہو جائے۔ فی الحال تو جو گندرسنگھ کے کارندے کا کارندہ تھا اس نے جو گندرسنگھ کے اسی کارندے کی ہدایت پر احمد آباد میں ہندو مسلم فساد کرائے تھے جس کے بعد کارندے کو اس پر اعتماد ہو گیا تھا۔ فساد کرانے کے لیے اس نے ہندوؤں کے جلوس پر صرف ایک پتھر پھینکا تھا اور باقی کام جلوس میں شامل ان لوگوں نے کر ڈالا تھا جو اشلوک پڑھ رہے تھے۔ گھروں پر حملے آتش زنی اور لوٹ مار کے واقعات بعض ایک گھنٹے میں گومتی پور۔ سرس پور اور ادھک تھانے کے علاقوں میں پھیل گئے تھے اور پھر بحیریت برما پہنچ گیا تھا یہاں بھی اسے ایک اہم مشن سونپا جانے والا تھا مگر کسی وجہ سے اس کے قابل نہیں سمجھا گیا اور اسے دہلی پہنچنے کا حکم ملا۔

وہ انہی سوچوں میں غلطان تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون کی طرف دیکھا بھی نہیں گھنٹی تین بار بجنے کے بعد بند ہو گئی۔ یہ ستیش بابو کا سنگٹل تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ فلیٹ میں رہنے والا بہت جلد اپنے گھر آنے والا ہے وہ کسی ہرن کی طرح چوکنہ ہو گیا۔ اس نے سنہرا چشمہ اتار کر جیب میں ڈالا اور رسی نکال کر اس کا پھندا اٹانے لگا۔ چند منٹ بعد وہ پوری طرح تیار تھا اس نے لفٹ نیچے جانے کی آواز سنی اور پھر لفٹ کے واپس آنے کی آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی دروازے میں کسی نے



چاہی گھبراہٹ اور چند لمحوں بعد بیڈ روم کا دروازہ کھول کر ایک شخص اندر داخل ہوا۔ یہ وہی شخص تھا جس کو آنند نے صبح ستیش بابو کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے لائٹ سوچ پاتھ مارا مگر روشنی نہ ہوئی تو وہ بجلی کے نظام کو برا بھلا کہنے لگا۔ لیکن پھر بیڈ کی حالت دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ آنند نے کسی لمبی کی طرح لپک کر پھندا اس کے سر سے گلے میں ڈال دیا۔ اس نے پھندے کو جھٹکا دے کر تنگ کیا اور ساتھ ہی پوری قوت سے گھٹنا اس شخص کے کولہے پر مارا۔ دونوں بیڈ پر گر کر گھٹم گھٹا ہو گئے مگر آنند کو اس شخص پر ہر اعتبار سے برتری حاصل تھی۔ وہ اس کے اوپر تھا۔ اس نے اپنے دونوں گھٹنے اس کے پیٹ پر رکھ دیے تو وہ پھلکی کی طرح تر پڑنے لگا۔ اس کے گلے پر پھندا تنگ ہوتا جا رہا تھا اور وہ پھندے کی گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اس نے آنند کو اوپر سے ہٹانے کے لیے اسٹنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا اب آنند نے اپنا پورا بوجھ اس پر ڈال رکھا تھا اور دے ہوئے شخص کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ آنند اس وقت تک اسے دبوچے رہا جب تک اسے سو فیصد یقین نہیں ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کے بعد اس نے بہت تیزی سے کام کیا۔ اس نے مردہ شخص کا کوٹ اور ٹائی اتار کر ایک طرف ڈال دی۔ موزے اور جوتے بھی اتار دیے۔ اس دوران میں مردہ شخص کی امبی ہوئی آنکھیں اسے کھول رہیں۔ ان آنکھوں کی پروا کیے بغیر آنند نے رسی کا ایک سرا دروازے کے ہینڈل سے باندھا فرش سے چھت تک کی بلند کا اندازہ لگایا اور پھندی کو چھت کے کٹے میں اس طرح پھنسا کر فرش سے اس کی بلندی ساڑھے چھ فٹ سے کم نہ ہو چن میں جا کر اس نے ریفریجریٹر سے ایک بوتل نکالی توڑا سا مشروب ایک گلاس میں ڈالا اور باقی مشروب سنک میں بہا دیا۔ تاہم بوتل میں تھپٹ باقی رہنے دی پھر بیڈ روم میں

آ کر اس نے گلاس اور بوتل پر مردہ شخص کی انگلیوں کو دبا کر دونوں چیزیں ایک طرف رکھ دیں۔ اس کی جیب سے لائٹر نکال کر سگریٹ الٹش ٹریے کے قریب ڈالا جو پہلے ہی ٹوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ احتیاطاً اس نے ایک سگریٹ سلگا کر الٹش ٹریے پر رکھ دی اور پھر مطمئن ہو کر لاش کی طرف پلٹ گیا۔ لاش کی گردن پھندے میں ڈالنے کے بعد اسے پھندا نیچے کرنا پڑا اور جب پھندے کی گرفت مضبوط ہو گئی تو اس نے اس کا دوسرا سرا کھینچنا شروع کر دیا۔ یہ وقت طلب کام تھا لیکن وہ اسے کر گزارا اور پھر جب لاش کے پیر فرش سے تین فٹ بلند ہو گئے تو اس نے دوسرا سرا دروازے سے دوبارہ باندھ دیا۔ اب اسے صرف ایک کام کرنا تھا۔ اس لاش کے پیروں کے نیچے تین فٹ اونچا اسٹول رکھ کر اسے گر دیا۔ اب اسے واپس جانا تھا مگر اس نے واپسی سے قبل بلب لیمپوں میں دوبارہ لگائے بیڈ ٹھیک کیا۔ لیمپ روشن کیے اور پھر لاش کو آنکھ مار کر نکل گیا۔

فلٹ ہاؤس سے نکلے ہوئے اس کا انداز بہت عام سا تھا۔ اس نے کچھ دور ایک گندے تالے میں دونوں چابیاں پھینک دیں پھر ایک بلبک بوتھ پر۔ ستیش بابو کے نمبر ملے اور تین بار گھنٹی کی آواز سن کر اس نے ریمور رکھ دیا۔ ہوٹل واپس جاتے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

اس رات اسے گہری نیند آئی مگر دوسرے آٹکے بھی کھلی ایک بار اس نے سگریٹ بھی پی اور پھر نو اگلی کے اس علاقے کے بارے میں سوچتا ہوا سو گیا جہاں ایک گندی بستی میں اس نے جنم لیا تھا مگر اس کی ماں بھی یہ نہیں بتا سکی کہ اس کا باپ کون تھا۔ وہ صرف یہ بتا سکی تھی کہ وہی کا ایک تاجر بابو بستی میں آیا تھا۔ اور پھر یہ وعدہ کر کے چلا گیا تھا کہ بچے کے پیدا ہونے سے قبل واپس آ جائے گا۔ اس کی ماں بچہ دیش کی آزادی کے لیے ہونے والی جنگ میں مکتی بستی کے ہاتھوں لٹی ہوئی تھی کیونکہ وہ ان کی

اکٹ تھی پھر ایک روز مکتی بستی کے ایک پورے سٹے نے نہ جانے کیوں اس کی ماں کو قتل کر دیا تھا۔ صبح ہونے پر اس نے ڈٹ کر ناشہ کیا اور پھر لگا کر آکھنے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ چشمے کی وجہ سے اس کی شخصیت بہت پروقار لگنے لگی تھی۔ جمعہ کا دن وہی میں اس کا آخری دن تھا لہذا اس نے عجیب گھر کی سیر کی، گاندھی جی اور اندرا گاندھی کی سادھیوں پر حاضری دی اور پھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے سفر کے انتظامات شروع کر دیے کیونکہ جو گندہ سنگھ کے آدمی نے کام پورا ہوتے ہی اسے سنگاپور بھیجنے کی ہدایت کی تھی۔

”آج رات کی پرواز ہے۔“ ٹریول ایجنسی کی حسین کلرک نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس کی ہر پر ایک خوبصورت سختی لگی ہوئی تھی جس پر شیلا لکھا ہوا تھا۔ ”کیا ایئر انڈیا کی فلائٹ ہی سے جائیں گے۔“

”کسی بھی فلائٹ سے جاسکتا ہوں۔“ آنند نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ویسے مجھے غیر ملکی پروازوں میں سفر کا لطف نہیں آتا کیونکہ ان کی فضائی سہولیات کسی چھلے ہوئے شلیم کی طرح لگتی ہیں۔ ہماری سہولیاتوں کی طرف سندر نہیں ہوتیں۔“ شیلا جی۔ اگر ایئر انڈیا میں نشست مل جائے تو کیا کہنے۔“

”میں کوشش کروں گی۔“ شیلا کو نے اپنے نامہ صورت و امتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ ساڑھے چار بجے آ جائیں۔“

وہ ہوٹل پہنچا تو فٹ پاتھ پر ستیش بابو ٹپ رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سرسری انداز میں دیکھا۔ ستیش قدرے پریشان لگ رہا تھا۔ اسے پریشان دیکھ کر آنند سوچنے لگا کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ہے، ستیش بابو پلٹ کر ایک طرف جانے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آنند بھی اس کے پیچھے ”لے“ ستیش کچھ دور جا کر ایک چھوٹے سے بار میں داخل ہو گیا اس نے سب سے آخری بوتھ منتخب کیا اور پھر آنند بھی اسی بوتھ میں چلا آیا۔

”کوئی پریشان تو نہیں ہوئی۔“ بوڑھے ستیش نے کھانٹے ہوئے پوچھا۔

”نہیں“ میں پریشانوں سے پریشان ہونے کا عادی نہیں ہوں۔“

”میں جانتا ہوں لیکن تم سے اس کام کے بعد دوبارہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ میں آج رات تم سے اور کام لینا چاہتا ہوں۔ اس کام میں نہ تو کوئی خطرہ ہے اور نہ ہی وقت۔“ ستیش نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

”مگر میں تو اگلی منزل کے لیے ٹکٹ بک کر چکا ہوں، مہاراج۔۔۔۔۔“ آنند نے لمبی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اسی دوران میں ویٹرنے آکر ان کے سامنے گلاس رکھ دیے۔ ”یہ دیکھیں۔۔۔۔۔ ٹکٹ یہ رہا۔ بس کنفرم کرنا باقی رہ گیا ہے۔“

”تو تم ایئر انڈیا سے سفر کرو گے۔“ بوڑھے ستیش نے ایک لمبا کھونٹ بھر کر کہا۔ ”کیا جو گندہ سنگھ کے آدمی نے تمہیں ایئر انڈیا کے بارے میں بتایا تھا۔۔۔۔۔“ آنند نے کوئی جواب نہیں دیا تو ستیش خود ہی بولا۔ ”نہیں جو گندہ سنگھ کے آدمی تمہیں کیوں بتائے گا۔ بہر حال میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے۔“

”کیا تم مجھے حکم دے رہے ہو ستیش بابو۔“ آنند کا بار بار اچھٹے لگا۔

”ہاں۔“ ستیش نے بڑے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔

”تمہیں میرے حکم پر عمل کرنا ہوگا اور حکم عدولی کا مطلب یہ ہوگا کہ تم جو گندہ سنگھ کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔“

”مگر میں ایسا نہیں سمجھتا۔“

”آنند۔“ بوڑھے کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”تم گندی نالی کے ایسے کیڑے ہو جس کو جب چاہو جوتے سے مسل دو۔ تم تو گندے باورچی خانے میں رینگنے والے کا کروچ



سے بھی زیادہ حقیر ہو۔ تمہیں کل رات کا کام اسی لیے سونپا گیا تھا کہ تم کوئی غلطی کر بیٹھو تو تمہیں مار دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ان کے لیے اہم نہیں ہو۔ سنو! اگر تم نے میرے حکم پر عمل نہ کیا تو تمہیں الزام قتل میں گرفتار کر لیا جاسکتا ہے۔ پولیس والوں کو ایک گناہ فون ہی کافی ہوگا۔ اندراجی ہی ہتیا کے بعد وہ پہلے ہی بے گنہگار ہیں۔“

آند کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ ایک کٹر و نجف و نزار بیمار بوڑھا اسے دھکیلا دے رہا تھا۔ ”اگر میں پکڑا گیا تو تم بھی نہیں بچ سکو گے۔“ اس نے ایک گھونٹ لینے کے بعد جواب دیا۔

”اسی کوئی بات نہیں ہوگی“ کالی کی کرپا سے یہاں کی پولیس میں میرا بڑا بھرم ہے کرم چار میرے ساتھ ہیں میرے پاس دولت کی تختی ہے جو سب شکلیوں سے بڑی ہے لہذا میری بات پر دھیان دؤ اپنی حیثیت کا خیال رکھو۔“

آند کا دل تھپا بار خوف سے دھڑکا۔ وہ جانتا تھا کہ بوڑھا کیا کہہ رہا ہے پھر بوڑھے نے اسے جو کام بتایا وہ واقعی اتنا بڑا نہیں تھا۔ ریسٹوران سے کچھ دور ایک نئی بھوری کار کھڑی ہوئی تھی جس کی پلیٹ کا نمبر آند یا آسانی ذہن میں رکھ سکتا تھا۔ تیش کی ہدایت کے مطابق آند کو اسی کار میں کار پارکنگ ایریا کے اندر جانا تھا۔ کار آئینڈنٹ کے بجائے اسے خود پارک کرنا تھی اور پھر آئینڈنٹ کے کین کی طرف پیدل جاتے ہوئے بھوری کار کے قریب سے گزرتا تھا۔ اس کے بعد اصلی مگر انتہائی معمولی کام کرنا تھا۔

”تم بھوری کار کے پچھلے پمپر پر بیٹھ کر اس طرح جھکو گے جیسے تھے باندھ رہے ہو۔“ تیش نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس دوران میں تمہارا دایاں ہاتھ بھر کے نیچے جائے گا اور تمہاری انگلیاں بھر کے نیچے چلی ہوئی کسی چیز سے ٹکرائیں گی۔ اس چیز کو نکال کر تیزی سے جیب میں ڈالنا ہوگا اور پھر تم آئینڈنٹ سے کار پارکنگ کا ٹکٹ لے کر وہاں سے نکل آؤ گے۔ میں تمہارا منتظر ہوں گا۔ بس یہ کام کرنا ہے اس میں کوئی

خطرہ نہیں یہ کام کر کے تم جو گندرسنگھ کی خوشنودی بھی حاصل کرو گے۔“

آند کو تیش بابو کی اس بات پر ایک فی صد بھی یقین نہیں تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں کیونکہ اگر واقعی کوئی خطرہ نہ ہوتا تو یہ کام خود تیش بھی کر سکتا تھا۔ اس نے یہ سوال تیش سے پوچھ ہی لیا۔

”صرف اس وجہ سے کہ مجھے فوراً شناخت کر لیا جائے گا۔“ تیش نے جواب دیا۔ ”اور پھر یہ تسلیم کر لیا کہ بعض ایسے افراد پارکنگ گراؤنڈ کے قریب ہی ایک فلیٹ کی نگرانی کر رہے ہوں گے جو اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔“

”لیکن تم؟“ تیش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ان کے لیے غلطی اجنبی بلکہ ایک انتہائی عام سے شخص ہو گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی نظر پارکنگ گراؤنڈ پر نہیں ہوگی۔ ان کا کام صرف فلیٹ کی نگرانی کرنا ہے۔“ یہ کہنے کے بعد اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں مزید کئی مرتبہ دھکیلا دیں کہ آند نے اس کا کام نہ کیا تو جو گندرسنگھ اسے پاتال سے بھی نکال کر اس طرح مار ڈالے گا کہ اس کی ارہی بھی نہیں اٹھے گی۔ اس دوران میں آند خود بھی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ تیش بابو نے جو گندرسنگھ سے اگر اس کی شکایت کر دی تو اس کا کیا حشر ہوگا وہ اپنے انجام کا سوچتا رہا اور تیش اسے تسلیاں دیتا رہا۔ اس نے بتایا کہ آند جو کار استعمال کرے گا وہ اس کی اپنی نہیں بلکہ کرائے کی ہے اور پھر اس نے میز پر دمکا مار کر کہا کہ بس بہت باتیں ہو گئیں اب کام کرؤ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔

کرائے کی گاڑی ریسٹوران سے کچھ ہی دور کھڑی ہوئی تھی آند چاروں طرف چابی لے کر ریسٹوران سے نکل آیا اس وقت تین بجتے ہیں میں منٹ تھے۔ تیش بابو نے اسے پارکنگ گراؤنڈ کا راستہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور اس بھوری کار کا نمبر بھی ذہن نشین کر دیا تھا جس کے پمپر کے نیچے آند کو کوئی چیز نکالنی تھی۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس نے

تمام حالات پر ایک بار پھر غور کیا کیونکہ اس وقت وہ آئینڈنٹ کے الاؤ میں چلا گیا لگانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے کار پارکنگ گراؤنڈ کے قریب ایک کونے پر گاڑی روک کر اطراف کا جائزہ لیا اور پھر گاڑی گراؤنڈ میں لے گیا۔ جس کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑھی اور صرف ایک جگہ جالک تھا جس کے ساتھ ہی آئینڈنٹ کا کین بنایا ہوا تھا۔ اس نے کار پارک کی۔ مگر بھوری کار کے قریب کے بغیر کین کی طرف بڑھا جہاں آئینڈنٹ نے اسے پارکنگ ٹکٹ دیا اس کے بعد وہ سڑک پار کر کے ایک چائیز ریسٹوران میں داخل ہو گیا جو پارکنگ گراؤنڈ کے بالکل سامنے تھا۔ یہاں سے وہ بھوری کار پر بخوبی نظر رکھ سکتا تھا اور اس کا ارادہ بھی یہی تھا کہ وہ حالات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ہی تیش بابو کے حکم پر عمل کرے گا۔ اس نے چکن اورن سوپ کا آرڈر دے کر کرسی سے ٹیک لگالی اور پارک پر گہما گہمی کا نظارہ کرنے لگا۔ یہاں درجنوں دکانیں اور سینکڑوں فلیٹ تھیں نئی دہلی کا مصروف ترین علاقہ تھا۔ پارکنگ گراؤنڈ کے دائیں طرف ایک عمارت زیر تعمیر تھی جس کے فٹ پاتھ پر چند عمارتیں اللہ بھگوان اور یسوع کے نام پر بھیک مانگ رہی تھیں غریبک یہاں ہزاروں افراد تھے۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس گہما گہمی میں بھلا کس کو فرصت ہے کہ وہ جوتے کا تسمہ باندھنے کی خاطر جھکنے والے پر نظر رکھتا پھرے۔ پارکنگ گراؤنڈ کے بائیں طرف رہائشی عمارت تھی جس کے ایک فلیٹ پر بقول۔ تیش بابو بعض افراد نظر رکھے ہوئے تھے لیکن خود آند کو ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا جس پر کسی فلیٹ کی نگرانی کا شبہ ہوتا ہو۔

چکن سوپ کا پیالہ ختم کرتے ہوئے سگریٹ لگانے کے بعد بھی وہ ان لوگوں کو تلاش نہیں کر سکا۔ فلیٹ کی نگرانی کر رہے تھے۔ چائیز ریسٹوران میں بھی اس وقت صرف دو دو گاہک موجود تھے دونوں نے والی ایک میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر میں

اخبار پڑھ رہا تھا جبکہ ماتھے پر سرخ تلک لگائے اینگو انڈین ویٹس مین میں مصروف تھی۔

وہ سوچنے لگا کہ اس مشن میں بھی کامیابی کے بعد وہ جو گندرسنگھ کی نظروں میں چڑھ جائے گا اور پھر جو گندرسنگھ اسے براہ راست احکام دیا کرے گا اس کی آج تک جو گندرسنگھ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور اس نے اوٹنی اوٹنی سنی تھی کہ گوردوارہ دربار صاحب پر فوجی آپریشن کے بعد جو گندرسنگھ نے دربار صاحب کی ہی کسی عمارت میں پناہ لے رکھی ہے اور یہ کہ وہ حکومت کے لیے کوئی اہم کام کر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ کھسوں کی بغاوت میں پاکستان کا ہاتھ ہونے کی جھوٹی اطلاع جو گندرسنگھ نے حکومت کو دی تھی مگر جب حکومت اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے میں ناکام ہونے کے بعد پشیمان ہو گئی تو جو گندرسنگھ نے فوجی طور پر خاموشی اختیار کر لی۔ تاہم آند کے نزدیک یہ خاموشی۔ خاموشی نہیں تھی کیونکہ اسے خود علم تھا کہ احمد آباد میں فساد کرنے کا کام خود جو گندرسنگھ کے قابل اعتماد ساتھی ہی نے اسے سونپا تھا۔ آند کے لیے یہ بات اہم نہیں تھی کہ جو گندرسنگھ اس طرح کیا چاہتا ہے بلکہ یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی تھی کہ جو گندرسنگھ کے لیے وہ کئی کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ وہ جتنی بار کامیاب ہوگا اسے اتنی ہی دولت ملے گی اور تحفظ ملے گا۔

وہ طویل سانس لے کر اٹھنے کا ارادہ کرنے لگا پھر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا کیونکہ کونے والی میز پر بیٹھے ہوئے دونوں گاہک بھی اب اٹھ چکے تھے اور ان کے قدم اس سیاہ کار کی طرف بڑھ رہے تھے جو ابھی فٹ پاتھ سے لگ کر رہی تھی۔ اس گاڑی میں تین افراد سوار تھے۔ جنہیں دیکھ کر آند گھبرا گیا اور اس نے اپنی شکل چھپانے کے لیے اخبار اٹھا لیا۔ تاہم اس نے اخبار اس طرح چہرے کے سامنے رکھا تھا کہ وہ ان پانچوں پر نظر بھی رکھ سکے چائیز سے جانے والے دونوں افراد اب گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک موٹے اور شاطر آدمی کو کچھ بتا رہے تھے۔ اس



فحش کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ان چاروں کا سربراہ ہے۔ اس شخص کو دیکھ کر آئند کے دل میں ستیش بابو کے لیے نفرت جنم لینے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اس منٹ قبل وہ بھوری کار کے قریب جا کر جوتے کے تسمے باندھتا تو کیا ہوتا۔ چائینز میں بیٹھے ہوئے بیبی دونوں کا ہیک سکون سے سڑک پار کر کے اسے پکڑ لیتے۔ اسے ستیش بابو کی کڑوی کبلی باتیں یاد آنے لگیں۔ ستیش نے اسے کارڈج سے بھی بدتر قرار دیا تھا۔ وہ دانستہ پینے لگا۔ یہ کیفیت اس پر اس وقت بھی طاری ہوئی تھی جب کئی باقی والے اس کی ماں کو گول کر رہے تھے۔

وہ مل ادا کر کے باہر نکلا اس نے ایک طرف کھڑے ہو کر سگریٹ سلگائی اور اس دوران میں ان پانچوں کے چلیے ذہن نشین کر لیے۔ وہ یقیناً خفیہ پولیس سے تعلق رکھتے تھے اور اب پھر مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ چائینز والے اب ایک کارز کی طرف چلے گئے تھے۔ ایک فحش سامنے والی ٹیبلر شاپ میں چلا گیا تھا جب کہ موٹا اور اس کا دبلا ساتھی کار میں بیٹھے بیٹھے جوش و خروش سے بحث کر رہے تھے۔ آئند انہیں یہ ساری سے انداز میں دیکھتا ہوا

ایک ایک اسٹور میں گھس گیا کیونکہ اب اسے یہ بے چینی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح ستیش بابو کو یہاں کی صورت حال سے مطلع کر دے۔ تاہم یہاں ٹیبلر فون نہیں تھا لہذا وہ مختلف کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا یہاں سے وہ ان دونوں افراد پر نگاہ بھی رکھ رہا تھا جو کوئی نہ کھڑے ہوئے تھے اسے بھوری کار بھی نظر آرہی تھی لیکن ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ ان پانچوں میں سے کوئی بھی بھوری کار کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ غیر معمولی طور پر محتاط تھے یا پھر بقول ستیش ان کا مقصد صرف اور صرف فلیٹ کی نگرانی کرنا تھا۔ اسے ابھی صبح صورت حال کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا اور ایسی کیفیت میں بھوری کار کی طرف جانا بھی احمقانہ بات تھی۔

تب ہی پارکنگ گراؤنڈ میں ایک اور کار داخل

ہوتی ہوئی نظر آئی اس کار کے ڈرائیور نے بھی آئند ہی کی طرح گاڑی خود پارک کی۔ یہ ایک بڑی سیڈان تھی آئند اس میں دلچسپی لینے لگا کیونکہ سیڈان بھوری کار کے نزدیک رک رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد ایک چوڑا چمکا سکھ اس گاڑی سے اتر اور جب بھوری کار کے قریب پہنچا تو ایک پیراس کے ہمپر پر رکھ کر جوتے کے تسمے باندھنے لگا۔ اس کا سیدھا ہاتھ صرف ایک سیکنڈ کے لیے ہمپر کے نیچے گیا۔ آئند کو شدید خطرے کا احساس ہونے لگا۔ اس نے سانس روک کر اس سکھ کی طرف دیکھا جواب بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگا رہا تھا لیکن ابھی وہ ایک کش بھی لینے نہیں پایا تھا کہ موٹا اور اس کا دبلا ساتھی نمودار ہوئے۔ دونوں سکھ کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ جب کہ ان کے دونوں ساتھی فٹ ہاتھ پر چوکس نظر آنے لگے۔ یہ سب کچھ انتہائی خاموشی اور کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر ہو گیا کسی راہ گیر نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ موٹے نے مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں سکھ کا ہاتھ تھام لیا جب کہ اس کے دبیلے ماتحت نے سکھ کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ اسے فلیٹ میں لے گئے اور پھر جب فلیٹ کا دروازہ بند ہوا تو آئند نے دیر سے رکی ہوئی سانس خارج کی اور پینہ پونچھے لگا۔ اب اسے کوئی انداز نہیں تھا کہ ستیش بابو کے اس دوسرے پیغامبر کا کیا انجام ہوا تاہم کچھ دیر بعد اسے موٹا شخص فلیٹ سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید کاغذ تھا۔ اس کاغذ کو آئند فوراً پہچان گیا۔ یہ پارکنگ ٹکٹ تھا جو سگریٹ سلگانے سے قبل اسٹینڈنٹ نے سیڈان والے کو دیا تھا۔ غالباً انہوں نے اس کی تلاش لی تھی۔ پارکنگ گراؤنڈ میں جا کر موٹے نے اسٹینڈنٹ سے کچھ کہا ٹکٹ دکھایا اور پھر وہ دونوں بھوری کار کی طرف بڑھنے لگے مگر جب وہ بھوری کار کے قریب سے گزر گئے تو آئند نے ایک بار پھر پیشانی سے پینہ پونچھا وہ موٹے کو سیڈان میں گھسے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر سیڈان ایک جھٹکے سے آگے بڑھی ریورس ہوئی اور

پارکنگ سے نکل کر فلیٹ بلڈنگ کے سامنے کھڑی ہوئی۔ تاہم اس کا انجن بند نہیں ہوا۔ موٹا ایک بار پھر فلیٹ میں چلا گیا چند لمحوں بعد سیڈان والا فلیٹ سے نکلا۔ اس کے دائیں بائیں موٹا اور دبلا دونوں موجود تھے۔ انہوں نے سکھ کو سیڈان میں بٹھا دیا۔ موٹا جھٹک کر اس سے باتیں کرنے لگا لیکن سکھ کا چہرہ ساٹ رہا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے لیے کچھ دیر بعد موٹا اکتا کر ایک طرف ہٹ گیا اور دبیلے شخص نے آئینڈنگ سیٹ سنبھال لی اسی لمحے سیڈان روانہ ہوئی۔ مگر اب بھی موٹے نے بھوری کار کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ آئند کا حلق ترختے لگا۔ سوال یہ تھا کہ یہ لوگ آخر کیا کر رہے ہیں۔ کیا سکھ نے انہیں بھوری کار کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کیا اب بھی یہ ممکن ہے کہ وہ بھوری کار کے بارے میں مشن مکمل کر کے کسی راہ گیر کی طرح بلا روک ٹوک یہاں سے نکل گئے۔ اس کی پچھلی حس اسے خبردار کرنے لگی کہ ان برادر افراد کو بھوری کار کی اہمیت کا بالکل اسی طرح علم ہے جس طرح سکھ کے بارے میں علم تھا۔ وہ جان بوجھ کر کار کی طرف متوجہ نہیں ہیں تاکہ شکار شکاری کو بے خبر سمجھ کر سکھ کی طرح ہی فاش غلطی کر بیٹھے۔ سوال تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ اس کا جواب اسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن یہ علم ضرور تھا کہ بوڑھا ستیش بار میں اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اسے بار کا نام معلوم نہیں تھا لہذا ایک لمحے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہنگامہ نہ کھانے کا تصور کیا تو اسے احساس ہوا کہ اس کے حاشوں پر واقعی بھاری ذمے درمی آ پڑی ہے اور بھوری کار کے ہمپر میں جو کچھ بھی چھپا ہے اس کا حلق بوگندہ ہے ہی ہوگا اور یہ کہ ستیش بابو یہاں جو گندہ کے گردہ کا سرغنہ ہے۔

وہ سوچنے لگا کہ اگر ان افراد کو کار میں کوئی دھکی نہیں تو وہ جلد ہی یہاں سے چلے جائیں گے اور مردہ اطمینان سے اپنا کام کر سکے گا یہی سوچ کر وہ فٹ ہاتھ پر آیا اور جان بوجھ کر نگرانی کرنے والے کے سامنے سے گزرتا چلا گیا مگر ان میں سے

کسی نے بھی اس پر ذرہ برابر توجہ نہیں دی۔ وہ مسلسل قدم اٹھاتا رہا اور یہ سوچ کر نواب صلابت جنگ روڈ کی سمت میں بڑھنے لگا کہ اب دو گھنٹے بعد ہی وہاں آجائے گا۔ اس دوران میں وہ ستیش سے مشورہ کرنے کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ٹکٹ بھی اوکے کرانا تھا۔ وہ پہلے ٹریول ایجنسی گیا۔ شیلڈ کو کسی دوسرے کام میں مصروف تھی اور ایک روکھا بھیکا آدی ریزوریشن ڈسک پر کام نمٹا رہا تھا۔ اس نے اشارے سے آئند کو اپنی باری کا انتظار کرنے کے لیے کہا حتیٰ کے پانچ بجے اس کی باری آئی۔ اس شخص نے بڑی مردہ دلی سے ٹکٹ کنفرم کیا۔ اس تاخیر سے آئند اکتا چکا تھا۔ سڑک پر ٹریفک بھی بہت زیادہ تھی اور کوئی خالی ٹیکسی نظر نہیں آرہی تھی لہذا وہ پیدل ہی باری کی طرف چل پڑا۔ وہ بیچ کر نہیں منٹ پر بار میں داخل ہوا تو وہاں ستیش بابو موجود نہیں تھا۔ آئند جھجکا کر رہ گیا۔ اس نے ستیش کے نمبر ملائے مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے ریسیور ہنچ دیا۔

☆☆

آئند چار بجے کے لگ بھگ پارکنگ گراؤنڈ کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس وقت دو افراد کارز پر کھڑے ہوئے تھے جب کہ موٹا شخص اپنی کار میں تھپا بیٹھا ہوا تھا۔ تینوں افراد ایک دوسرے سے التعلق نظر آ رہے تھے۔ وقت گزرتا رہا مگر پھر چندہ منٹ بعد ایک ٹیکسی فلیٹ بلڈنگ کے سامنے آ کر رکی ٹیکسی سے اترنے والا شخص اگرچہ زیادہ عمر کا نہیں تھا لیکن اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ وہ نکڑا کر چلتا ہے۔ اس شخص کے بال گھنے اور سیاہ تھے اس کے چہرے کی رنگت سانولی تھی اور چہرے سے پروقار نظر آ رہا تھا اس کو دیکھتے ہی موٹا آدی پھرتی سے کار سے اتر گیا اور فلیٹ بلڈنگ کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میں چھڑی والا شخص ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر دروازے کی طرف پلٹ رہا تھا۔



موٹے آنے آگے بڑھ کر اس سے اپنا تعارف کرایا اور پھر اسے کچھ بتانے لگا۔ چھڑی والے دراز قدم شخص کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرنے لگے۔ پانچ منٹ تک وہ موٹے کی باتیں سنتا رہا۔ اس دوران میں اس کا سر جھکا رہا مگر کبھی بھی وہ سر اٹھا کر موٹے کو دیکھتا۔ بھی رہا۔ آخر میں موٹے نے اپنی کاری طرف اشارہ کیا جس پر چھڑی والے شخص نے برا سامنے بناتے ہوئے کاری طرف قدم اٹھا دیے۔ موٹا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور نووارد شخص نے برابر والی سیٹ سنبھال کر چھڑی احتیاط سے گود میں رکھ لی۔ وہ پھر باتیں کرنے لگے۔ اب اس پر وقار شخص کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمودار ہونے لگے۔ وہ نشست پر پہلو بدلنے لگا۔ خود موٹے کے چہرے پر بھی غصہ نظر آنے لگا اور دونوں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے تاہم اس خاموش زبان کا اثر چھڑی والے شخص پر ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ کھینچے پر رکھے اور پھر غصیلے انداز میں بولا۔ ”بند کرو یہ باتیں مجھے جھوٹا اور منافقانہ احترام پسند نہیں مجھے بار بار مسٹر احمد مت کہو میں جانتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو انپکٹر فاروق مجھے کوئی پروا نہیں کہ تمہارے پاس راج کے خلاف کیا اطلاعات ہیں۔ تم اگر اس کے خلاف رات بھر اسی کاری میں بیٹھے رہ کر بک بک کرتے رہو گے۔ تب بھی مجھے تمہاری کسی بات پر یقین نہیں آئے گا۔ تم اس کے بارے میں رائے طلب کر رہے ہونا۔ تو سنو ہمیں راج پر شک ہے مگر مجھے تمہاری ذہنی کیفیت پر شبہ ہے۔“

”ہم دونوں میں سے کسی ایک کا شبہ درست ہو سکتا ہے مسٹر احمد۔“ انپکٹر فاروق نے برامانے بغیر جواب دیا۔ ”مجھے احساس ہے کہ آپ کو اپنے دوست راج پر اس قسم کے الزامات سن کر کیا محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن اگر ہمیں راج کے بارے میں چند باتیں معلوم ہو جائیں تو.....“

”تمہیں تو راج کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ آج کل تم لوگ شہریوں کی نجی زندگی میں تا

جھانک کر رہے ہو۔ میں یہاں اپنے دفتر سے صرف اس لیے آیا ہوں کہ رنجیت سنگھ نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ راج کو کم لوگوں سے کوئی پریشانی ہو سکتی ہے۔ لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم لوگ میرے خطر ہو گے اور مجھے کسی گندے کھیل میں اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کرو گے۔ یہ نہیں اب تک میں کس طرح یہ ساری باتیں سنتا رہا ہوں۔“

”میں تو آپ کو صورت حال سے آگاہ کر رہا ہوں مسٹر احمد۔“

”تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔“ احمد نے کہا۔ ”اور تمہارے ہر سوال کا میرے پاس یہی جواب ہے۔“

”ہوں۔“ انپکٹر فاروق نے ہنکارا بھر کر کہا۔ ”آپ یقین کریں کہ آپ کا دوست انتہائی بڑی مصیبت کا شکار ہو سکتا ہے۔ میں آپ سے صرف اتنی درخواست کر سکتا ہوں کہ بعد میں ہمیں مورد الزام نہیں ٹھہرائیں گے۔“

”کیا مطلب۔“ احمد نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”سنو فاروق میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگ کس طرح کام کرتے ہو پانچ سال قبل جب میں وزارت میں تھا تو میں نے اس قسم کے کئی کیس رنجیت سنگھ کے لیے حل کر کے دیے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے اس جرم کی سزا کا اچھی طرح علم ہے جس کا الزام تم میرے دوست راج پر لگا رہے ہو۔ اسے پانچ سے دس سال کی سزا ہو سکتی ہے۔“

”نہیں۔“ فاروق نے اپنی ہتھیلیاں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب سزائے موت بھی ہو سکتی ہے نئے قانون کے تحت سزا جرم میں ملوث ہونے کی شدت کو دیکھ کر دی جا رہی ہے۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ احمد نے گھبرا کر فاروق کی طرف دیکھا اسے اچھی طرح علم تھا کہ نئے قوانین کتنے سخت ہیں۔

”آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔“ انپکٹر فاروق نے دیر سے کہا۔ ”لیکن آپ کا اصرار

یہی ہے کہ راج فرشتوں کی طرح معصوم ہے ممکن ہے کہ ہمیں کوئی غلط فہمی ہو لیکن آپ اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے ہماری مدد تو کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ اس سے بات کریں ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے وہ کسی بھی وقت آ سکتا ہے میں اب تک جو کچھ کہتا رہا ہوں اس پر مجھے سو فیصد یقین ہے۔ مثال کے طور پر ہم گزشتہ سچر سے اس کا فون شیپ کرتے رہے ہیں اس نے کل تین بجے آپ کو فون کیا تھا اور اسی فون کے بعد ہمیں یہ علم ہوا کہ آپ اس کے قریبی دوست ہیں۔“

”ہاں وہ میرا دوست ہے اور اس نے مجھے فون کیا تھا میں نے اس کی تردید تو نہیں کی۔ فون کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں.....“

”ہرگز نہیں۔“ انپکٹر نے فوراً جواب دیا۔ ”میں آپ کو اس اسکیڈل میں ملوث کرنے کا قبل بھر کے لیے بھی نہیں سوچ سکتا لیکن آپ اس کے دیرینہ رفیق ہیں۔ آپ فوجداری مقدمات کے بہترین وکیل بھی ہیں ممکن ہے اس نے آپ سے کسی جرم کے بارے میں کوئی مشورہ کیا ہو مجھے یقین ہے کہ کل وہ آپ سے اسی نوعیت کا مشورہ کرنا چاہتا تھا لیکن آپ کے پاس دو تین اہم مقدمات کی سماعت کے باعث اس سے ملنے کا وقت نہیں تھا لہذا آپ آج اس سے ملنے کے لیے آ گئے۔ آپ یقین کریں کہ وہ حدود سے آگے بڑھ گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ہمیں وسیع تجربہ ہے اور ہم محض علامتوں کی بنا پر بہت کچھ سمجھ لیتے ہیں۔“

احمد کا حلق خشک ہو گیا وہ علامتیں دیکھ کر مرض تشخیص کرنے کے واقعی ماہر تھے۔ ”میں تم لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں فاروق۔“ اس نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ”پہلے تم میٹھی میٹھی باتوں سے مجھے پھانسا چاہتے تھے اور اب دھکیوں پر اتر آئے۔ صرف اس لیے کہ میں اپنے دوست راج کے خلاف کوئی ثبوت فراہم کر دوں لیکن تم اور تمہارا پورا گروہ سے کوئی جھوٹا بیان نہیں لے سکتا اگر اس کے

خلاف تمہارے پاس کوئی اطلاع ہے۔ تو اس کی چھان بین کرنا تمہاری ذاتی ذمہ داری ہے۔“

”درست!۔“ انپکٹر فاروق نے قلیٹ اور پھر مرکزی دروازے کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ ”لیکن ہم سب اتنا چاہتے ہیں کہ آپ یہاں اس کا انتظار کریں۔ اس کے ساتھ قلیٹ میں جائیں۔ اس کی باتیں سنیں اور پھر خود فیصلہ کریں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ یہ اندازہ لگائیں کہ وہ آپ سے کس طرح پیش آتا ہے صرف اسی وجہ سے اسے ایس بی رنجیت سنگھ نے آپ کو اس مسئلے میں شامل کیا ہے۔ ہمیں واقعی مدد کی ضرورت ہے احمد صاحب۔“

”میرے خدا۔ رنجیت مجھے استعمال کرنا چاہتا ہے۔“

”یہ بات نہیں ایس بی رنجیت سنگھ کو آپ کی حب الوطنی پر اعتماد ہے۔“

”میں اب بھی تم سے کوئی وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ احمد کا لہجہ اس بار نرم تھا۔ ”لیکن مزید پانچ منٹ ضائع کر سکتا ہوں۔ اس دوران تم جو چاہو مجھے بتا سکتے ہو میں تفصیلات سننا چاہتا ہوں۔“

”گڈ.....“ فاروق نے مسکرا کر کہا۔ ”سنئے! وہ سنگار پور جانے والی پرواز کا ہوا باز ہے جو آگے مغربی جرمی تک جاتی ہے۔ وہ بنگلہ دیش جانے والی فلائٹ بھی چلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھارتی کسٹمر سے بے خوف و خطر گزر جاتا ہے اس سے صرف یہ پوچھا جاتا ہے کہ اس کے پاس کوئی قابل اعتراض چیز تو نہیں وہ ٹکی میں جواب دیتا ہے اور پھر اس کا طیارہ پرواز کر جاتا ہے۔ اتنی سہولت سے وہ یقینی طور پر ناجائز فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“

”تمہارا یہ بیان راج کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرنا انپکٹر۔“

”میرے پاس مزید حقائق بھی موجود ہیں مسٹر احمد۔ گزشتہ چند ہفتوں سے ہم ایک شخص ہری لال میں بہت دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ ہم ان لوگوں پر کبھی



نظر رکھتے رہے ہیں جن کا اس سے تعلق ہے اور ان لوگوں میں ہم نے بھی اپنا ایک آدمی شامل کرادیا ہے۔ اس طرح ہمیں ان سب کے بارے میں کافی تفصیلات مل گئی ہیں ان میں سے چند کو ہم فوراً پکڑ سکتے تھے لیکن ہم نے جان بوجھ کر ڈھیل دے رکھی ہے کیونکہ ہم چند افراد کو نہیں بلکہ پورے گروپ کو پکڑنا چاہتے تھے۔ تاہم یہ ہماری فاش غلطی تھی کیونکہ آج صبح دس بجے ایک انتہائی حساس اور نازک خفیہ دستاویز کسی نے ہری لال کے حوالے کر دیں۔ اس کی اطلاع ملتے ہی ہم نے کارروائی شروع کر دی۔ ہم نے سب کو پکڑ لیا لیکن ہری لال اور ستیش بالو نامی دو افراد بچ نکلے۔ ستیش بالو یہاں ایک درآمدی و برآمدی کمپنی کی آرٹسٹ جاسوسی کا دھندلا کر رہا تھا۔ اب ہمیں ہر قیمت پر ان اہم افراد کو پکڑنا ہے۔ ہم نے ان کی کمین گاہ پر چھاپہ مارا تو ہمیں وہاں سے مائیکرو فلمیں بنانے کا سامان ملا۔ وہ اصل دستاویز بھی مل گئی جو ہری لال کے حوالے کی گئی تھی۔ اس کی آٹھ فلمیں بھی ہاتھ لگ گئیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے دس فلمیں بنائی تھیں تو یہی فلم بھی ہمارے ہاتھ لگ گئی مگر ہری لال بچ نکلا۔ اب ہمیں دسویں فلم کی بھی تلاش ہے جو یقیناً ہری لال کے قبضے میں ہوئی۔ ہمیں ایک ذریعے سے علم ہوا ہے کہ اس گروہ کو انڈیا کے بعض ذمے دار افراد کا تعاون حاصل ہے اور ان ہی افراد کے ذریعے یہ لوگ حساس دستاویزات کی مائیکرو فلمیں اسمگل کرتے ہیں جو روس، امریکہ، مغربی جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے ہاتھوں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ انڈیا میں وہ لوگ کون ہیں جو اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس طرح کی اسمگلنگ میں ملوث ہوتے ہیں تاہم پھر ہمیں بتایا گیا کہ راج اس پکڑ میں کسی نہ کسی طرح ملوث ہے لہذا ہم نے یہاں اس کے فلیٹ کی نگرانی شروع کر دی۔

”ہمیں راج پر شبہ کیوں ہوا۔“

”میلی فونکال سے۔“ انسپکٹر فاروق نے

جواب دیا۔ ”ہمیں ایکس چیجنگ کے ریکارڈ سے معلوم ہوا کہ راج جب بھی فلائٹ پر جاتا ہے تو فلیٹ سے نکلنے سے قبل ایک شیخ ہری لال کا فون ضرور آتا ہے۔ ان دونوں میں کیا باتیں ہوتی ہیں۔ اس کا ہمیں کوئی علم نہیں کیونکہ اس وقت تک ہم نے میلی فون ٹیپ کرنے کی ہدایت نہیں دی تھی۔“

”واہ! تمہارے شک کی وجہ اب معقول نظر آنے لگی ہے۔“ احمد نے طویل سانس لے کر کہا۔

”شکریہ۔“ فاروق کے چہرے پر پہلی بار فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”ہری لال اور ستیش بالو دونوں پر بندوں کی طرح میرے ہاتھ سے اڑ گئے۔ ستیش آج اپنے دفتر بھی نہیں پہنچا لیکن ہم نے دفتر کی نگرانی شروع کر دی ہے۔ اسی طرح اس کے فلیٹ کی بھی نگرانی ہو رہی ہے آج تقریباً ڈھائی بجے اس کے فون کی گھنٹی بجی لیکن بد قسمتی سے ہم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے کیونکہ دوسری طرف سے سواری رنگ نمبر کہہ کر فوراً ریسور کھ دیا گیا۔ ویسے ہمیں یقین ہے کہ رانگ نمبر کہنے والا ہری لال کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا اس کو علم ہو گیا ہے کہ ستیش کے فلیٹ پر پولیس کا قبضہ ہے لہذا وہ اپنے طور پر فلم اسمگل کرانے کی کوشش کرے گا اور اس کام کے لیے راج کو استعمال کرے گا۔ ہمیں اس بات پر یقین ہے کہ انہیں ابھی تک یہ علم نہیں ہو سکا ہے کہ ہم انڈیا کے کنکشن سے باخبر ہو چکے ہیں پھر قسمت ہی نے ہمارا ساتھ دیا۔ ہری لال اس لاکھی میں ہے کہ ہم راج تک نہیں پہنچ سکے ہیں کچھ دیر قبل یہاں آیا اور ہم نے اسے پکڑ لیا۔“

”اوہ! احمد کا لہجہ اس بار کنزرتھا۔

”لیکن ہمیں پھر بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ ہری لال کے قبضے سے فلم نہیں مل سکی ویسے مجھے سو فیصد یقین ہے کہ فلم گرفتاری سے قبل اسی کے پاس تھی اور اس نے کسی خاص طریقے کو استعمال کرتے ہوئے اسے کسی جگہ منتقل کر دیا تھا اور پھر راج کو یہ سکتل دینے کے لیے آیا تھا کہ فلم مقررہ جگہ پر رکھی جا چکی ہے اب

میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ راج کے ذریعے یہ فلم درجن ملک اسمگل کی جا رہی ہے اور یہ فلم ان لوگوں کی ہمت کے بارے میں ہے جو برصغیر کے مختلف ممالک میں ہمارے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ فلم اگر کسی آئی اے کے ہاتھ میں چلی گئی تو ان تمام افراد کو صبح ہونے سے قبل پکڑ لیا جائے گا اور ہماری غیر ملکی ایجنسی جس کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ہمیں اس فلم کی بالکل اسی طرح ضرورت ہے جس طرح قریب المرگ شخص کو آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ایک ایک لمحہ جیتی ہے۔ ایئر انڈیا کی سنگاپور فلائٹ گیارہ بجے روانہ ہو جائے گی اور ہم اس سے قبل ہی فلم قبضے میں لیتا چاہتے ہیں۔“

”راج کے بارے میں تم کسی غلط فہمی کے شکار تو نہیں ہو۔“ احمد نے لرزبانی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ سلگا کر کہا۔ ”میں اس شخص کو ۱۹ء کی جنگ سے جانتا ہوں۔“

”غلط فہمی۔“ انسپکٹر فاروق نے کہا۔ ”نہیں مسٹر احمد اگر آپ اسے غلط فہمی سمجھتے ہیں تو صرف یہ بتادیں کہ ہر فلائٹ سے قبل ہری لال اسے فون کیوں کرتا تھا۔“

”یہ سوال تم خود اسی سے پوچھ سکتے ہو۔“ احمد نے خشک لہجے میں جواب دیا لیکن وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس ڈپٹی انسپکٹر نے راج کے گرد دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ ”مگر وہ ہے کہاں۔ آج دن بھر کیا کرتا رہا ہے۔“

”وہ آج ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ نظر آیا تھا ہم نے اس کا ریکارڈ کھنگال ڈالا ہے۔ وہ دو تین شادیاں کر چکا ہے اور اب ایک نئی لڑکی امرت کو اس کی زندگی میں داخل ہو چکی ہے۔ وہ سکھ ہے اور ہم اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ امرت کو رہی نے راج آج دن بھر کھومتے پھرتے رہے ہیں اور ہمارے آدمی کی اطلاع کے مطابق اب وہ اپنے فلیٹ میں اہل آس لے والا ہے۔“

”تمہیں علم ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں وہ ایک بار میری جان بچا چکا ہے۔“ احمد نے مختصر لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ لیکن مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی کہ اس احسان کا بدلہ اسے خبردار کر کے چکا میں گئے مسٹر احمد! اس طرح آپ بھی سازش بجرمانہ کے مقدمے میں ملوث ہو سکتے ہیں۔“ فاروق نے کہا۔

”اوہ۔ وہ آگیا۔ ٹیکسی سے اتر رہا ہے۔“

فلیٹ کا ڈرائنگ روم بہت وسیع اور انتہائی خوبصورت تھا اور احمد کی آنکھیں راج پر جمی ہوئی تھیں جو بوتل سے مشروب انڈل رہا تھا۔

”مادھو کا کیا حال ہے راج۔“ احمد نے ذہنی اضطراب کو کم کرنے کے لیے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہے بہت اچھی بہن ہے۔ احمد اور شاید تمہارے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگی ہے آج رات تمہارا کیا پروگرام ہے میں اور مادھو رات کا کھانا اسکاٹی روم میں کھائیں گے تم بھی ساتھ چلو۔“

”تم تو کسی فلائٹ پر جا رہے ہو نا۔“

”ہاں رات گیارہ بجے کی فلائٹ ہے۔“ راج تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے دو گھنٹے قبل بریفنگ ملنی ہے لیکن ہم تینوں پہلے وہاں ج کر کے کچھ وقت گزار سکیں گے۔“

احمد طویل سانس لے کر رہ گیا۔ انسپکٹر فاروق نے یہی درخواست کی تھی کہ وہ طیارے کی روانگی تک راج پر نظر رکھے۔

”درحقیقت! احمد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور تم بھی پریشان ہو دو نہ فلائٹ سے قبل گلاس ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔“

”ہاں۔ ہاں۔“ راج لایسنی انداز میں بولا پھر مسکرانے لگا۔ اس کی عمر اڑتیس سال تھی اور احمد اس سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ دونوں محاذ پر ایک ساتھ تھے اور جب ساکلوٹ کے محاذ پر بھارتی فوج کو ہزیمت اٹھانی پڑی تو پسپائی کے دوران احمد کی ٹانگ



میں گولیاں لگی تھیں اور یہ راج تھا جس نے اسے اٹھا کر عقبی مورچے تک پہنچایا۔ اس وقت راج سے گفتگو کرتے ہوئے احمد بہت محتاط تھا کیونکہ یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی کہ دروازے کے پیچھے کوئی شخص کھڑا ہوا ان کی گفتگو سن رہا ہوگا۔

”میں تم سے ایک قانونی مشورہ لینا چاہتا ہوں“ احمد! راج نے اچانک ہی کہا۔

”کیا لوسی نے نان نفقہ کا مقدمہ کر دیا ہے۔“ احمد نے پوچھا۔ لوسی اور راج کی شادی ایک سال قبل ہوئی تھی اور اب مسئلہ طلاق تک پہنچ گیا تھا۔

”نہیں ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اسے سچاس ہزار روپے دے کر جان چھڑا چکا ہوں اور اب وہ میرے من میں بھی نہیں رہی ہے۔ اس وقت میں اہم اور سنگین مسئلے پر تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہوں۔“ ”ضرور۔“ احمد لنگڑاتا ہوا کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا نیچے سڑک پر ٹریفک زندگی کے تیز رفتار کارواں کی طرح رواں دواں تھا۔

”میں سیدھے سادے لفظوں میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ زمانہ جنگ میں اگر ہم کوئی چیز ادھر سے ادھر لے جاتے ہوئے پکڑے جاتے تو اس کی سزا کیا ہوتی۔“

”سزا!“ احمد نے تھوک نکلنے کے لیے گھاس سے بڑا سا گھونٹ لیا۔ ”سزا کا انحصار ادھر سے ادھر لے جانے والی چیز پر ہوتا ہے راج۔“ ”اگر اگر کوئی شخص یہ کام کسی لڑکی کی خاطر کرتا تب۔“

”تب!“ احمد کا جسم سنسنانے لگا وہ سوچنے لگا کہ کیا فاروق کی ہر بات سچی ہے۔ ”تب بھی سزا کا انحصار اس عمل کی جانے والی چیز کی اہمیت پر ہوتا۔ تب تم کیا کہنا چاہتے ہو راج یولو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”میرا مطلب یہ تھا کہ!“ راج نے کچھ کہنا چاہا مگر اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی یہ راج کی بہن مادھوی۔ وہ احمد کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ اس کی عمر احمد کے برابر تھی۔ وہ

پہلے اپنے بھائی اور پھر احمد کو دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے اپنا پرس ایک طرف ڈال کر دھیرے سے کہا۔ ”تم کہاں غائب تھے احمد۔“ ”نہیں نہیں“ میرا خیال ہے کہ تم ہی غائب تھیں۔“ احمد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور راج بھی سر ہلا کر مسکرانے لگا۔

”اور تمہارا کیا حال ہے بھیا۔“ وہ معنی خیز انداز میں بھائی کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”کوئی نئی دوست بنی یا۔“

”مادھو!“ راج نے معنوی غفگی سے کہا۔ ”تم بہت بے باک ہوئی جا رہی ہو جانتی ہو میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔“

”بالکل جانتی ہوں مگر۔“ ”سنو! ہم تینوں اس فلیٹ میں وقت برباد کرنے کے شغل میں ہو سکتے۔ آج رات کھانے پر تم میرے مہمان ہو گے“ میرے ساتھ ایئر پورٹ چلو گے اور جب میں اپنا پرندہ لے کر پرواز کر جاؤں گا تو سنجیدگی سے یہ فیصلہ کرو گے کہ آخر تم دونوں میں اجنبیت کب تک برقرار رہے گی۔“

مادھو حیا سے سرخ ہوئی اسے علم تھا کہ احمد کو اپنانے میں واحد رکاوٹ مذہب ہے اور وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ احمد کو اپنانے کے لیے مسلمان بھی ہو سکتی ہے۔ اسے بچپن سے ہی مسلمانوں سے انیت تھی اور وہ نہ صرف مسلم خاندانوں میں جانی رہتی تھی بلکہ بعض اوقات اجنبی اسے مسلمان ہی سمجھتے تھے کیونکہ اس نے عام طور سے شلوار قمیض پہننا شروع کر دی تھی۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا مہمان بننے پر تم دونوں کو کوئی اعتراض نہیں۔“ راج نے آنکھ مارنے ہوئے کہا۔ احمد کا دل نہ جانے کیوں ڈوبنے لگا۔ اسے ایک بار پھر یقین ہونے لگا کہ راج مجرم نہیں اور یہ کہ فاروق محض احمقانہ شبہ کی بنیاد پر اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

اس دوران نیچے سڑک پر بھی کوئی خاص واقعہ

دہلا نہیں ہوا لوگ بس اسٹاپ پر کھڑے رہے۔ گاڑیاں آتی جاتی رہیں مگر فاروق کی سیاہ گاڑی یہاں بھی وہیں کھڑی رہی فاروق کے آدمی مختلف مقامات پر کھڑی ہوئے تھے۔

☆ ☆ چھ بجے کے قریب فوجی کوٹ اور سرخ ہیٹ پہنے ہوئے ایک شخص چوراسے پر نمودار ہوا اس کے ہیٹ میں مور کا پر لگا ہوا تھا۔ سڑک پار کرنے کے بعد وہ ایک میڈیکل اسٹور میں داخل ہو گیا اور وہاں سے لٹلے کے بعد پان کی دکان سے سگریٹ لینے لگا۔

آئندے سگریٹ خریدتے ہوئے کن اکھیوں سے مشتہ افراد کی طرف دیکھا دو افراد کارنر پر موجود تھے ایک کار میں بیٹھا ہوا تھا جب کہ ایک نے چائیز میں اسٹول سنبھالا ہوا تھا۔ آئندہ طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ اب بھی موجود اور چوکس تھے اور انہیں اپنا کسی کا انتظار تھا پھر یہ سوچ کر اس کی منہ کا ذائقہ ہو گیا کہ ان لوگوں کو پھوری کار کے بارے میں کیا معلوم ہے اور وہ اس شخص کا انتظار کر رہے ہیں جو اس کار کی طرف قدم بڑھا لے گا۔ اس نے مزید چند لمحوں کے توقف کے بعد میڈیکل اسٹور سے نکل کر بائو کے نمبر پھر ملائے۔ اس بار کسی نے ریسیور اٹھایا مگر اس کی آواز تیش بائو کی نہیں تھی۔

”وہ تشریف نہیں رکھتے جناب لیکن بہت جلد واپس آ جائیں گے۔ آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں میں آتے ہی انہیں مطلع کر دوں گا۔“

”ان سے کہنا کہ میں انہیں تفصیلی خط لکھوں گا۔“ آئندے رخ انداز میں جواب دے کر ریسیور لے دیا اور یہ سوچ کر ہی گھبرانے لگا کہ دوسری طرف سے کوئی پولیس والا تھا۔ اس نے سب کچھ چھوڑ کر ہمارت سے نکل جانے کا ارادہ کر لیا مگر ابھی پرواز کی روانگی میں بہت وقت باقی تھا اور پھر۔ پھر جو گنڈر کو جواب بھی دیتا تھا۔ آئندے سن رکھا تھا کہ کسی نام کی تکمیل نہ ہونا جو گنڈر سٹک کے نزدیک ناقابل مال جرم ہے اور مجرم کو یا تو براہ راست قتل کر دیا جاتا

ہے یا پھر وہ سڑک کے کسی حادثے میں مارا جاتا ہے۔ آئندہ بھی سوچ کر لرز گیا کہ اگر تیش باؤ نے یہ کام اسے جو گنڈر کے کہنے پر سونپا ہے تو پھر اس میں ناکامی کا مطلب اذیت ناک موت ہی ہوگا۔

ان ہی سوچوں میں غلطیاں وہ شوکیس میں رکھا ہوا سامان دیکھنے لگا اس شوکیس کے ساتھ ایک کھڑکی تھی اور یہاں سے اسے وہ دونوں آدمی صاف نظر آ رہے تھے جنہوں نے کارنر پر پوزیشن سنبھال رکھی تھی ان دونوں کا رخ فلیٹ کی طرف تھا سیاح گاڑی بھی پارکنگ گراؤنڈ سے دور کھڑی ہوئی تھی اور وہ چائیز میں بیٹھے ہوئے شخص کی پوزیشن ایسی تھی کہ اسے پورا پارکنگ گراؤنڈ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ محاسب کی کی طرح ایک نیا خیال اس کے ذہن میں چمکا۔ اگر پولیس والوں کو پھوری کار پر شبہ تھا تو سیاہ کار پارکنگ گراؤنڈ میں ایسی جگہ پر کھڑی نظر آتی جو پھوری گاڑی سے زیادہ دور نہیں ہوتی اور پارکنگ اینڈینٹ کے کہیں میں بھی کوئی خفیہ پولیس والا آدمی ضرور موجود ہوتا تیش باؤ کی یقین دہانی اس کے کانوں میں گونجنے لگی کہ ان لوگوں کی ساری دیکھی صرف فلیٹ تک محدود ہے جو گنڈر سٹک اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ کر وہ میڈیکل اسٹور سے نکل آیا اور پارکنگ گراؤنڈ کی خاردار پاڑ کے قریب سے گزرتا چلا گیا اگرچہ رات ہو چکی تھی لیکن پارکنگ گراؤنڈ کی وسعت کا بھی انداز لگایا یہ ایک گونے سے دوسرے گونے تک پھیلا ہوا تھا ایک طرف کاروں کے داغے کا راستہ تھا کاریں اسی راستے سے واپس بھی جاتی تھیں جب کہ دوسری طرف نہ صرف گھپ اندھیرا تھا بلکہ ایک پاڑ بھی ٹوٹی ہوئی تھی اس نے اس جگہ رک کر دائیں بائیں دیکھا اور ایک نئے خیال سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اس ٹوٹی ہوئی پاڑ کو پار کرنے کے وہ چند گز دور ایک ٹرک کی آڑ میں چھپ سکتا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ یہ کام کر کر راور ٹرک کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے چند منٹ تک انتظار کیا مگر نہ تو کسی نے اسے



لکارا اور نہ ہی کوئی نظر آیا پھر وہ لمبی سانس لے کر ٹرک کی اوٹ سے نکل کر ایک کاری آڑ میں آ گیا اور اسی طرح چھپتا چھپتا ہوا بھوری کاری طرف بڑھنے لگا اب بھوری گاڑی اس سے دس قدم دور نظر آ رہی تھی یہاں سے چائیز بھی نظر آ رہا تھا اس میں چند گاہک موجود تھے مگر خیر محکمہ والا نظر نہیں آ رہا تھا وہ کچھ سوچتا رہا اور پھر بھوری کاری کے عقب میں پہنچ گیا اس نے بمپر کے نیچے ہاتھ ڈالا تو اس کا دل اچھ کر تپنے میں آ رہا وہاں کوئی چیز واقعی موجود تھی پولیس والوں نے جس شخص کو پکڑا تھا اس نے گرفتاری سے قبل بڑی مہارت سے یہ چیز بمپر کے نیچے چھکا دی تھی تاہم اب یہ ٹیپ اکھاڑنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا اس نے چاقو نکالنے کے لیے ہاتھ جب کی طرف لے جا رہا تھا کہ اس کی نظر موٹے اور دبے شخص پر پڑی وہ دونوں سڑک کے پار پارکنگ گراؤنڈ کی طرف منہ کیے کھڑے تھے وہ گاڑی کے پیچھے دیک کر بیٹھ گیا اس نے ان پر مسلسل نظر رکھی وہاں نہیں کر رہے تھے اسے ایسا لگا کہ جیسے دونوں اسے دیکھ چکے ہیں اور اب چوہے بلی والا کھیل کھیلتا جا رہے ہیں خوف کی وجہ سے اس کی سانس تک رک گئی اس نے چاقو نکال کر اسے کھول لیا اسے یقین تھا کہ اگر دونوں اس کی طرف آئے تو وہ چاقو زنی میں اپنی مہارت کے باعث دونوں کو زخمی کر کے فرار ہو سکے گا۔ لیکن پھر پھر کیا ہوگا۔

پھر اچانک ہی وہ دونوں مخالف سمتوں میں چلے گئے اور آئندہ سکون کی سانس لینے لگا۔ اس نے مزید وقت ضائع کئے بغیر چاقو کی تیز دھار سے ٹیپ کاٹا اور پھر اس کے ہاتھ نے ایک مائیکرو فلم سنبھال لی۔ اس نے مسکرا کر خود کو شاباش دی۔ ابھی وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ پارکنگ اینڈسٹ اس کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ آئندہ ایک بار پھر گھبرا گیا۔ اس نے فلم تو جیب میں رکھ لی مگر اسے چاقو بند کر کے جیب میں ڈالنے کا موقع نہیں مل سکا لہذا اس نے کھڑے ہوتے ہوئے چاقو والا ہاتھ پشت پر رکھ لیا اور پھر

اینڈسٹ کے سر پہنچ گیا۔  
”کون ہو۔“ اینڈسٹ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”یہاں کسی طرح آئے۔ میں نے تمہیں کے سامنے سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔“  
پارکنگ کٹ کہاں ہے۔“

آئندہ نے خود کو پرسکون رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور پشت کاری طرف کر لی تاکہ چاقو والا اینڈسٹ کو نظر نہ آ سکے۔ ”میری چابی گر پڑی اسے تلاش کر رہا تھا بھائی میاں۔“ اس نے خالہ پرانی دلی والے لہجے میں کہا۔ ”یہ لو۔ یہ رہا کٹ۔“ اس نے کوٹ کی ایک جیب سے کٹ نکال کر اینڈسٹ کی طرف بڑھا دیا۔

”ٹھیک ہے مگر تم پارکنگ میں داخل کی طرح ہوئے۔“ کٹ دیکھ کر اینڈسٹ کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ”دیکھو بھی میں یہاں کھڑی ہوئی کاروں کے ڈسے دار ہوں اگر کسی کار سے کوئی چیز چوری ہو گئی میری گردن تانی جائے گی۔“

”گویا مجھے لنگا اور اچکا سمجھ رہے ہو۔“ آئندہ نے قدر غصیلے انداز میں کہا مگر اب بھی اسے چاقو جیب میں ڈالنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

”معافی چاہتا ہوں جناب لیکن آپ اس کار کے قریب کیوں کھڑے ہیں۔ یہ کار تو پکتان ران کی ہے اور یہ آپ کے دوسرے ہاتھ میں کیا ہے جسے آپ نے پشت پر چھپا رکھا ہے۔“ یہ کہہ کر اینڈسٹ آگے بڑھا مگر اس سے قبل کہ وہ کوئی حرکت کرتا آئندہ نے لپک کر ایک ہی ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی اور پوری قوت سے اس کے پیٹ گھٹنا مارتے ہوئے فوراً ہی ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اینڈسٹ کے منہ سے آواز نہ نکلی لیکن وہ اس سے لپٹ گیا۔ دونوں ایک کار کے قریب فرش پر گر پڑے اور پھر آئندہ نے بڑی نفاست سے اینڈسٹ کے دل میں چاقو پیوست کر دیا۔ اس بار اینڈسٹ کے دل میں چاقو پیوست کر دیا۔ اینڈسٹ کے دل سے بہت لمبی آواز نکلی اور وہ پٹ سے گر پڑا۔

اس کشمکش میں اینڈسٹ کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ بھی گر چکا تھا اور کٹ کی تلاش لا حاصل تھی اب اسے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ایک کار کے عقب میں دبک گیا۔ خون اڑا ہوا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ دوسرا کٹ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ لوگ اور کاری طرف ہی آ رہے تھے اس کا خون خشک ہو گیا۔ پھر آئندہ کی نظر ان پر پڑی۔ وہ تین تھے اور ایک عورت۔ ایک شخص کے ہاتھ میں کٹ تھی اور دوسرا انڈیا کی وردی میں تھا۔

”چلو۔ تم دونوں بھی میرے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھو۔“ اسے وردی والے کی آواز سنائی دی۔

بھوری کاری کے دروازے کھلے اور بند ہو گئے۔ پارکی کے مترجم قہقہے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ذرا بعد بھوری کاری کی ہیڈ لیمنس روشن ہو گئیں۔ گاڑی رپورس ہوئی اور پھر تیزی سے سڑک کی طرف دوڑ گئی۔ آئندہ نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور ہاتھ قاطع انداز میں اسی راستے سے واپس نکل گیا اس سے پارکنگ گراؤنڈ میں داخل ہوا تھا۔

ایک تاریک جگہ پر رک کر اس نے کوٹ کے کھوکھڑا سا کٹ کر اس میں فلم چھپائی کوٹ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا اور جب یہ یقین ہو گیا کہ ہاتھ پھیرنے سے بھی فلم کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا مسکراتے لگا۔ چاقو اب اس کی دوسری جیب میں چھپ چکا تھا۔ کامیابی کی سنسنی بہت خوشگوار تھی اور وہ پارکنگ گراؤنڈ سے نکلنے ہوئے یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ فلم تیش باؤ کو دینے کے بجائے جو گندر سنگھ کے پاس آ دی کو دے گا تاکہ اس کے نمبر بڑھ سکیں اس طرح ممکن ہے کہ جو گندر سے بھی اس کی ملاقات ہو جائے اور وہ اس کا خاص آدمی بن جائے۔

ہوٹل پہنچ کر اس نے سوٹ کیس میں کپڑے ڈالے اور بل ادا کر کے باہر چلا آیا۔ یہاں اسے جلد ہی مل گئی۔

”ایئر پورٹ چلو۔“ اس نے سوٹ کیس کو چھت پر رکھتے ہوئے کہا۔  
سات بج کر دس منٹ ہوئے تھے اور بھوری کاری تیزی سے ہوائی اڈے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ”آج تم میں لوگوں کو ٹرل کے اندر لے جاؤں گا۔“ راج نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد تم دونوں کو کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دوں گا تاکہ بریفنگ میں شرکت کر سکو۔“ مادھو ذرا اس لڑکے سے یہ تو پوچھو کہ یہ آج اتنا کام کیوں ہے۔“

”درحقیقت۔“ احمد نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا لیکن اس وقت وہ مسکراتا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اب تک جو باتیں ہوئی تھیں۔ ان سے صاف ظاہر تھا کہ راج مضطرب اور پریشان ہے۔ اس کی نظریں عقب نما آئینے پر تھیں لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کون سی کار پولیس والوں کی ہے۔

کچھ دیر بعد ان کی گاڑی ٹرل میں داخل ہو گئی۔ یہاں سے انہیں انڈیا کی عمارت صاف نظر آ رہی تھی اور عقب میں ایک سیاہ گاڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ تاہم اس کا فاصلہ دوسو فٹ سے زیادہ تھا ان کے دائیں طرف دیگر تھے اور بائیں طرف چھوٹی بڑی عمارتیں اور لاؤنج وہ انڈیا کی پارکنگ میں اتر گئے۔ اب احمد کو گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ گاڑی کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ راج نے گاڑی سے اتر کر اپنا خاص بیک نکالا جو ایئر انڈیا کا عملہ اپنے سامان کے لیے استعمال کرتا تھا۔ دیگر کے دروازے پر لکھا تھا۔ ”صرف ملازمین کے لیے یہ نوٹس پڑھتے ہوئے بھی احمد سوچ رہا تھا کہ کیا مائیکرو فلم راج کے بیک میں ہوگی۔ راج انہیں لے کر عمارت کے اندر داخل ہوا۔ یہاں ایک ادھیڑ عمر ٹیلی فون آپریٹر مصروف تھا۔ قریب ہی سبز گارڈ کھڑے ہوئے تھے اور آپریٹر کے بالکل سامنے ایک کمرے پر تختی لگی ہوئی تھی۔ ”صرف ہوا بازوں کے لیے ریسپشن کے قریب انڈیا کی وردی میں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا جس سے احمد کی ایک ہی



ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی راج کے فلیٹ میں۔ یہ اڑاٹھا کا چیف پائلٹ تھا۔ احمد سوچنے لگا کہ چیف پائلٹ کی حیثیت سے چارلی ہر جگہ آ جاسکتا ہے اور گیا وہی راج کو کسی طرف لے جا کر کچھ دے گا۔ وہ مادھو کے ساتھ ایک بیچ پر بیٹھ گیا اور راج پر وقار انداز میں چلتا ہوا ریسیشن ہال کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ اس نے آپریٹر سے کچھ پوچھا۔ ”نہیں بیٹن!“ آپریٹر نے جواب دیا۔ ”میں نے مسٹر چارلی کو بہت دیر سے نہیں دیکھا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ راج نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ابھی کافی وقت ہے۔ اس سے کہنا کہ میں چند دوستوں کے ساتھ مسافروں والے لاؤنج میں طوں گا۔“ اس کے بعد وہ ہال میں چیف پائلٹ کے پاس آیا۔ دونوں کے درمیان چند باتیں ہوئیں اور احمد نے دوری سے انداز لگایا کہ چیف پائلٹ قدرے مضطرب اور کشیدہ سا ہے پھر دونوں بریفنگ روم میں چلے گئے۔ ان دوران مادھو ساڑھیوں میں لمبوس ان حسین فضائی میزبانوں کو دیکھتی رہی جو تیلیوں کی طرح ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔

”نئی خوبصورت لگ رہی ہیں۔ کیوں احمد۔“ اس نے کن انھیوں سے احمد کی طرف کر پوچھا۔ ”نہیں۔“ احمد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ لڑکیاں خوبصورت نہیں، ان کا لباس خوبصورت ہے۔“ اگرچہ تہمرہ اس نے بہت خوشگوار لہجے میں کیا تھا لیکن وہ اب بہت الجھا ہوا تھا اور صرف یہی سوچ رہا تھا کہ کیا راج کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث ہے پھر جب اس سوچ نے واقعی دوسری شکل اختیار کرنا شروع کر دی تو وہ تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے مادھو کو وہیں چھوڑ کر باہر آ گیا اس وقت اڑاٹھا کی بس میں کسی پرواز کا علم سوار ہو رہا تھا ان سب کے ٹریول بیگ ایک جیسے تھے۔ ان کو دیکھ کر معا احمد سوچنے لگا کہ کیا ان ایک جیسے ٹریول بیگ میں کوئی چیز اسمگل کی جاسکتی ہے بس کے جاتے ہی اس نے طویل سانس لی اور پھر لاؤنج میں واپس آ گیا۔

یہاں ایک ٹریول بیگ ابھی موجود تھا کہ یہ ٹریول بیگ راج کا ہے۔ اسی لمحے ایک عجیب سے خدشے نے اس کے قدم روک لیے ”کیا راج واقعی اسمگلر ہے۔ کیا راج واقعی راز فروخت کر رہا ہے۔“ انسپکٹر فاروق کی باتیں اسے یاد آنے لگیں اور شبہ تقویت پکڑنے لگا کہ راج کسی نہ کسی طرح ملوث ضرور ہے۔ اسی شبہ نے اس کے حلق کو خشک کر دیا اور مادھو کی طرف جانے کے بجائے پھر باہر چلا آیا۔ اس بار وہ پارکنگ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ پھر اچانک اسے دو افراد نظر آئے۔ ایک سیدھا کھڑا ہوا تھا اور دوسرا گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں اس کے عزیز ترین دوست راج کی بھوری گاڑی کے قریب تھے پہلے تو احمد ساکت کھڑا رہا۔ پھر انہیں چور سمجھ کر تیزی سے گاڑی کی طرف لپکا اور اس نے چوروں کی پٹائی کرنے کے لیے چھڑی مضبوطی سے پکڑ لی لیکن جو بھی وہ ان کے قریب پہنچا اس کا خون خشک ہو گیا سیدھا کھڑا ہوا شخص کوئی اور نہیں بلکہ انسپکٹر فاروق تھا۔

”آؤ احمد!“ فاروق نے اس کی طرف دیکھ کر اس بار تمام تکلفات بالائے طاق رکھ دیے اور احمد اس نو جوان کو دیکھتا رہا جو گھٹنوں کے بل جھکا ہوا راج کی کار کے بمپر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ”مجھے تم سے چند باتیں کرنی ہیں احمد! کیا یہ بتانے کی زحمت کو ادا کرو گے کہ چائیز والے پارکنگ گراؤنڈ میں کیا واقعات رونما ہوئے تھے۔“ فاروق کے لہجے میں اکھڑ پن تھا۔ ”اینڈنٹ کا کیا حشر کیا۔“

”کیا مطلب۔“ احمد کو اس کی بدتمیزی پر غصہ آنے لگا۔ ”پارکنگ گراؤنڈ میں کیا ہونا تھا ہم کار میں بیٹھے اور یہاں چلے آئے۔“

”اور یہاں چلے آئے۔“ فاروق نے تلخ انداز میں کہا۔ ”تم نے اینڈنٹ کو پارکنگ فیس دی تھی۔“

”وہ وہاں نہیں تھا اور پھر راج پارکنگ فیس کی ادائیگی ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو کرتا ہے یہی مستقل انتظام ہے۔“

”تم نے سنا موہن!“ فاروق نے اپنے دبلے لہجے سے کہا۔ ”شاید احمد یہ کہنا چاہتا ہے کہ کار میں آئے اور پھر پارکنگ سے نکلے ہوئے ان سے کسی نے بھی اینڈنٹ کو نہیں دیکھا تھا۔“

”نظر یہ لہجے میں بات مت کرو انسپکٹر۔“ احمد نے اپنی سیڑھی سے جواب دیا۔ ”جسمیں جو کہتا ہے کو لیکن ان درازی مت کرنا ورنہ میں نہیں۔“

”تم بھی دھمکیاں دینے سے پرہیز کرو۔“

انسپکٹر فاروق نے نرم لہجے میں جواب دیا کیونکہ اسے علم تھا کہ اگر احمد واقعی بڑا گیا تو وہ جنگ عزت کے اصول مقدمے دائر کر دے گا اور اخبارات بات کا اعلان نہیں گے۔

”صرف اتنا بتا دو کہ راج کی کار کہاں کھڑی ہوئی تھی۔“

”پارکنگ گراؤنڈ کے آخری حصے میں۔“ احمد نے اپنی اس بات کا نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”اس کے ساتھ ایک فیت کار بھی سمجھ گئے۔“

”گڈ اور اسی فیت کے قریب ایک شخص کو اینڈنٹ بھگوان داس کی لاش ملی تھی اس کی اطلاع ہمیں چند لمحے قبل وائر لیس پر ملی ہے کیا تم نے اس کی لاش۔“

”چیف!“ موہن اچانک چلا اٹھا۔ ”دیکھو! یہاں ان کی سوگند یہاں کچھ چپکا ہوا تھا۔“

”اوہ!“ فاروق نارنج لے کر بمپر کے نیچے ہاتھ لگے لگا اور پھر اس نے چٹکی سے سرخ اسکاچ کا ایک ٹکڑا نکال کر نکال لیا۔

”میرے خدا!“ وہ اس طرح سر ہلانے لگا کہ اسے ہچھتاوا ہو رہا ہے۔

”ہم سب گدھے اور نا اہل ہیں موہن ہم نے لالہ کی گرفتاری کے بعد اس کار کی نگرانی ترک کر دی تھی اور یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ہری لال نے اس کی مدد سے کوئی چیز گاڑی میں چھپا دی ہوگی۔“

”سانپ تو نکل گیا کیر پینے سے کیا حاصل۔“

”سانپ تو موجود ہے چیف!“ موہن نے

دانت پیٹے ہوئے کہا۔ ”میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ راج نے کار سے اترتے ہی سب سے پہلا کام یہی کیا ہوگا کہ فلم نکال کر جب میں ڈال لی ہوگی۔ وہ تو ہمارے ہاتھ میں ہے جب چاہیں اس کو پکڑ لیں۔“

”ہمارے ہاتھ میں۔“ انسپکٹر فاروق نے بڑے پرسکون لہجے میں دہرایا۔ ”میں موہن۔ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو کیا تم تیش بابو کو بھول گئے وہ ابھی تک کہیں نظر نہیں آیا ہے اسے علم ہو چکا ہے کہ ہم نے آج ہی اس کے فلیٹ پر چھاپہ مارا ہے اس کے آٹھ دس ساھی بھینگی میں پکڑے جا چکے ہیں۔ ہم نے ہری لال کو بھی گرفتار کر لیا ہے اب تک وہ سمجھ چکا ہوگا کہ ہم جن جن کرسازشیوں کو پکڑ رہے ہیں لہذا اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا ہوگا کہ فلم کی اسمگلنگ کے سلسلے میں اب راج پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا اس صورتحال میں اس نے کسی دوسرے کے ذریعے فلم بمپر کے نیچے سے نکلوانی اور یہی دوسرا شخص اینڈنٹ کا کل بھی کر بیٹھا ہمیں اس قاتل کے بارے میں کوئی علم نہیں۔“

احمد منہ بھاڑے سب کچھ سنتا رہا۔

”میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اینڈنٹ بھگوان داس کا قتل راج نے نہیں کیا۔“ انسپکٹر فاروق نے پشیمانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے پاس بھگوان داس کو قتل کرنے کا موقع ہی نہیں تھا کیونکہ اس کے ساتھ نہ صرف اس کی بہن بلکہ خود ہمارا دوست احمد بھی تھا۔ قاتل چوری چپے چپے ہائی باڑ بار کر کے پارکنگ گراؤنڈ میں داخل ہوا اور پھر کام مکمل کر کے خاموشی سے چلا گیا اور ہم احمقوں کی طرح سڑک پر کھڑی رہے مجھے یقین ہے کہ تیش اپنے اس دوسرے ذریعے کو کسی دوسری اڑاٹھا کے ذریعے کہیں اسمگل کرنے کی کوشش کرے گا فلم لے کر جانے والا شخص اڑاٹھا کے علاوہ امریکی فرامینسی تھا یا پاکستانی اڑاٹھا بھی استعمال کر سکتا ہے سوال یہ ہے کہ ہم اسے کس طرح روکیں گے ہمیں نہ تو اس کا حلیہ معلوم ہے اور نہ ہی نام۔ خلاصہ



ہے کہ اس وقت فلم راج کے پاس نہیں کسی ایسے شخص کے پاس ہے جس کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں صرف اور صرف ستیش اسے جانتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ اچانک احمد کی طرف پلٹا۔ ”ویل صاحب! کیا راج نے ڈکی سے بیک نکالتے ہوئے کوئی غیر معمولی حرکت کی تھی۔“

”میرا خیال ہے کہ نہیں ویسے اس دوران مادھو سے گفتگو کر رہا تھا۔“ احمد نے دیانت داری سے جواب دیا۔

”احمد کو اپنی بہن سے جو گفتگو دیکھ کر اس نے ہنسنے کے بجائے تھوڑا سا کلم نکال لی ہوئی چیف!“ موہن اب بھی اپنی ضد پر قائم تھا۔

”یہ شک بھی پانچ منٹ میں دور کر لیا جائے گا۔“ فاروق نے جواب دیا۔ ”کار نکالو ہم اسے پتھر لاؤنج کے سکوری آفس میں لے چلیں گے اور کسٹم کا خصوصی اسکاؤڈ اس کی تلاشی لے لے گا۔ کسٹم کے بلیک گیگنگ والے سوئی تک بھی تلاش کر سکتے ہیں۔“

”فاروق۔ اس کی بہن بھی یہیں موجود ہے۔“ احمد نے احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔ ”میں مجبور ہوں احمد۔“ فاروق انگلیاں مٹاتے ہوئے بولا۔ ”میں پہلے ہی ڈیل دے کر ہتھارہا ہوں۔ یقین کرو کہ ایس بی رنجیت سنگھ اس صورتحال کو ٹھیک پسند نہیں کرے گا۔“

”اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“ احمد نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”وہ سوچ رہا تھا کہ اگر راج کو بلیک گیگنگ کے حوالے کر دیا گیا تو مادھو پر گزرے گی۔“ ”کچھ نہیں۔ تم نے ہماری زیادہ مدد نہیں کی لیکن جو کچھ بھی کیا اس پر میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور احمد اپنی جگہ پر مفلوج سا کھڑا رہا پھر جب وہ نکلنا ہوا آفس ڈور پر پہنچا تو اس نے ان تینوں کو ہال میں دیکھا فاروق چیف پائلٹ سے کچھ کہہ رہا تھا اور راج بخور سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی جب کہ چیف پائلٹ کا

چہرہ ستا ہوا تھا اور مادھو آنکھیں مچاڑے ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی حالت دیکھ کر احمد کا دل کٹنے لگا اور وہ اس کے برابر جا کر بیٹھ گیا پھر اچانک فاروق پلٹ کر ایک طرف چل دیا اور چیف پائلٹ کی طرف راج بھی اس کے پیچھے چلے لگا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے احمد۔“ مادھو نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس وقت وہ تینوں فاروق کی گاڑی میں بیٹھ رہے تھے جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موہن نظر آ رہا تھا۔ چیف پائلٹ نے گاڑی میں بیٹھنے سے قبل راج کے ٹریول بیک خود اٹھالیے تھے۔

☆☆

آئندہ ٹیکسی میں سفر کے دوران بھی یہی سوچنا رہا کہ اب اسے ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہے تاکہ سنگاپور پہنچ کر وہ جو گند رنگہ کے خاص آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے اور پھر جب جو گند رنگہ کے روہاس کی پیشی ہو تو اس کا سر فخر سے اٹھا ہو۔ اسے صرف یہ خوف تھا کہ انرا انڈیا کی پرواز سے سنگاپور کے سفر میں نہیں پکڑا نہ جائے لیکن اب وہ ٹکٹ تبدیل کرانے کا خطرہ بھی مول لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ٹریول لاؤنج میں کسی قسم کے اضطراب یا کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرے گا صرف یہی ایک ایسا طریقہ تھا جس میں اس کی بچت تھی۔

ہوائی اڈے پر اتر کر اس نے دو تین لمبی لمبی سانس لیں یہاں سینکڑوں مسافروں کو دیکھ کر وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگا۔ ایئر انڈیا کے مسافروں کے لیے مخصوص حصے میں داخل ہوتے ہی ایک قلی نے اس کا سوٹ کیس سنبھال لیا اور وہ بڑے باوقار انداز میں اپنے مور کے پر والہ ہیٹ ٹھیک کرنا ہوائی قلی کے پیچھے چھپ چل دیا۔ لاؤنج میں پہنچ کر اسے مزید اطمینان ہوا۔ یہاں خود کار نظام کام کر رہا تھا۔ مسافر کو صرف اپنا ٹکٹ دکھانا ہوتا تھا اور پھر سوٹ کیس یا بیک پکٹ سے ٹیک لگا کر متحرک و خود کار ہیٹ پر رکھ دیا جاتا تھا جو اسے ایک مخصوص مقام تک لے جاتا

تھی۔ سوٹ کیس ہیٹ کے حوالے کرنے کے بعد وہ اڑا دیا کے کاؤنٹر پر گیا جہاں اس نے سیٹ کنفرم کرائی اور محض دو منٹ میں ساری رسمی کارروائی ختم ہو گئی اب وہ آزادی سے چل پھر سکتا تھا۔ یہاں اس کی نگرانی کا کوئی امکان نہیں تھا اور نہ ہی اسے اس موٹے پولیس والے کی فکر تھی جو چائینز کے دہرائے دے سکتا تھا۔ اس کے ساتھ نظر آیا تھا۔ وہ گریٹ ہونٹوں میں دبا کر ادھر ادھر کھونٹے لگا۔ اس کو لاؤنج کے حد پسند آیا کیونکہ یہاں دیواروں کی ہلکی سی گونج تھی جن کے آواز پر دیکھا جاسکتا تھا۔ اسے گیت نمبر تین پر ایک جھوٹا نظر آیا۔ یہ ایک آٹھ بجے لندن کے لیے پرواز کرنے والا تھا اور ٹیک آٹھ بجے جب جو جیت کی پرندے کی طرح اٹھائے بیٹھ میں پرواز کرتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے لاؤنج کی دکانوں کا جائزہ لیا۔ یہاں نوادرات، کپڑے اور زیورات فروخت اور ہے تھے۔ ایک طرف پبلک ٹیلی فون بوٹھ بنے ہوئے تھے جن کے باہر مختلف شہروں اور حتی کہ مشہور ہالک کی ٹیلی فون ڈائریکٹریاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ لاؤنج سے ایک زینہ میزبان فلور تک لے جاتا تھا۔ یہ فلور دکانوں کے اوپر تھا۔ فلور پر چھوٹے چھوٹے ریسٹوران بنے ہوئے تھے جن میں درجنوں افراد کھانے پینے میں مصروف تھے۔

فلور کے دائیں طرف ایک چکر دار زینہ تھا جو کافی شاب پر ختم ہوتا تھا جبکہ بائیں طرف والا زینہ کافی ٹیل لاؤنج کی طرف لے جاتا تھا۔ کافی شاب کا خیال آتے ہی اسے ہنک گئے تھے۔ اس نے ابھی تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا اور ہوائی اڈے پر پہنچنے سے قبل اسے اشتہا بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

کافی شاب میں اس نے خوب رغبت سے کھانا کھا کر اب کھائے اور اس دوران میں وہ یہ بات بھی لیتا رہا کہ کہیں کوئی مشکوک آدمی تو اس پاس موجود نہیں ہے۔ اسے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا تاہم وہ ایسے افراد ضرور دکھائی دیے جو لمبے لمبے چوٹے

ہوتے تھے۔ وہ انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس کی محویت کا یہ عالم اس وقت ہوا جب ایک حسین ویرس نے اچانک اس کے خالی کپ میں کافی اٹھائی۔ غالباً ویرس نے بھی ان چوغوں والوں میں اس کی دلچسپی کا انداز لگایا تھا لہذا وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ”آج رات ایسے بہت سے لوگ نظر آئیں گے کیونکہ دلائی لامہ خود سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں نے دو طیارے چارٹر کر رکھے ہیں۔ یہ لوگ پوپ سے ملنے کے لیے روم جارہے ہیں۔“

”بڑے عجیب لوگ ہیں کیا یہاں ان لوگوں کو برگزیدہ سمجھا جاتا ہے۔“

”کیا مطلب۔“

”مطلب یہ کہ کیا یہ لوگ واقعی مہمان ہیں مہمان ہونے والے۔“

”لاکھوں لوگ ان کو مہمان قرار دیتے ہیں لہذا ہمیں بھی ان کا احترام کرنا چاہیے۔“ ویرس نے اس بار غصیلے لہجے میں جواب دیا اور اسے گھورنے لگی۔ مگر آئندہ یہی سوچتا رہا کہ کیا ان مہمان آتماؤں سے کوئی پاپ بھی نہیں ہوا۔

”سنو! ان میں سے بعض لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر سرخم کر رہے ہیں۔ دلائی لامہ کی آمد پر تو یہ سجدہ کرنے لگیں گے۔“ آئندہ کا لہجہ اب مسخرانہ تھا۔ اس پر ویرس چلی گئی سروس کاؤنٹر پر جا کر اس نے پلٹ کر آئند کی طرف دیکھا۔ جواب بھی چوغوں والوں کی طرف متوجہ تھا۔ لڑکی نے اشارے سے ایک ایسے نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کیا، جولا ابالی سالگ رہا تھا۔ وہ قریب آ یا تو اس کی پشت آئند کی طرف تھی اور چہرہ قد آدم آئینے کی طرف۔

”مارٹن اس دے لمبے پتے دراز قدم آدمی کا جائزہ لو جو کونے والی میز پر اکیلا بیٹھا ہوا ہے مور کے پر والا ہیٹ لگائے ہوئے۔ میری مانو تو اس پر نگاہ رکھو۔“

”اوہ! مارٹن نے پلٹے بغیر کہا۔ مگر اسے پلٹنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ قد آدم آئینے میں ہیٹ والا شخص صاف نظر آ رہا تھا۔“ کیا چکر ہے چندا۔“



”بڑی عجیب سی باتیں کر رہا تھا۔“ چندا نامی اس لڑکی نے بالوں کی ایک لٹ ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ ”یا تو نشے میں ہے یا پھر۔ مجھے تو کوئی جنونی اور کرائے کا قاتل لگ رہا ہے۔ بار بار دلائی لامہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“

”شکر یہ چندا! میں اسے ابھی چیک کئے لیتا ہوں اگر اس کے پاس ٹکٹ نہیں ہوا تو اسے لاؤنج ہی سے نہیں ہوائی اڈے سے بھی نکلوا دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ کافر سے سگریٹ کا پیکٹ خریدنے لگا۔ اسی دوران آندہ بھی بل ادا کرنے کے لیے وہاں آ گیا اور جب آندہ وہاں پہنچا تو مارش بھی اس کے ساتھ ساتھ ٹھکر پڑھیں جو بچے جارہی تھیں۔ ”ہیلو۔“ مارش نے مائل کی۔ ”تم نے ان چوٹوں والوں کو دیکھا اور ذرا ان ہوا بازوں کو تو دیکھو طیارہ چلاتے ہوئے کچھ بھی خوف محسوس نہیں کرتے۔“ اس کی نظریں ہلک کر اب ہوا بازوں کی ٹولی پر جم گئی تھیں۔

”ہاں یہ بات سو فیصد درست ہے۔“ آندہ نے مسکرا کر کہا وہ اسے دوغلی نلی کا کوئی امیر زادہ سمجھ رہا تھا۔

”دلائی لامہ دس بجے یہاں پہنچے گا۔ کیا عجیب منظر ہوگا وہ!“ مارش نے اسے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

”وہ ان کا بڑا آدمی ہے نا۔“

”گیارہ بجے کی فلائٹ سے سنگاپور جا رہا ہوں۔“ آندہ نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ دلی سنگاپور کی فلائٹ سے۔۔۔۔۔!“

مارش نے حیرت سے پوچھا۔ ”مجھے ابھی کوئی بتا رہا تھا کہ کافی شاپ میں اسی فلائٹ کا ایک ٹکٹ پڑا ہوا ملا ہے اپنا ٹکٹ دیکھ لو کہیں تمہارا ہی نہ ہو۔“

”ارے نہیں۔“ آندہ نے جبب سے لفافہ نکال کر کہا اور پھر ٹکٹ نکال کر بولا۔ ”نہیں میرا نہیں تھا وہ تو یہ رہا۔“

مارش مایوس ہو گیا مگر اس نے فیصلہ کر لیا کہ

اب اس شخص کی کڑی نگرانی کرنی پڑے گی کیونکہ وہ خفیہ ابھی کا آدمی تھا اور یہاں اس کی ذمہ داری بھی تھی کہ دلائی لامہ کی حفاظت کرے۔

”اچھا۔ فی الحال تو میں چلتا ہوں۔“ نیچے چلی کر مارش نے کہا۔ ”مجھے چند دوستوں کو فون کرنے ہیں۔ اگر دلائی لامہ کو دیکھنا ہو تو اوپر کا کٹیل لاؤنج میں آ جانا وہاں سے سب کچھ صاف نظر آئے گا میں بھی وہیں سے منظر دیکھوں گا۔“

مارش نے اس سے جدا ہوتے ہی ایک وردی پوش محافظ سے کچھ کہا۔ آندہ کی طرف اشارہ کیا اور پھر جھوم میں گم ہو گیا۔ اس وقت آٹھ بج کر تیس منٹ ہو رہے تھے۔ آندہ وقت گزارنے کے لیے انفارمیشن سینٹر میں آ گیا جہاں درجنوں کتابیں پڑے ہوئے تھے۔ وہ سنگاپور بنگاک اور ٹھنڈو کے بارے میں کتابیں اٹھا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس جگہ مسافروں کے بیٹھنے کی خاطر دو حصے بنائے گئے تھے اور ان دونوں حصوں کو گول ستون الگ الگ کرتے تھے۔ فرش پر دبیز سبز قالین بچھا ہوا تھا اور یہاں بھی چند چوڑے والے پہلے سے موجود تھے۔ ایک شخص کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ اس کے قریب ایک اور کتابچی پڑا ہوا تھا جس پر لکھا تھا دوران سفر گھبراہٹ دور کرنے کے طریقے۔

بنگاک کے بارے میں پڑھتے ہوئے آندہ اچانک بے چینی کا احساس ہونے لگا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اسے گھور رہا ہو۔ اس نے بڑی احتیاط سے دائیں طرف دیکھا لیکن وہاں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا جو اس کی طرف دیکھ رہا ہو لیکن دیکھے جانے کا یہ احساس مسلسل شدید ہوتا گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا اس نے ٹکٹ اتار کر کرسی پر ڈال دیا کہ شاید ٹکٹ کی وجہ سے الجھن ہو رہی ہو۔ پھر ٹیلی فون بوتھ کی قطار کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک اسٹال کی دیوار کے ساتھ ایک آدمی ٹیک لگائے ہوئے اخبار پڑھ رہا تھا اخبار پڑھنے کا تاثر دے رہا تھا اور یہ شخص ستیش

کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

آندہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹکٹ گھنٹوں پر ڈال لیا اور اسے ذہنی صلاحیتیں مفلوج سی ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا وہ شخص واقعی ستیش بابو ہے اس کی مونچھیں صاف تھیں وہ بہت نفیس سوٹ میں لمبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیک کے اضافے اور مونچھیں صاف ہونے کی وجہ سے اس کا حلیہ بڑے حد تک بدل چکا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ آندہ اسے پہچان ہی نہیں سکے۔ ستیش بابو آندہ کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر مخصوص انداز میں کھانا اور اسی پیلے رومال سے منہ صاف کرنے لگا جو آندہ پہلے بھی اس کے پاس دیکھ چکا تھا پھر اس نے اس طرح نظریں پھیر لیں جیسے آندہ کو دیکھا ہی نہ ہو۔ اس نے اخبار چھڑ کر کے جب میں رکھا اور پانچویں ٹیلی فون بوتھ میں گھس گیا۔ پھر فوراً واپس نکل آیا۔ یہ حرکت اس نے تین مرتبہ کی تو آندہ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ ستیش بابو اسے پانچویں بوتھ میں آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ آندہ کا سر پھرانے لگا۔ ستیش اس سے کیا پتا تھا کیا پانچویں بوتھ میں اس نے اس کے لیے کوئی پیغام چھوڑا ہے اور پھر بھی سوچ کر وہ ٹکٹ چھوڑ کر پانچویں بوتھ میں گھس گیا لیکن وہاں اسے کوئی پتا نہ رہا اسی لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی اور وہ لاشعوری طور پر آندہ نے ریسور اٹھا لیا۔

”یقین کر دو کہ تم پر کسی کو شبہ نہیں ہوا۔“ اسے ستیش بابو کی سرگوشی سنائی دی۔ ”میں نے اپنا انتظام کر لیا ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی کو کوئی نظر نہ آئے۔ بس تمہیں پرسکون رہنا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔“

”میں۔۔۔۔۔ آندہ نے تھوک نھٹتے ہوئے کہا۔ اسے حیرت تھی کہ ستیش اسے کہاں سے فون کر رہا ہے۔ ”بھلا میں پریشان اور مضطرب کیوں ہوں گا۔“

”تم سمجھ نہیں۔“ ستیش کی سرگوشی پھر سنائی دی۔ ”سنو! میں ریسٹوران میں تمہارا انتظار کرتا رہا

پھر میں ہوٹل گیا لیکن تم نہ ملے۔ میں نے کئی فون کیے لیکن تم کہاں تھے۔“

”میں ا!“ اس بار آندہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”جب تم ہوٹل گئے تو میں ریسٹوران میں تھا اور جب تم ریسٹوران میں تھے تو میں ہوٹل میں تھا۔“

”درست یہی ہوا ہوگا۔۔۔۔۔ بکروہ۔۔۔۔۔“

”وہ چیز محفوظ ہاتھوں میں ہے بوڑھے مکھڑا!“

آندہ اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکا تھا اس نے جس فلم کی خاطر اتنے باڑے بیٹے تھے وہ اب ستیش حاصل کر کے جو گندہ رنگہ کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ وہ چیز محفوظ ہاتھوں میں ہے۔“ ستیش نے مصالحتانہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میری بات دھیان سے سنو! تم نے وہاں جانے کے لیے اڑاٹھیا کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ مجھے بمشکل علم ہوا کہ تم کس پرواز سے جا رہے ہو۔ میں صرف دس منٹ قبل ہی یہاں آیا ہوں۔ تمہیں بھی خطروں کا احساس ہونا چاہیے کیا تمہارے سر پرست نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ۔۔۔۔۔“

”اب اس کی کوئی نصیحت میری کام نہیں آ سکتی۔“ آندہ نے جواب دیا۔ ”میں نے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر کامیابی حاصل کی۔ اب تم اپنی خیر مناد میری فکر مت کرو۔“

”تم نے خود کو بڑے اور اہم کاموں کے لیے اہل ثابت کر دیا ہے آندہ!“ ستیش نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”میں اس کی رپورٹ ضرور دوں گا مگر یہ تمہیں ہنس بھی مل جائے لیکن مقصد حاصل کرنے اور اس چیز کو منزل تک پہنچانے کے لیے میں نے جو انتظامات کئے ہیں۔ تمہیں انہی کے مطابق کام کرنا ہوگا۔“

”میرے انتظامات بھی بہت محفوظ ہیں چچا جان۔“ آندہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری مانو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تمہارا ہتھ وہاں تک پہنچ جائے گا۔“

”میں جانتا ہوں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے لیکن میں تو تمہاری اپنی بھلائی کی لیے اتنی زحمت مول



لے رہا ہوں۔ ابھی تم تا تجربہ کار اور خام ہولڈنا۔  
 ”نہیں!“ آئند نے مضبوط لہجے میں کہا۔  
 ”میری فکر مت کرو۔ تم میرے کوٹ میں ہے اور  
 کوٹ باہر کرسی پر پڑا ہوا ہے۔ مجھے اس کی طرف  
 سے کوئی تشویش نہیں۔“

”کیا۔“ ستیش نے اس بار برہم لہجے میں  
 کہا۔ ”تم نے اسے کوٹ میں باہر چھوڑ دیا۔ تم..... تم  
 تو انداز سے سے بھی کہیں زیادہ احسن نکلے۔ یہ تمہیں  
 بھیجنے والوں نے آخر تم میں کیا خصوصیت دیکھی تھی تم  
 تو انتہائی ناص انھل نکلے اپنا کوٹ باہر چھوڑ کر آئے  
 کہ جو چاہے اٹھا کر لے جائے، سنو! میں نے جرمن  
 ائر لائن سے ٹکٹ بک کر رکھا ہے۔ جو گنڈر سے  
 وہیں ملاقات ہونی ہے اور اب اگر اپنی زندگی  
 چاہتے ہو تو جیسا میں کہوں دیا ہی کرو۔“ اس کے  
 بعد ستیش نے اسے جو دھمکیاں دیں، وہ بہت  
 خطرناک تھیں۔ ”اب تم باہر جا کر کوٹ اٹھاؤ گے۔  
 اس کے بعد قریبی ہاتھ روم میں جا کر میکرو فلم اپنی  
 مٹھی میں دبا کر باہر آؤ گے اپنی سیٹ پر واپس  
 آ کر رسالوں میں فلم رکھو گے اور اس کے بعد وہاں  
 سے ہٹ جاؤ گے تم نے ان ہدایتوں پر عمل نہیں کیا تو  
 اذیت ناک موت تمہارا مقدر ہوگی۔“

آئند کا بے گناہ نفرت اور خوف کی وجہ سے  
 اس کو پسینہ آنے لگا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر لائن  
 بے جان ہو چکی تھی۔ وہ پسینہ پونچھتے ہوئے باہر آیا تو  
 کوٹ کرسی پر دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔  
 سیٹ پر بیٹھ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں اسے  
 ستیش تو نظر نہ آیا مگر مارٹن ضرور موجود تھا، تاہم چند  
 ہی لمحوں بعد اسے ایک ستون کے قریب ستیش بھی  
 نظر آ گیا۔

آئند طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک  
 اسٹال پر گیا۔ جہاں مورتیاں فروخت ہو رہی تھیں  
 اس نے کالی دیوی کی ایک مورتی خریدی اور پلٹ  
 کر دیکھا۔ ستیش اب بھی وہیں موجود تھا اور اس کے  
 چہرے پر غصے کے آثار صاف دکھائی دے رہے

تھے۔ اسی لمحے مارٹن پھر نظر آیا مگر اس بار وہ آئند  
 کے بجائے ستیش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک  
 دبے شخص سے کچھ کہا اور پھر بل بھر میں وہ دونوں  
 ستیش کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ یہ دہلا شخص  
 وہی تھا جس کو آئند نے موٹے کے ساتھ دیکھا۔  
 اسی نے ستیش کا ہاتھ بڑے دوستانہ انداز میں تھام  
 لیا۔ دونوں اسے کشاں کشاں ایک راہداری کے  
 دروازے کی طرف لے گئے اور آئند مطمئن انداز  
 میں سر ہلاتا ہوا کالی کی مورتی کو دیکھتا رہا۔  
 اس وقت نونج رہے تھے اور ایک طیارہ ٹیک  
 آف کر رہا تھا وہ سوچنے لگا کہ کل جب وہ جو گنڈر  
 کے آدمی کو ستیش کی حماقت کے بارے میں رپورٹ  
 دے گا تو ستیش کی کتنی کرکری ہوگی۔

☆☆

وہ دونوں اڑاڑیا کے بینکر سے نکلے تو مادھو کا  
 چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ احمد نے اپنا کوٹ اتار  
 کر بینک پر ڈالا اور رک گیا۔ ”میں نے انپکٹر  
 فاروق کو دو نوک انداز میں پتا دیا ہے کہ وہ شخص  
 حماقت کر رہا ہے لیکن وہ کسی قتل کے بارے میں  
 بکواس کرنے لگا اور اس نے میری ایک نہ سنی۔  
 میں.....“

”مجھے علم ہے کہ تم نے راج کے لیے کیا کیا  
 ہوگا، احمد۔“ وہ بڑے دکھ سے بولی۔ ”لیکن میں تو  
 اس بات پر حیران ہوں کہ انہیں بھیابہ اس قسم کا شبہ  
 بھی ہو سکتا ہے۔“ احمد سگریٹ سلگانے لگا اور دونوں  
 ایک بار پھر ٹرل میں چلے آئے یہاں ایک دروازہ  
 نو جوان مور کے پر والا ہیٹ لگائے ہوئے کچھ دور  
 کھڑا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک طرف چلا گیا تو  
 احمد نے مادھو کا ہاتھ تھام لیا تاکہ مادھو کسی حد تک  
 اضطراب و پریشانی سے نجات پائے مگر وہ نوبے کی  
 پرداز کو ٹیک آف کرتے ہوئے دیکھتی رہی جو جیسر  
 جاری تھی۔

”وہ اسے کہاں لے گئے ہوں گے احمد۔“  
 مادھو نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کیا وہ زہر

”است ہے۔“  
 ”ارے نہیں۔“ احمد نے اسے تسلی دیتے  
 ہوئے کہا۔ ”وہ تو شخص ری پوچھ کچھ کے لیے سیکورٹی  
 آفس میں لے گئے ہیں۔ چلو کانی بیٹے ہیں۔ کاش!  
 میں راج کو فلیٹ ہی میں ان پاگل انھنوں کے  
 بارے میں بتا دیتا۔“

”تم خود کو دوش مت دو! احمد! میں بھی فضول  
 ہر اسان ہو رہی ہوں۔“ اس بار مادھو کے لہجے میں  
 پیار بھرا ہوا تھا وہ اسے کافی شاب میں لے گیا۔ کانی  
 کا آرڈر دے کر اس نے سیکورٹی روم کے بارے  
 میں گارڈ سے دریافت کیا جو انفارمیشن سینٹر کے  
 دائیں طرف چند کمرے دور تھا۔ مادھو کو وہاں چھوڑ کر وہ  
 سیکورٹی روم کی طرف آیا جس کا ریسپشن خالی تھا۔  
 تاہم بائیں طرف ایک دروازہ ہال میں کھلتا تھا  
 یہاں سے اصل سیکورٹی روم میں جانے کا ارادہ ترک  
 کر دیا اور باہر بڑی ہوئی لکڑی کی بیچ پر بیٹھ کر انتظار  
 کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد ہی کمرے سے انپکٹر  
 فاروق نکلا اس کے ساتھ دو آدمی تھے، دروازہ کھلنے  
 کی وجہ سے احمد کو اندر چھانکنے کا موقع مل گیا، راج  
 کے چہرے کی رنگت زرد تھی۔ پائلٹ کا مخصوص ہیٹ  
 اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ایس بی رنجیت سنگھ سے  
 کچھ کہہ رہا تھا۔ فاروق نے فوراً ہی دروازہ بند  
 کر دیا۔ اس نے یقیناً احمد کو دیکھ لیا تھا مگر اس پر نظر  
 بھی نہیں ڈالی تھی۔

”تم نے ستیش کو کہاں سے پکڑا۔“ فاروق  
 نے اکھڑے لہجے میں ایک شخص سے پوچھا۔ ”اسے پہلے  
 کس نے دیکھا تھا۔“  
 ”ستیش ہمارے بالکل سامنے کھڑا ہوا تھا۔“  
 دہلی نسل کے نو جوان نے جواب دیا۔ ”بے مقصد  
 گوم رہا تھا اور بالکل اکیلا۔“  
 ”کیا واقعی اکیلا تھا مارٹن۔“ انپکٹر فاروق نے  
 کسی زخمی شیر کی طرح غرا کر پوچھا۔ ”تب پھر یہاں  
 اس کی آمد کا مقصد کیا تھا۔ اسے تو جرمن ٹرل میں ہونا  
 چاہیے تھا۔ اس کے پاس سے ساڑھے دس بجے کی

جرمن فلائٹ کا ٹکٹ ملا ہے، وہ اڑاڑیا کے لاؤنج  
 میں کیوں آیا تھا۔“  
 دونوں افراد فاروق سے نگاہیں جھانے لگے۔  
 ”میرا خیال ہے کہ ہم نے اسے کل از وقت پکڑ لیا۔  
 اگر آپ کو اطلاع دے کر اس پر نگرانی رکھتے تو شاید  
 کسی اور کی گرفتاری بھی ہو سکتی تھی۔“ وردی والے  
 نے ندامت سے سر ہلاتے ہوئے اعتراف کر لیا۔  
 ”مجھے یقین ہے کہ وہ کسی خاص مقصد سے اڑ  
 اڑیا کے لاؤنج میں آیا تھا اور اسے احساس تھا کہ  
 یہاں وہ کسی خطرے میں بھی پڑ سکتا ہے لیکن پھر بھی  
 اس نے ہمت کی اور..... اور سنو! ابھی سکیل نے مجھے  
 اطلاع دی ہے کہ انہیں بھگوان داس کی لاش کے نیچے  
 سے ایک پارکنگ ٹکٹ ملا ہے لیکن کیونکہ ٹکٹ پر کار کا  
 نمبر نہیں ہوتا لہذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ٹکٹ کس کا بارک  
 کرنے کے لیے لیا گیا تھا۔ اس پر بہر حال غلطی کے  
 وقت کی مہم کی اور اس پر دو بج کر باؤن منٹ!“ مارٹن  
 نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دہرایا۔  
 ”ہم بھی تقریباً اسی وقت وہاں پہنچے تھے  
 چیف۔“  
 ”تقریباً اسی وقت!“ فاروق نے کن انھوں  
 سے احمد کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ ”لیکن  
 ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل سکیل اور راجیو چانیز میں  
 موجود تھے تاہم انہوں نے کوئی خاص بات نوٹ  
 نہیں کی۔ پارکنگ گراؤنڈ پر ان کی نظر نہیں تھی لیکن  
 ستیش وہاں آتا تو وہ اسے فوراً پہچان لیتے، مطلب  
 یہ ہوا کہ دو بج کر باؤن منٹ پر کوئی اور شخص وہاں پہنچا  
 تاکہ ستیش کے لیے فلم حاصل کر سکے لیکن کیونکہ اسے  
 فلیٹ کی نگرانی کا شبہ ہو گیا لہذا اس نے مناسب  
 وقت کا انتظار کیا۔ اس نے یقیناً ہر کارے کی گرفتاری  
 بھی دیکھی اور ہم سب لوگوں کو بھی دیکھ لیا پھر جب تم  
 دونوں نے ستیش کو گرفتار کیا تو وہ جہیں پہچان گیا اسی  
 باعث وہ گرفتار نہیں ہو سکا۔ سب سے بڑی بات یہ  
 ہے کہ وہ ہم سب کو پہچانتا ہے مگر ہمارے لیے وہ  
 اچھی ہے۔“



”واقعی! یہ تو بڑا مسئلہ ہے۔“ مارٹن نے سر ہلا کر کہا۔ ”لیکن اس طرح ایک بات تو معلوم ہوگئی کہ اجنبی مجرم انرا انڈیا سے کہیں جانے والا ہے اور یوں تلاش کا دائرہ کار محدود ہو گیا ہے۔“

”ممکن ہے کہ یہ دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے۔“ فاروق نے غصے انداز میں کہا۔ ”بقول تمہارے اجنبی مجرم خطرے کی بویا کرکٹ بدلواسکتا ہے اور کسی دوسری انر لائن سے جاسکتا ہے۔“

”اوہ!“ مارٹن اور وردی والا دونوں ہی مایوس ہو گئے۔

”لیکن دعا کرو کہ ایسا ہی ہو۔“ فاروق اس بار زیر لب مسکرا کر بولا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اب کسی دوسری انر لائن سے رابطہ قائم کرے گا اور اس کی کسی بھی ایسی کوشش پر ہم نگاہ رکھیں گے۔ میں نے حسین سے کہہ دیا ہے کہ وہ امریکی انر لائنوں کی بنگلے پر نظر رکھے۔ اب تم دونوں انرا انڈیا کے سوچ بورڈ جاؤ اور ہر غیر ملکی بنگلے آفس سے رابطہ رکھوانا سے کہو کہ اگر کوئی ستر سالہ بڑھیا بھی آخری وقت میں لگت حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ فی الفور ہمیں آگاہ کر دیں۔“

فاروق کا یہ کہنا تھا کہ دونوں پابند رہا گئے اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ کیا ایک منٹ پہلے بھی وہ کسی دوسری انر لائن سے رابطہ قائم کر دیتا۔

”تمہیں پہلے ہی بہت وقت دیا جا چکا تھا احمد لیکن تم نے اسے ضائع کر دیا۔“

”میں کسی قسم کی سودے بازی نہیں کر رہا ہوں لیکن تم تینوں کی گفتگو سن کر ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں انرا انڈیا کا بلیک ہیلٹ باہر موجود ہے اور تم کو یقین ہے کہ تمہارا مطلوبہ شخص انرا لائن ضرور بدلے گا۔ انسانی فطرت کو پیش نظر رکھو اگر وہ کسی دوسری انر لائن سے جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو سب سے پہلے اپنا سوٹ کیس باسامان واپس لے گا۔ میری مانو تو پورے ہوائی اڈے کی نگرانی کی بجائے صرف دو آدمی انرا انڈیا کے بیچنگ کاؤنٹر پر لگا دو مگر وہ ایسے افراد ہوں جن کو وہ پہلے نہ دیکھ سکا ہو۔ اس کے بعد

وہ کسی کے ہوئے آم کی طرح تمہاری جھولی میں آ کر رہے گا۔“

”اوہ!“ فاروق کی آنکھیں جھپکنے لگیں، اس نے مارٹن اور دوسرے آدمی کو دیکھا۔ انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ ریسپورڈر کہہ کر اس نے گہری نظروں سے احمد کا جائزہ لیا۔ پھر چند ہی لمحوں میں ایک شخص اندر آیا یہ یقیناً ایئر انڈیا کی سیکورٹی کا افسر تھا۔ فاروق اس سے سرگوشیوں میں باتیں کرتا رہا چند لمحوں بعد اس شخص کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”بالکل درست انسپکٹر! یہی بہترین طریقہ ہے۔ میں راجہ اور گپتہ رائے کو بیچنگ کاؤنٹر پر تعینات کر دیتا ہوں، عملے کی وردی میں تم میزائمن فلور پر رہ کر نیچے نظر رکھنا۔ راجہ اور گپتہ دو منٹ بعد عملے کی وردی میں وہاں پہنچ جائیں گے اور پھر میں تمہیں اطلاع کر دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا۔ باقی دونوں افراد بھی نقل گئے۔ اب کمرے میں احمد اور فاروق کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

”شکریہ احمد۔“ فاروق نے آخر کار اپنی شکست تسلیم کر لی۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم اپنے دوست راجہ کے کارنامے سننے کے حقدار ہو گئے ہو راجہ کے ساتھ گزشتہ نو مہینے سے ایک فرسٹ آفسر چارلی فلائٹ پر جا رہا ہے ان دونوں کی جوڑی ہمیشہ برقرار رہی ہے راجہ کا کہنا ہے کہ اس نے چارلی کے بارے میں ہی تم سے شرہ کرنے کے لیے فون کیا تھا اور چند گھنٹے قبل اسی کے مسئلے پر قانونی رائے طلب کی تھی۔“

”وہ۔ وہ تو یہ پوچھ رہا تھا کہ اگر کوئی چیز ادھر سے ادھر کر دی جائے تو۔“

”ہاں اس نے یہی بتایا تھا لیکن اس نے یہ مشورہ اپنے فرسٹ آفسر کے بجائے اپنے لیے طلب کیا ہوگا، ویسے ہم نے چارلی کو بھی طلب کر لیا ہے وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچنے والا ہے تم جاننے ہو کہ فلائٹ کے عملے کو وہ گھنٹے قبل رپورٹ کرنی ہوتی

ہے لیکن چارلی ابھی تک نہیں پہنچایا باعث ہم نے اس کے قلیبت پر آدمی بھیج دیا راجہ کا کہنا ہے کہ چارلی کو ایک خوبصورت لڑکی نے اپنے جال میں پھنسا کر کوئی غیر قانونی کام کرایا ہے لیکن مجھے یقین نہیں بلکہ اپنی پسلی کو بھی اس کہانی پر یقین نہیں آتا کیونکہ ہری لال راجہ کو فون کرتا تھا اور راجہ ہی کی کار سے اسکا کاج ٹیپ کا ٹکڑا ملا ہے ٹیپ کے بارے میں اس نے قطعی لا علمی کا اظہار کیا ہے اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ کسی نے اسے پھنسانے کی سازش کی ہوگی۔“

”تمہیں اب بھی راجہ پر شک ہے مگر مجھے نہیں کیا اس صورتحال سے اس کی بہن کو مطلع کر دوں۔“

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر فاروق سیکورٹی روم میں چلا گیا اور احمد باہر چلا آیا جہاں مادھو اس کا بچے جینی سے انتظار کر رہی تھی جب احمد نے اسے سب کچھ بتا دیا تو اس کی آنکھیں بے یقینی کی وجہ سے زیادہ جھیل گئیں۔ ”اوہ۔ نہیں احمد! چارلی ایسا نہیں ہو سکتا، وہ تو بہت معصوم سا لڑکا ہے۔ کیا انہوں نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔“

”کر لیں گے۔“ احمد نے دھیرے سے جواب دیا۔ اسے یقین تھا کہ چارلی اقبال جرم کر لے گا اور پھر راجہ کو چھوڑ دیا جائے گا۔ ”فاروق بہت شاطر آدمی ہے مادھو اس نے اس گروہ پر کئی روز سے نظر رکھی ہوئی تھی مگر جب گرفتاریاں شروع ہوئیں تو شاید کسی نے چارلے کو خبردار کر دیا لہذا وہ آج آیا ہی نہیں لیکن بہر حال پولیس اس کو پکڑنے لگی۔“

”اب سوچتی ہوں کہ گزشتہ کئی مہینوں سے بھیا پریشان کیوں تھے، تھوڑا پر جب میں نے اس کے راجہ کی باندھی تو اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور ایسا پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ کیا تم نے نوٹ نہیں کیا کہ وہ گزشتہ کئی دنوں سے کتنا مضطرب تھا۔“

”وہ تو ہمیشہ ہی سے پریشان لگتا ہے، مادھو۔“ احمد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کی موجودہ پریشانیوں کا اصل سبب چارلی ہے جس سے وہ دوستی نہانا چاہتا ہے۔“

”شاید ایسا ہی ہو لیکن اگر وہ خود بھی ملوث ہوا تو پھر۔ پھر میں کیا کروں گی احمد۔“

”تمہیں کسی قسم کے خدشات کو اعصاب پر سوار نہیں ہونے دینا چاہیے مجھے یقین ہے کہ چارلی کی گرفتار کے ساتھ ہی۔“

”حالات خواہ کچھ بھی ہو وہ میرا بھائی رہے گا۔“ مادھو نے جذبات سے رندگی ہوئی آواز میں کہا۔ دونوں اسی قسم کی باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ کئی منٹ گزر گئے اور پھر احمد کی نظر فاروق پر پڑی جو مارٹن کے ساتھ کاک ٹیل لاؤنج سے نکل کر میزائمن فلور کی طرف جا رہا تھا۔

”دیکھو! یہ لوگ ایک ایسے شخص کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اس معصے کا اصل کردار ہے۔ دراز قد شخص کے برابر میں چلنے والا موٹا ہی فاروق ہے تم یہاں بیٹھو میں اس سے سن گن لے کر ابھی آتا ہوں۔“

فاروق اور موہن ایک ستون کی آڑ میں اس طرح کھڑے ہو گئے کہ ان پر کسی کنیٹر نہ پڑ سکے لیکن وہ بیچنگ کاؤنٹر پر اچھی طرح نظر رکھیں۔

”فاروق! اس کی بہن بہت پریشان ہے کیا اس سے پوچھ کچھ مل نہیں ہوئی۔“

”نہیں، صورتحال مزید بے چیدہ ہو گئی ہے، احمد۔“ فاروق نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ”ہم چارلی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“

”اوہ! اس نے کچھ بتایا۔“

”نہیں! اس کی زبان بندھی اور۔“

”چیف! موہن نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہ دیکھو نیچے انفارمیشن سینٹر میں۔ مارٹن اشارہ کر رہا ہے۔“

”گڈ۔“ فاروق کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ ”تم اور مارٹن اسے سیکورٹی روم میں لے آؤ۔۔۔۔۔ اور ہاں احمد! میں یہ کہہ رہا تھا کہ چارلی ہمیں ایک لفظ بھی نہیں بتا سکا اس کی لاش چھت سے لٹی ہوئی لی ہے۔“



آئندہ لڑکی اور لنگڑے کو سرسری طور پر دیکھتا ہوا بار میں چلا آیا اور یہ سوچنے لگا کہ فلم جو گنڈر یا اس کے خاص آدمی کے حوالے کرتے ہوئے اپنے کارنامے کو کس انداز میں بیان کرے گا پھر وہ بار سے نکل کر گیت نمبر سیون پر آیا اور یہاں پہنچتے ہی اچانک اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا اسے صورتحال کی سنگینی کا پہلی بار احساس ہوا وہ پیش بابو کو گرفتار کر چکے تھے اور تیش اپنی چوڑی بچانے کے لیے انہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہے اس کے ذریعے پولیس کو یہ اطلاع بھی مل سکتی تھی کہ فلم انراٹھیا کی پرواز سے اسمگل ہوئی وہ بے چینی سے سوچنے لگا اور سب سے پہلے بھی تجویز سمجھ میں آئی کہ وہ محنت واپس کر کے کسی دوسری انراٹھیا سے سنگاپور یا کہیں بھی پہنچ جائے۔ اس نے جرمین انراٹھیا کے استعمال پر غور ہی نہیں کیا کیونکہ تیش اسے بتا چکا تھا کہ وہ جرمین انراٹھیا سے جانے گا اور پولیس والوں کو بھی اس کا ٹکٹ مل چکا ہوگا اس نے دو تین امریکی کمپنیوں کے شیڈول دیکھے اور پھر جب اسے دلی سنگار پور فلائٹ کی سہولت کا علم ہوا تو خوشی سے اس کی باتیں کر لیں۔ اس نے فوراً امریکن انراٹھیا کی ٹکٹ آفس فون کیا۔ ”مجھے سنگار پور فلائٹ کا ٹکٹ چاہیے۔“ اس نے آپریٹری آواز میں کشش کا احساس کئے بغیر مدعا بیان کر دیا۔

”ایک منٹ ہولڈ کریں نصف شب کے بعد سنگاپور کے لیے فلائٹ جائے گی، ممکن ہے کوئی خالی نشست موجود ہو۔“

وہ ہولڈ کیے سوچتا رہا کہ اب اس کی کامیابی یقینی ہے پورا ایک منٹ گزر گیا تو وہ بے چینی محسوس کرنے لگا پھر اسے دوسری طرف سے کئی آوازیں سنائی دیں اور پھر لڑکی کی آواز آئی۔ لیکن پھر اس بار اس کا لہجہ بہت ساٹ تھا۔ ”آپ مسٹر کورنر سے بات کر لیں۔“ آئندہ کے اعصاب اچانک ہی چٹختے لگے محض ایک نشست کے لیے اسے کسی دوسرے

فصل سے بات کرنی تھی اس نے ادھر ادھر دیکھا دلائی لامہ کے عقیدت مند اب بھی نظر آ رہے تھے اسی لمحے اسے دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی آواز تھی جو اس نے تیش کے فون پر سنئی تھی لہجہ سڑپاٹ اور عجیب سا تھا۔ ”ابھی دو فحشیں خالی ہیں۔ آپ کو ایک سیٹ مل سکتی ہے آپ کے پاس پاسپورٹ تو ہوگا۔“

”کیوں نہیں۔“ آئندہ نے فوراً جواب دیا لیکن سوچنے لگا کہ کیا لڑکی کو ان نشستوں کا علم نہیں تھا جن میں ایک اب آئندہ کو پیش کی جا رہی تھی۔

”گڈ۔ ہم ایک نشست آپ کے لیے محفوظ رکھیں گے آپ کا نام کیا ہے۔ جناب۔“

”نام! وہ سوچنے لگا۔ تیش کا فون اٹھانے والے شخص نے اس کا فون نمبر پوچھا۔ اسے ایسا لگ جیسے کوئی جال تنگ ہو رہا ہے۔ اس نے طویل سانس لی اور پھر بولا۔ ”میرا نام جواہر لال نہرو ہے آپ یہ نام بھی نہیں بھول سکیں گے مسٹر کورنر؟“ یہ کہہ کر اس نے ریسپورڈ رکھ دیا خدشات اور خوف کے باعث وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اس نے سنگاپور جانے کا ارادہ ظاہر کر کے از خود ٹھوکر کھائی تھی اور کورنر جو یقیناً پولیس کا آدمی تھا اب سنگاپور جانے والے چند سو افراد پر کڑی نظر رکھ سکتا تھا خواہ امریکن انراٹھیا سے جا رہے ہیں ہوں یا انڈیا انراٹھیا سے اسے یہ بھی احساس تھا کہ ان لوگوں کو یہ علم بھی ہو چکا ہوگا کہ اس نے ٹیلی فون کہاں سے کیا تھا اور اب انراٹھیا کا لاؤنج اسے قید خانہ لگنے لگا تھا۔

وہ لاؤنج میں آ کر بے چینی سے جلد از جلد کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مارٹن نمودار ہوا۔ ”کیا حال ہے دوست مجھے ابھی علم ہوا ہے کہ دلائی لامہ ٹھیک دس بجے یہاں پہنچ جائے گا۔ تم اس کی آمد کا منظر دیکھنا چاہتے ہو۔ اوپر چلو میں پانچ منٹ بعد آ جاؤں گا اور پھر ہم دونوں آرام سے بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور پھر آئندہ نے دیکھا کہ

دلائی لامہ کے تمام عقیدت مند ایک قطار میں کھڑے اور ہے تھے اور ایک شخص جو ان سب میں ممتاز تھا دو اطراف سے باتیں کر رہا تھا۔ آئندہ نے اسے کسی سے باتیں کرتے ہوئے اس کا نام بھی سن لیا تھا۔ وہ ہر کیس تھا اور اس وقت اس کی شخصیت بہت پروکار نظر آ رہی تھی سفید چوٹے پر کام بہت شاندار لگ رہا تھا پھر اچانک نیچے کی ایک اور راہ اسے دکھائی دی۔ وہ راہ یہ تھی کہ وہ پولیس والوں کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرادے۔ غلط آدمی پکڑا جائے تو پھر آئندہ کو لال چانے میں کسی دشواری کا سامنا کرنے کی توقع نہیں تھی وہ سوچتا رہا اس نے حکمت عملی پر از سر نو غور کیا اور پھر ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا اس نے اس اعتماد کے ساتھ نمبر ملائے کہ دوسری طرف کوئی پولیس والا جواب دے رہا تھا۔

”ہیل او۔“ کسی نے کھانتے ہوئے کہا۔ وہ تیش کے لہجے کی نقل اتار رہا تھا۔ آواز سن کر آئندہ مسکرانے لگا اس شخص کو فاروق ہی نے بتایا ہوگا کہ تیش ہر جملے کے بعد زور زور سے کھانتا ہے۔

”رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔“ آئندہ نے ساٹ لہجے میں کہا۔ ”ہوائی اڈے پر صورتحال معمول کے مطابق ہے۔ وہاں آپ کی ملاقات ہر کیس سے ہوگی کوئی مسئلہ تو پیش نہیں آیا۔“

”ہاں۔“ کسی نے رومال منہ پر رکھ کر جواب دیا اور پھر کھانسنے لگا۔

”لیکن میں بہت فکر مند ہوں ہر کیس مضطرب نظر آ رہا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکیں گے میں نے ہر کیس کو پاسپورٹ سمیت تمام ضروری دستاویزات فراہم کر دی ہیں۔“

”ہوں۔“ دوسری طرف سے جواب ملا اور آئندہ کو یقین ہو گیا کہ فون سننے والا ہر کیس کا نام لکھ کر کسی دوسرے آدمی کو دے رہا ہے اور پھر اس نے ریسپورڈ رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ فوراً ہر کیس کو گرفتار کریں گے اور پھر وہ عام سے مسافر کے انداز میں بھارت سے نکل

جائے گا۔

وہ ٹیلی فون بوتھ سے باہر نہیں نکلا وہیں سے حالات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اس نے مارٹن کو تیزی سے آتے ہوئے دیکھا۔ مارٹن اب انفارمیشن کاؤنٹر پر ایک لڑکی سے بات کر رہا تھا پھر اچانک ہی لاؤنج میں نصب لاؤنڈری پینکر پر لڑکی کی آواز گونجنے لگی۔

”مسٹر ہریکس۔ اٹھن شن پلیز“ مسٹر ہریکس کیا آپ انفارمیشن سینٹر پر تشریف لا سکتے ہیں۔“ اپنا نام سن کر ہریکس مسکرانے لگا اور دوسرے سے کچھ کہہ کر مسکراتا ہوا انفارمیشن سینٹر کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی وہ انفارمیشن سینٹر پہنچا ہی تھا کہ تین افراد نے اسے گھیر لیا ہریکس انہیں پاسپورٹ اور ٹکٹ دکھا کر کچھ کہنے لگا لیکن وہ تینوں اسے کاؤنٹر کے راستے ایک دروازے کی طرف لے گئے اور پھر کمرے میں چلے گئے۔

یہ تماشا دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا بوتھ سے نکل آیا اس وقت دس بج رہے تھے اور سنگاپور کے لیے انراٹھیا کی فلائٹ میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا اسے یقین تھا کہ جب طیارہ ٹیک آف کر رہا ہوگا تو پولیس والے ہر کیس پر تھڑ ڈگری استعمال کر رہے ہوں گے۔ اس نے اپنی کرسی کی طرف دیکھا جہاں وہ کوٹ چھوڑ گیا تھا پھر خوف کی سردلہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی کوٹ اب وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ یا گلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا اسی لمحے مارٹن نے آ کر اس کا بازو تھام لیا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ بار میں جا کر بیٹھو۔“ اس بار اس کا لہجہ دوستانہ نہیں تھا۔ ”مگر تم بار کے بجائے ٹیلی فون بوتھ میں کھس گئے وہاں سے جھانکتے رہے بولو کیا چکر ہے۔“

”میرا کوٹ۔“ آئندہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں ابھی کوٹ کرسی پر چھوڑ گیا تھا۔“

”کیسا کوٹ۔ تم تو خود کو بوتھ میں چھپائے ہوئے تھے تمہیں یقیناً دلائی لامہ کا انتظار تھا اور تم اس کی آمد پر کوئی نعرہ وغیرہ لگا کر افراتفری پھیلانا چاہتے تھے۔“



”لیکن میرا کوٹ!“ اس نے پھٹی پھٹی سی آواز میں کہا۔  
 ”چلو۔ مگر یہ مرد دروہی کہاں مر گیا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ تم پر نظر رکھے۔ یہ کہہ کر اس نے آئندہ کو دکھا دیا اور سیکورٹی روم کی طرف لے گیا۔ اسی لمحے دلائی لامہ نمودار ہوا۔ آئندہ اس کی صرف شکل دیکھ سکا کیونکہ پھر آئندہ کو دکھا دے کر سیکورٹی روم کے ریسپشن میں لایا گیا تھا اور دروازہ بند ہو گیا تھا۔

☆☆

اس واقعے سے دو تین منٹ قبل احمد ہریس کی گرفتاری کا منظر دیکھ کر مطمئن انداز میں سر ہلاتا ہوا ”مادھو کی طرف جارہا تھا“ اس نے اپنا کوٹ اٹھا کر کہا۔ ”انہوں نے آخری پرندہ بھی شکار کر لیا“ مادھو لیکن چارلی ان کو زندہ نہیں مل سکا“ اس نے خود کشی کر لی ہے۔“

”احمد“ مادھو اچھل پڑی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”تم یہیں بیٹھو“ میں فاروق یارنجیت سے تفصیلی بات کر کے واپس آؤں گا۔“ احمد نے کہا مگر مادھو نے اس کا بازو تھام لیا اور اس کے ساتھ ساتھ سیکورٹی روم میں آگئے جہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ ان میں سے ایک وردی والا تھا جس کے ہاتھ میں ایک نیلا فوجی کوٹ تھا دوسرا شخص مفلس اور بھوکا لگ رہا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ”تم نے کوٹ چوری کیا ہے نا بویو۔“ وردی والے نے بڑے غصیلے انداز میں کہا۔ ”میں نے تمہیں پچھلے بار صرف اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ تم ایک بریف کیس چوری کر کے لے جا رہے تھے اور وہ تمہاری پہلی غلطی تھی“ جس کو میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔“

سیکورٹی روم سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں لہذا احمد کچھ سوچ کر رک گیا۔ ”ہمیں اندر جانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے“ مادھو بیٹھو ممکن

ہے کہ فاروق اور رنجیت دونوں میں سے کوئی جلد ہی باہر نکل آئے۔“  
 مادھو بیچ پر بیٹھ گئی۔ اسی لمحے مارٹن بیرونی دروازہ کھول کر اندر آیا اس کے ساتھ ایک دروازہ نو جوان بھی تھا جس نے چشمہ لگا رکھا تھا اور جس کے ہاتھ میں مور کے پروالا ہتھ تھا۔  
 ”تم کہاں مر گئے تھے روئی؟“ مارٹن نے وردی والے سے پوچھا۔  
 ”میں نے تم سے کہا تھا کہ اس منخرے پر اس وقت تک نظر رکھنا جب تک دلائی لامہ کی فلائٹ ٹیک آف نہ کر جائے۔“

”میں اسی پر نظر رکھے ہوئے تھا“ مارٹن میں نے اسے بوٹھ میں جاتے ہوئے دیکھا اور پھر اس بڑھے کو اس کا کوٹ چوری کرتے ہوئے پایا۔“  
 ”اوہ۔ دیکھا ہم نے تمہارا کوٹ تلاش کر لیا ہے۔“ مارٹن نے مسکرا کر کہا اور آئندہ یہ سوچ کر ڈرنے لگا کہ کہیں وہ کوٹ کی تلاش نہ لے لیں اس میں کالی کی مورٹی کے علاوہ اینڈنٹ کوئل کرنے والا چاقو بھی تھا اور قلم بھی۔ اسے پسینہ آنے لگا۔ اسے یہ سوچ کر ہی غصہ آنے لگا کہ وہ اس لابیال شخص مارٹن کی اصلیت کا پہلے ہی اندازہ کیوں نہیں لگا سکا۔ اس نے بیچ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور اسے ایسا لگا جیسے وہ پہلے بھی نہیں دیکھ چکا ہے مگر کہاں۔

”میں انسپکٹر فاروق سے ملنا چاہتی ہوں۔“ لڑکی نے اچانک ہی غصیلے انداز میں کہا۔ وہ مارٹن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”میرا نام مادھو ہے اور میں لیپٹن راج کی بہن ہوں“ کیا تم انسپکٹر تک میرا پیغام پہنچا سکتے ہو۔“

”میرا نام مارٹن کرو ہے اور آپ انسپکٹر فاروق سے نہیں مل سکتیں کیونکہ وہ اس وقت بہت مصروف ہیں ویسے یہاں غصیلے اور اونچے لہجے میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے“ کماری مادھو۔“ ”مادھو پلیز۔“ احمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہم انسپکٹر کا انتظار کر سکتے ہیں۔“ اس کے کہنے پر مادھو خاموش ہو گئی اور مارٹن اس بار روئی کی طرف ”توجہ ہوا۔“ اب اس کوٹ کی تفصیلات بتاؤ روئی (راستاشی تو لو۔“  
 ”نہیں“ تمہیں اس کا کوئی حق نہیں۔“ آئندہ لے گھبرا کر کہا۔ ”اس میں میری ذاتی اشیاء ہیں اور تم کو علم ہے کہ یہ کوٹ میرا ہے۔ اف بھگوان۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے کیا جائے مل جائے گی۔“  
 ”جائے۔“ مارٹن نے مسکرا کر کہا۔ ”مگر تم بوٹھ میں کیوں جیسے ہوئے تھے۔“

آئندہ کو ایسا لگا جیسے کمرے میں تیز روشنی پھیل کر اب اس کے اعصاب کو متاثر کر رہی ہو۔ اس کا ہاتھ ہتھکانے لگا اسی لمحے اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا۔ یہ کمرہ زیادہ روشن تھا اور اس میں تین سوٹ کیس کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے تیش باؤ اسی کمرے میں تھا مگر اس کے چہرے پر خوف کے آثار نہیں تھے۔ تاہم اس کی پیش اتری ہوئی تھی ہر کیس بھی وہیں موجود تھا اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آ رہے تھے اور وہ صرف زیر جامہ پہنے ہوئے تھا پھر اس کا جسم نظر آیا۔ وہ کمرے سے ریسپشن ہال میں آیا اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا مرنے کو دیکھتے ہی آئندہ کے اوسان خطا ہو گئے لیکن اس نے دود پر قابو رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مونے کے ہاتھ میں ایک پاسپورٹ اور پرس تھا۔ یہ دونوں چیزیں یقیناً ہریس کی تھیں اس نے آئندہ کی طرف دیکھا تاکہ نہیں لہذا آئندہ کی خود اعتمادی واپس آنے کی۔ مونٹا اس کی طرف دیکھے بغیر باہر چلا گیا۔

اسی وقت مارٹن کا ہاتھ کوٹ کی اس جیب میں گیا جس میں چاقو رکھا ہوا تھا اور اسی وقت مونٹا واپس آ گیا۔ وہ دروازے پر کھڑا ہوا اور پھر باہر بیٹھ گیا۔ ”سنو کوٹ میں چند تحائف کے علاوہ کچھ نہیں۔“ آئندہ نے خوشامداند لہجے میں کہا۔ ”میں اپنی جیب کے لیے کالی کی دیوی کا مجسمہ اور ایک بھائی کے لیے بند ہونے والا چاقو لے جا رہا ہوں۔ اگر

میں ان کے لیے تحائف نہیں لے گیا تو.....“  
 مارٹن نے کالی کا مجسمہ نکال کر میز پر رکھا اور اس کے بعد چاقو نکال لیا۔ اس نے چاقو کھولنے کی زحمت نہیں کی اور بظاہر یہی آئندہ کے لیے بہتر ہوا کیونکہ چاقو کا تیز دھار بلیڈ خون آلود تھا۔  
 ”تو تم یہ چاقو بطور تحفہ لے جا رہے ہو۔ ہاں۔“ مارٹن نے زہریلے انداز میں ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے تحفہ لے جانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن چاقو۔ چاقو سمیت طیارے میں سوار ہونا خلاف قانون ہے۔“

”مارٹن!“ مونے نے واپس آتے ہوئے اندرونی کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”اندر آؤ۔“

”ابھی آیا چیف!“ مارٹن نے کہا۔ ”سنو دوست! تم اس شخص کو لے کر طیارے میں سوار نہیں ہو سکتے“ میں چاہوں تو تمہیں گرفتار بھی کر سکتا ہوں لیکن تم مجھے شریف آدمی نظر آ رہے ہو اور قدرے اہم بھی“ میں یہ چاقو ضبط کر رہا ہوں“ تم گیارہ بجے تک یہیں رہو گے اور گرمی نے اس کمرے سے ایک قدم بھی باہر نکالا تو میں تمہیں حوالات بیچ دوں گا طیارے کی میز چیموں تک میں تمہیں خود چھوڑنے جاؤں گا تاکہ تم پھر کوئی خطرناک تحفہ نہ خرید سکو“ روئی! اسے کوٹ واپس کر دو اور اس بڑھے کا بھی خیال رکھو“ جس نے کوٹ چوری کیا تھا۔ میں جا رہا ہوں۔ اور سنو چاقو دراز میں ڈال دو۔“

کوٹ ہاتھ میں آتے ہی آئندہ کو ایسا لگا جیسے اسے جنت مل گئی ہو۔ ”بڑے اچھے لوگ ہیں۔“ اس نے احمد نامی شخص کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”انہوں نے قلم رقم اور کالی دیوی کے مجسمے کو ضبط نہیں کیا۔“ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ مادھو تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ احمد گھبرا کر اس کے پیچھے جانے لگا۔ ”کیا ہوا مادھو کیا بات ہے۔“ ”کچھ نہیں“ میں تھیک ہوں“ ٹوائٹ کہاں



ہے۔

”دائیں ہاتھ پر مگر۔“

”میں ابھی آئی۔“ ادھو نے کہا اور پھر چلی گئی۔ احمد واپس آیا تو مور کے پروالا ہیٹ اب آند کے گھنٹوں پر تھا اور وہ سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ احمد اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے اندرونی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو وہاں بڑی گہما گہمی نظر آئی، کسٹم، بلیک ٹینک کے تین افراد وہاں مصروف تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اسمگل ہونے والی روٹی بھی تلاش کر سکتے ہیں مارٹن راج سے کچھ پوچھ رہا تھا اور ایک شخص سڑا ہوا بیٹھا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

راج کے ٹریول بیک میز پر کھلے پڑے ہوئے تھے جب کہ ایک طرف غالباً رونے والی شخص کے دو سوٹ کیسوں کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ایک سٹنر آفیسر سرخ رنگ کے چونے کی سلاخی پر ہاتھ پھیر رہا تھا، ٹوٹھے پیسٹ کی دو ٹیوٹیں ایک طرف خالی پڑی ہوئی تھیں، احمد یہی دیکھ پایا تھا کہ ایس بی رنجیت کی نظر اس پر پڑ گئی اس نے اس طرح احمد کو دیکھا جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو اور اچھی شناسائی کے باوجود اجنبیت کے اس مظاہرے پر احمد خفیف سا ہل گیا۔ ”دراصل راج کی بہن بہت پریشان ہے۔“ اس نے رنجیت کے اپنے قریب آتے ہی سرگوشی میں کہا۔ ”میں اس کو کیا کہہ کر تسلی دوں رنجیت۔“ تب ہی راج نے بھی اس کی طرف دیکھا اس کی چہرے پر امید ویم کے آثار تھے۔

”کیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ ہم سرکاری کام میں مصروف ہیں احمد!“ رنجیت کا لہجہ کھر درا تھا۔ ”رنجیت۔ یہ تم کہہ رہے ہو۔“ احمد نے برہم ہو کر پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ فاروق نے تمہیں فلم کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ ہم صرف اسی کو تلاش کر رہے ہیں یہ تم راج کی بہن کو بھی بتا سکتے ہو اگر

وہ اس کے لیے پریشان ہے تو ہم فلم کے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔“

”نہیں اب پلیز۔ یہاں سے چلے جاؤ ہمیں جوئی کوئی کامیابی ہوئی تو ہم۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے رنجیت، وقت وقت کی بات ہے کبھی عدالت میں میرا رویہ بھی اسی قسم کا ہوگا۔“

”میری پوزیشن کا احساس کرو احمد۔“ رنجیت نے اس بار نرم لہجے میں کہا۔ اسے علم تھا کہ احمد پولیس کیس کے نیچے اڈھڑکتا ہے اور اگر پولیس کے خلاف مقدمے لے لے لے لے تو پولیس والوں کی دائمی شامت آ سکتی ہے۔ احمد منہ بنا کر واپس آ گیا اس بار فاروق بھی اس کے ساتھ تھا۔

”احمد۔ ایک منٹ میں۔۔۔۔۔“

”مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا ہے انسپٹر۔۔۔۔۔“ وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ”صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تم راج پر انڈینٹ کے قتل اور مائیکرو فلم اسمگل کرنے کا الزام لگا کر عدالت میں آؤ پھر میں دیکھوں گا کہ تم لوگ کتنے پانی میں ہو۔“

اس دوران آندائیں بخورد بکھتا رہا۔ ”کیا تمہیں علم ہے کہ راج نے تین شادیاں کی ہیں۔“ انسپٹر نے اچانک موضوع بدل دیا۔ ”اس کے دو بچے بھی ہیں پہلی بیوی سے وہ آخری بار بچوں سے کب ملا تھا۔“

”وہ ہمیں میں رہتے ہیں اور راج انہیں دیوالی پر کارڈ بھیجتا ہے۔“

”بہت اچھا باپ ہے۔“ فاروق نے مسکرا کر کہا۔ ”دوسری بیوی کا کیا حال ہے جب سے اس نے اسے چھوڑا ہے وہ اسپتال میں زیادہ وقت گزارتی ہے کیا اس کے علاج کا خرچہ راج اٹھا رہا ہے یا لڑکی کے والدین۔“

”احتمالاً باتوں میں وقت ضائع کرتے رہا انسپٹر فاروق! وہ لڑکی اعصاب مریض ہے اسے

لادہ ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”وہ اعصابی مریض کیوں بنی احمد۔ شادی سے پہلے یا اس کے بعد۔ خیر اسے چھوڑو۔ ان لڑکیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن سے اس نے شادی کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی، احمد اور اب میں ذاتی طور پر تمہارے دوست سے لڑتے کرنے لگا ہوں ہم میں سے کوئی بھی فرشتہ نہیں لیکن بہر حال ہم شیطان نہیں، وہ انسانیت اور اقداریوں کی ساری اقدار بھلا چکا ہے اسی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی قاتلہ عالم کی خاطر کوئی ایسی کام کر سکتا ہے۔“

”تم ذاتیات پر اتر آئے ہو۔“ احمد نے کمزور لہجے میں کہا اور پھر فاروق کے دلائل پر غور کرتا ہوا باہر لاؤنچ میں چلا آیا جہاں مادھو ایک کرسی پر سناکت بیٹھی ہوئی تھی اگر انڈیا کی آخری دروازہ گیارہ بجے سنگاپور کے لیے ٹیک آف کرنے والی تھی لہذا اب لاؤنچ میں زیادہ مسافر بھی نہیں تھے دکانیں بند ہونے لگی تھیں۔

”کیا حال ہے۔“ مادھو احمد نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ مادھو کا لہجہ بے تاثر تھا۔ ”سنو احمد مجھے پتہ نہیں کہ راج بھیا اس اسکینڈل میں کس حد تک ملوث ہے لیکن اگر وہ مجرم بھی ہے اب بھی میں اس سے نفرت نہیں کر سکتوں گی، تم اسے ان کے ہتھکنڈوں سے بچانے کے لیے کچھ کرو پلیز۔ اور اب میں جو کچھ بھی کہوں اسے غور سے سنو! کل رات ہم فلیٹ میں خوش گپیاں کر رہے تھے اور وہ مسلسل بولے جا رہے تھے پھر ان نے اچانک ہی کافی کا کپ رکھ کر مجھ سے کہا کہ ایک روز میں تمہیں سنگاپور لے چلوں گا، پھر سے سر پر مور کے پروالا ہیٹ ہوگا اور کسی کو تھخہ پہننے کے لیے کالی کی دیوی کا مجسمہ۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کر زور زور سے ہنسنے لگا، اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ذرا سوچو احمد اس نے

کالی دیوی کا مجسمہ نہیں بلکہ کالی کی دیوی کا مجسمہ کہا تھا اور مور کے پروالے ہیٹ کا ذکر کیا تھا اور ابھی کچھ دیر قبل رینیشن روم میں موجود شخص نے بھی کالی کے مجسمے کو کالی کی دیوی کا مجسمہ کہا اور اس کے پاس مور کے پروالا ہیٹ تھا۔“

احمد بھونچکا ہو کر مادھو کی طرف دیکھنے لگا۔ ”میرا مطلب صرف یہ ہے کہ شاید راج کو یہ بتا دیا گیا ہو کہ اس سے ملنے کے لیے ہوائی اڈے پر آنے والا شخص کسی لباس میں ہوگا۔“ اب مادھو کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ ”تم اندر جاؤ اس کی مدد کرو انہیں اس پر نفسیاتی تشدد سے روکو احمد۔“

اسی لمحے احمد کی نظر انڈیا کے عملے پر پڑی جو گیارہ بجے کی آخری پرواز کے لیے جا رہا تھا اور اس عملے میں رینیشن راج کی جگہ کسی اور ہوا باز لے لی تھی مادھو کی باتوں سے احمد کو یقین ہو گیا کہ سچ پر بیٹھے ہوئے شخص اور راج کے درمیان کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہے۔

”احمد!“ مادھو سسکی لے کر بولی۔ ”میں بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ راج اس قسم کے کسی اسکینڈل میں ملوث ہوگا شاید اس نے کسی لڑکی کے چکر میں پھنس کر یہ سب کچھ کیا ہوگا لیکن احمد اگر ہیٹ والا شخص نکل گیا تو پھر سارا الزام راج پر ہی آئے گا۔ راج کو بچا لو احمد۔ پلیز میری خاطر۔“

مادھو کی باتیں سن کر احمد کا خون کھولنے لگا۔ ان باتوں کا واحد مطلب یہی تھا کہ راج کسی نہ کسی انداز میں جاسوسی اور اسمگلنگ میں ملوث ہے وہ سوچ رہا تھا کہ راج کو بچانے اور ہیٹ والے شخص کی نشاندہی کے لیے فاروق کے سامنے کیا کہانی بیان کرے گا وہ جانتا تھا کہ اگر راج پر الزامات کا جزی ہر حصہ بھی ثابت ہو گیا تو سننے والے تین کے تحت اسے کم سے کم سات سال قید کی سزا ہوگی اور وہ زندگی بھر کی طیارے کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گا۔

”مادھو! میں راج بچانے اور اس مردود شخص کی نشاندہی کرنے کے لیے کوئی جھوٹی کہانی نہیں



گڑھ سکتا کیونکہ رنجیت اور فاروق مجھ پرسوالوں کی ہوجار کردیں گے اور مجھے تمہاری اور راج کی گفتگو تفصیل سے بتانی پڑے گی اس طرح راج کے گرد گھٹکے اور سخت ہو جائے گا۔

”اگر تم راج کو نہیں بچا سکتے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ مادھو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اوہ!“ احمد نے شکوے بھرے انداز میں مادھو کی طرف دیکھا مگر اس دوران اس کا ذہن بہت تیزی سے کام بھی کرتا رہا۔ پھر اچانک بجلی کی طرح ایک نیا خیال ذہن میں آیا۔ وہ فاروق سے کہہ سکتا تھا کہ راج کے فلیٹ کے پاس اس نے ریسیشن میں موجود مور کے پروالا ہیٹ لیے ہوئے اس شخص کو منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔

”میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ راج کو بچا سکتا ہوں یا نہیں۔“ اس نے بھی بے اثر لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن میں ایک کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا اس وقت دس بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔

وقت بہت کم تھا لہذا وہ تیزی سے سیکورٹی روم میں داخل ہو گیا وہاں تین افراد موجود تھے۔ پہلا وہی شخص تھا جس پر مادھو نے شک کا اظہار کیا تھا۔ وہ اب بج کے سامنے کھڑا ہوا تھا دوسرا شخص فاروقی تھا جو ہیٹ والے کو گھورے جا رہا تھا اور تیسرا شخص خود راج تھا جو مارٹن کے ساتھ کمرے میں آ رہا تھا۔

☆☆

اس سے کچھ دیر قبل فاروق اور مارٹن آئندہ کے سامنے صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے رہے تھے اور فاروق کو یقین تھا کہ کوئی ایسی فلم اسمگل کرنے کی کوشش کر رہا ہے ہریکس اور راج کے سامان اور جسم کی تلاشی کے باوجود انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اور ہریکس کی گرفتاری پر دلائی لا مہ نے بھارتی وزارت خارجہ سے باضابطہ احتجاج بھی

کر ڈالا تھا۔

”سنگاپور کی فلاح ہی فلم اسمگل کرنے کے لیے استعمال ہوگی مارٹن۔“ فاروق نے کہا تھا۔

”کچھ دیر قبل کسی نے اڑانڈا کے بوتھ ہی سے حسن سے بات کی تھی اور کلکٹ کے بارے میں معلوم کیا تھا لیکن پھر اسے حسن پر شبہ ہو گیا لہذا اس نے ریسیور رکھ دیا حسن نے ابھی ہریکس کی بات کی ہے اور یہ تجویز پیش کیا ہے کہ ہریکس کی آواز اس شخص سے بہت مختلف تھی جو فون پر بات کر رہا تھا اس کا کہنا ہے کہ وہ آواز مقامی اور نو جوان شخص کی تھی میرا خیال ہے کہ جس کسی نے بھی تیشیش کے فلیٹ پر فون کیا تھا اس نے ہریکس کو پھنسا کر اپنا کام نکالنے کی کوشش کی ہے۔“

”میں نے تیشیش پر تمام گرا آزمائے ہیں چیف وہ انتہائی طور پر نرن پشور شخص لگتا ہے۔“ مارٹن نے کہا تو آئندہ سکون کی ساس لی اس کا مطلب یہ تھا کہ بوڑھے تیشیش نے زبان نہیں کھولی ہے۔ مارٹن فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا اور فاروق آئندہ کی طرف ہٹ کر کے کھڑا ہو گیا یہ فرار کا بہترین موقع تھا لیکن اس نے فرار کے لیے قدم نہیں اٹھائے مارٹن اس وقت ریزرویشن ٹھکر سے باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ہی ایک کاغذ پر اس کا قلم بہت تیزی سے چل رہا تھا پھر اس نے ریسیور رکھ کر کاغذ فاروق کی طرف بڑھا دیا یہ فہرست اڑانڈا کے مسافروں اور ان کی منزل کی تھی۔

”بھگوان کا شکر ہے کہ اب میں اپنی ماں کے پاس پہنچ سکوں گا۔“ آئندہ نے مارٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”وہ عارضہ قلب کی مریضہ ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔“

”اوہ!“ مارٹن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن کچھ دیر پہلے تم یہ کہہ چکے تھے کہ تمہارے بھانجے بھتیجیاں بھی ہیں اور کزن بھی اب کہہ رہے ہو کہ تمہاری ماں تمہارے اتنی جلدی کہانی بدلنا ابھی بات نہیں۔“

”مارٹن! کیا گیارہ بجے کی فلاح کے لیے آج صبح یا شام کوئی ریزرویشن نہیں کرائی گئی۔“

”فاروق نے فہرست دیکھ کر پوچھا۔“

”ایک شخص نے کرائی تھی اور وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے۔“ مارٹن نے جواب دیا۔

”اوہ!“ فاروق نے پہلی مرتبہ آئندہ کو دیکھا۔ ”میرے قریب آؤ فرزند اوتین سوالوں کا جواب دے سکتے ہو تمہارا نام کیا ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے تھے اور تمہارا تعلق کس شہر سے ہے۔“

آئندہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ فاروق اس کی طرف دیکھی سے دیکھ رہا تھا اور یہی خطرناک بات تھی فاروق نے پہلے مارٹن کی طرف دیکھا جس نے اسے آئندہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

”تو تمہیں یہ پتہ لگتا ہے مارٹن۔“ فاروق نے مسکرا کر کہا۔ ”تب پھر میرا یہ خیال ہے کہ اس کا نام آئندہ کمرچی کے بجائے جواہر لال نہرو ہوگا مارے پاس ایسا شخص ہے جو جواہر لال نہرو کی آواز پہچان سکتا ہے۔“

آئندہ اب ہائب رہا تھا۔ فاروق نے شخص چند لمحوں میں کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر وہ شکست تسلیم کرنے پر اب بھی آمادہ نہیں تھا لہذا غیر محسوس طریقے پر اس ڈیسک تک پہنچ گیا جس کی دراز میں ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

”آپ لوگ بہت ہلکی مزاح ہیں کیا آپ کو ہراپا سپورٹ اور کلکٹ چھٹی لگ رہا ہے۔“ آئندہ نے دراز پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ چاقو نکال کر مارٹن کو قابو کرے گا لیکن پھر اس نے یہ سوچا کہ کسی طرح ان دونوں میں سے ایک کو کمرے سے باہر جانے پر مجبور کر دے۔

”میں نیلی فون بوتھ میں ایک پیکٹ بھول آیا ہوں جناب! کیا مجھے پیکٹ لانے کی اجازت دیں گے۔“

”مارٹن.....“ فاروق اس کے جال میں پھنس گیا اس وقت وہ ڈیسک سے دور ہلکے

دروازے پر تھا۔ ”تم بیٹھ جاؤ آئندہ!“ یہ کہہ کر اس نے آئندہ کا بازو پکڑا۔ اس کی بیبیوں پر ماہرانہ انداز میں ہاتھ پھیرا اس کے بعد آئندہ ڈیسک کے بہت قریب پہنچ کر بیٹھ گیا۔

”میرا پیکٹ جناب۔“ آئندہ نے مارٹن کو اندرونی کمرے میں جاتے ہوئے دیکھ کر احتجاج کیا۔

”نی الوقت اسے بھول جاؤ۔ کیا تم کیپٹن راج سے واقف ہو۔“

”نہیں۔“

”تیشیش یا بویا چارلی سے بھی نہیں۔“ یہ کہتا ہوا وہ ڈیسک پر بیٹھ گیا۔ یہ پوزیشن آئندہ کے لیے پسندیدہ نہیں تھی۔ ”گیارہ بج رہے ہیں آئندہ۔ تم نے آخری پرواز ہی کیوں منتخب کی شاید اس لیے کہ تم زیادہ عقل مند نہیں ہو اب ذرا کھل کر بات ہو جائے ورنہ دوسرے لوگ سارا الزام تمہارے سر رکھ دیں گے۔ تمہیں کیپٹن راج کو شناخت کرنا ہوگا۔ لودہ آ رہا ہے یہ مت بھولنا کہ میں تم کو اب گیارہ بجے کی پرواز سے جانے نہیں دوں گا“

کھڑے ہواؤ۔

اندرونی کمرے سے مارٹن ایک دبلے پتلے ہوا باز کے ساتھ نمودار ہوا یہی کیپٹن راج تھا اسی لمحے بیرونی دروازے سے احمد داخل ہوا۔

”احمد۔“ ہوا باز نے لرزاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مادھو کہاں ہے کیسی ہے وہ۔“

”بالکل ٹھیک ہے بس ذرا سی پریشان ضرور ہے۔“ احمد نے جواب دیا۔ ”تم کوئی فکر مت کرو۔“

”میں فکروں سے لڑنے کا عادی ہوں دوست۔“ راج نے بڑھرمہ لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن کیا انہوں نے تمہیں چارلی کے بارے میں بتا دیا ہے۔“

”ہاں!“ اس بار فاروق نے کہا۔ ”اور یہاں ہم نے تمہارے ایک دوست کو بھی زحمت



دی ہے کیا تم اس سے واقف ہو۔“  
 ”آں۔“ راج نے بغور آئند کی طرف دیکھا۔ ”اوہ۔ ہاں کل شام چارلی کے ساتھ ایک ریسٹوران میں بیٹھا تھا کہ یہ شخص نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں یہی ہیٹ تھا کیا یہ بھی تمہارا آدمی ہے فاروق۔“

”تم بھی تو ہمارے آدمی ہو کیپٹن!“ فاروق نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

”میرا پیکٹ آفسر!“ آئند نے پھر احتجاج کیا۔ اب وہ جلد از جلد کچھ کر گزرتا چاہتا تھا۔ ”آپ مارشل کو بھیج دیں تاکہ میں بوتھ سے پیکٹ لاسکوں۔“

”میں اکیلا جا کر لاسکتا ہوں آئند میاں!“ مارشل نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر فاروق کی اجازت سے چلا گیا، پھر راج، احمد اور فاروق ہاتھیں کرنے لگے انہوں نے آئند کو نظر انداز کر رکھا تھا۔

”تم آئند نامی اس شخص کو فراموش کر رہے ہو؟“ فاروق نے کہا۔ ”اس کو میں نے راج کے اپارٹمنٹ کے قریب منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ اور اسی لمحے آئند نے دراز سے چاقو نکال لیا مگر اب بھی کسی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

”یہ بات تمہیں اب یاد آتی ہے۔“ فاروق نے زہر مند لہجے میں کہا اور امرتہ راج نے آئند کے ہاتھوں میں چاقو دیکھ لیا لیکن فوراً ہی اس نے فاروق کو باتوں میں لگا لیا۔ ”ستیش نامی آدمی تو بہت خفیہ نگار انسپکٹر۔“

”مگر تم۔“ فاروق کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسی لمحے آئند نے بڑی پھرتی سے اس کے عقب میں آکر چاقو اس کی گردن پر رکھ دیا۔

”اپنے ہاتھ مت ہلانا انسپکٹر۔ یہ چاقو پہلے ہی پارکنگ گراؤنڈ کے اینڈینٹ کی جان لے چکا ہے۔“ اس کا لہجہ بہت سفاکانہ تھا۔ ساتھ ہی اس نے فاروق کی جیب سے سروس ریوالور بھی نکال لیا اور تیزی سے پیچھے ہٹا چلا گیا۔ اس کے دائیں

ہاتھ میں بھاری ریوالور تیار تھا اور وہ تینوں اس کے رحم و کرم پر تھے۔

”کسی نے بھی چپخنے کی کوشش کی تو سرکاری گولی اس کے دل میں پیوست ہو جائے گی۔“ آئند نے بڑے غصوں لہجے میں دھمکی دی، اس کو پہلے ہی اندازہ تھا کہ اگر باہر جاتے ہوئے دروازے کے قفل کا بٹن باہر سے دبا دیا جائے تو پھر اندر سے کوئی دروازہ نہیں کھول سکتا۔ وہ چابی لا کر دروازہ ضرور کھول سکتے تھے۔ لیکن اسی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آئند ٹرل بلڈنگ سے نکل سکتا تھا، عمارت کے باہر رن دے کا وسیع میدان تھا جس پر تاریکی چھائی ہوئی تھی یہی اندھیرا اسے پولیس سے بچا سکتا تھا وہ اسی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر مین روڈ پر نکل سکتا تھا اور پھر کوئی بھی بس اس محفوظ ترین مقام پر لے جاسکتی تھی۔

وہ ریوالور تانے پیچھے ہٹا رہا۔ فاروق کو اس وقت آئند پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ ہوا باز راج کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے جب کہ احمد نے اپنی چھتری مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔ ”آئند!“ فاروق نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”بے قوفی مت کرو، ممکن ہے کہ اس عمارت سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ لیکن پھر ہم رن دے اور فیلڈ کی تمام بتیاں روشن کر دیں گے کوئی گوشہ تاریک نہیں رہے گا اور میرے نشانچہ نہیں مچھی کی طرح مار ڈالیں گے تمہارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ریوالور پھینک دو۔“

”راج!“ احمد نے ہوا بازی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم اس برتنیں طرف سے حملہ کر سکتے ہیں۔ یہ بیخ کر نہیں نکل سکتا۔“

”نہیں۔“ فاروق نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”مجھے پارکنگ کے اینڈینٹ کا حشر یاد ہے لہذا اب میں کسی شوقیہ فنکار کی مدد حاصل نہیں کروں گا۔ آئند میرا مسئلہ ہے اسے مجھ پر ہی چھوڑ دو۔“ ”انسپکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے، احمد! تم کچھ نہیں

کر دو گے۔“ راج نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا، اسی لمحے مارشل واپس آیا لیکن اندر کی صورتحال دیکھ کر مارے حیرت کے وہ مفلوج سا ہو گیا اور اس کی اس کیفیت کے باعث آئند کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا اس نے دروازے کو ٹھوکر مار کر بند کیا، ان دبا یا اور ہال میں دوڑنے لگا، وہ اس وقت ہال میں تھا اس کی چوڑائی کم کر لہجائی زیادہ تھی، چھت پر فاصلوں سے تین بلب روشن تھے وہ پوری رفتار سے بھاگتا ہوا ہال کے آخری سرے پہنچا۔ ابھی تک اس سے کوئی نہیں ٹکرایا تھا۔ آخری سرے پر ایک اور دروازہ تھا، اس نے دروازہ کھولا۔ یہ ہاتھ روم تھا اور اس میں گھٹا موت کو دعوت دیتا تھا لہذا وہ پلٹا، پھسلا اور دیوار سے ٹکرا گیا، اس کا سر فرش سے ٹکرایا اور ریوالور ہاتھ سے نکل گیا لیکن اس نے سر میں شدید درد کی دوا کے بغیر لپک کر ریوالور اٹھایا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سر جھٹکنے لگا چند لمحوں بعد وہ بائیں جانب والی راہداری میں گھس گیا، اور اس بار آبزرویشن روم میں جا نکلا، یہاں چار پانچ آدمی کھڑے ہوئے تھے جو اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر گھبرا گئے، خود آئند بھی ان لوگوں کو دیکھ کر ڈر گیا، اس نے انہیں لٹکار کر سامنے سے ہٹنے کے لیے کہا، مگر اب دیر ہو چکی تھی اس سے قبل کہ وہ سامنے سے ہٹ کر اسے راہ دیتے عقب سے انسپکٹر فاروق دوڑتا ہوا غضبناک انداز میں دوڑ رہا تھا، انسپکٹر فاروق نہتا تھا وہ دونوں اچانک ہی اس کے سر پر آ گئے اور احمد اپنی چھتری سے اسے مارنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اس کا دار مالی گیا تاہم دوسرا دار آئند کندھے پر پڑا۔

”ہٹ جاؤ احمد یہ میرا شکار ہے۔“ فاروق نے چنگھاڑ کر کہا اور دونوں کے درمیان میں آ گیا، اس کی بنیادی غلطی تھی آئند کی انگلی نے دو مرتبہ لپک کر دبا یا اور دو گولیاں فاروق کے سر میں دھت ہو گئیں پھر معافی آئند کو ایسا لگا جیسے کسی

نے اس کے دائیں شانے میں چٹکی بھری ہو یہی احساس پیٹھ میں بھی ہوا، اس کی آنکھوں میں دیواریں ناچنے لگیں، عقب میں مارشل کے ریوالور سے دھواں نکل رہا تھا، مارشل کی تیسری گولی آئند کی ٹانگ پر لگی اور پھر آئند فاروق کے اوپر گر گیا۔

گیارہ بجے سنگار پور جانے والا طیارہ پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا اور اتر ہوئیں صرف ایک مسافر آئند مگر جی کا انتظار کر رہی تھی لیکن شاید اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ آئند اب کبھی سفر نہیں کرے گا، وہ تو آخری سفر پر روانہ ہونے کے لیے پر تول رہا تھا، وہ بہت زور سے کھانسا، خون کا ایک ٹوٹھرا اس کے منہ سے نکلا اور اور میض برگر گیا، دوسری بار کھانا اور تیسری بار بھی لے کر سائٹ ہو گیا۔

☆☆

”وہ بہت جیالا تھا، احمد۔“ رنجیت نے فاروق کی لاش کے جاتے ہی کہا۔ ”یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔“

”فاروق میرے اور آئند کے درمیان آ گیا تھا۔“ احمد نے غم ناک آنکھیں پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”شاید وہ مجھے آئند کے حملے سے بچانا چاہتا تھا۔“

”ہاں قربانی دینا، اس کی فطرت تھی، احمد!“ رنجیت سنگھ نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اس وقت وہ سیکورٹی آفس میں تھے۔ ان کے علاوہ ایک درجن افراد وہاں نظر آرہے تھے ان میں ڈی آئی جی بھی تھا اور لیفٹیننٹ گورنر بھی، تاہم راج نظر نہیں آ رہا تھا، رنجیت سنگھ کے قریب آئند کا کوٹ پڑا ہوا تھا جس کی تمام سلامتیوں ادھیڑی جا چکی تھی اور مائیکرو فلم رنجیت سنگھ کے قبضے میں تھی۔

”میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا راج اس مکروہ اسکینڈل میں موٹ تھا۔“ رنجیت نے دھیرے سے پوچھا۔ اس وقت مادھو مارشل



ڈارون ہر رابرٹ سے واقف تھا۔ سب سے پہلا رابرٹ مرچکا تھا۔ دوسرا باپ کے نقش قدم پر چل کر بہت بڑا وکیل بنا تھا۔ تیسرا رابرٹ پہلے رابرٹ کا پوتا تھا اور باپ کی طرح وکالت کرتا تھا۔ اسٹون اس کا پارٹنر تھا۔ دوسرا رابرٹ عملی طور پر ریٹائر ہو چکا تھا اور اس کی قائم کردہ فرم میں دونوں نوجوان یعنی تیسرا رابرٹ اور اس کا دوست اسٹون مالک تھے۔

### اس شارے کی ایک دلچسپ تحریر

ملازمت کر لیں میری طرح۔ کسی ہوٹل میں برتن وغیرہ دھونے لگیں تو امید ہے خاصے خوشحال ہو جائیں گے اور یہ قرض بھی ادا کر سکیں گے۔  
اس مشورے سے زیادہ ساڑھے تین شلنگ قیمتی تھے کیونکہ ڈارون کے لیے سارے کام مشکل تھے۔ نہ وہ برتن دھو سکتا تھا نہ وہ برطانیہ کا وزیر اعظم بن سکتا تھا۔ سراغ رسانی اس کی کٹھنی میں پڑی تھی اور

**جوتھی** سیکریٹری انجیلا بڑی اچھی لڑکی تھی۔ اگر وہ اچھی لڑکی نہ ہوتی، ڈارون کی ساری دولت لے جاتی۔ اس نے ایک خط لکھا کہ۔ ”سر میں نے تین شلنگ چھ پنس تجوری میں بند کر دیے ہیں۔ کیس بک میں آمدنی اور اخراجات کا حساب برابر کر دیا ہے۔ تین ہفتے کی تنخواہ کی کوئی بات نہیں جب پیسے ہوں تو بیچ دیجیے گا۔ اگر آپ بھی کوئی معقول سی

تک سنگاپور سے بھی نکل چکا ہوگا تمہیں علم ہے کہ مائیکر و فلم میں کیا تھا۔“  
”نہیں فہرست نہیں تھی۔“ رنجیت سنگھ نے پہل بار مسکرا کر کہا۔ ”اس میں روس اور بھارت بھارت اور فرانس، امریکہ اور بھارت کی درمیان اعلیٰ دفاعی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے معاہدوں کو عکس تھا جو گنڈر سنگھ روس اور بھارت کے معاہدے کی فلم امریکہ کو امریکہ اور بھارت کے معاہدے کی فلم روس کو اور بھارت اور فرانس کے سمجھوتے کی فلم دونوں سپر طاقتوں کو فروخت کرنا چاہتا تھا۔“  
”میرے خدا!“ احمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر جب اس میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی تو رنجیت سے ہاتھ ملا کر دروازے پر پہنچ گیا جہاں مادھو اس کا انتظار کر رہی تھی۔  
”راج مجرم ہے یادو!“ احمد نے سیاٹ لچے میں کہا۔ ”میں جانتی تھی کہ تم بھی اس نیپے پر پہنچو گے، کتنے ٹھور ہوتے!“ مادھو کا لہجہ رندھا ہوا تھا۔ مگر احمد نے اس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ”میں باہر جا رہا ہوں اگر تم ایک سال قبل کیے ہوئے وعدے پر قائم ہو تو میں ایک گھنٹے تک باہر تمہارا منتظر رہوں گا اور پھر ہم شامی مسجد کے امام کے پاس چلیں گے۔“  
مادھو نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ احمد کو جواب مل گیا تھا مگر وہ پھر بھی پارکنگ میں مادھو کا منتظر تھا اور پھر ایک گھنٹے کے بعد اپنے کوٹ کے بٹن لگانے کے بعد چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جانے لگا۔ وہ اس دنیا میں اب بھی بالکل تنہا تھا بالکل اکیلا، اداس اور دل کیر۔

سے کچھ باتیں کر رہی تھی اور اس کا چہرہ سنا ہوا تھا۔ ”میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ شاید آئندہ سے واقف تھا“ اسی باعث اس نے اپنی بہن سے مور کے پروالے بیٹ کا ذکر کیا تھا“ میرا خیال ہے کہ راج اور ستیش ہی نے کل آئند کو چارلی کا چہرہ دکھایا تھا اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ چارلی کو راج پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تھا اور ان دونوں نے آئند کی مدد سے اسے راستے سے ہٹا دیا۔“  
”تمہیں راج پر کب شبہ ہوا۔“ رنجیت سنگھ نے دربار صاحب کے بیچ پیاروں کی تعلیمات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سگریٹ ساگالی۔  
”اس وقت جب آئند نے دراز سے چاقو نکالا تھا۔“ احمد نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اس وقت اگر راج چاہتا تو با آسانی آئند پر قابو پا سکتا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا“ مجھے یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ خود آئند کو راج کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا اب اگر تم ستیش کی زبان کھلوا کر سکو تو بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

”وہ زبان کھول چکا ہے احمد۔“ رنجیت نے تھکے تھکے سے لچے میں جواب دیا۔ ”لیکن میں راج کے متعلق مزید کوئی نئی بات سننا چاہتا ہوں۔“  
”مجھے صرف ایک بات نئی اور غیر معمولی لگتی ہے۔“ احمد نے کہا۔ ”اسے ایک فیصلے کے تحت اپنی تیسری بیوی کو طلاق دینے کے عوض بیس ہزار روپے ادا کرنے تھے اس وقت اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی مگر پھر اچانک اس نے نہ صرف یہ رقم ادا کر دی بلکہ ایک نئی کار بھی خرید لی یہ رقم کہاں سے آئی اس کا مجھے علم نہیں۔“

”ستیش بابو اس بارے میں بتا چکا ہے۔“ رنجیت سنگھ نے جواب دیا۔ ”لیکن احمد افسوس یہ ہے کہ ستیش راج آئند کو بھی اس گروہ کا سرغنہ نہیں تھا“ سنگاپور میں ایک شخص جو گنڈر سنگھ اس گروہ کی سربراہی کر رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اب





اب تک اس نے جتنے کیس لیے تھے ان میں کامیابی زیادہ حاصل ہوئی تھی شہرت اور دولت ڈراموں کی تھی۔ اس میں بھی ڈارون کا کوئی قصور نہ تھا کیونکہ مجرم انارڈی تھے وہ اپنے دفتر سے نکلا اور گھر سے بھاگے ہوئے شریر بچے کی طرح انہیں کان سے پکڑ کر لے گیا اور انہوں نے اقبال جرم کر لیا۔ نہ کوئی تفتیش نہ کوئی مار دھاڑ نہ بھاگ دوڑ۔ نہ سنسنی خیز خبریں جن میں اس کا نام نمایاں ہوتا کیس ختم۔

چنانچہ ایک سال کے دوران ڈارون پرائیویٹ سرانگرساں انجی کے دفاتر تین جگہ منتقل ہو چکے تھے۔ موجودہ دفتر سبزی منڈی کے چھلی طرف ایک مختصر عمارت کے مختصر سے اسٹور نما کمرے میں تھا۔ جب وہ لکڑی کی میزھیوں پر قدم رکھتا اور پہنچتا تھا دروازے لٹکا ہوا پورڈھونے لگتا تھا اور فرش کے چرچراتے تختوں پر سے گزرتے ہوئے اسے ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ کوریڈور نما برآمدے کے پہلے آدھے حصے میں کوئی تخت لٹا ہوا وہ سیدھا آؤں کے گودام میں پڑیوں کے درمیان پڑا ہوا گا اور دوسرے آدھے حصے میں یہ حادثہ پیش آیا تو دوسرا حادثہ یہ ہوگا کہ بچے رہنے والے بڑے حصے پہلی پروفیسری کوئی چیز ٹوٹ جائے گی۔ گردن، کمری، دی یا بیوی۔

دفتر کا واحد کمرہ بارہ فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا تھا جس کے آخری کونے میں دروازے تھے۔ دونوں ایک ہی سائز کے چھ فٹ لمبے پانچ فٹ چوڑے خانوں میں کھلتے تھے۔ ایک کا نام باورچی خانہ تھا، دوسرے کا غسل خانہ کمرے کے وسط میں ایک طویل میز تھے جس کے سامنے تین اور دائیں بائیں ایک ایک کرسی رکھی رہتی تھی۔ میز کی دوسری طرف چھونے والی کرسی پر ڈارون پرائیویٹ سرانگرساں بیٹھتا تھا۔ اس کے سامنے والے کونے میں مختصر میز پر دنیا کا پہلا ٹائپ رائٹر رکھا تھا اور ایک کرسی جس پر انجی کا کلمہ بیٹھتا

آیا تھا۔ رات ہوتے ہی ڈارون میز کے نیچے سے اپنا بستر نکال کر میز کو مسہری میں تبدیل کر دیتا تھا۔ گزشتہ سال بھر سے زندگی بڑی پرسکون گزر رہی تھی۔ اسے چار ہی کیس ملے تھے۔ دو عورتیں اپنے شوہروں کو بے وفا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ایک عورت کا شوہر واقعی بے وفائی کا مرتکب پایا گیا اور ڈارون نے آسانی سے اس کے خلاف ثبوت اور گواہ فراہم کر کے خاتون سے دو سو پونڈ وصول کر لیے۔ دوسرے گناہ چنانچہ ڈارون نے اسے بتا دیا کہ اس کی بیوی کیا چاہتی ہے اور رقم ہاتھ سے گئی۔ عورتوں کے بارے میں کبھی یہی ہوا۔ ایک بے گناہ بھی اور ڈارون نے اسے شوہر کی نسبت سے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ دوسرے دن خاصے ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ شوہر نامراد نے فیس کے بجائے ڈارون کے دو ہاتھ دیے اور ڈارون نے ایک کے سے اس کے دونوں دانت توڑ دیے۔ مگر دوسرے شخص نے اپنی بیوی کے عاشق کی گوثالی کرنے کے بعد ڈارون کو دو سو پونڈ دے دیے اور ہاتھ ملا کر اسے دنیا کا عظیم ترین سرانگرساں بھی کہا۔ ڈارون اس کی صاف گوئی سے بہت متاثر ہوا۔

ایک سرد آہ بھر کا ڈارون نے آخری سیکرٹری کا استعفیٰ منظور کیا اور دروازے میں سے ساڑھے تین شلنگ نکال کر جیب میں ڈالے۔ وہ ڈنر کے لیے باہر جانے والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے آخری سگریٹ کو جیب سے نکالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور مسہری کو جلدی سے پھر آفس ٹیبل میں تبدیل کر کے دروازہ کھولا۔ آنے والا کوئی انجی تھا۔ بریف کیس اٹھائے ہوئے اور قیمتی سوٹ میں ملبوس۔ چالیس پینتالیس برس کا سنجیدہ شخص ”مسٹر ڈارون۔“ اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ”پرائیویٹ سرانگرساں۔“

”جی ہاں۔ اندر آئیے۔“ ڈارون نے پروقار انداز میں جواب دیا۔ ”کیس۔“ اس نے

سوچا۔ فحشی فحشی چالس ہیں۔ اگر بیوی بے وفا ہے پھر تو اس کے دو سو پونڈ نہیں گئے لیکن اگر یہ خود ہوا تو۔ اس نے انجی کے مضبوط کمرٹی جسم کو دیکھا۔ ”میرا نام ڈک ٹیلر ہے مسٹر ڈارون۔ میں رابرٹ رابرٹ اسٹون اینڈ رابرٹ کا منیجر ہوں۔“ انجی نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ جانتے ہوں گے۔“

ڈارون ہر رابرٹ سے واقف تھا۔ سب سے پہلا رابرٹ مرچ تھا۔ دوسرا باپ کے نقش قدم پر چل کر بہت بڑا وکیل بنا تھا۔ تیسرا رابرٹ پہلے رابرٹ کا پوتا تھا اور باپ کی طرح وکالت کرتا تھا۔ اسٹون اس کا پارٹنر تھا۔ دوسرا رابرٹ عملی طور پر ریٹائر ہو چکا تھا اور اس کی قائم کردہ فرم میں دونوں نوجوان یعنی تیسرا رابرٹ اور اس کا دوست اسٹون مالک تھے۔ بڑے کامیاب وکیل تھے اور ذہین ہونے کے علاوہ جدی پیشی وکیل ہونے کی وجہ سے بہت مشہور بھی تھے اور دولت مند بھی۔ کوئی نصف درجن وکیل تو ان کے ماتحت اور ملازم تھے۔

”ہمیں ایک کیس میں تحقیقات کے لیے آپ کی خدمات مطلوب ہیں۔“ ٹیلر نے کہا۔ فوری طور پر ڈارون کو یقین نہ آیا۔ اگر اتنی بڑی فرم کا کیس مل جائے تو کیا نہیں مل سکتا۔ دولت شہرت کامیابی یہ فرم چھوٹے موٹے مقدمات کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی تھی اور ان کے مصارف برداشت کرنے والے بھی معمولی لوگ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ پریس خود چلنی دیتا تھا۔

”عموماً ہم لوگ مشہور سرانگرساںوں کی مقدمات حاصل کرتے ہیں۔“ ٹیلر نے کہا۔ ”لیکن ام ذہین اور نوجوان سرانگرساںوں کو بھی ترقی کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔“ ٹیلر نے سر پرستی کا سا انداز اختیار کیا۔

”مجھے دیکھنا پڑے گا کہ کیس کی نوعیت کیا ہے۔ میرے بھی کچھ اصول ہیں۔“ ڈارون نے کہا۔ ”میں گھانے کا سودا نہیں کرتا۔“

”کیس ایک خاتون کا ہے۔ انہیں شہر ہے کہ ان کا شوہر کمرٹی اور کے مشق میں گرفتار ہے۔ شہر کیا ہے اب تو یقین ہے۔ ان کا شوہر کئی ماہ سے اس چکر میں ہے گھر سے غائب رہتا ہے۔ اب اس نے ”کمرین ہون“ ہوٹل میں ایک ڈنل روم بک کیا ہے۔“ ٹیلر نے کہا۔ ہفتہ دس دن کے لیے جان درلان کے نام سے۔“

”یہ ”کمرین ہون“ کہاں ہے۔“ ڈارون نے ایک پیڑ پر نام لکھتے ہوئے پوچھا۔

”وال اسٹریٹ کے کونے پر۔ میرا خیال ہے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ ٹیلر نے کہا۔

”لگتا تو نہیں۔ مگر انجی کچھ یقین سے کہتا مشکل ہے۔“ ڈارون نے جیب سے غیر ارادی طور پر واحد سگریٹ نکال کر سلگائی اور گھونے والی کرسی کی پشت کا سہارا لیا۔ مسٹر ٹیلر نے جب سے سونے کا سگریٹ کیس نکال کر اپنے لیے سگریٹ نکالی اور کیس لائٹر سے جلائی تو ڈارون کو اپنی بد اخلاقی کا احساس ہوا مگر وہ پی گیا۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ ذہنی طور پر غیر حاضر ہے اور اس کا دماغ کیس میں الجھا ہوا ہے۔ حالانکہ ابھی انجی کی کوئی بات پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

”ابتدائی اخراجات کے طور پر یہ پچاس پونڈ حاضر ہیں۔“ ٹیلر نے پانچ پانچ پونڈ کے دس نوٹ میز پر ڈال کر جیب سے چھپی ہوئی رسید نکالی اور ڈارون کی طرف بڑھائی۔ ”اس پر دستخط کر دیجئے۔“ اس نے گولڈ کیپ پار کر آگے بڑھایا۔ ڈارون نے نوٹوں پر نگاہ ڈالے بغیر دستخط کیے۔ ”کب چاہیے آپ کو رپورٹ۔“ ٹیلر کے جانے کے بعد ڈارون نے نوٹوں کو چوما اور جیب میں رکھ لیا۔ گوئی الحال طلاق کے مقدمات کے سوا اس کے مقدر میں کچھ نہیں تھا لیکن جب آدمی کی جیب میں ساڑھے تین شلنگ بچے ہوں اور سیکرٹری بھی تنخواہ لیے بغیر بھاگ گئی ہو تو پچاس پونڈ بہت لگتے ہیں اور مستقبل تاناک نظر آتا ہے۔ اگلے دن



دو پہر کو زبردست قسم کا مقابلہ تھا۔ چنانچہ پانچ پونٹ تو ڈارون نے فوری طور پر بائنگ کا مقابلہ دینے کے لیے الگ کر دیے اور ڈرنر کے لیے چل دیا۔

☆☆

ٹھیک بارہ دن بعد ڈارون اپنی تحقیقات کے نتائج مرتب کرنے میں مصروف تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور مسٹر ٹیلر کی بجائے ایک اور شخص اندر آ گیا۔ ڈارون بھونچکا رہ گیا۔ ”مسٹر جان ورلان“ اس نے اپنے دفاع کے لیے وہی طور پر تیار ہوتے ہوئے کہا۔ ”بس مسٹر ڈارون پرائیویٹ سرانگراں“ وہ اس کے عین سامنے میز پر ٹک گیا۔ گزشتہ بارہ دن میں ڈارون نے اسے کم سے کم بارہ دفعہ دیکھا تھا لیکن اس سے گفتگو کی نوبت نہیں آئی تھی۔ دیے وہ خاصا خوش پوش اور خوش شکل آدمی تھا۔ بظاہر خطرناک بھی نہیں لگتا تھا اور اس کے ہاتھ میں صرف ایک چھری تھی۔

”یہ دفتر ہے یا کباڑ خانہ۔“ اس نے تنقیدی نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کرسی پر شرافت سے بیٹھنے کی بجائے اس کے میز پر بھر لٹکا کے بیٹھنے کا ڈارون نے اتنا برا نہیں مانا تھا جتنا اس بات کا مانا۔

”آپ دفتر کا معائنہ مت کیجئے۔ مجھ سے بات کیجئے۔“ ڈارون نے کہا۔ ”میں یہاں بہت خوش و فرم ہوں۔“

”آپ کی تحقیقات مکمل ہو گئیں۔“ اس نے چھری سے کاغذات کے اس پلندے کو چھوا جو ڈارون نے تحریر کیا تھا۔

”ہاں۔“ ڈارون نے کاغذات کو سمیت کو دراز میں ڈالا۔ ”اب آپ اپنی خیر منائیے۔“

”خاصی محنت کی ہے تم نے بارہ دن تک۔“ وہ بھر پلاتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ہوٹل کی اس ویٹرس کو بھی تقریباً پھنسا لیا ہے جس نے تمہیں ساری معلومات فراہم کیں۔ مگر میں ابھی ابھی اسے یہ بتا آیا ہوں کہ تم محض اپنا الوسیدھا کر رہے ہو۔“

”اس فضول بکواس کا مطلب کیا ہے۔“ ڈارون نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”خواہ مخواہ برائے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اس بات کا صدمہ ہے تا کہ مجھے تمہاری سرانگراں کا علم کیسے ہوا تو بات یہ ہے مسٹر ڈارون کہ سرانگراں تو تم اچھے خاصے ہو مگر وہ لڑکی بڑی حرافہ ہے اور کچھ میں بھی صورت سے جتنا حق لگتا ہوں اتنا نہیں ہوں۔“ جان ورلان نے کہا۔ ”میں بارہ دن سے تمہاری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ آج میں نے اس ویٹرس کو کیا نام ہے اس کا۔ ہاں لڑکی تو پچاس پونٹ دیے اور اس نے سب اگل دیا۔ تمہیں بھی تو پچاس پونٹ ہی ملے ہیں نا اب تک۔“ ڈارون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”مسٹر جان ورلان۔ آپ نے پچاس پونٹ ضائع کیے۔ میری شہادت مکمل ہو گئی ہے اور یہ شہادت ناقابل تردید ہے۔“

”مسٹر ڈارون۔ میں تردید کرنے نہیں آیا۔ میں تو یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ آخر تم جیسے پرائیویٹ سرانگراں کو اس کام کے لیے کیوں منتخب کیا گیا۔“

”میرے جیسے سے آپ کا کیا مطلب ہے۔“

وہ ہنسا۔ ”مسٹر ڈارون۔ گزشتہ پورے سال میں آپ نے کوئی حیرتیں مارا۔ سوائے چار طلاق کے مقدمات کے آپ کو کچھ نہیں ملا۔ معاذ مے میں آپ کو تین سو پونٹ اور دو جہانپڑ ملے۔ آپ کی سیکرٹری تین ہفتے کی تنخواہ آپ کے ذمے چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ ورنہ وہ بھی آپ کی طرح فاتے کرتی۔ اس کبار خانے کا کرایہ بھی آپ نے تین ماہ سے ادا نہیں کیا لیکن مالک مکان رحل ہے اور یوں بھی اس جگہ کو مفت میں بھی کوئی نہیں لیتا۔ چنانچہ اس نے اب تک آپ کا یہ بیڈ۔“ جان ورلان نے چھری سے میز کو بجایا۔ ”اور یہ چوہے دان۔ سوری۔ یہ ٹائپ رائٹر اور خود آپ کو اٹھا کر

مڑک پر نہیں پھینکا۔ کس کی تحقیقات زیادہ مکمل ہیں۔ میری یا تمہاری۔“ وہ ہنسا۔ ڈارون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے بستر سمیٹ کر میز کے نیچے رکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

”اب میں اپنی آمد کا مقصد بیان کرتا ہوں۔ اگر تم ذرا سمجھداری سے کام لو گے تو فائدے میں رہو گے۔ سرانگراں تمہارا پیشہ ہے اور اس پیشے کو اختیار کر کے تم خدمت خلق نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پیسہ کمانا چاہتے تھے۔ جائز طریقے سے محنت کر کے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا۔ آدمی کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔“ مسٹر جان نے کہا۔ اس کی گفتگو کا انداز مسخر آمیز مگر دوستانہ تھا جس سے توہین کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

”میں حقیقت پسند ہوں اور جائز طریقے سے محنت کر کے کچھ کمانے کا قائل ہوں۔“ ڈارون نے کہا۔

”گڈ اب میری بات غور سے سنو۔“ وہ میز سے اتر اور کمرے میں غصے لگا۔ ”میں تمہیں دو ہزار پونٹ اسی وقت دے سکتا ہوں۔ سو پچاس نہیں۔ دو ہزار اور کام ایسا ہے کہ تم بالکل آسانی سے کر سکتے ہو۔ نہ اس میں کوئی خطرہ ہے نہ کوئی غیر قانونی یا غیر اخلاقی بات۔ دو ہزار پونٹ ہوں تو تم اس کباڑ خانے کی بجائے کسی معقول جگہ پر دفتر بنا سکتے ہو۔ کامیابی کے لیے محض ذہانت کافی نہیں ہوتی۔ سرمایہ بھی چاہیے۔ یہ کوئی کھانے کا سودا نہیں۔“

”دو ہزار پونٹ کی پیش کش کو دیکھتے ہوئے میرا اندازہ ہے کہ مجھ سے زیادہ یہ کام تمہارے لیے اہم ہے۔ اگر میں دو کی بجائے چار ماگوں گا تو تم دے دو گے۔“ ڈارون نے کہا۔ ”حقیقت پسند آدمی ہوتا چنانچہ۔“

”میں دو کے چار ضرور دیدوں گا مگر اسے بلیک میل کہوں گا۔“

جان ورلان نے کہا۔ ”حالانکہ مجھے علم ہے کہ تم باکسر ہو پڑے اچھے۔“

”ٹھیک ہو۔ اب کام بتاؤ۔“ ڈارون نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا۔ جان ورلان اس کے سامنے کرسی پر جا بیٹھا۔ ”کام وہی ہے میری بیوی مجھ سے طلاق چاہتی ہے۔ اس نے تمہیں میرے خلاف شہادت فراہم کرنے کو کہا ہے تمہارے پاس شہادت ہے کہ میں اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہوں۔ مگر میرے پاس ایک ایسی شہادت ہے کہ طلاق ہو ہی نہیں سکتی۔ اس شہادت کو میں فی الحال عدالت کے سامنے پیش نہیں کروں گا۔ جب عدالت طلاق کی درخواست منظور کر لے گی تو تمہارا کام ختم ہو چکا ہو گا اور یہ دستاویز تم پیش کر دو گے چونکہ اس وقت تک تم اپنے موجودہ موکل سے کئے ہوئے معاہدے کی تکمیل کر چکے ہو گی اور محاذ ہو گے کہ کوئی بھی شخص تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہے تو تم اس سے معاہدہ کر سکو اس لیے یہ کام۔“

”چکرمت دو۔ سیدی صاف بات کر دتا کہ میری سمجھ میں آئے۔ کام کیا ہے۔ دستاویز کیسی ہے۔“

”مسٹر سرانگراں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں بے حد اسماٹ اور ہینڈسم آدمی ہوں لیکن زندگی میں عورتیں ہمیشہ مجھ پر مرمی رہی ہیں۔ قصور میرا نہیں ہے یا تو عورتوں کی عقل کا ہے یا..... ایک چیز ہوتی ہے سیکس اپیل غالباً وہ مجھ سے حد سے زیادہ ہے۔ چنانچہ میری بیوی اسی طرح مجھ پر اچانک فریفتہ ہوئی تھی جس طرح پہلے بھی پندرہ سال سے لے کر پچیس سال تک کی خواتین ہوتی رہی ہیں۔ یہ تو ہے میری خدا داد صلاحیت لیکن میں اپنی عقل کا بھی حسب ضرورت استعمال کرتا ہوں اور خواتین کی اس کمزوری کے سبب میری زندگی خاصی فراغت سے بسر ہو رہی ہے۔ چند سال قبل میری بیوی میرے عشق میں جھلا ہوئی تو وہ بھی تنہا تھی اور میں بھی تنہا تھا۔ تین شوہر اسے چھوڑ چکے تھے اور دو بیویوں کو میں چھوڑ چکا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ خاصی دولت مند ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ عقل سے بھی



پیدل ہے۔ چنانچہ میں نے صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ اظہار محبت مجھے ہی کرنا پڑا لیکن اس کے بعد مہینہ بھر کے اندر اندر یہ نوبت پہنچی کہ وہ میرے لیے مایہ آب کی طرح ترسے لگی۔ ظاہر تو میں نے بھی یہی کیا کہ میری حالت بھی کم ابتر نہیں دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادھر بچ بچ کی آگ تھی تو ادھر پردہ عیس کی آگ۔ رومانی ڈائلاگ میں خاصے بول لیتا ہوں اور نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگی کہ مجھ سے زیادہ مخلص اور بے غرض قسم کا شوہر چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا جو حسن سیرت و صورت سے بول مالا مال بھی ہو۔ جب اس کی حالت غیر ہونے لگی اور وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر پانی پینے لگی اور چاند کو دیکھ دیکھ کر اس پر رقت طاری ہونے لگی اور وقت بے وقت میرے دروازے پر دستک دینے لگی تو میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتی تو میں دو قدم پیچھے ہٹ جاتا۔۔۔۔۔۔ وہ بے قرار ہو کر اور آگے آتی اور میں جان بوجھ کر۔۔۔۔۔۔ وہ دہانہ دار میرے تقاب میں رہی اور میں اسے اس انتہاء لے آیا یہاں وہ میری شرمناک صورت کے مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی۔ میں نے ایک معمولی سی شرط رکھی۔ بس پانچ ہزار پونڈ سالانہ۔ اس کے لیے یہ رقم کچھ نہ تھی اور میں نے یہ بات سلیقے سے کہی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ذرا کامل واقع ہوا ہوں اور اس کے پاس بے اندازہ دولت ہے جو ویسے تو شادی کے بعد میری ہی کھلائے گی لیکن میں چاہتا ہوں کہ کچھ رقم بطور جیب خرچ مجھے بھی ملتی رہے جسے میں اپنی مرضی سے خرچ کر سکوں۔ وہ فوراً مان گئی ایک تحریری معاہدہ ہو گیا۔ جس میں عین وقت پر میں نے پانچ ہزار پونڈ میں تاحیات یا طاق تک ہر سال ادائیگی کی حق بڑھا دی۔ اسے احساس بھی نہ ہوا۔ ”وہ کرسی سے اٹھا اور کمرے میں ٹپکنے لگا۔ چھڑی کو وہ دونوں انگلیوں میں پکے کی طرح گھما رہا تھا۔“ طلاق کی

صورت میں تمہیں پانچ ہزار پونڈ سالانہ کا نقصان ہے۔“ ڈارون نے کہا۔ وہ رک گیا۔ ”بالکل۔ مگر انہی بات ختم نہیں ہوئی۔ چوری سے جائے ہیرا پھیری سے کہاں جاتا ہے۔ شادی سے میری ضرورت تو پوری ہوئی مگر فطرت نہیں بدلی۔ دو چار معاشقوں کی ہینک اس کے کان میں بھی پڑی اور دو چار مرتبہ اس نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ایک بار گھر کی ملازمہ کے ساتھ۔ ایک بار اس کی بہن کی لڑکی اور ایک بار اس کی کسی سہیلی سے وہی باتیں کرتے ہوئے جو میں نے اپنی بیوی سے کی تھیں۔ یہ گفتگو ریکارڈ کی طرح مجھے آذیر تھی اور میں ذرا سے روو بدل کے ساتھ موقع محل کی مناسبت سے کوئی بھی ریکارڈنگ دیتا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے مجھے اسی سہیلی کے ساتھ پکنک اور تھیر وغیرہ جاتے دیکھا۔ اسی زمانے میں میری بیوی کا تھوڑا سا زیور چوری ہو گیا۔ اور اس کی سہیلی کے پاس دیکھا گیا۔ امید ہے تم بات سمجھ رہے ہو گے۔ زیور میں نے خود چرایا تھا اور تحفے میں دے دیا تھا مگر مجھے معلوم تھا۔ راز افشاء بھی ہو گا اور میری بیوی ہنگامہ بھی کرے گی چنانچہ اس نے مجھ پر بے وفائی کے ساتھ چوری کا الزام بھی لگایا اور میں نے ایک جھانپو رسید کیا۔ پھر وہ رونے دھونے لگی کہ میں ہرجانی ہوں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اس سے محبت وغیرہ نہیں رہی اور میں نے کہا محبت تو واقعی نہیں رہی مگر چھٹکارا مانے کا کوئی سوال نہیں۔ میں احمق نہیں ہوں جو پانچ ہزار پونڈ سالانہ کی آمدنی پر خود لات مار دوں۔ وہ اس صاف گوئی اور پرلا اظہار حقیقت پر بھونچکی رہ گئی مگر وہ پھنس چکی تھی۔ معاہدہ میرے پاس تھا مگر اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس نے مجھے مکار عیار چار سو بیس بلیک میلر وغیرہ کہا جو میں تھا مگر میں نے بھی جواباً اسے پیشہ ور ”شو باز“ کہا۔ پاؤں سے اتری ہوئی جوتی سے تشبیہ دی اور بات اس پر ختم ہوئی کہ وہ ایک طوائف سے کسی صورت کم نہیں جسے ایک مرد کے

ساتھ زندگی بسر کرنے کی عادت نہیں ہوتی ورنہ اس کے تین شوہر اس پر تھوک کر نہ گئے ہوتے۔ مسٹر ڈارون عورتیں ذرا جذباتی طور پر کمزور ہوتی ہیں اور حقیقت کو فوراً تسلیم نہیں کر سکتیں۔ کرنی ہیں مگر آہستہ آہستہ جس طرح میں نے اس کے الزامات کو سکون سے سنا تھا اور قبول کر لیا تھا وہ نہ کر سکی۔ اس نے ہسٹریائی کیفیت میں گلہ ان وال لائش برتن اور معلوم نہیں کیا کچھ تو دیا۔ پھر میں ایک ہفتے تک غائب رہا۔ اس کا غصہ تداامت میں بدل گیا کیونکہ وہ بے بس تھی۔ وہ مجھے تلاش کرتی رہی اور جب میں اسے ملا تو اس نے فوراً معافی مانگ لی مگر میں جو کچھ کر رہا تھا ایک مقصد کو سامنے رکھ کر کر رہا تھا۔ مشکل سے دس دن گزرے ہوں گے کہ اس کا ایک نکلس چوری ہو گیا اور پھر اسی سہیلی کے گلے میں نظر آیا۔ کبھی تو جوان تھی لیکن خوب صورت نہ تھی اور میں اسے یہ جھانسنے دے رہا تھا کہ بہت جلد میں اس بڑھیا سے نجات حاصل کر کے اس سے شادی کر لوں گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میں زیور چرواؤں گا اور تمہیں لا دوں گا اور وہ مجھ سے لڑے گی مجھے چور کہے گی اور میرے لیے علیحدگی کا جواز پیدا ہو جائے گا۔ اس کی وہ سہیلی بڑے ٹھاٹھ سے نکلس پہن کر میرے ساتھ پھرتی رہی اور ایک دن میری بیوی نے اپنی سہیلی کو بھی چور کہا تو سہیلی نے میری بیوی کے ایک پھٹ مارا اور وہی باتیں کہیں جو میں کہہ چکا تھا۔ اس سے مل کہ میری بیوی پولیس میں رپورٹ کرنی، میں نے اپنی بیوی سے سارا زیور واپس لے لیا اور اس کی سہیلی کو خاصی رقم ملی کیونکہ پولیس کو سہیلی کے گھر سے کچھ نہ ملا اور سہیلی نے اس پر ہینک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ پولیس نے مجھ سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کچھ ثابت نہ کر سکی۔ ہمارے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ بیوی نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ شروع کر دیا مگر میں پانچ ہزار پونڈ سالانہ کی آمدنی کو کیسے جانے دیتا۔ میں نے کہا ایک صورت میں طلاق ہو سکتی ہے۔ تم یکشت پچاس ہزار پونڈ ادا کر دو۔ پچاس پر

تو وہ نہیں مانی مگر چالیس پر مان گئی۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ طلاق کے بعد کمزور نہ جائے۔ چنانچہ میں نے کہا کہ طلاق کا مقدمہ اس کی طرف سے دائر ہو گا مگر ثبوت میں فراہم کر دوں گا۔ گزشتہ بارہ دنوں سے میں یہی کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کو خاصے ٹھوس ثبوت فراہم کر دیے ہیں اور میرا خیال ہے ان کی بنیاد پر طلاق ہو جائے گی۔“ اس نے چھڑی سے میز بجاتے ہوئے کہا۔ ”میرے لیے یہ کھانے کا سودا نہیں۔“ ڈارون نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”لیکن اپنے چالیس ہزار پونڈ کا تحفہ کرنے کے لیے میں نے کہا کہ اسے ایک تحریر دی ہوگی۔ ایک نیا معاہدہ ہو گا جس کی رو سے طلاق کی درخواست منظور ہوتے ہی وہ مجھے چالیس ہزار پونڈ ادا کر دے گی۔ عورت کی ذات کس حد تک ناقص اٹھل ہوتی ہے مسٹر ڈارون اس کا اندازہ آپ اس تحریر سے لگا سکتے ہیں۔ طلاق کی درخواست منظور ہونے اور طلاق ہونے میں بڑا فرق ہے طلاق نوے دن بعد نافذ العمل ہوتی ہے۔ اس درمیان میں فریقین اگر چاہیں تو مصالحت کر سکتے ہیں اور درخواست کا لعدم ہو جاتی ہے۔ اگر صورت حال برقرار رہے تو نوے دن گزرتے ہی طلاق عمل میں آ جاتی ہے۔ میں نے اس کی طرف سے ایک خط کا مسودہ تیار کیا کہ ”مسٹر جان ویرلان میں وعدہ کرتی ہوں کہ طلاق کی درخواست منظور ہوتے ہی آپ کو چالیس ہزار پونڈ ادا کر دوں گی۔“ مسودہ ٹائپ کیا ہوا تھا اور میں نے عملاً ایک ایک سطر کی جگہ خالی چھوڑ دی تھی۔ جب اس بے وفوف نے دستخط کر دیے تو میں نے اسی ٹائپ رائٹر پر ایک سطر کا اضافہ کیا۔ کیونکہ اس طلاق سے میرا مفاد وابستہ ہے۔“ یہاں تک بات آپ کی سمجھ میں آ گئی۔ ”آگئی تم نے چوٹی اور اس نے بانجویں شادی کرنے کے لیے یہ معاہدہ کر کے بڑی عظمندی کا ثبوت دیا۔“



”میرا خیال ہے اس نے اب تک جتنی شادیاں کی ہیں غلط کی ہیں۔ شوہر کا انتخاب کرنے میں کبھی عقل سے کام نہیں لیا اور نہ یہ ثبوت برآتی۔“ جان درلان نے پھر میز پر ڈارون کے سینے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کی سب سے بڑی بے وفائی یہ خط ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”دو دن بعد تمہارے پیش کردہ ثبوت کی بنیاد پر رابرٹ رابرٹ اسٹون اینڈ رابرٹ۔ کیا محکمہ خیر اور غیر ضروری طور پر طویل نام ہے۔ خیر یہ مکمل طلاق کی درخواست دیں گے اور درخواست منظور ہو جائے گی۔ چار ہزار آپ کو مل جائیں گے۔ چھتیس ہزار مجھے۔“

”ہیں۔“ ڈارون نے کہا۔  
”تانا تویں۔ جب مجھے چالیس ہزار پونڈ مل جائیں گے۔ تو میں یہ خط آپ کو دیدوں گا۔ آپ اسے عدالت میں پیش کر دیں گے کہ آپ کے موکل نے آپ سے غلط بیانی کی اور طلاق کی درخواست بدعتی بنی ہے کیونکہ آپ کو اپنے موکل کی یہ تحریر پڑھنی چاہیے جو وہ آپ کے دفتر میں غلطی سے چھوڑ گئی اور اب آپ کو شبہ ہے کہ جو ثبوت آپ نے فراہم کیے ہیں وہ مشتبہ ہیں۔ ممکن ہے یہ سارا ڈرامہ ہو اور اس کے لیے ایک لڑکی بھی حاصل کر لی گئی ہو۔ جب سماعت ہوگی تو نہ میں ثبوت صحیح تسلیم کروں گا۔ اس لڑکی کو بیچاؤں گا۔ صرف یہ کہوں گا کہ مجھے بلیک میل کرنے کے لیے اس لڑکی کو میرے پیچھے لگایا گیا ہوگا اور ثبوت اس طرح حاصل کر لیے گئے ہوں گے کہ مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ دیکھئے نامسٹر ڈارون۔ کسی پارک میں کوئی بھی لڑکی آپ کے قریب آکر بیٹھ سکتی ہے۔ آپ سے ٹکرا سکتی ہے اس طرح کہ آپ اسے دونوں ہاتھوں سے سنبھالنے پر مجبور ہو جائیں۔ اسی قسم کی تصاویر ہیں نا آپ کے پاس دو ہزار پونڈ کے عوض ایک لڑکی شیلہ اسکاٹ کے نام سے ہوں میں ضرور پتھر ہی بھی مکر وہ صرف یہ تصدیق کر سکے گی

کہ اس نے مجھے ہوٹل میں دیکھا تھا۔ شاید ایک بار مجھے سے ٹکرائی بھی تھی۔ بیخ والی تصویر کا علم نہیں۔ کسی نے اسے میرے ساتھ نہیں دیکھا۔ ہم دونوں ہمیشہ الگ الگ نیچے اوپر آتے جاتے تھے۔ روم سروس والے نے بھی اسے میرے کمرے میں نہیں دیکھا۔ البتہ اس کا ایک علیحدہ کمرہ بھی ایک تھا جہاں اسے سب نے دیکھا اور مجھے نہیں دیکھا۔ اس کا نام شیلہ اسکاٹ ہے اور اس کا کمرہ اسی نام سے بک تھا۔ میرا اپنا ڈبل روم بھی جان درلان اور شیلہ اسکاٹ کے نام سے بک تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نام کی کوئی لڑکی ہوٹل میں نہیں ٹھہری تھی۔ میری بیوی سمجھ رہی تھی کہ میں ثبوت فراہم کرنے کے لیے ڈرامہ کر رہا ہوں اور آپ اپنی کارکردگی سے مطمئن تھے۔ اصل شیلہ اسکاٹ اپنے ماں باپ کے گھر میں موجود ہے اور عدالت میں بیان دینے پر ضرور حاضر ہوگی۔ وہ لڑکی جو شیلہ اسکاٹ بن کر رہی تھی کوئی اور تھی۔ چنانچہ ان حالات میں طلاق کیسے ہوگی۔ درخواست خارج ہو جائے گی۔“

”خوب مسٹر جان درلان۔ یو ار اے باسٹڈ۔ تم نے بڑا مکمل پلان بنایا ہے۔“ ڈارون نے کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”طلاق کی درخواست منظور ہونے پر تمہیں چالیس ہزار پونڈ مل جائیں گے پھر طلاق نہیں ہوگی اور پانچ ہزار پونڈ سالانہ چلتے رہیں گے۔“

”اے درمیان ابتداء میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں ڈارون نے کہا۔“ ڈارون نے کہا۔ ”کام کی نوعیت کے پیش نظر۔“

”کیا۔۔۔۔۔۔“ جان درلان نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔  
”کیسی ترمیم۔“

”دفتری گفتی۔ تم بیس ہزار کے علاوہ سالانہ پانچ ہزار بھی لو گے۔ میں صرف ایک بار بیس ہزار لوں گا۔“ ڈارون نے کہا۔ ”مستقل آمدنی بڑی اچھی چیز ہے۔ کھانے کا سودا نہیں ہے تمہارے لیے۔“

جان درلان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”تم بھی بلیک میل کر رہے ہو مجھے۔“ وہ ڈارون کے سامنے میز پر جھکا۔  
”دوسری بات یہ کہ مجھے بھی اپنے بیس ہزار ہانڈ کا تحفظ چاہیے تم وہ خط میرے پاس چھوڑ جاؤ۔“

دارون نے اطمینان سے کہا۔ ”کیونکہ تم بھی تو کر سکتے ہو۔ ڈرا دور سے بات کرو اور تمیز سے تمہیں معلوم ہے میں بڑا اچھا باکسر ہوں۔“ جان درلان ہنسا اور ڈارون کو گھورنے لگا۔ پھر اس نے ایک گندی سی گالی دی اور جیب سے ایک کاغذ نکالا۔  
”یہ لو۔ اس نے میز پر وہ کاغذ پھینک دیا۔ سنبھال کر رکھنا۔ ورنہ۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے لیے بیس ہزار پونڈ کا چیک ہے۔“ ڈارون ہنسا اور اس نے کاغذ کو تہہ کر کے

ایب میں رکھ لیا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کے بغیر اس کو یس نہیں کر سکتے۔“ جان درلان کے جانے کے بعد ڈارون نے آفس چیمبل کو مسہری میں تبدیل کر دیا اور سو گیا۔

☆☆

ٹھیک ایک ہفتے بعد ڈارون اپنے بیڈ روم میں لیٹا چھت پر چکی ہوئی چھلکی کو گھور رہا تھا کہ دروازہ بجا۔ اس نے فوراً بستر گول کیا اور میز کے نیچے ڈال دیا۔ دراز میں سے قلم دوات کاغذات

وغیرہ لٹال کر میز پر پھیلانے اور نائٹ گون پہن کر دروازہ کھولا۔ جان درلان نے بیٹھ اتار کر سرخم کیا اور مسکرایا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ ”اگر تم نے میرے استقبال کے لیے یہ اہتمام نہ کیا ہوتا۔“ اس نے چھتری سے میز پر پھیلے ہوئے سامان کو دیکھ کر کہا۔ ”تو بہتر تھا۔ اتنی رات کو بھلا میرے سوا کون آ سکتا تھا۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائٹ گون اتار کے ڈارون نے پھر اس سامان کو دراز میں ڈالا اور بستر بچھا کر میز پر بیٹھ گیا۔ ”تمہاری صورت بتا رہی ہے کہ تمہیں چالیس ہزار پونڈ مل گئے ہیں۔“

”لیں۔ وعدے کے مطابق میں تمہارے بیس ہزار پونڈ لے آیا ہوں۔ تم خواہ خواہ بدگمان تھے۔“ جان درلان نے کہا۔

”طلاق کی درخواست برسوں منظور ہوئی تھی۔“ ڈارون نے آلتی پالتی مار کر کہا۔  
”ہاں۔ کل مجھے رقم وصول ہو جانی مکر وہ چیک دے رہی تھی۔ میں نے کیش پر اصرار کیا۔ چنانچہ ایک دن کی تاخیر ہوئی۔“ جان درلان نے جوتوں سمیت میز پر بیٹھ پھیلا دیے۔ ”تم رقم کن لو۔“  
”مجھے اعتبار ہے۔“ ڈارون نے بریف کیس کھول کر ایک نظر فونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس وہ خط محفوظ ہے نا۔ میں کل صبح دس بجے آ رہا ہوں۔“ ڈارون نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”خط ابھی تک بالکل محفوظ ہے۔ ضرور آؤ۔“

”اوکے۔ میں چلتا ہوں۔ تمہارے سونے کا وقت ہے۔“ جان درلان اٹھا۔ ”شب بخیر۔“  
”ایک منٹ۔ تم کدھر جا رہے ہو۔“

ڈارون میز سے اتر ا۔  
”میں۔“ وہ ہنسا۔ ”تم سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں بلیو ہون جا رہا ہوں۔“  
”بلیو ہون یا گرین ہون۔“ ڈارون نے حیرانی سے کہا۔ ”جنت کے دنیا میں کتنے رنگ



ہیں۔“

”ابھی میں نے سارے نہیں دیکھے۔“ وہ ہنسا۔ ”دیکھ لوں گا۔ کیوں۔“

”مجھے گرین ہیون جانا تھا۔ میرا خیال تھا تمہارے ساتھ چلا جاؤں خیر.....“ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”چلو کوئی بات نہیں میں راستے میں اتار دوں گا۔ وہ..... کیا نام تھا اس کا..... لڑی..... لڑی ہی تھان۔“

”ہاں۔“ ڈارون نے لباس تبدیل کرتے ہوئے جواب دیا۔ جان درلان نے قہقہہ لگایا۔ گرین ہیون کے سامنے جان درلان کی کار سے اتر کر ڈارون نے بریف کیس ہاتھ میں اٹھایا اور ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ جان درلان نے ہاتھ ہلایا اور اس کی کار زدم سے آگے نکل گئی۔ پھر ڈارون پلٹا اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔

☆☆

ساڑھ نو بجے ڈارون نے کمرے پر آخری نظر ڈالی۔ سوائے میز کے کمرے میں کچھ نہیں تھا اور میز پر بھی بستر بچھا ہوا تھا۔ تینوں کرسیاں جو سامنے رکھی رہتی تھیں باورچی خانے میں بند تھیں۔ دائیں اور بائیں ہاتھ والی کرسیاں اور ”عملے“ کا فرنیچر ٹاپ رائٹر سمیت منسلک خانے میں تھا۔

دس بجے جان درلان نے کھلے دروازے سے اندر قدم رکھا تو تھوڑا سا حیران ہوا۔ ”فائن“ تم دفتر تبدیل کر رہے ہو۔ راتوں رات تم نے بندوبست کر لیا ہے یا پہلے سے کوئی جگہ دیکھ رکھی تھی۔ مگر اب تم ترتی کرو گے۔ اچھا دفتر اچھے کاروبار کی ضمانت ہے۔“ وہ بریف میس کو اپنے سامنے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔

”یہاں سے میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔“ ڈارون نے دونوں ہاتھ پیچھے رکھے اور میز کے سہارے کھڑا رہا۔

”پھر۔ سامان کہاں گیا۔ خیر چلو۔ تمہارے ساتھ میں بھی ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر چل رہا

ہوں۔“ جان درلان نے کہا۔

”میں نے کہا تا کہ میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔“ ڈارون نے آہستہ سے پرسکون آواز میں کہا۔

”کیوں۔ میری بیوی کا خط نہیں پیش کرتا۔“ جان درلان نے حیرت سے کہا۔

”نہیں۔ وہ خط میں نے جلا دیا ہے۔“ ”تمہارا دماغ خراب ہے۔ یہ کیا مذاق ہے۔“

”نہ میرا دماغ خراب ہے۔ نہ یہ مذاق ہے۔ میں نے خط واقعی جلا دیا ہے۔“ ڈارون نے دونوں ہاتھ بظلوں میں دیتے ہوئے کہا۔ دونوں ہاتھوں پر باکسنگ کے دستاں چڑھے ہوئے تھے۔ باکسنگ کے دستاں دیکھ کر جان درلان سب کچھ سمجھ گیا۔ ”تم..... تم نے وہ خط جلا دیا ہے۔ کیوں۔ اور خط جلایا ہے تو میرے بیس ہزار پونڈ کدھر ہیں۔“

”میں ہزار پونڈ۔“ ڈارون نے حیرانی سے دہرایا۔ آپ کے بیس ہزار پونڈ آپ کے پاس ہوں گے مسٹر جان درلان۔“

”شٹ اپ۔“ جان درلان نے بریف کیس گھمایا۔ ”وہ جو میں نے تمہیں دیے تھے۔ وہ بیس ہزار پونڈ۔“

”جو مجھے دیے تھے۔“ ڈارون نے ایک ہاتھ پر بریف کیس کو روکتے ہوئے دوسرے ہاتھ کا کہ جان درلان کے منہ پر مارا وہ دروازے کے قریب جا کر۔ ڈارون اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جان درلان نے اٹھ کر کپڑے چھاڑے۔

”آپ کے پاس کوئی گواہ ہے مسٹر جان درلان نہیں۔“ ڈارون نے کہا۔ ”مشکل یہ ہے۔ آپ آئے ہی ایسے وقت تھے..... خیر وہ میں نے آپ کی بیوی کو پہنچا دیے ہیں۔“

”کیا۔“ جان درلان نے رومال سے جبڑے کو دباتے ہوئے کہا اور ایک انگلی سے ہاتھ

جانب کی داڑھوں کو ہلا کر دیکھا۔

”کل رات جب آپ نے مجھے گرین ہیون کے دروازے پر چھوڑا تو میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی آپ بلیو ہیون جا رہے ہیں۔ پھر میں آپ کی بیوی سے ملنے چلا گیا۔ روم میں نے اسے واپس کر دی اور خط اس کے سامنے جلا دیا۔“ ڈارون نے کہا۔ ”دانت کوئی نہیں ٹوٹا ہوگا۔ میں ناپ تول کر ہاتھ مارتا ہوں۔“

”کیوں۔ اس ڈرامے کا مقصد کیا تھا۔ تمہیں اس سے کیا ملا۔ یہ گھانے کا سودا کر کے حاصل کیا ہوا تمہیں۔“

”مجھے ایک سو پونڈ ملے۔ میری آدمی فیس۔ دیے وہ دو سو پونڈ کیا دو ہزار پونڈ بھی خوشی سے دے دیتی۔ مگر میں نے اسے پرانے تعلقات کی وجہ سے پچاس فیصد رعایت دی۔“ ڈارون نے کہا۔

”کیسے پرانے تعلقات۔ تم اسے کب سے جانتے ہو۔“ اس نے جبڑے سے ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”تیس سال سے وہ میری آخری بیوی تھی پہلی اور آخری اور میں اس کا پہلا شوہر تھا۔ آخری شوہر کہلانے کا اعزاز بھی غالباً مجھے ہی حاصل ہو گا۔ اس معاملے میں وہ واقعی اناڑی ہے۔ تم نے ایک کہا تھا کہ اس نے ساری شادیاں غلط کی ہیں۔ مگر وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھ رہے۔ جب رابرٹ رابرٹ اسٹون اینڈ رابرٹ کیا منجھکے خیر اور غیر ضروری طور پر طویل ام ہے۔ ان کا منیجر میرے پاس آیا تو میں سمجھ نہیں سکا کہ اتنی بڑی فرم نے میرے جیسے سراغ رسالوں کو کیوں منتخب کیا۔ جس نے سال بھر میں کوئی تیر لاکھ مارا سوائے طلاق کے چار مقدمات لینے۔ جس کا معاوضہ تین سو پونڈ اور دو جھانپڑ ملے۔ بس مسٹر جان درلان۔ آپ کی تحقیقات مکمل ہو گئیں۔“

”مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ میں نے بھی اس

کے دو جھانپڑ کھانے کے بعد اس کے دو دانت توڑ دیے تھے خیر جب انہوں نے موکل کا نام بتایا تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میری بیوی نے اصرار کیا ہوگا کہ میری خدمات حاصل کی جائیں۔ ورنہ وہ اس کباڑ خانے میں کبھی قدم نہ رکھتے۔ جہاں ایک چوہے دان نما ٹائپ رائٹر ہے۔ اس وقت میں نے اسے ہاتھ روم میں رکھ دیا ہے۔ ایک فاقہ زدہ سیکرٹری بھی جو تین ہفتے کی تنخواہ چھوڑ کر بالآخر بھاگ گئی۔ میری بیوی مجھے جانتی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ اس کا نام سن کر میں اس کی مدد ضرور کروں گا۔ اسے خود میرے سامنے آتے ہوئے شرم آئی تھی مگر اسے جو کہنا تھا وہ اس کے کہے بغیر میں نے سمجھ لیا۔ جب تم آئے تو بات بالکل واضح ہو گئی اور میں نے تمہاری نہیں تمہاری بیوی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ امید ہے اب تم سمجھ گئے ہو گے۔ آدمی روم اسے واپس پہنچ گئی۔ تین ماہ بعد طلاق ہو جانے کی اور اس کے پانچ ہزار پونڈ سالانہ صاف فاقہ جائیں گے بیس ہزار پونڈ دے کر اس نے تم جیسے شیطان سے نجات حاصل کر لی۔ میرے خیال میں یہ گھانے کا سودا نہیں۔ میں تمہاری نہیں اپنی بات کر رہا ہوں۔ بیس ہزار پونڈ کے بدلے آدمی کو اپنی گمشدہ محبت کی جنت مل جائے تو وہ اس کباڑ خانے سے یقیناً بہتر ہے۔“

جان درلان نے بریف کیس اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ”مسٹر جان۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اٹھارہ پونڈ راستے میں کسی ڈاک خانے سے انجیلا کے نام مٹی آرڈر کر دیجیے۔ یہ ہے اس کا پتا اور یہ ساڑھ تین شلنگ مٹی آرڈر فیس۔“

﴿.....﴾





عابد علی سید

کچھ دیر کے لیے میری توجہ عام لڑائی کی طرف ہو گئی تھی لیکن پھر میں نے جب گولہ بارود کے کڑکتے بادل کے بیچ میں نظر دوڑائی تو برائیل دکھائی دیا جو اس وقت دوست دشمن دونوں کی نظر میں اس قتل عام کی وجہ سے مفلح تھا۔ وہ ایسی جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں وہ دونوں طرف کی افواج کی نظر سے اوجھل تھا۔

### ایک شخص کا قصہ جو میدان جنگ میں شریک تھا۔

تھا۔ چونکہ وہ عام طور پر لڑائی کے دوران بھی پوری وردی میں ملبوس ہوتا تھا۔ جب کہ دوسرے لوگ لباس کے سلسلے میں لا پرواہ تھے۔ وہ سارے لوگوں میں دور سے نمایاں نظر آتا تھا، اس کے چہرے سے وجاہت نکلتی تھی۔ اس کی عمر تقریباً تیس سال تھی اور وہ شریفانہ اطوار عالموں اور فلسفیوں کا سا انداز فکر اور شیر کا دل رکھتا تھا۔

وہ جلد ہی ہم سب کی پسندیدگی اور تعریف و توصیف کا مرکز بن گیا لیکن اس کے ہمارے ساتھ شریک ہونے کے بعد پہلے ہی محر کے دوران یہ جان کے بہت تشویش ہوئی کہ اس میں ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک غیر سپاہیانہ عادت تھی یعنی وہ میدان جنگ میں ضرورت سے زیادہ دلیری کا مظاہرہ کرتا تھا جو یقیناً قابل اعتراض بات تھی۔

اس سارے خطرناک معرکے کے دوران جبکہ ہمارا دستہ کپاس کے کھیت میں لڑ رہا تھا یا جنگل میں مورچہ بند تھا یا ریلوے لائن کے کنارے کے عقب سے حملہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی پناہ لینے کی کوشش نہیں کی سوائے ان موقعوں کے

**لیفٹیننٹ ہرمن برائیل** ہمارا بہترین ساتھی تھا۔ اس کا شمار دستانے کے دو ممتاز ترین افسروں میں ہوتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں جنرل سے مل گیا تھا۔ شاید کسی اوپور جمنٹ میں۔ ہم میں سے کسی کے ساتھ پہلے سے اس کی کوئی شناسائی نہیں تھی اور یقیناً یہ بات حیرت انگیز ہوتی۔ اس لیے کہ ہم میں سے کوئی بھی دو افراد کسی ایک ریاست یا دوسری ریاستوں سے نہیں آئے تھے۔ جنرل کے خیال کے مطابق جوانوں کو اس کی فوج میں شمولیت کا اعزاز بخشے ہوئے صرف اس معیار پر تیار کیا جاتا تھا کہ ان میں علاقائی اور گروہی تعصبات تو موجود نہیں۔ اس نے اپنے ذاتی عمل کا انتخاب بھی اپنی فوج سے نہیں کیا تھا بلکہ اس کے لیے افسران بالا کی تائید سے مختلف بریگیڈوں سے جوانوں کو چنا گیا تھا۔ اس کے عملے میں جو افراد بچھری کیے گئے تھے۔ ان کی مشترک خصوصیت یہی تھی کہ وہ شاندار اور ممتاز شخصیت کے لوگ تھے۔

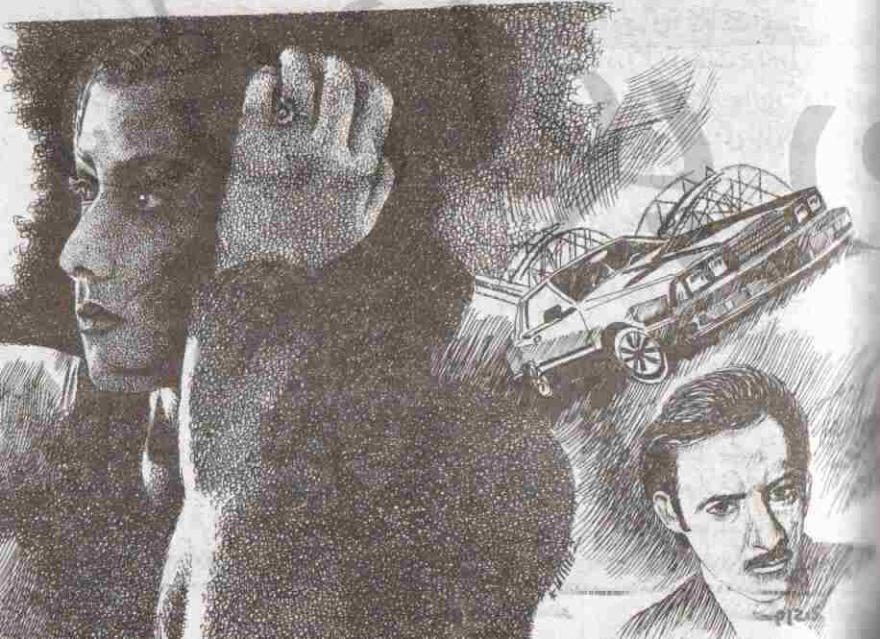
لیفٹیننٹ ہرمن برائیل بھی بہترین شخصیت کا ملک تھا۔ چھ فٹ سے زائد قد، شاندار بدن، آنکھیں نیلی اور بال بھورے۔ اس کے چہرے سے اس کے اعلیٰ ترین باہمت ہونے کا اندازہ ہوتا

اب جنرل نے سختی کے ساتھ اسے اس حرکت سے باز رہنے کی تنبیہ کی۔

بعد کے معرکوں میں بھی یہی ہوا اور وہ عموماً گولیوں کی بارش میں بھی اپنے گھوڑے پر سوار مہلکی ہوئی جگہوں پر ایسی بے نیازی سے کھڑا رہتا جیسے کوئی مجسمہ۔ حالانکہ وہ بعض موقعوں پر بغیر اپنے گھار کو خطرے میں ڈالے اطمینان سے پناہ لے سکتا تھا اور خود کو دشمن کی نگاہوں سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اب وہ گھوڑے پر سوار نہ ہوتا تو بھی اس کا یہی رویہ ہوتا اور ایسے وقت میں جب بلحاظ عہدہ تمام اعلیٰ و اعلیٰ فوجی پناہ گاہوں میں چھپ جانے کو ترجیح دیتے۔ وہ کھلے میدان میں یا پہاڑی چوٹی پر کچھ اس شان سے ایستادہ رہتا۔ جیسے دشمن کو دعوت

مبارزت دے رہا ہو۔ جب لڑائی کھلے میدان میں ہو رہی ہو اور (یقیناً نہایت قریبی فاصلے پر آئے سارے موجود اہل تو لڑنے والوں کو زمین سے چپک کے مٹی سے اپنی محبت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ زندگی سے ہمت انہیں مٹی چاٹنے کی بے عزتی برداشت کرنے

پر مجبور کر دیتی ہے کیونکہ اسی طریقے پر وہ اڑتے ہوئے سیسے کے گلولوں اور فضا میں سرسراہٹ ہوئی گولیوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ سوچئے اس صورت حال میں بریگیڈ کے کسی اسٹاف آفیسر کی زندگی کیسے خوشگوار ہو سکتی ہے۔ اس کے فرائض منہمی کا تقاضا کچھ ایسا ہے کہ وہ کسی بھی لمحے لڑائی کی ہولناکی کا شکار ہو سکتا ہے۔ مزید برآں اسے اور بھی کئی خوفناک کام سرانجام دینے ہوتے ہیں۔ مثلاً اسے بعض اوقات اگلے مورچوں میں کسی افسر تک کوئی ضروری پیغام پہنچانے کے لیے بھی منتخب کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بڑے جان جوہوں کا کام ہے اور لڑائی میں مصروف فوجیوں کے ہجوم میں اس مخصوص شخص کو ڈھونڈ کے خاص نشانات کے ذریعے پیغام پہنچانے کے لیے آدی کو اپنی ہتھیلی پر دھر رکھ کے جانا پڑتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کو یہ فرض سونپا جاتا ہے تو اسے سر جھکا کے میدان جنگ میں تیر کی مانند دوڑنا پڑتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دوڑتے ہوئے کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے سینکڑوں نشاندہ بازوں کے لیے





ایک بہت ہی پرکشش ہدف کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد واپسی میں..... لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جانے والے واپس نہیں آتے۔

برائیل کی عادت کچھ عجیب تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو اردلی کے چوالے کر دیتا کیونکہ اسے اپنے گھوڑے سے محبت تھی۔ پھر وہ بڑی بے خونی اور خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنے خوفناک مشن پر روانہ ہو جاتا لیکن وہ سر جھکانے کا تکلف نہ کرتا نہ اس کی کمر خم ہوتی اور اس کا تپا ہوا شاندار بدن جگمگاتی ہوئی وردی میں انتہائی پرکشش لگتا۔ ہم سب سانس روکے اسے دور جاتے دیکھتے رہتے اور بار بار کلیجہ اچھل کے منہ کو آ جاتا۔ ایک ایسے ہی موقع پر ہمارا ایک ساتھی اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اور بھلا کے بولا۔

”مم..... میں..... شرط..... ل..... لگاتا ہوں کہ وہ اسے اگلی خندق تک پہنچنے سے پہلے ہی مار گرائیں گے۔ نہیں تو میں تمہیں دو ڈالر دوں گا۔“

لیکن میں نے یہ خونی شرط قبول نہیں کی اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ یہی انجام ہوگا۔

بہر حال یہاں مجھے اس بہادر آدمی کو یہ کہہ کر خراج عقیدت پیش کرنے دیجیے کہ اگرچہ غیر ضروری طور پر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا اس کی عادت تھی لیکن میں اس نے اپنی بہادری کا تذکرہ کرنے یا خواہ مخواہ اترانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اگر بھی ہم میں سے کوئی شخص اسے میدان کارزار میں محتاط رہنے کی ہدایت کرتا تو براہل مسکرا کے کوئی ایسا شگفتہ سا جواب دیتا کہ اس موضوع پر کسی گفتگو کی گنجائش نہ رہتی۔ ایک بار اس نے کہا۔

”کپتان یقین کریں اگر بھی آپ کی ہدایت فراموش کرنے پر مجھے اپنے انجام کو پہنچنا پڑا تو میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ آخری لمحوں میں میرے کان آپ کی محبت آمیز سرگوشی سے گونج اٹھیں۔ دیکھا میں

نے کیا کہا تھا۔“

ہم سب کپتان پر ہنس پڑے۔ کیوں بنے اس کا جواب خود ہمارے پاس نہیں تھا۔

پھر اسی شام جب کپتان دشمن کے ایک اچانک حملے کے دوران گولی کا نشانہ بنا تو براہل دیہ تک توپوں کے پھٹتے ہوئے گولوں اور سنسنائی گولیوں کے درمیان اس کی نقش کے پاس بیٹھا اس کے اعضاء درست کرتا رہا۔ برائیل کے غیر محتاط رویے کو آسانی کے ساتھ لٹن طعن کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔

اس عادت سے گریز کرنا بھی کوئی مشکل نہیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس کا احترام نہ کیا جائے۔ براہل کو اس کی غیر محتاط ہونے کی ناپسندیدہ عادت کے باوجود سب لوگ بہت پسند کرتے تھے اور سب کی خواہش یہی تھی کہ وہ عقل سے کام لے کر زندگی کے قدر کرنا سیکھے لیکن وہ آخر دم تک اپنے دستور پر قائم رہا اور کئی مرتبہ اپنی اسی عادت کے سبب بری طرح زخمی ہوا لیکن محبت یاب ہونے پر ہمیشہ پہلے کی طرح تازہ دم ڈیوٹی پر واپس آیا۔

آخر کار وہ کبھی آہنچھا جسے ایک نہ ایک دن ضرور آنا تھا۔ دراصل وہ لوگ جو اصول شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں نادانستہ طور پر ان دیکھی آفتوں کو دعوت دیتے ہیں جن کا وار بھی خالی نہیں جاتا۔

اٹلانٹا کی فتح کی مہم کے دوران جوڑ جیا میں الکا کے مقام پر یہ واقعہ پیش آیا۔ ہمارے بریگیڈ کے عین سامنے کھلے میدان میں دشمن کے دمدمے پھیلے ہوئے تھے اور اس میدان کے قریب ہی جنگل میں ہمارے مورچے تھے لیکن رات سے قبل ہمیں دشمن کی فوجوں اور اپنے مورچوں کے وسطی میدان پر قبضہ کرنے کی توقع نہیں تھی۔

ہمیں رات کا اس لیے انتظار تھا کہ اندھیرے میں آگے بڑھ کر خدقیں کھودنے اور مورچے بنانے کا موقع مل جاتا۔ ہماری صفیں دشمن کے مورچوں سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر

نکل میں نیم دائرے کی شکل میں قائم تھیں جبکہ دشمن کے دمدمے اسے نصف دائرے کے دہانے پر خط مستقیم کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے۔ اسی وقت جنرل نے براہیل سے کہا۔

”لیفٹیننٹ ذرا جا کے کرنل وارڈ سے کہو کہ وہ مناسب حفاظتی اقدامات کے ساتھ دشمن کے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرے اور غیر ضروری فائرنگ میں گولہ بارود ضائع کرنے سے گریز کرے اور ہاں دیکھو اپنا گھوڑا ہمیں چھوڑ جاؤ تو اچھا ہے۔“

اس وقت ہم جنگل کے آخر میں نیم دائرے کے داہنے سرے پر تھے جبکہ کرنل وارڈ کے دستے نیم دائرے کے بائیں جانب متعین تھے جنرل نے براہیل کو گھوڑے سے اتر جانے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ وہ لمبا راستہ اختیار کر کے جنگل کے اندر ہمارے نیم دائرے کو پار کرے کیونکہ کوئی چھوٹا راستہ اختیار کرنے کا مطلب دشمن کی نظر میں آنا تھا جو بلاشبہ خطرناک بات تھی اور اس طرح کرنل تک پیغام پہنچانا ناممکن ہوتا۔

لیکن براہیل کو نہ جانے کیا سوچی کہ اس نے اپنے گھوڑے کا رخ دشمن کے مورچوں اور ہماری فوج کے درمیان واقع میدانی علاقے کی طرف موڑ دیا۔ اسے دیکھتے ہی دشمن کے مورچوں سے آگ برسنے لگی۔

جنرل نے چیخ کر کہا۔

”ارے کوئی اس اتحق کو روکو۔“ ایک فرماں بردار قسم کا بے عقل فوجی آگے بڑھا اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا کر براہیل تک پہنچا یا لیکن ابھی وہ مشکل سے دس گز دور گیا ہوگا کہ دشمن کی گولیوں نے اسے گھوڑے سمیت بھونک کر رکھ دیا۔

ادھر براہیل تھا کہ وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا دشمن کی صفوں کے کنارے کنارے کئی سو گز دور جا چکا تھا۔ جہاں سے اسے آواز دے کر بلانا ممکن نہ رہا

تھا۔ اس وقت وہ بہت شاعرانہ لگ رہا تھا۔ اس کا ہیٹ ہوا سے اڑ گیا تھا یا شاید اسے دشمن کی گولی جاٹ گئی تھی اور اس کے لیے لیے سنہرے بال گھوڑے کے چلنے سے اٹھ اٹھ کے گر رہے تھے۔

وہ گھوڑے پر پوری شان کے ساتھ جما ہوا تھا اور اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں لگا میں تمام رکھی تھیں اور دایاں ہاتھ پہلو میں لٹکا ہوا تھا۔ جب کبھی وہ سر گھما کے ادھر ادھر دیکھتا تو اس کا چہرہ نظر آتا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس سارے معاملے سے اس کی دلچسپی نہایت قدرتی اور غیر مصنوعی تھی۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا گیا دشمن کے مورچوں سے گولیوں کی بوچھاڑ تیز ہوتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری جانب سے جوابی فائرنگ شروع ہوئی۔

چند لمحے بعد ہمارے بہت سے ساتھی اپنے تحفظات کو پیس پشت ڈال کے اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر کھلے میدان میں پہنچ گئے اور دشمن کے مورچوں پر اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔

جواب میں دشمن کی طرف سے گولہ باری شدید تر ہو گئی جس کا خوفناک نتیجہ نکلا۔ دونوں طرف کا توپ خانہ بھی لڑائی میں شریک ہو گیا اور بندوق کی گولیوں کی سنسنیٹ کے ساتھ ساتھ توپوں کے گولے بھی پھٹنے لگے۔ دشمن کی فائرنگ سے ہماری طرف درخت ٹوٹ ٹوٹ کر گرے اور ان کے تنے ہمارے ساتھیوں کے خون سے لال ہو گئے۔ جب کہ دشمن کے مورچوں میں ہمارے توپ خانے نے تباہی مچادی اور مٹی کے پشتوں کے ریزہ ریزہ ہونے سے گرد و غبار کے بادل چھا گئے۔

کچھ دیر کے لیے میری توجہ عام لڑائی کی طرف ہو گئی تھی لیکن پھر میں نے جب گولہ بارود کے کڑکتے بادل کے بیچ میں نظر دوڑائی تو براہیل دکھائی دیا جو اس وقت دوست دشمن دونوں کی نظر میں اس نکل عام کی وجہ سے مطمئن تھا۔ وہ ایسی جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں وہ دونوں طرف کی افواج



☆ محترم مالک مرحوم لکھتے ہیں کہ خولہ حسن نظامی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ بڑے بھگدار آدمی ہیں بھلا یہ تو بتائیے کہ انسان میں متانت کس عمر میں آتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ مجھ پر چوٹ ہے کہ 37 برس کے ہو گئے ابھی تک غیر سنجیدہ ہوں۔ میں نے نہایت سوکھامند بنا کر جواب دیا۔ ”حضرت! بات یہ ہے کہ متانت اور عمر کا تعلق کچھ اعتباری سا ہے۔ بعض لوگ پیدا ہی متین ہوتے ہیں لیکن بعض صوفیاء کرام کو دیکھا ہے کہ پچاس پچاس برس کے ہو گئے لیکن رہے وہی مخرے کے مخرے۔“

☆ ایک دفعہ رمضان کے مہینے میں مرزا غالب نے پان منگوا کر کھایا۔ مرزا صفدر علی بھی موجود تھے انہوں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ”قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے۔“ مرزا غالب مسکرا کر بولے۔ ”شیطان غالب ہے۔“

پھر اس نے پلٹ کے پوچھا۔ ”وہ کیسے مرا تھا۔“

میں نے کوشش کی کہ اس خط کو جو میرے لیے مقدس تھا جلنے سے بچا سکوں لیکن جیسے ہی وہ میری جانب مڑی مجھے اس کی آنکھوں میں جلتے ہوئے خط کا عکس نظر آیا اور خط پر بکھرے ہوئے خون کی لالی اس کے گالوں پر چھلک آئی۔ میں نے اس سے قبل اتنی خوب صورت لیکن قابل نفیرین مخلوق بھلا کہاں دیکھی تھی اور پھر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”اس بے چارے کو تو سانپ نے ڈس لیا تھا۔“



کہا جاسکتا ہے۔

پھر ایک شام میں مس میرین سے ملنے کے لیے گیا تاکہ اس خط کے نتیجے میں بہت سارے لوگوں پر کیا قیامت گزر گئی تھی جس کا شاید اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔ مجھے وہ اظہار مل پر ایک خوب صورت مکان میں ملی۔ وہ ایک مہذب اور خوب صورت لڑکی تھی جس کے سراپا کو ایک لفظ میں دلفریب کہا جاسکتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”اچھا تو آپ ہیں مس میرین۔“

اس نے مجھے تجسس نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”بی بی! آپ لیفٹیننٹ ہرمن برائیل سے واقف ہوں گی اور یقیناً آپ کو پتہ ہو گا کہ وہ ایک لڑائی میں ہلاک ہو گئے۔“ لڑکی اب بھی کچھ نہ بولی۔

میں نے کہا۔ ”دراصل لیفٹیننٹ کے ذاتی اثاثے میں آپ کا یہ خط بھی ملا تھا جسے میں آپ کو لوٹانے آیا ہوں۔“

اس نے سستی انداز میں میرے ہاتھ سے خط لے لیا اور اپنے رخساروں پر ابھرتے ہوئے رنگوں کا پو پو پا کے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی پھر ہنسنے لگی۔

”آپ کی زحمت کا شکریہ اگرچہ اس کے لیے آپ نے ناحق اتنی تکلیف کی۔“

پھر اچانک اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ اس نے خط پر نظر ڈالی اور کہا۔

”یہ دھبہ..... میرا خیال ہے..... شاید یہ دھبہ۔“

”خاتون!“ میں نے کہا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ ایک بہت بہادر اور عظیم آدمی کے خون کا دھبہ ہے۔“

اس نے فوراً وہ خط آتش دان میں دیکھتے دیکھتے انکاروں پر پھینک دیا۔ ”اوہ میں خون تو دیکھ ہی نہیں سکتی۔“

بعد میں جب برائیل کا اثاثہ تقسیم ہوا تو اس کی ایک گرد آلود چمبی ڈائری جنرل کی سخاوت کے طفیل میرے حصے میں آئی۔

جنگ کے خاتمے کے تقریباً ایک سال بعد جب میں کیلی فورنیا جا رہا تھا میں نے پہلی بار یوں ہی اس ڈائری کو کھولی کے دیکھا۔ ڈائری میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی البتہ اس کے ایک خانے سے ایک بے لفاظ خط گرا جس پر کوئی پتہ تحریر نہیں تھا۔ انداز تحریر نروانی تھا۔ اس کا آغاز بڑے محبت آمیز جملوں سے ہوا تھا لیکن کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔

یہ خط سان فرانسسکو سے بھیجا گیا تھا اور آخر میں دستخط کی جگہ صرف ”تمہاری بیوی“ کے الفاظ تحریر تھے۔ میں نے خط بغور پڑھا تو پڑھنے میں خط لکھنے والی کا پورا نام پتہ ملا جو میرین منڈ نہال تھا۔ خط سے لکھنے والی کی شناسائی اور اعلیٰ تربیت کا پتہ چلتا تھا لیکن جہاں تک خط کا تعلق تھا وہ ایک عام قسم کا محبت نامہ تھا اگرچہ کسی محبت نامے کو عام قسم کا کہنا بجائے خود ایک غلط بات ہے۔ خیر اس محبت نامے میں کوئی خاص بات تحریر نہیں تھی۔ سوائے ایک جملے کے جو مجھے ذرا کھٹکا اور وہ یہ تھا۔

”وٹرس صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ درجنہا میں کسی لڑائی کے موقع پر جہاں دوڑتی ہوئے تھے۔ تمہیں ایک درخت کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھا گیا تھا لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں آیا۔ یقین کرو اس جھوٹ سے مجھے اس شخص سے شدید نفرت ہو گئی۔ یقیناً وہ واقعہ اس نے میری نظر میں لیے کہ اسے معلوم تھا کہ میں اپنے محبوب کے بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے جان دینے کی خبر سن سکتی ہوں اس کی بزدلی کا غم نہیں سمجھ سکتی۔“

اچھا اب میری سمجھ میں آیا کہ یہ وہ شعلہ فشاں جملے تھے۔ جنہوں نے بہت دور ایک پہاڑ کے کٹھے سو آدمیوں کو موت کے کھٹ اتار دیا تھا۔ اف میں نے سوچا کیا عورت کو اب بھی کڑوا

کی نظر سے اوجھل تھا۔ وہ سنسناتی گولیوں کے بیچ میں بے حس و حرکت کھڑا تھا اور اس کا چہرہ دشمن کی سمت تھا۔ اس سے کچھ دور اس کا کھوڑا پڑا ہوا تھا جسے دیکھتے ہی مجھے برائیل کی بے عملی کا راز سمجھ میں آ گیا۔

مجھے یاد آیا کہ زمینی طبقات کے ماہر ہونے کی حیثیت سے جب بیچ میں نے اس مقام کا سرسری جائزہ لیا تھا تو اس جگہ مجھے ایک گہری کھائی نظر آئی تھی جس میں پانی کا نالہ دشمن کی صفوں کی جانب زاویہ قائمہ بناتے ہوئے بہہ رہا تھا۔ دراصل یہ کھائی ہمیں ایک مقام سے جہاں پر ہم موجود تھے دکھائی نہ دیتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ برائیل کو بھی پہلے یہ کھائی نظر نہ آئی تھی۔ اسے پار کرنا مشکل تھا لیکن اس کے اونچے اونچے کنارے برائیل کو دشمن کی گولیوں سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔

اگر وہ اس محجزے سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا۔ وہ اب آگے نہیں جاسکتا تھا مگر شاید وہ پیچھے لوٹنے پر بھی آمادہ نہیں تھا۔ وہ اسی جگہ کھڑا خاموشی سے موت کی راہ دیکھتا رہا لیکن اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ عجب اتفاق نزار کہ جیسے ہی برائیل گرافارنگ آگ سے آگے بڑھا اس کی دھمکی اور بعد میں جو اکا دکا دھماکے سنائی دیے ایسا لگتا تھا جیسے وہ سکوت کی سکرانی کا اعلان کر رہے ہوں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے دونوں فریق اس بے فائدہ جرم پر پشیمانی کا اظہار کر رہے ہوں۔

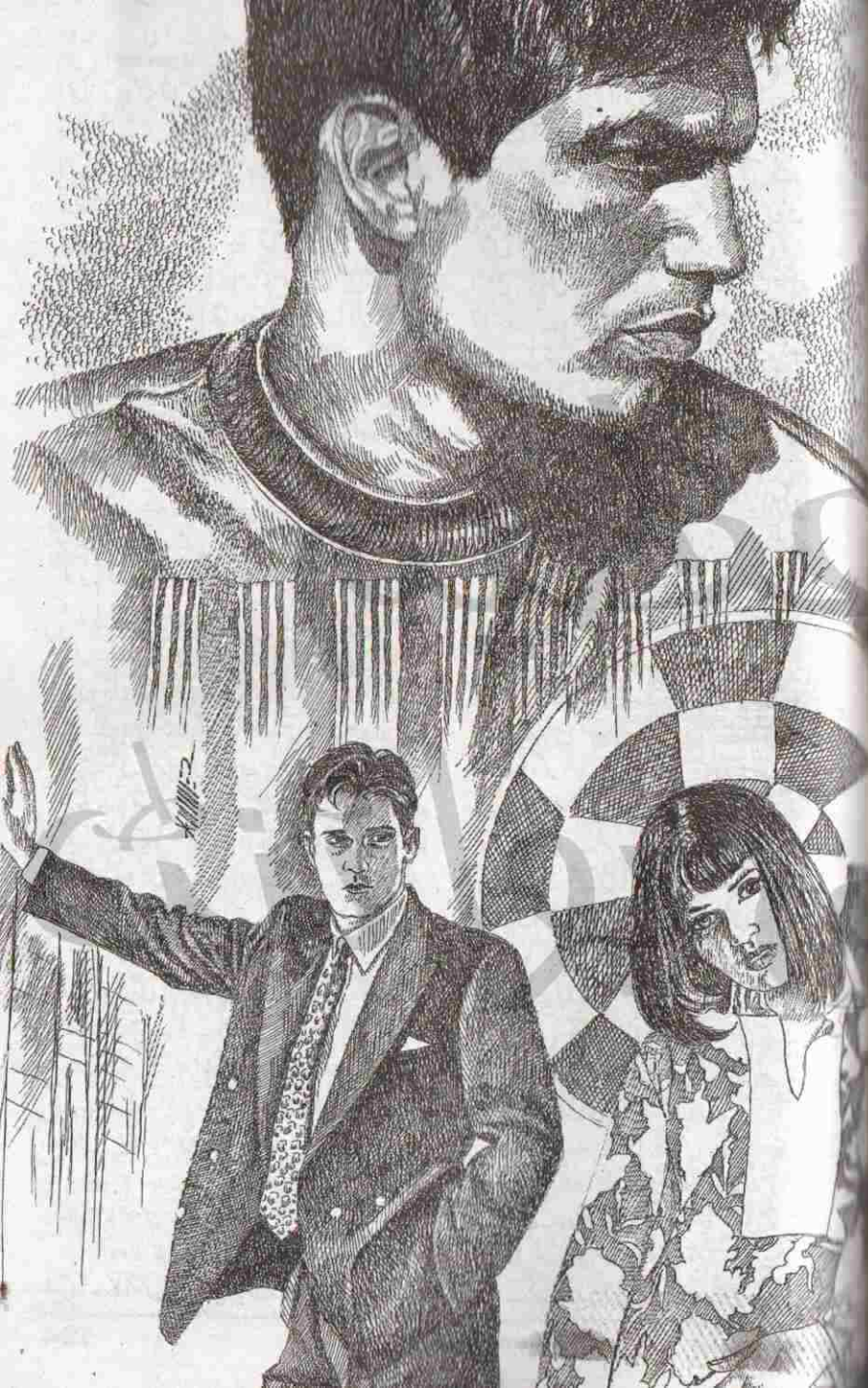
ذرا دیر میں چار آدمی اسٹریچر اٹھائے ہوئے نکلے ان کے پیچھے پیچھے ایک سارجنٹ سفید جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ برائیل کی نقش کے پاس پہنچے تو کچھ لوگ تنگ سر دشمن کی صفوں سے بھی نکلے اور انہوں نے اس کی نقش اٹھانے میں مدد کی۔ جب اسے ہماری طرف لایا جا رہا تھا تو دشمن کے مورچوں کے عقب سے فوجی باجوں کی آواز سنائی دی۔ کشادہ دل دشمن باہر کی موت پر خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔



دین دشمن قوتوں سے برسریکار ایک کچے فولاد کی ولولہ انگیز داستان جو را اور موساد کے گٹھ جوڑ اور ان کی ناپاک سازشوں کے خلاف دہشت کا نشان بن گیا۔ سرزمین پنجاب کی حسین وادی جہلم کا ایک سادہ لوح جوان جو دشمن کی ناپاک کارروائیوں سے برگشتہ ہوکر ناقابل تسخیر فولاد بن گیا۔

ایک ایسے نوجوان کی داستان جو دیار غیر میں تعلیم حاصل کرنے گیا تھا مگر اچانک اس کے سامنے اس کے پیارے وطن کے دشمنوں کی سازشیں آگئیں اور وہ ان سب کے خلاف برسریکار ہو گیا۔ اس کے پاس ہتھیار کے طور پر اس کے ملک کی محبت ہی کافی تھی۔

عمران ڈائجسٹ کا سنٹی خیز پرتیس اور نیا سلسلہ





**اپنی** زندگی کے بارے میں اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا رنگ بدل چکا ہے میرا وطن پاک میں اس پر لاکھوں بار شاز لیکن اب میں اس دشمن کی سرزمین پر موجود تھا۔ جس نے مجھے بے گناہ مشکل میں ڈال دیا تھا اور اب میں اس کے لیے مشکل بن چکا تھا، مکمل مصلحت اور ہوشیاری سے کام لیتا تھا۔ جیکسن نے کسی کام کے لیے میرا انتخاب کیا تھا اور ایک لاکھ ڈالر کی پیش کش بھی کی تھی۔ میں اپنی زندگی کو اسی رنگ میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ جس کی اس وقت ضرورت تھی۔

”میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا اور جیکسن آسودگی سے مسکرایا۔

اس کے بعد تقریباً ایک ماہ میں نے بڑی پرسکون حالت میں گزارا۔ جیکسن میری تربیت کر رہا تھا۔ مجھے ان کرداروں سے روشناس سا کر رہا تھا اور میرے ذہن کی گہری کل رہی تھیں۔ اب جیکسن نے مجھے ارجن کا نام دیا تھا اور میری پہلی ملاقات سروج سے کرائی گئی۔ اس کے لیے مجھے دہلی بھیجا گیا تھا اور اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھی اور میرا دل شاعری کرنے کو بل رہا تھا کہ اس کی آنکھیں غلامی، ب یا قوت رنگ ہال سیاہ، کھیرے اور سراپا سحر انگیز تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی خوب صورت خواب سے نکل کر میرے سامنے آئی ہو۔

کمرہ تقریباً تاریک تھا۔ کیونکہ میں نے روشنی گل کردی تھی اور دو بچوں کے پردے کھینچ دیے تھے۔ نیلے نائٹ بلب کی روشنی اتنی مدہم نہیں تھی کہ سروج کا سحر انگیز سراپا پورے حسن کے ساتھ دکھائی نہ دے سکے۔ اس نے اپنی گردن کو جھکا دے کر بال مرمریں شانوں پر لہراتے ہوئے کہا۔

”تم نے یہاں دہلی میں اپنی آمد کا مقصد نہیں بتایا ارجن۔“

”وہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ میں نے اپنی آمد کا اصل مقصد چھپاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن

شاید تم بھول گئی ہو۔ میں یہاں اپنی فرم کے لیے بناری ساڑھیاں اور ریڈی میڈ لمبوسات کا سودا کرنے آیا ہوں۔“

سروج میری طرف دیکھنے لگی جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ..... کسی کو میرے اصل مشن کی ہوا بھی لگے۔ میں آج شام کی ایک فلائٹ سے دہلی پہنچا اور مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ آتے ہی اس ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل میں میرا سابقہ سروج جیسی خوب صورت ہستی سے پڑے گا۔ جس میں وقت گزارنے کے لیے کتابوں کی دکان پر آیا تو وہ وہاں کھڑی کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ وہ براؤن رنگ کی بڑے اور سنبھے بارڈر والی ساڑھی میں اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ میں اس سے بات کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”ارے.....!“ وہ چونکتے ہوئے بولی۔

”آپ ہندی جانتے ہیں۔“

”اردو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر ان تمہیدی مکالموں نے اتنی طوالت اختیار کی کہ ہم نے ایک فرانسیسی ریسٹوران میں رات کا کھانا کھایا اور اس کے بعد وہ میرے ساتھ میرے ہوٹل کے کمرے میں آگئی لیکن اس کی اس مہربانی نے مجھے محتاط اور چونکنا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ ویسے مجھے جس مشن پر بھیجا تھا ہر اس کی تکمیل کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے جیکسن سے کہا۔

”یہ ٹانگ ٹوئیاں مارنے والی بات ہوگی جناب! آپ کو یقین سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس آدمی کا کوئی وجود بھی یہ یا نہیں۔“

”بلوے اور فسادات اس کے وجود کا چہوت ہیں ارجن۔ وہ اسلحہ جوان فسادات میں استعمال ہو رہا ہے۔ درختوں پر نہیں اگتا، کوئی تو ہے جو فساد یوں کو اسمگل شدہ اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔“

”مگر یہ ہندوستانی حکومت کا داخلی معاملہ ہے۔“

”بالکل ٹھیک، اگر بات بھارت کے مختلف شہروں میں فسادات تک محدود رہتی تو ہمیں اس معاملے سے کوئی غرض نہ ہوتی، لیکن ذرا یہ کاغذات دیکھو۔“ یہ کہتے ہوئے جیکسن نے مجھے ایک فائل تھمادی۔

میں نے فائل کھولی۔ پہلے صفحے پر تحریر تھا۔

”اگر پراسرار دلیر سنگھا کا کوئی وجود ہے تو بے حد خطرناک ہے۔ وہ ایک کروڑ ڈالر کی ہیروئن امریکہ اسمگل کرنا چاہتا ہے۔ وہ صرف اسلحے اور منشیات کا اسمگلر ہی نہیں بلکہ عالمی امن کو تباہ کرنے کا خواہاں بھی ہے۔“

”وہ عالمی امن کو کیسے تباہ کر سکتا ہے۔“ میں نے فائل واپس کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے واشنگٹن میں روس کے سفیر کو صدر امریکہ بن کر فون پر دھمکیاں آواز صدر امریکہ سے اس قدر مشابہت رکھتی تھی کہ سفیر کو فوراً اپنے ملک جانا پڑا۔ اسی طرح اس نے پاک و ہند اور مصر و اسرائیل کے درمیان بھی غلط فہمیاں پھیلائیں، میں نے تمہیں وہاں بھیجے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”ایک آدمی کا کام تو نہیں ہو سکتا، اس کے پیچھے یقیناً کوئی تنظیم ہوگی۔“

”ہاں..... اس تنظیم کا نام بلیک ہول ہے اور دلیر سنگھا ہی اس تنظیم کا سربراہ ہے۔“ جیکسن نے اپنا بدبودار سکار بجاتے ہوئے بات جاری رکھی۔

دلیر سنگھا کا کوئی وجود ہو یا نہیں، مگر بلیک ہول تنظیم ضرور موجود ہے جو فسادات کی ذمہ دار اور اسلحے اور منشیات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے، لیکن یہ کام دو بڑی طاقتوں یا دو ہمسایہ ملکوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مجھے ایک ایسے آدمی کی تلاش کرنا ہے جسے نہ تو کوئی جانتا ہے اور نہ ہی کسی نے اسے دیکھا ہے اور جس کے بارے میں یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا کوئی وجود ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو اب تک اس کی

صرف یہ ایک خصوصیت سامنے آئی ہے کہ وہ لوگوں کی آواز اور لب و لہجے کی خوب نقل کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں اسے کیسے اور کہاں تلاش کروں۔“

”اس سوال کا جواب تمہیں خود ہی تلاش کرنا ہوگا ارجن۔“ جیکسن نے کہا۔

میں اسی سوال کا جواب یاد دلیر سنگھا کو تلاش کرنے دہلی آیا ہوں، مگر ہوٹل پہنچتے ہی میری ملاقات سروج سے ہو گئی جواب میرے سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اس نے وہ کتاب اٹھالی جو میں نے اس کی موجودگی میں خریدی تھی۔

”یہ کتاب تم نے کیوں خریدی۔“ سروج نے مجھ سے سوال کیا۔

”بس پون ہی وقت گزارنے کے لیے، لیکن اب بس میں تمہیں پڑھنا چاہتا ہوں، ورق ورق بلکہ لفظ لفظ، حرف حرف۔“

سروج نے ایک مترنم قہقہہ لگایا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں جلتے رنگ سے بج اٹھے ہوں۔ وہ خوشی سے بولی۔ ”مجھے بھی پڑھ لینا، اگر تم کہو تو میں تمہیں اس کتاب کا خلاصہ سنا دوں۔“

”ضرور، لیکن میں تمہیں خود پڑھوں گا اور تفصیل سے پڑھوں گا۔“

”یہ کتاب بھگوان شیو سے متعلق ہے، جو موت اور تباہ کاری کا دیوتا ہے۔ اس کے گلے میں شیش ناگ یوں لٹکے ہوئے ہیں جیسے موتیوں کی مالا ہیں۔“

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ مجھے دروازے پر ہلکا سا کلک محسوس ہوا۔ سروج اٹھ کر تھوڑے دور میں چلی گئی، چند لمحوں بعد کلک کی مدہم آواز نے بتا دیا کہ میرے مقفل کمرے کا دروازہ کھولا جا رہا ہے۔ میرا ریوا لوز بیڈ سائیڈ ٹیبل کی اوپر دراز میں رکھا ہوا تھا۔ میں اسے نکالنے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ دروازہ ہائوں پاٹ کھلا اور دو آدمی ہاتھوں میں سائلنسر لگے ریوا لوز لیے در آئے۔



ایک نے مجھے زد میں لے لیا اور دوسرے نے دروازے بند کر دیا۔ پھر اس نے کمرے کی ہتی بھی جلادی۔ اب میں انہیں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ دونوں گھٹے ہوئے جسم کے مالک اور نوجوان تھے۔ ان کی سانولی رنگت اور یان سے سرخ ہونٹ غمازی کر رہے تھے کہ ان کا تعلق نچلے درجے کے غنڈوں سے ہے۔ اپنے چہرے کے خدو خال سے وہ مرہٹے دکھا دیتے تھے۔

”تم کون ہو اور یہاں کمرے میں کیوں آئے ہو۔“ میں نے غصے سے پوچھا اور آہستہ آہستہ بستر کی طرف بڑھنے لگا۔

”کیسا احمقانہ سوال ہے۔“ آگے والا بولا۔

”اور آپ کو آگے بڑھنے کی اجازت کس نے دی ہے۔“ اور پھر وہ اپنے سامنے سے مخاطب ہوا۔

”دراز کی تلاشی لو سہنا۔“

”اگر تم چوری کی نیت سے آئے ہو تو تمہیں کوئی قیمتی چیز یہاں سے نہیں ملے گی۔ میرے پاس روپے یا امریکی ڈالر نہیں، سفری چیک ہیں۔“ میں نے انہیں بتایا مگر انہوں نے میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس دوران میں بھی ذہنی اور جسمانی طور پر ان سے مقابلے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

پانچ جب سہنا سائیڈ ٹیبل کی تلاشی لے رہا تھا۔ میں خود کو پہلے اقدام کے لیے تیار کر رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس اسپرنگ کی طرح محسوس کیا جو کھلنے کے ساتھ اٹتا ہے۔ شاید اس آدی نے میرے تیور بھانپ لیے اور بولا۔

”ہمارے متعلق غلط اندازہ مت لگاتا صاحب ہم نے تو ایسے بہت دیکھے ہیں۔ ہم اس لڑکی سے بعد میں نمٹیں گے جو ہاتھ روم میں چھپ گئی ہے اور یہ ہی اچھا ہے ورنہ تمہارا شتر دیکھ کر چیختی گئی۔“

وہ میرا جو حشر کرنے والے تھے۔ میں نے انہیں اس کا موقع ہی نہ دیا۔ دائیں پاؤں پر گھومتے ہوئے جسم کی تمام تر توانائی کے ساتھ میں

نے سہنا کے پیٹ میں اتنی زور کی ضرب لگائی کہ ایک کراہ کے ساتھ منہ کے بل گرا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر فائر کرتا۔ میں اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اور اسے اپنی گرفت میں لے کر لوٹ لگائی تاکہ اس کا سامنے مجھے گولی کا نشانہ نہ بن سکے۔ پھر میں نے ہتھیلی کے کنارے سے اس کی گردن پر ہڈی توڑنے والی ضرب لگائی۔ اس ضرب نے اس کا منکا توڑ دیا۔

اب سہنا قاتل سے لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے سہنا کی لاش اس کے سامنے پر اچھال دی۔ وہ پیٹھ کے بل فرش پر گر پڑا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور اچھل کر مہنی سے اس کے منہ پر ضرب لگائی جس کے نتیجے میں اس کے سامنے والے مقصد دانت ٹوٹ گئے اور وہ خون اگلنے لگا لیکن اس نے مجھ پر گولی چلا دی اگر میں پیچھے ہٹنے میں ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کرتا تو میری کھوپڑی کے پرچے اڑ گئے ہوتے۔

پھر وہ مجھ پر گولی چلانے کی بجائے دروازے کی طرف لگا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے گیند کے طرح لڑھکتا بند کیا اور اس کے پیچھے بھاگا مگر دروازے تک پہنچنے سے پہلے وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں نے دروازے سے جھانکا۔ راہداری خالی تھی لیکن فرش پر خون کے قطرے نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ آگ سے بچاؤ والے گول عقبی زبے کی طرف کیا ہے۔ میں باہر جانے کے بجائے بیڈ کی طرف آیا اور سائیڈ ٹیبل سے اپنا ریوالور نکالنے لگا۔ اتنے میں سروج ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

”یہ... یہ سب کیا ہے۔“ وہ لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں بولی۔

”ملبوسات کا بزنس ہو یا کوئی اور اس قسم کے واقعات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ اور دروازے کی طرف لپکا۔ سروج اس وقت بڑی حیرت اور خوف سے سہنا کی لاش پر وہ

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تیزی سے آگے بڑھا

للہیں گاڑے ہوئے تھی۔

میں بہر صورت فرار ہونے والے دشمن تک پہنچنا چاہتا تھا۔ تاکہ ان کی حقیقت اور مقصد معلوم ہو سکے۔ میں انہیں کوئی اٹھائی گیرے یا عام چور نہیں سمجھتا تھا۔ کیونکہ ان کا رویہ اور بل و لہجہ عام سے چوروں جیسا نہیں تھا۔ میرے ذہن میں بار بار ایک ہتھی سی بج اٹتی تھی اور یہ احساس دلاتی تھی کہ ان کی آمد کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ دلیر گنگا کی بلیک ہول تنظیم کے آدی تھے۔ اگر ایسا تھا تو انہیں میری اصلیت کا علم کیسے ہو گیا تھا۔ میں تو ایک عام سیاح کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ اب اگر سہنا کے سامنے کو تلاش نہ کر سکا تو بہت سے سوال و جواب کو ترستے رہیں گے اسی لیے میں مفروضہ حملہ آور کی تلاش میں نکلا تھا۔

ہول کی لابی خالی تھی۔ حینہ کلرک کاؤنٹر پر سر لیکے ادھر رہا تھا۔ میں گریہ قدم چلتا ہوا اس دروازے کی طرف گیا جو باہر کھلتا تھا اس کا پردہ سرکا کر میں اندر سے میں ڈوبے بائیسے میں آگیا۔ اور ہمد تن گوش ہو کر کوئی آواز کوئی آہٹ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ چاند بالوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ جب بادل رکتے تو چاند کا عکس پول میں نظر آتا۔ اچانک میرے بازو میں انگارے کی جلن محسوس ہونے لگی۔ سہنا کے سامنے نے نہ جانے کس گوشے سے بے آواز فائر کیا تھا۔ میں دبک کر دوسرے فائر یا آہٹ کا انتظار کرنے لگا لیکن دوسری آہٹ نے مجھے بتایا کہ وہ بائیسے کے اختتام پر بنی دیوار پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں درختوں کی اوٹ لیتا ہوا ادھر بھاگا مگر میرے دہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود چکا تھا۔

جب میں دیوار چڑھنے لگا تو سنا دھماکوں سے گونج اٹھا۔ مگر یہ دھماکہ ریوالور کی گولیوں کے نہیں بلکہ اسکوٹر اشارت ہونے سے پیدا ہو رہے تھے۔ میں دیوار پر چڑھا تو وہ اسکوٹر پر سوار ہو چکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تیزی سے آگے بڑھا

گیا۔ اب اس کا تعاقب فضول تھا۔ میں کسی ٹیکسی یا رکشہ میں اس کے پیچھے جاتا تو وہ دلی کی پر پیچ گلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں واپس آیا۔ سوئنگ پول پر بازو کا زخم دھویا جو زیادہ گہرا نہیں تھا، بلکہ گولی بازو کو چھوتے ہوئے گزر گئی۔ جب میں اپنے کمرے میں آیا تو سروج شاستری کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اپنی زبان بند رکھتی تھیں بھی نہیں چاہتا تھا۔ کہ سہنا کی لاش میرے کمرے سے برآمد ہو۔ اس لیے سب سے پہلے سہنا کی لاش ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ میں نے سہنا کی لاش کا ندھے پر ڈالی اور لفٹ تک لے آیا۔ غنیمت تھا کہ اس وقت بھی راہداری بالکل خالی تھی اور سب ہی کمروں کے دروازے بند تھے۔ میں نے لفٹ کے لیے سب سے اوپری منزل کا بٹن دیا اور جب لفٹ اوپر چلی گئی تو سہنا کی لاش فرش پر رکھ کر جیب سے چاقو نکالا اور لفٹ نیچے بیچ کر کمرے میں آنے کے بعد اپنا سامان سینٹے لگا تاکہ آج کسی دوسرے ہول پر چلا جاؤں۔

سامان سینٹے ہوئے مجھے اچانک ایک بات یاد آگئی تو میرے ہاتھ رک گئے۔ جب میں سہنا کی لاش گرانے والا تھا تو مجھے اس کے بازو پر سانپ کی تصویر گدی ہوئی نظر آئی تھی۔ میں نے اس خدشے کے تحت کہ کوئی آنے جانے اس تصویر کو غور سے نہیں دیکھا تھا اور لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد فوراً ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ سہنا اور اس کے ساتھ کے متعلق میرا خیال درست تھا کہ وہ چور نہیں بلکہ بلیک ہول تنظیم کے ارکان ہیں۔ اس کے بازو پر کنڈلی مارے اور پھن اٹھے سانپ کی تصویر غالباً اس تنظیم کا نشان تھا۔ سہنا اور اس کا سامنے شاید یہ معلوم کرنے آئے تھے کہ آیا میں واقعی ایک سیاح ہوں یا ان کی تنظیم اور دلیر گنگا کے بارے میں سراغ لگانے آیا ہوں۔ اگر میرا یہ مفروضہ درست تھا تو سانپ کی دم پر میرا ہجر پڑ چکا تھا۔



سرکس کے سفید ستون پارک کے گردکاروں رکشاؤں، سائیکلوں اور پیدل راگیروں کے بے جمل کو خاموش سنڑیوں کی طرح تک رہے تھے۔ ساریوں اور شلوار سوٹ میں ملبوس خوب صورت خواتین بھی دعوت نگارہ دیتی ادھر ادھر جا رہی تھیں لیکن میرے لیے ان میں کوئی کشش نہ تھی۔ میرے ذہن پر تو صرف دلیر سنگھا کا بھوت سوار تھا۔ اس وقت میں اس خوب صورت پارک کے ایک آؤٹ ڈور کینے میں بھارتی محکمہ داخلہ کے ایک افسر کے ساتھ بیٹھا اسی سلسلے میں بات چیت کر رہا تھا اور یہ ایک دلچسپ پمپیشن تھی۔ ایک طرف میں حکومت ہندوستان کو مطلوب ایک پاکستانی جاسوس تھا لیکن جیکسن نے میرا حلیہ ہی بدل دیا تھا اور اب میں ان کے لیے ایک اہم کردار بن گیا تھا اور اس نے بھارتی حکومت سے درخواست کی تھی کہ بوقت ضرورت مجھے مطلوبہ مدد دی جائے۔

چنانچہ آج صبح ہی میں نے محکمہ داخلہ کو فون کیا تھا جس نے شن سنگھا نامی کسی افسر کو میرے پاس بھیج دیا تھا۔

”ہم بھی بلیک ہول تنظیم کے متعلق جانتے ہیں ارجن۔“ شن سنگھا نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ”شعبہ سے کلکتہ اور مدراس سے ممبئی تک جہاں بھی ہنگامے ہوتے ہیں۔ ان کے پس پشت اسی تنظیم کا ہاتھ ہوتا ہے۔“

”اور دلیر سنگھا کے بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

وہ مکرایا اور اس نے میز کی صاف سطح پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ”جس طرح اس میز کی سطح بالکل صاف ہے۔ اس کے کوئی خدو خال نہیں بالکل اسی طرح دلیر سنگھا بھی بے چہرہ آدمی ہے۔ کسی شناخت اور خدو خال کے بغیر صرف ایک نام ہے جو ہمارے ایک دیوتا کے نام پر رکھا گیا ہے۔“ شن سنگھا سے ملنے کے بعد بھی میری

معلومات وہیں تک محدود رہی تھیں جہاں کل تھیں۔ فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ میں پہلا ہوٹل چھوڑ کر دوسرے ہوٹل میں آ گیا تھا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی حکومت ہمارے دلیر سنگھا سے ملنے کی اتنی خوش مندیوں ہے۔“ شن سنگھا نے سوال کیا۔

”ہیروئن کی وجہ سے ایک کروڑ ڈالر کی ہیروئن امریکہ بھیجی گئی ہے اور اس میں بھی غالباً دلیر سنگھا کا ہاتھ ہے۔“

”اوہ.....“ شن سنگھا اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے انچارج سے فون پر بات کرتا ہوں۔ شاید اس سلسلے میں مزید کچھ معلومات حاصل ہو سکیں۔“ یہ کہہ کر وہ ریسٹوران کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

میں ایک بار پھر سرکس میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ سب ہی چہرے سب ہی راستے میرے لیے نا آشنا تھے۔ اتنے میں ایک ہیرا

میرے پاس آیا اور بولا۔ ”چائے چاہیے

جناب۔“

”ہاں..... دو چائے لے آؤ۔“

میرے نے دونوں کپ اٹھائے اور جانے لگا۔ تو میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس کی کلائی پر بھی سانپ کی تصویر گدی ہوئی تھی۔ میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا میں نے سوچا کہ شن سنگھا کو اس کے بارے میں بتا دوں جواب تک واپس نہیں آیا تھا چنانچہ میں میزوں کرسیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ریسٹوران کے اندرونی حصے میں جانے لگا۔

”کیا چاہیے آپ کو۔“ اچانک سفید جیکٹ والے ایک ہیرے نے میرا راستہ روکتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے فون کرنا ہے۔“

”وہ ادھر کارڈیور میں چلے جائیے۔“ اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

کارڈیور میں پرانے قسم کے بلیک ٹیلی فون

اور دھتے۔ مگر کشن سنگھا وہاں نہیں تھا میں نے ادھر ادھر دیکھا تو کارڈیور ایک سرے پر مجھے اندازہ نظر آیا میں اس طرف بڑھ گیا یہ ایک بڑا الٹ تھا۔ جس میں ایک دیوار کے ساتھ بین لگا ہوا تھا اور دوسری کے ساتھ چھوٹے چھوٹے تین پارکینگ بنے ہوئے تھے۔

”کشن!“ میں نے آہستہ سے پکارا۔ مگر کوئی جواب نہیں مل سکا۔ میں نے دوسری بار سے صدا دی۔ مگر جواب میں خاموشی رہی اچانک ہی خیال آیا کہ میں خود کسی جال میں تو پھنس چکا تھا اس خیال کے آتے ہی میرا ہاتھ کندھے سے ٹٹکتے ہوئے ٹیسٹر میں رکھے ریو اور پینچ لگا گیا پھر میں کینوں میں جھانکنے لگا پہلے دو بین بنی تھیں۔ تیسرے کین میں جھانکتے ہی مجھے ہمت کا شدید جھٹکا لگا سامنے ہی کشن سنگھا کا بے حس و حرکت جسم بڑا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کشن سنگھا کی فور آکھیں اپنا احساس طلب کر رہی ہیں۔ اس کی گردن پر ایک لمبی سی لکیر دکھائی دی تو میں نے اس کی ٹھیس کا کارڈیور دیا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ زرخرے پردہ سوراخ بنے ہوئے ہیں جیسے سانپ نے اسے ڈس لیا ہو۔ نظارہ تو اسے گلا کھونٹ کر مارا گیا تھا۔ پھر یہ نشانات کیسے تھے۔

میں جانتا تھا کہ سانپ کے ڈسنے کا عمل پندرہ سے تیس منٹوں تک ہوتا ہے اگر کشن کو سانپ نے مارا تھا تو اسے ابھی زندہ ہونا چاہیے تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو اسے مرنے کے بعد سانپ نے ڈسا تھا یا اس کی گردن پر بعد میں نشانات مائے گئے تھے۔

مگر کیوں۔ یہ کس قسم کی تنبیہ تھی یا مارنے والوں کی نشانی۔ یہ جاننے کے لیے میرے پاس وقت نہ تھا تاہم مجھے اتنا یقین ہو گیا تھا کہ کشن سنگھا کو قتل کر سکتے ہیں تو ان کی طرف سے مجھ پر بھی بے

خبری میں حملہ کیا جاسکتا اس لیے مجھے کسی دوسرے

راستے سے باہر نکل جانا چاہیے۔

یہ سوچ کر میں ٹائلٹ کا جائزہ لیا۔ واش بین کے اوپر ایک جالی دار کھڑکی تھی۔ میں نے بین پر چڑھ کر باہر دیکھا۔ یہ پچھوڑے کی گلی تھی۔ جس میں کوئی آمد و رفت نہیں تھی۔ میں جالی والا فریم اکھاڑنے لگا۔

”باہر جانے کے لیے سیدھے راستے میں موجود ہیں جناب۔“ اچانک عقب سے کسی کی آواز ابھری میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے پر وہی ہیرا کھڑا تھا۔ جس کی کلائی پر سانپ کی تصویر گدی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریو اور تھا جس کا رخ میری جانب تھا۔

”میں تو ہوا کی آمد و رفت کے لیے جالی ہٹا رہا تھا یہ مٹی سے اٹ گئی ہے۔“ میں نے منکراتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ مجھے بھی معلوم ہے کہ یہاں سے باہر نہیں جاسکتا۔“

میرے نے کوئی جواب دینے کی بجائے اشارے سے مجھے نیچے اترنے کو کہا۔ اس کے برٹا اعاشرے دو دو کارڈ اب بھی میری جانب تھا اور چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اسے استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرے گا۔ مجھے یہ بھی بخوبی اندازہ تھا کہ یہ پستول اتنے قریب سے میرا کیا حشر کر سکتا ہے۔ سو میں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیے اور کوڈر فرم پر آ گیا۔

”میں نے تو سنا کہ ہندوستانی بڑے مہمان نواز اور مہربان ہوتے ہیں۔“ میں نے اسے کہا۔

”لیکن میرے دوست کے ساتھ یہاں جو سلوک کیا گیا ہے وہ بڑا وحشیانہ ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کین کی طرف اشارہ کیا جہاں کشن سنگھا کی لاش پڑی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ لاش کی طرف متوجہ ہو تو مجھے اس پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے۔ مگر اس نے میری بات سنی ان کی کردی۔

”تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا



جائے گا۔ جیسا تمہارے ساتھی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ”وہ مجھے زد میں لیے ہوئے بولا۔ ”ابھی چند لمحے بعد تم باہر سے شور سانسو گے اور یہ شور اٹتا ہوگا کہ اس دھماکے کو اپنے اندر جذب کر لے۔“

میرا دماغ چکرا گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے قدم قدم بلیک ہول کی تنظیم کے ارکان سے واسطہ پڑے گا۔ پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ انہیں میری آمد کا پتا کیسے چلا اور یہ کہ میں اس کینے میں کتنی سگھ سے ملنے والا ہوں۔ میں خاموشی سے کھڑا یہ سوچے اور اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”بس اب فرگ آنے ہی والا ہوگا“ مرنے کے لیے تیار ہو۔“ مجھے کھوتا پا کر وہ سرد لہجے میں بولا۔

”جھاڑا ابھی بات دروازے میں کھڑے کاٹھیل کو چھی بتا دو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”جواب اس نے جو حرکت کی وہ اس کی نا تجربہ کاری کا ہی ثبوت تھی۔ مجھے بس اتنی مہلت درکار تھی۔ جو نبی وہ پلٹا میں نے ایک پیر پر کھومتے ہوئے ضرب لگائی۔ وہ منہ کے بل گر پڑا۔

پھر میں اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اچھل کر اس پر اس طرح جا پڑا کہ میرے گھٹنے کی ٹکر سے اس کے دانت بھی ٹوٹ گئے اور ناک کا بانہ بھی پک کر رہ گیا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے ریوالور والی کلائی پر بھی چاب رسید کی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا کر ا۔ میں نے ریوالور اٹھالیا۔ پیر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اس کی پشت پر گھنی مار کر اسے دوبارہ فرش پر لٹا دیا۔ عین اسی وقت گلی میں ٹرک کی آواز سنائی دی اور پھر بہت سے برتن ٹوٹنے کی آواز آئی تو میں سمجھ گیا کہ میرا مجھے شوٹ کرنے کے لیے اسی وقت کا منتظر تھا۔

میں نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اونچا کیا اس کے منہ اور ناک سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ ”دلیر سگھا کہاں ہے۔“ میں نے اپنے لہجے میں سفاکی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”دلیر سگھا۔“ میرے نے خون تھوکے ہوئے کہا۔ ”میں کسی دلیر سگھا کو نہیں جانتا۔“

”اگر تم سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے تو میں تمہاری آنکھوں کی پتلیاں نوچ لوں گا۔“ میں نے اپنی انگلیاں اس کی آنکھوں میں گاڑتے ہوئے کہا۔ اگرچہ اس وقت میری انگلیاں اس کے پپوٹوں پر تھیں۔ مگر ان کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے میرا ہری طرح بلبلاتا تھا۔

”جلدی بتاؤ ورنہ یہ انگلیاں پپوٹوں کو چیر کر پتلیوں تک جا پہنچیں گی۔“

”وہ..... وہ.....“ مگر اتنا کہہ کر وہ وردے مارے بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس کا سر دہانہ جسم گھسیٹ کر ایک کینن میں ڈالا اور اپنے خون آلود ہاتھ دھونے لگا۔ اتنے میں راہ داری سے کسی کی چاب سنائی دی۔ میں جلدی سے داش بین پر چڑھا گیا۔ باہر سے کسی نے پکارا۔

”دیوندر اتنی دیر کیوں لگاؤی تم نے۔“

مگر دیوندر اس حالت میں نہیں تھا کہ اسے کوئی جواب دیتا۔ میں جالی کا فریم تو ڈھیلا کر ہی چکا تھا۔ اب اس دھکا دے کر ہٹا ہی دیا تھا کہ وہ آواز پھر سنائی دی۔ ”کیا بات ہے دیوندر تم نے جواب نہیں دیا۔“

اس سے پہلے کہ وہ خاموشی کی وجہ دریافت کرنے اندر آتا میں فریم ہٹا کر باہر کود چکا تھا لیکن کودتے وقت میں نے داخل ہونے والے کی ایک جھلک دیکھ ہی لی تھی۔ یہ نیا آدمی تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ جلد ہی اس نو جوان سے بھی میری ملاقات ہوگی۔

میں کتابوں کی ایک دکان پر کھڑا بظاہر کتابیں دیکھ رہا تھا، مگر میری نگاہیں اس کینے کی سبز سیوں پر مرکوز تھیں۔ کھڑکی سے کودتے وقت مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ دیوندر کا سامنی بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ کیونکہ ٹائلٹ میں داخل ہوتے وقت اس کی توجہ اس کینن کی طرف تھی

اس پر دیوندر کی انگلیں جھانک رہی تھیں۔ میرا یہ خیال بھی درست ثابت ہوا تھا کہ دیوندر کا سامنی نہ شور مچائے گا اور نہ پولیس کو اطلاع دیے گا۔ چنانچہ پولیس یا ایسویس دہاں نہیں آئی تھی میں وہیں سیاحوں اور مقامی آدمیوں کے درمیان گھومتا رہا اور اب سولن ٹاور میں کتابوں کی ایک دکان میں کھڑا کینے کی نگرانی کر رہا تھا۔

کینے کا مالک یا تو خود مجی بلیک ہول تنظیم کا رکن تھا یا ہانا تھا کہ اس کے ملازم اس خطی ناک تنظیم سے وابستہ ہیں اس لیے کتنی سگھ سے قتل اور بیرے کی اس درگت کا گاہکوں کو کوئی علم نہیں ہو پایا تھا اور وہ حسب معمول کینے میں آ جا رہے تھے۔ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں دیوندر یا اس کے ساتھ کی راہ دیکھتا ہوں جو دلیر سگھ تک پہنچنے کی کڑی یا ذریعہ ثابت ہو سکتے تھے۔

مجھے یہ خوش فہمی ہرگز نہیں تھی کہ یہ لوگ مجھے راہ راست پر اسرار دلیر سگھا تک لے جائیں گی لیکن اتنا مجھے یقین تھا کہ اگر دلیر سگھا کا کوئی وجود ہے تو وہ میرے بارے میں سن کر مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے خود ہی سامنے آ جائے گا۔

تین کتابیں خریدنے کے بعد میں دکان سے باہر آ گیا کہ بہت دیر تک وہاں نہیں رہ سکتا تھا دکان سے باہر آ کر میں سیاحوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا اور کینے کے ارد گرد منڈلاتا رہا۔ جو نبی شام ہوئی مجھے میرے انتظار کا ٹرل گیا۔ دیوندر اور اس کا سامنی کینے کی بیڑھیاں اتر رہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ اور آنکھیں پیپوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اس کا ساتھ اسے یوں ساتھ لیے جا رہا تھا جیسے کسی نابینا کا ہاتھ تھام کر اس کی رہبری کر رہا ہو۔ میں کچھ فاصلہ دے کر ان کا تعاقب کرنے لگا۔

سولن ٹاور میں کام کاج سے فارغ ہو کر گھروں کو جانے والے لوگوں کا ہجوم تھا مگر میں نے اپنی نگاہیں دیوندر اور اس کے ساتھ پر مرکوز رکھیں۔ ایک مقام پر اس نے رکشہ روکی۔ دیوندر کو

سوار کیا اور رکشہ والے سے کچھ کہا۔ رکشہ آگے بڑھ گیا مگر وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا، رکشہ آگے بڑھ گیا۔ میں نے ایک ستون کی آڑ لے لی اس نے سٹی بجاکر ایک ٹیکسی روکی اور اس میں سوار ہو گیا۔ ٹیکسی غریب کے ہجوم میں رینگنے لگی۔ میں نے بھی دوسری ٹیکسی روکنے میں تاخیر سے کام نہ لیا۔

”اس ٹیکسی میں میرا دوست جا رہا ہے۔ بس اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔“ میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا اور ساتھ ہی اسے سو سو کے چند نوٹ تھما دیے۔

دیوندر کا یہ سامنی سفید وردی پہنے ہوئے تھا۔ مگر اب اس نے وردی کی سفید پتلون پر رنگین ٹی شٹ پہن رکھی تھی۔ جس کے بن کھلے ہوئے تھے جب اس نے دیوندر کے لیے رکشہ روکا تو مجھے اس کے گلے میں کوئی چمک دار چیز دکھائی تھی۔ شاید وہ زنجیر تھی جو اکثر نو جوان گلے میں ڈالے پھرتے ہیں۔

”میرا دوست کس علاقے کی طرف جا رہا ہے۔“ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

”پرانی دلی کی طرف۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔ ”آپ نے اردو میں بات نہ کی ہوئی تو میں آپ کو انگریز سمجھتا جنتا۔“

”میری رنگت کی وجہ سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے۔“ اس وقت ہر طرف اندھیرا چھیل چکا تھا اور ہم جس سڑک سے گزر رہے تھے۔ وہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ ہم جامع مسجد کے پاس سے گزر کر عہد مظلیہ کی ایک اور یادگار عمارت کے سامنے آ گئے۔ جہاں دیوندر کے سامنی کی گاڑی رک گئی تھی۔ میں نے اپنی ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکوالی اور کتابیں لیے بغیر اتر گیا۔

دیوندر کا سامنی قلعے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا میں بھی اس کے تعاقب میں چل دیا وہ جس راستے سے گزر رہا تھا اس کے دونوں جانب دور مظلیہ کے کھانے پینے کی اشیاء کی دکانیں تھیں۔



مگر وہ کہیں نہ رکا۔ اگر اس نے سفید پتلون نہ پہن رکھی ہوتی تو شاید میں اس پر نظر نہ کر سکتا اور وہ لوگوں کی بھیڑ میں غائب ہو جاتا۔

اس تنگ بازار یا گلی کے اختتام پر وہ ایک چوبی کیبن کے سامنے رک گیا۔ جس کے باہر ایک بورڈ پر اس شو کی تفصیل لکھی تھی۔ جس کا اس نے گلت خریدا تھا۔ میں نے بھی گلت خریدا اور قلعے کے اندر دلی محن میں چلا گیا۔ جہاں سنگ مرمر کی متعدد عمارتوں کے درمیان باغچے میں تماشائیوں کے لیے فولڈنگ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اتنے میں شو شروع ہو گیا جو روشنیوں اور آوازوں پر مشتمل تھا۔

ایک اسپاٹ لائٹ سے پھوٹنے والی لکیر سنگ مرمر کی بنی ہوئی سب سے بڑی عمارت کے ستونوں کو اجاگر کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی لاؤڈ اسپیکر پر کمپوزیٹ آواز ابھری اور وہ بتانے لگا کہ اٹھارویں صدی میں ایرانی حملہ آوروں نے دلی میں کس طرح قتل عام کیا تھا اور جاتے جاتے اپنے ساتھ تخت طاؤس بھی لے گئے۔ اس تمہید کے بعد روشنی گل ہو گئی اور عقب کے لاؤڈ اسپیکر سے ٹاپوں اور کھڑوؤں کے ٹہناتنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسی کوئی فوج حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہی ہو۔ یہ آوازیں بتدریج بلند ہونے لگیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس حملہ آور فوج کے راستے میں کھڑا ہوں۔

میں نے لاشعوری طور پر پیچھے پلٹ کر دیکھا تو اپنے آپ کو فوج کے راستے میں تو نہیں البتہ ایک تیز دھار خنجر کی زد میں ضرور کھڑا پایا۔ خنجر برق رفتاری سے نیچے آیا تو میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن نوک خنجر میری بائیں آستین کو چیرتی چلی گئی۔ مجھ پر خنجر سے حملہ کرنے والا وہی بھرا تھا۔ جس کا تعاقب کرتے ہوئے میں یہاں آیا تھا۔ میں اس اس کا دوسرا وار روکنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا لیکن وہ دوسرا وار کرنے کی بجائے بھاگ کھڑا ہوا۔

تماشا سائیں کی اکثریت چونکہ غیر ملکی سیاح پر مشتمل تھی۔ اس لیے جب اس نے کرسیوں کے درمیان سے راہ فرار اختیار کی تو وہ سمجھے کہ بھاگنے والا بھی کوئی اسی تماشے کا کردار ہے۔ ایک بار پھر روشنی گل ہو گئی اور اسپیکرز سے جنگ میں زخمی ہونے اور مرنے والوں کی کراہیں اور تلواروں کے ٹکرانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ تو میں بھی ہیرے کو پکڑنے کے لیے دوڑنے لگا۔ میری جگہ میں یہ بات نہ آسکی کہ اس نے مجھے کیسے پہچانا۔ دوڑتے ہوئے میں نے کوٹ کی جبب میں رکے ریوالور کے دستے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی لیکن دیوندر کا سامنی غائب ہو چکا تھا۔

جب اسپاٹ لائٹ کی روشنی دوبارہ شاہی عمارت کا احاطہ کرنے لگی تو میری نظر میں بھی روشنی کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ وہ ہیرا میری نگاہوں میں آ گیا اس وقت میں ایک ستون کی اوٹ میں تھا اور ہیرا اپنی جگہ کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ کب میں اس کے سامنے سے گزروں تو وہ اپنا خنجر میری پنڈھ میں گھونپ دے۔ میں ہولک والہس جا سکتا تھا۔ لیکن میں نے وہیں رکنے اور ہیرے سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ اس طرح میں شکر تک پہنچ سکتا تھا۔

اندھیرے میں مجھے ہلکی سی دھب کی آواز سنائی دی اور پھر ہیرے دوڑتے ہوئے قدموں نے بتایا کہ وہ عمارت کے پچھواڑے سے فرار ہو رہا ہے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی کہ اب کسی تماشائی کی گولی کی زد میں آنے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔ میں بھی محتاط انداز سے اسی طرف دوڑنے لگا۔ چدرہ سے ہیرے کے قدموں کی آواز آرہی تھی مگر بھی بھی اسپیکر پر کیے جانے والے تہرے کی وجہ سے معدوم ہو جاتی تھی۔

میں عمارتوں کے درمیان ایک کشادہ سی روشنی پر اس کا تعاقب کرتا رہا اور جب اسپیکر پر ایک بار پھر ٹاپیں اور کراہیں گونجنے لگیں تو میں نے اس کا

لامدہ اٹھاتے ہوئے فارز کر دیا۔ یہ فارز اسے صرف خوف زدہ کرنے کے لیے تھا۔ کیونکہ اگر میں اسے گولی کا نشانہ بنا دیتا تو دلیر سنگھ کے بارے میں معلومات حاصل نہ کر سکتا۔ گولی ویرے کے سامنے ایک ستون میں لگی تھی اور وہ فوراً زمین میں لیٹ گیا تھا۔ جب میں اندازے کے مطابق اس جگہ پہنچا تو مجھے اپنے عقب میں کسی کی آواز سنائی دی۔

میں نے اپنی کہنیاں پیچھے کو ماریں لیکن بولنے والا شاید اپنی جگہ تبدیل کر چکا تھا۔ اب میرا مقابلہ ایک سے نہیں دو دشمنوں سے تھا۔

”یہ ہماری دوسری ملاقات ہے صاحب۔“ اندھیرے میں اس آدمی کی آواز آئی اور مجھے یہ جانتے میں دیر نہ لے کر وہ سہتا کا وہی آدمی ہے۔ جس کا میں نے جبر اور کئی دانت توڑ دیے تھے۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ”ہمیں گولی مارنے سے نہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا صاحب۔“

”اور اگر میں تمہیں گولی نہ ماروں تو کیا تم.....“ ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دھماکے کی مانند کوئی پتلی سی چیز اندھیرے میں میری آنکھوں کے سامنے لہرائی اور میرے ریوالور کی نال میں اٹک گئی۔

اس کے ساتھ ہی ریوالور ایک جھٹکے سے میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ دوسرے لمحے دیوندر کا سامنی ہیرا میرا ریوالور تھا۔ اندھیرے سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ اب مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ سون ٹاور میں میں نے اس کے گلے میں جو چمکتی ہوئی چیز دیکھی تھی۔ وہ زنجیر نہیں بلکہ تانبے کی تاروں سے بنی ایک پتلی سی رسی تھی اور غالباً اس سے کشن گٹھ کا گھلا گھونٹا گیا تھا۔ اس تانبے کی رسی سے میرا ریوالور اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”تم اتنے چالاک نہیں ہو جتنا اپنے آپ کو سمجھتے ہو۔“ وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ میں اسے کوئی جواب دینے کے بجائے

آہستہ آہستہ پیچھے کھٹکنے لگا۔ مگر اس نے نال کا رخ میرے سینے کی طرف کر دیا، ہو گیا یا سمجھی کہ اگر میں نے کوئی حرکت کی تو گولی میرے سینے کے پار ہو جاتی۔

”اپنے ہاتھ سر کے اوپر اٹھا لو صاحب۔“ اس نے ایک ایک لفظ بڑبڑا دیتے ہوئے کہا۔ میں اس کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہو گیا۔

”شاباش پر تباہ! دوسرا آدمی بھی سامنے آتے ہوئے ستائی انداز میں بولا۔ اس کے چہرے اور سر پر پٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ پر تباہ نے تانبے کا ٹپا ہوتا ایک ہاتھ سے اسے دے دیا اور دوسرے ہاتھ ریوالور تھا۔ مجھے زد میں لیے رہا۔

”سہتا چکا ہے مگر گوندہ ابھی زندہ ہے۔“ سہتا کے سامنی نے تانبے کے تار کو دونوں ہاتھ سے جھٹکا دیا تو وہ جھنجھٹا اٹھا۔ ”تم بدترین سلوک کے مرتکب ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرے عقب میں گیا۔

”اگر تم نے ذرا بھی جنشش کی تو تمہارا سینہ چھلکی کر دوں گا۔“ پر تباہ بولا اور میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہ گیا۔ دوسرے لمحے وہی تار میرے گلے میں حائل ہو گیا، میں نے کھڑے کھڑے ایڑی پیچھے کو ماری مگر وہ گوندہ کے گھٹنے سے ٹکرانے کے بجائے ہوا میں رہ گئی۔ جبکہ میرے گلے میں پڑا ہوا تار کسا جانے لگا، میں نے بے ساختہ ہٹانا چاہا لیکن اس کا کساؤ اتنا شدید تھا کہ میری انگلیاں اسے گردن سے جدا نہ کر سکیں۔ اتنے میں پر تباہ نے ریوالور والا ہاتھ گھما کر اس سے میری پٹیشی پر ضرب لگائی اس کے ساتھ اس نے اپنا گھٹنا میرے سر پر دے مارا تو..... میں درد سے دوہرا ہو گیا۔ ریوالور کے دستے کی ایک اور ضرب میری کھوپڑی پر پڑی تو میرے حواس جواب دے گئے اور یوں محسوس ہوا جیسے میں اندھیرے خلا میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

☆☆



یہ خواب تھا یا کوئی اور کیفیت کہ مجھے اپنے غنودہ ذہن میں بجلیاں سی کوندنی محسوس ہو رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرا جسم ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑ رہا ہو۔ میں نے آنکھیں بند کر لینا چاہیں تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے پوٹے سلوٹن سے چپکا دیے گئے ہوں۔ میں نے جب مشکل تمام ذرا سی آنکھیں کھولیں تو کوئی چیز آگے پیچھے جھوٹی نظر آئی۔ لیکن میں یہ نہ جان سکا کہ وہ کیا ہے۔ اتنے میں میری آنکھیں پھر بند ہوئیں۔ میں نے اپنے ہاتھ پیر ہلانا چاہے تو یوں لگا جیسے وہ پتھر بن چکے ہوں۔ پھر مجھے عجیب سے خواب دکھائی دینے لگے۔ بھی میں سر کے بل معلق ہوتا اور کبھی پاؤںوں میں تحلیل ہو جاتا۔ کبھی مجھے اپنے جسم پر چونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوتیں کبھی چاروں طرف سانپ پھن اٹھائے نظر آتے۔ بھی وہ مجھے ڈستے اور کبھی میرے اعضا سے لپٹ جاتے تو میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتا۔

بالآخر میں بے ہوشی غنودگی کی اس کیفیت سے نکلنے میں کامیاب ہوئی گیا۔ تب پتا چلا کہ میں ایک سچ پرچت لینا ہوا ہوں اور میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ میں نے انہیں ہلایا، جلایا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن سر پکراتا ہوا محسوس ہوا تو میں نے قریبی دیوار سے ٹیک لگا لی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ برتاب نے میرے سر پر جو ضربیں لگائی تھیں ان میں میںیں اٹھنے لگیں۔

کچھ دیر میں اسی طرح کھڑا رہا، پھر میں نے اپنا اور اس کمرے کا جائزہ لیا۔ جہاں مجھے رکھا گیا تھا یہ جگہ دیواروں والا ایک چھوٹا سا چوکور کمرہ تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں کوئی دروازہ نہیں تھا، البتہ ایک دیوار میں دو جالی دار کھڑکیاں ضرور تھیں شاید انہیں سلاخوں والی جالی دار کھڑکیوں کے راستے مجھے اس زندان میں لایا گیا تھا۔ میں نے سلاخوں کو چھونے سے پہلے جوتا اتار کر کھڑکی پر دے مارا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ سلاخوں میں برقی روتو نہیں ہے لیکن سلاخوں سے چنگاریاں نہ

اڑیں تو میں مطمئن ہو گیا کہ ان میں برقی رو نہیں ہے، اب میں نے کھڑکیوں کا جائزہ لیا تو مجھے وہ چار اسکرود دکھائی دے گئے۔ جن کے ذریعے جال کو فریم میں جڑا گیا تھا۔ میں انہیں چھو رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”صبح بخیر مسز ارجن۔ اب صبح ہو چکی ہے میرا خیال ہے کہ آپ نے رات بھر بڑے خوب صورت خواب دیکھے ہوں گے۔“ یہ آواز دونوں کھڑکیوں میں سے کسی ایک کے پیچھے لگے اسپیکر سے آئی تھی۔ مجھے آشنائی تھی۔

”آپ کون ہیں۔“ میں نے بلند آواز سے پوچھا۔ جواب کے لیے مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا لیکن یہ جواب میرے لیے حیران کن ہی تھا۔

”میں ارجن بول رہا ہوں۔“ اسپیکر سے آواز ابھری۔ ”جیکن نے آپ کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا، یہ آپ کے ٹھکے کے آدمی کا معاملہ ہے۔ شاید اس کا نام کشن سنگھ ہے، اسے اپائنٹمنٹ کے مطابق مجھ سے ملنا تھا۔ مگر وہ نہیں آیا۔ نہیں..... نہیں آپ کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہمیں جس آدمی کی تلاش تھی وہ نہیں مل سکا۔ یہ بات نہیں دراصل اس آدمی کا کوئی وجود نہیں لہذا میں کل شام کسی فلائٹ سے واشنگٹن روانہ ہو جاؤں گا۔ بلیک ہول تنظیم کے سلسلے میں ہماری حکومت کچھ نہیں کر سکتی، کیونکہ یہ آپ کا اندرونی معاملہ ہے۔ جی ہاں! آپ کا بہت بہت شکریہ ہے اور ہاں مسٹر کشن سنگھ سے معذرت کر لیجئے کہ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔“

پھر خاموشی چھا گئی اور میں حیرت سے دنگ کھڑا رہ گیا کہ آواز میری تھی یا ہو بہو میری آواز سے لٹی تھی۔ اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا کہ دلیر سنگھ کوئی تصوراتی ہستی نہیں بلکہ جی سچ کا آدمی ہے۔ جو کہ کی آواز اور لب ولہجہ کی نقل کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ وہ ٹھنڈے مزاج

کا قاتل اور بے حد چالاک بھی ہے، اتنے تیز و طرار آدمی سے پہلے بھی میرا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ بلکہ کوئی وقت ضائع کیے بغیر اس نے بھارتی انٹیلی جنس کو بھی بیچ سے نکال دیا تھا۔ جو کچھ میں نے سنا تھا اس نے فری ٹیلی فون کی بات چیت کا ٹیپ تیار کر کے میرے ٹھکے کو بھیجا جا سکتا تھا۔

”تم نے میری آواز میں جس طرح یہ ٹیپ تیار کیا ہے۔ میں اس سے متاثر یہی نہیں بلکہ تمہارے کمال فن معترف بھی ہوں۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہ ٹیپ تیار کرنے کے لیے تمہیں میرا لب ولہجہ کیسے معلوم ہوا۔“

”تم جس ہول کے کمرے میں مقیم تھے۔ وہاں ہمارا ایک ٹرانسمیٹر موجود تھا۔“

”تو پھر میں تمہارے الیکٹرانک انجینئر کو مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ میں نے کمرے کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی تھی، مگر مجھے وہاں کوئی بگ کوئی چیز ایسی دکھائی نہیں دی تھی جو ٹرانسمیٹر کا کام دے سکے۔“

جواب میں ایک قہقہہ سنائی دیا جو سو فی صد میرا قہقہہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے جیسے میں خود ہی جواب دے رہا ہوں۔ قہقہے کے بعد کہا گیا۔ ”ایک عام پن کے برابر مائیکروفون والا ٹرانسمیٹر روبرمین کی تازہ ترین ایجاد ہے۔ کیا تم روبرمین کو جانتے ہو یا تم نے اس کا نام سنا ہے۔“

”نہیں، مسٹر دلیر سنگھ۔“

”جیس فلور یہ نے گزشتہ بیس برسوں میں کوئی بہترین چیز برآمد کی ہے تو وہ روبرمین ہے۔ ایسا بہترین دماغ صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ارجن! اور اب وہ صرف میرے لیے اور بلیک ہول کے لیے کام ہو رہا ہے۔“

”کون سا کام۔“ میں نے پوچھا۔

”اب اتنے بھولے بھی نہ ہو ارجن تمہارے ٹھکے نے تمہیں یہاں فساد یوں یا اسگٹنگ کی

تحقیقات کے لیے نہیں بھیجا تھا یہاں روبرمین کی حیرت انگیز ایجاد ڈوک کے لیے بھیجا گیا ہے۔“

”ڈوک.....“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں..... وہ طلسمی ڈوک جس میں اگر کسی آدمی کی آواز صرف چند جملے فیڈ کر دیے جائیں تو وہ کسی بھی دوسرے آدمی کی آواز کو اس آدمی کی آواز میں ڈھال دیتی ہے اور اتنی خوب صورتی سی ڈھالتی ہے کہ اصلی آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کی آواز اور لب ولہجہ نہیں ہے کیا میں تم سے تمہاری آواز اور لب ولہجہ میں بائیں نہیں کر رہا۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ تمہاری آواز اور لب ولہجہ نہیں ہے۔“

”نہیں، مسٹر دلیر سنگھ، مجھے اعتراف ہے کہ یہ میری آواز اور میرا ہی لب ولہجہ ہے۔ مگر تم اس طلسمی ڈوک سے کیا کام لے سکتے ہو۔“

”تم نے پھر احقنا نہ سوال کیا ہے ارجن۔ تم اور تمہارا ٹھکے جانتا ہے کہ میں نے اس ڈوک سے کیا کام لیا ہے اور سنو سربراہوں اور سفیروں کی آواز میں یہ بات چیت تو صرف ابتدائی تجربہ بھی چند چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے بعد جب یہ ڈوک تحلیل تک پہنچ جائے گی تو اتنے بڑے عالمی انقلاب کا باعث بنے گی جواب تک رونما نہیں ہوا۔“

”ناممکن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”یہ ہوگا..... اور مزید ہوگا۔ ارجن، ہندوستان جو اپنے آپ کو ایک حقیر اور جانبدار ملک باور کراتا تھا، بہت جلد ایک بڑی عالمی طاقت کے ساتھ متحد ہو جائے گا۔ تب میرے ملک کے لوگ بھوکے ننگے نہیں رہیں گے۔ تمہارے مغربی صحابی میرے ملک کے باشندوں کو بھوکے ننگے کہتے ہیں لیکن جلد ہی یہ بھوکے ننگے لوگ طاقت کی علامت بن جائیں گے۔ میرا ملک پرانا بھارت بن جائے گا اور لوگ ایک بار پھر ناگ دیوتا پوجا کرنے لگیں گے۔ یہ سب اسی طلسمی ڈوک کی بدولت ہوگا۔ مگر میں یہ سب اپنی ذات یا ملک کا



سربراہ یا ڈکٹیٹر بننے کے لیے نہیں کر رہا۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ نہ اس کا شمار کر سکتا ہوں اور نہ میری اپنے افلاس زدہ ملک کو پرانا بھارت ورثہ بنانے اور دھرم سے دور ہو جانے والے لوگوں کو ناگ دیوتا کی پوجا کرنے پر مجبور کرنے کی خاطر کر رہا ہوں۔

”لیکن یہ بیسویں صدی ہے۔ مسٹر دلیر سنگھا! یہ غلطی دور ہے تم کروڑوں لوگوں کی ماضی کی طرف لوٹنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ سانپوں کی پرستش کرنے کے بجائے پیٹ پالنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔“

”تم ہندوستانیوں کی ذہنیت نہیں جانتے ارجن! میں شادی خاندان کا فرد ہوں، میرے آباؤ اجداد کا مورث اعلا ناگ تھا۔ تم نے ہندوستان کے لوگوں کے سر پر بگڑی بندھی دیکھی ہوگی۔ کیا وہ کنڈلی مارے سانپ جیسی نہیں ہوتی۔“

میں دلیر سنگھا کو باتوں میں لگا کر اس کے خیالات اور منصوبوں سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں اس کوٹھری کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ جس کی دیواروں میں کوئی دروازہ نہیں تھا، میرا خیال تھا کہ شاید کسی دیوار میں کوئی خفیہ دروازہ ہو۔ مگر ایسے کوئی آثار نظر نہ آئے جو کسی الیکٹرانک دروازے کی نشاندہی کرتے، قرین قیاس یہی تھا کہ شاید دلیر سنگھا کسی الیکٹرانک آنکھ کے ذریعے میری حرکات پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے میں نے زیادہ نقل و حرکت مناسب نہیں سمجھی۔

”اگر تمہارے پاس بے شمار دولت ہے۔ تو تم بھوکے عوام کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ وہ دولت حکومت کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے تاکہ بچے فاقوں کا شکار نہ ہوں۔ یا تم ڈرتے ہو کہ وہ تمہارا بے جا مطالبہ تسلیم نہیں کریں گے۔“

اسے میری یہ بات بری لگی۔ ”بس بہت باتیں ہو چکی ارجن! حالانکہ میں تمہیں صرف اتنا

بتانا چاہتا ہوں کہ تم سچ سچ سانپوں کے بل میں پھنس چکے ہو۔ میں تم جیسے چھوٹے لوگوں سے ہم کلام ہونا اپنی توین سمجھتا ہوں۔ تمہاری حکومت دنیا کے لیے پولیس مین نہیں اور نہ ہی وہ مجھے اپنے خوابوں کو تعبیر دینے سے روک سکتی ہے۔“

”تمہیں خواب دیکھنے سے کوئی نہیں روک سکتا، دلیر سنگھا۔“ میں نے کہا۔ پھر سوچنے لگا کہ مجھے اس سے بحث کرنے کے بجائے اپنے بچاؤ اور فرار کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہیے۔

”سنو ارجن!“ پھر مجھے اپنی آواز سنائی دی۔ جو دراصل دلیر سنگھا کی آواز تھی۔ ”مجھے

گووندہ نے سہنا کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ میں وہ حساب برابر کرنا چاہتا ہوں لیکن تمہاری طرح چشم زدن میں نہیں۔ تم سہنا کی طرح فوری طور پر نہیں مرو گے۔ تمہارے حصے میں ریگنی سکتی، تڑپتی موت آئے گی۔ کیا تم جانتے ہو کہ سانپ کے ڈسنے سے آدمی کی موت کب اور کس طرح واقع ہوتی ہے۔“

”یہ تو سانپ کی قسم پر منحصر ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔ اگرچہ مجھے بہت کام ہے۔ مگر تمہاری معلومات میں تمہارا اضافہ کر ہی دیتا ہوں۔ سانپ پالنا اور ان کے بارے میں تحقیقات کرنا پسندیدہ مشغلہ ہے اس وقت بھی میرے پاس مختلف ممالک کے دو درجن سے زیادہ مہلک ترین سانپ موجود ہیں۔“

”میرے لیے تم نے کون سے سانپ منتخب کیا ہے۔“

”ایک نہیں پانچ اقسام کے تم انہیں دیکھ کر نہیں پہچان سکو گے لیکن وہ اپنے شکار کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ سانپوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی رہائشی حدود کے متعلق بڑے حساس ہوتے ہیں اور انہیں چاہتے کہ کوئی ان کی حدود میں دخل دے کر انہیں بے سکون کرے۔ تمہاری موت کس سانپ کے ڈسنے سے واقع ہوگی۔ یہ میں نہیں جانتا

ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری موت دو گھنٹوں سے لے کر سات روز کے عرصے میں واقع ہو سکتی ہے۔ اگر مٹھی نے تمہیں کاٹا تو تم گھنٹوں کے اندر مر جاؤ گے۔ اگر تمہیں چانے دار سانپ نے ڈسا تو تمہارے ناک اور منہ سے خون نکلتا شروع ہو جائے گا۔ اگر تم جلدی مرنا چاہو تو پھر خود کوشش ناک سے ڈسوا لیتا۔ بہر کیف یہ تمہاری اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ کس سانپ سے ڈسوانا چاہو۔“

”اگر میں کسی سے بھی نہ ڈسوانا چاہوں تو.....“

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد ان چند منٹوں میں..... میں کئی حیرتوں سے گزرا تھا۔ اور اب مجھے مزید حیرت کے ساتھ ساتھ موت سے بھی دوچار ہونا تھا۔ میں نے ایک بار پھر دیواروں کا جائزہ لیتا شروع کیا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں چرچاہٹ سنائی دی۔ میں ایک دم پلٹا، سامنے کی دیوار میں نصب ایک کھڑکی کی جالی آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہی تھی۔ اور یہ چرچاہٹ اسی کی تھی۔ جالی آہستہ سے کسی الیکٹرانک نظام کے تحت اوپری دیوار میں چلی گئی اور ایک چوکور موکھا دکھائی دینے لگا۔ میں نے بہتر یہ ہی سمجھا کہ خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا ہوں لیکن ابھی مشکل سے ایک منٹ ہی گزرا تھا کہ اسی موکھے سے تقریباً دس فٹ لمبا ایک مٹھی سانپ رینگتا ہوا کوٹھری میں آگرا۔ کیونکہ کھڑکی والا یہ موکھا فرش سے تقریباً پانچ فٹ اونچا تھا، ظاہر ہے کہ اب میں ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔

مٹھی نے کوٹھری کے کچے فرش پر گر کر تے ہی پھن اٹھایا اور پھنکارتے ہوئے اسے پھیلا کر بھونسنے لگا۔ ابھی میں خوف و حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی کہ کوٹھری کی دیوار میں ایک سوراخ اور ہوا دوسرے ہی لمحے ایک سانپ نے اس سوراخ سے سر نکال لیا، میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کسی قبیلے کا ہے۔ مگر اس کے جسم پر چانے یا کھیرے سے تھے۔ جو مٹی وہ

سوراخ سے زمین پر گرا۔ اس کے منہ سے ایسی آواز نکلی جیسی انگاروں پر پانی ڈالنے سے پیدا ہوتی ہے۔ میں آہستہ آہستہ مٹھی دیوار کی جانب کھٹکنے لگا تاکہ اس بیچ تک پہنچ سکوں جس پر گھاس چھپی ہوئی تھی اور جس نے رات بستر کا کام دیا تھا۔ دلیر سنگھا نے کہا تھا کہ اس نے مجھے موت کے اندھیروں میں دھکیلنے کے لیے پانچ سانپ منتخب کیے ہیں۔ جن میں دو اس کوٹھری میں آچکے تھے۔ مٹھی پھن پھیلائے ڈسنے کے لیے تیار بٹھا تھا۔ چانوں والا سانپ بھی اپنی زبان لپٹا کر عجیب سی پھنکارنے مجھے مزید خوف زدہ کر رہا تھا۔ اتنے میں موکھے سے تیسرا سانپ لڑھک کر نیچے گرا۔ جالی دار کھڑکی والا یہ موکھا، اب مجھے جہنم کا دہانہ محسوس ہونے لگا۔ یہ تیسرا سانپ آسٹریلیا کا سب سے مہلک ترین کوبرا تھا۔ جس کا زہر ہندوستانی مٹھی سانپ سے دگنی تیزی کے ساتھ اثر کرتا ہے۔ اس کی پھنکارا پہلے دونوں سانپوں سے مختلف تھی۔ پھر ان پھنکاروں میں میرے اپنے قبیلے بھی شامل ہو گئے۔ حالانکہ میں نے خوف کے مارے ہونٹ تک بیچ رکھے تھے۔ یہ قبیلہ میری آواز میں دلیر سنگھا ہی کے تھے اور اسی آپٹیکر سے سنائی دے رہے تھے۔ جس سے میں پہلے اپنی آواز میں دلیر سنگھا کی باتیں سن چکا تھا۔

”الوداع ارجن، تم مرنے کے بعد نرک میں جاؤ گے اور میں ناگ دیوتا کے سورگ میں اس لیے اب ہماری ملاقات ہی نہیں ہو سکے گی۔“ اب قبیلوں کی گونج بالکل ختم ہو گئی اور مجھے موکھے میں چوتھے سانپ کی سرخ و شاخ زبان ہیروں کے طرح چمکتی آنکھیں دکھائی دیں۔ جب وہ کوٹھری کے فرش پر گرا تو میں اسے پہچان گیا یہ ایشیائی کوبرا تھا۔ وہ پھن اٹھا بغیر دیوار کے ساتھ ساتھ رینگنے لگا۔ اتنے میں مجھے ایک عجیب سی مہک کا احساس ہونے لگا، میں نے سانس روک لی تاکہ اپنے پیچھے ہندوں کو اس مہک سے بچا سکوں مگر



میں ایسا نہ کر سکا پھر محک ایسی یہ بہک جیو حتی چلی گئی اور سانپوں کی پھکار میں اضافہ ہوتا گیا، ایسا لگتا تھا جیسے یہ خوشیوان پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ دس فٹ لمبا مٹکی جواب تک کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ رینگنے اور میری طرف بڑھنے لگا۔ اگر میں تیزی سے متحرک ہوتا تو اس کا اشتعال میں آ جانا ضروری تھا۔ اس سانپ کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ جسے اپنا دشمن سمجھ لے۔ اسے پیچھے سے آ کر ڈس لیتا ہے۔ تاہم میں نے تیزی سے سر کننا شروع کیا اور جب بیچ کے قریب پہنچا تو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ عین اسی وقت مخالف سمت کی دیوار میں ایک سوراخ ہوا اور پانچواں سانپ نیچے آ رہا تھا۔

یہ سانپ پہلے چار سانپوں کی بہ نسبت لمبائی میں چھوٹا تھا لیکن ان سے کم زہر پلا نہیں تھا، وہ بھی اپنے چاروں ساتھیوں کے ہمراہ آہستہ آہستہ بیچ کی طرف رینگنے لگا۔ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میرا جوشہر ہو مگر مجھے سانپوں کی زد سے بچنے کے لیے وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ میں چھلانگ لگا لگا کر دوسرے کونے میں جاتا، مٹکی پھنکارا اور میرے سامنے پھن اٹھا کر جھومنے لگا۔ جیسے منظر ہو کہ میں کس طرف کودتا ہوں۔ میں نے جلدی سے اپنی میض اتار دی اور اسے آستینوں سے پکڑ کر اس موذی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مٹکی نے جیسے ہی مجھے ڈسنے کے لیے پھن آگے بڑھایا۔ میں نے ہاتھوں میں جھولتی ہوئی میض اس پر ڈال دی اور ایک جانب جھٹکا دیا تو مٹکی نے بڑے زور سے اس پر پھن مارا اور اس کے نوکیلے دانت میض میں اٹک گئے۔ میں نے میض چھوڑ دی۔ مٹکی اس میں یوں الجھ کر رہ گیا جیسے وہ کسی جال میں پھنس گیا ہو۔ اب میرے سامنے چار سانپ رہ گئے تھے۔ میں نے جلدی سے پتلون کی پٹی اتاری اور بیچ کے اس سرے کے طرف بڑھنے لگا جو موٹے سے قریب تھا اگرچہ نکلنے کا کوئی راستہ تھا۔ تو وہی موٹھا

تھا جو میرے سامنے اونچا تھا، پھر وہ ابھی تک بند بھی نہیں کیا گیا تھا۔ شاید دلیر سمجھا اسے بند کرنا بھول گیا تھا۔ اس کے الیکٹرک نظام میں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ میں اچھل کر موٹے تک پہنچا اور اس میں گھسنا چاہتا تھا لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا۔ جب سانپ مجھے گھسنے کی مہلت دیتے جو بظاہر ناممکن دکھائی دے رہی تھی۔ مگر میں ان سے بچ نکلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔

میری فیض میں پھنسا ہوا مٹکی پھنکارتے ہوئے دم پیچ رہا تھا۔ تین سانپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ مگر ایک نے مجھ پر آنکھیں گاڑ رکھی تھیں اور وہی سانپ تھا جس کے بارے میں دلیر سمجھا نے بتایا تھا کہ اس کے ڈستے ہی منہ، ناک اور کانوں سے خون رسنا شروع ہو جائے گا۔ دو فٹ لمبا یہ خطرناک ترین سانپ میرے اور موٹے کے درمیان حائل تھا۔ میں نے پٹی کا ایک سرا ہاتھ میں تھام کر بکسوئے والا سر اس کی طرف بھلایا تو سانپ نے اتنی تیزی سے بکسوئے پر پھن مارا کہ پٹی ایک جھٹکے سے ہاتھ سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اور ہوا میں زہر کے وہ قطرے بھی زمین پر گرتے دکھائی دیے جو سانپ کے دانتوں سے نکلے تھے۔ میں نے پٹی کو ایک بار پھر سانپ کے سر پر بھلایا، اس نے دوسری بار اس پر پھن مارا تو اس کے دانت بکسوئے میں اٹک گئے۔ میں نے جھٹکے سے پٹی ایک جانب ہٹتی تو سانپ دیوار سے جا ٹکرایا اور وہیں زمین پر پڑے پھنکارنے لگا۔

میں اسی لمحے کا منظر تھا۔ میں نے فوراً موٹے کے طرف چھلانگ لگا دی جو نبی میرے قدم زمین پر گرنے میں سے پلٹ کر دیکھا۔ مٹکی فیض سے نکل آیا تھا اور اس کے تین ساتھی میری طرف رینگ رہے تھے۔ میں نے بچوں پر زور دیا اور موٹے میں گھس آیا۔ میری زندگی کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ کتنی جلدی اپنا وجود موٹے میں لے جا سکتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میری ٹانگیں نیچے رہ گئیں

تو سانپوں میں سے کوئی نہ کوئی ڈس لے گا، اس لیے اپنی تمام تر قوت سے اپنے آپ کو آگے کی طرف کھینچنا مگر اتنے میں مجھے اپنی ایڑی پر زور کی ایک ضرب محسوس ہوئی۔ مجھے مٹکی نے ڈسنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کے دانت میرے بوٹ کی ایڑی پر پڑے، اگر وہ صرف تین انچ اوپر پڑتے تو اس کا زہر میرے جسم میں اتر چکا ہوتا۔

یہ موٹھا ایک تنگ سرنگ کی مانند تھا۔ میں کہنوں اور سینے کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ اس سرنگ میں مزید سانپ ہیں یا نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سرنگ مجھے کہاں لے جائے گی۔ میں اس سرنگ میں بشکل رینگ سکتا تھا اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا، کہ کوئی سانپ میرا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ دلیر سمجھا نے بتایا تھا کہ سانپ اپنی رہائشی حدود میں کسی قسم کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتے اور اسی سرنگ سے اس کوٹھری میں پہنچے تھے۔ گویا یہ سرنگ بھی ان کی رہائشی حدود میں شامل تھی۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ دس فٹ لمبے مٹکی سے تھا۔ کیونکہ میں نے سنا تھا کہ جب مٹکی اشتعال میں آتا ہے تو اپنا قد آدمی کی بلندی تک اٹھا سکتا ہے اور یہ سرنگ قد آدم سے کم ہی بلند تھی۔

میں آہستہ آہستہ رینگتا رہا، میری کہنیاں پہلے دکنے اور پھر چھلنے لگیں مگر میں آگے ہی بڑھتا رہا، کچھ دور جا کر سرنگ اونچائی کی طرف جانی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس میں جو مٹکی سی روشنی تھی۔ وہ سامنے سے نہیں بلکہ عقب سے آ رہی تھی۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا، وہ ہلکی سی روشنی بھی معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں تھک کر سرنگ میں بی لیٹ گیا، جس کی مٹی اب کچھ نرم محسوس ہو رہی تھی۔

لینے لیٹے میں سے سوچا کہ جب دلیر سمجھا کے پاس ڈومین جیسے الیکٹرونک انجینئر موجود ہیں تو کیا اسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ میں کونسی سے فرار

ہو کر سرنگ میں آ گیا ہوں۔ کوئی نہ کوئی خفیہ آنکھ مجھے ضرور دیکھ رہی ہوگی اور جب میں سرنگ کے دہانے سے نکلوں گا تو دلیر سمجھا پھر میری آواز میں میری بے بسی پر قہقہہ لگائے گا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ اس کا الیکٹرونک نظام شاید خراب ہو گیا ہو۔ ورنہ موٹے کی جالی دار کھڑکی دوبارہ بند ہو جاتی۔ اس اطمینان کے بعد میں پھر رینگنے لگا، لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وقت ختم ہو گیا ہو کیونکہ سرنگ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ اچانک مجھے اپنے چہرے پر ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا محسوس ہوا تو میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا، لیکن اب سرنگ تنگ تر ہوئی جا رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ آگے جا کر یہ بند ہو جائے گی۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور رینگتا رہا۔ پھر میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اس نے مجھے وہیں رکنے پر مجبور کر دیا، جہاں میں تھا۔

چند گز کے فاصلے پر سرنگ ختم ہوئی تھی اور اس کا دہانہ ایک چوٹی کیڑی سے بند تھا، جس کے تختوں کی درزوں سے روشنی کی عمودی لکیریں سرنگ میں جھانک رہی تھیں۔ میں پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا، اور بالآخر کھڑکی تک پہنچ گیا، چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد میں نے درزوں سے جھانکا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سرنگ کا دہانہ ایک ایسے جوہر کے کنارے کھلتا تھا جس کے پتھوں بیچ پانی اور چاروں طرف پتھر پڑے ہوئے تھے۔ جوہر میں پانی کے سانپ رینگتے، پھنکارتے اور پھن پھیلانے دکھائی دے رہے تھے۔ ان سب خطرناک اور مایوس کن میں وہ پانچ چھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ جس نے جوہر کو گھیر رکھا تھا۔ اگر میں چوٹی کھڑکی کھول کر سرنگ سے باہر آتا تو اپنے آپ کو چاروں طرف سے سانپوں سے گھرا ہوا پاتا۔

ابھی میں اپنے گرد تے موت کے اس جال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ جوہر میں کچھ کرنے سے پھپھاک کی آواز آئی۔ پھر اوپر سے پانی اور پھروں میں گوشت کے ٹکڑے گرنے لگے۔



سانپ تیزی سے لپکتے اور وہ لوتھڑے ہڑپ کر جاتے کچھ دیر کے بعد گوشت کے ٹکڑوں کے بجائے زندہ چوہے گرائے جانے لگے۔ چوہے جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگتے تو سانپ لپک کر انہیں ڈستے اور پھر زہر کے زیر اثر لٹھکنے والے چوہوں کو زندہ نکل جاتے۔

یہ بڑا مکروہ منظر تھا مگر میں دل پر جبر کے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ دلیر سنگھ میرے ساتھ بھی یہی کچھ کرنا چاہتا ہے

اس دوران میں جو سانپ میرے ہو گئے تھے۔ ادھر ادھر پتھروں سے لیٹ گئے اور کچھ پتھروں کے نیچے دبک گئے۔ انہوں نے پھکارنا بھی بند کر دیا۔

اب میں جان چکا تھا کہ دلیر سنگھ نے یہ سرنگ سانپوں کے لیے بنوائی تھی اور جسے سزا دینا چاہتا ہوگا اسے اس کوٹھری یا تہہ خانے میں قید کر دیتا ہوگا اور پھر بھوکے سانپوں کو سرنگ کے ذریعے اپنے شکار پہنچا دیتا ہوگا اور وہ مہک جو مجھے محسوس ہوئی تھی کوئی ایسا کیمیکل تھی جس سے سانپ مشتعل ہو جاتے تھے۔

میں یہ تو نہیں دیکھ سکا تھا کہ سانپوں کو خوراک کس نے فراہم کی ہے مگر مجھے وہ کھڑکی ضرور دکھائی دے گئی تھی جس سے گوشت اور چوہے گرائے گئے تھے۔ یہ کھڑکی جو ہڑ کے گرد تعمیر شدہ دیوار میں بنی ہوئی تھی۔ جب یہ کھڑکی بند ہو گئی تو بھی میں درزوں سے جھانکتا رہا مگر مجھے کسی کا چہرہ دکھائی نہ دیا نہ کوئی آواز آئی۔ سانپ بھی پیٹ بھرنے کے بعد سست ہو گئے تھے میں نے سانپوں کے بارے میں ایک مضمون پڑھا تھا کہ سانپ تیزی سے متحرک چیزوں سے بھڑکتے ہیں اور انہیں اپنی سلامتی کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں اس لیے مشتعل ہو کر ڈس لیتے ہیں۔ لہذا میں آرام سے لیٹا درزوں سے جھانکتا رہا۔ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”اب تم سب آسودگی محسوس کر رہے ہو کیونکہ تمہارے پیٹ بھر چکے ہیں۔ جب کہ اس بستی کے آدھے سے زیادہ لوگ بھوکے پیٹ سوتے ہیں۔“

میرے کان اس آواز سے آشنا تھے۔ آواز دلیر سنگھ کی تھی۔ نہ میری یہ آواز اس بیک حسن و شادب سروج کی تھی میں یہ سوچ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ دلیر سنگھ کی فرستادہ بھی اور دلیر سنگھ کے ذرائع کتنے وسیع تھے کہ اسے میری آمد کا پہلے ہی علم ہو گیا تھا تب ہی تو اس نے سروج کو مجھے اپنے دام میں گرفتار کرنے کے لیے بھیجا تھا سروج کو پہلی بار دیکھتے ہی میرا دل جتنی تیزی سے دھڑکا تھا اب بھی اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ مگر پہلی مرتبہ اس کے دھڑکنے کا سبب کچھ اور تھا اب دھڑکنوں کی تیزی کا باعث نفرت اور جذبہ انتقام تھا اب میں نہ صرف اپنی زندگی کے لیے فرار نہیں ہونا چاہتا تھا، بلکہ سروج کو بھی اس کرب سے اور اذیت سے آشنا کرنے کا مقصد تھا جس سے میں دوچار تھا۔

کافی دیر گزرنے کے بعد جب نہ سروج کی آواز دوبارہ آئی اور نہ کسی سانپ کی پھکار سنا دی تو میں نے سرنگ کے دہانے والی کھڑکی کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھانا شروع کر دیا دہانے کے قریب کوئی سانپ نہیں تھا میں نے جو ہڑ اور ارد گرد کا جائزہ لیا پانی والے سانپ تہہ میں تھے اور باقی پتھروں کے درمیان یوں پڑے تھے جیسے ”قیولہ“ فرما رہے ہوں میں بڑی آہستگی سے باہر نکلا۔

کھڑکی دوبارہ بند کی اور کچھ لمحے سانپوں کا جائزہ لیتا رہا صرف ایک سیاہ سانپ نے جو ہڑ پتھر کے گرد لیٹا ہوا تھا۔ چن اٹھایا مگر مجھے بے حس حرکت دیکھ کر پچھن دوبارہ پتھر پر رکھ لیا۔

”تیزی سے جتنی تیزی سے ہو سکے دیوار پھاند جاؤ“ ارجن۔ میں نے اپنے آپ سے کہا اور لپک کر دیوار کا اوپر حصہ پکڑ لیا اسے لیے

ماپ پھکارا اور پتھر کی گرفت ڈھیل کر کے میری طرف لپکا مگر میں اچھل کر دیوار پر چڑھا گیا اور دوسری جانب کو دھڑکتی تیزی سے دھڑکتے دل پر قابو پانے لگا یقین نہیں آتا تھا کہ میں دنیا کے مہلک ترین سانپوں کو غا دے کر موت کے کنوئیں سے نکل آیا ہوں عین اسی وقت مجھے ایک چیخ سنا دی اور چیخ سروج کی تھی جو کچھ فاصلے پر ایک جالی دار کمرے میں بند اڑدھا کے سامنے گوشت کے ٹکڑے پھینک رہی تھی۔ میں برق رفتاری سے اس کی طرف لپکا اور اس کا ایک بازو مروڑ کر اپنا ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا تاکہ وہ دوبارہ چیخ کر یا کسی کو بلا کر میری موت کا باعث نہ بن جائے۔ بلکہ خود میرے ہاتھوں موت کا ڈانٹہ چکھ لے وہ مجھے ایک ہاتھ سے ٹوہنی اور میری ہنڈی پر اپنے سینہ لوہوں سے پھیریں لگاتے ہوئے گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتی رہی مگر میں نے اسے ہلنے کا موقع نہ دیا اور آہستہ سے کہا۔

”خاموش رہو اگر منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو سہتا کی طرح تمہارا منکا بھی توڑ دوں گا۔“ سروج کی آنکھوں میں دہشت کے سائے گہرے ہو گئے۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”مجھے زندہ دیکھ کر تمہیں حیرت ہوئی ہوگی لیکن اب یہ مت کہنا کہ تمہیں یہ علم نہیں تھا کہ مجھے یہاں قید کیا گیا تھا۔“

”بھگوان کی سوگند مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔“ بالکل اسی طرح جیسے سہتا اور گوندہ کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ ”سروج نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔“ مجھے اپنے ماتا پتا کی سوگند ہے کہ میں ان کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ تمہیں میری بات کا یقین کرنا پڑے گا۔“

”اور پھر اپنی کھوپڑی کے پرچے اڑوانا پڑیں گے۔ یہ سامنے کس کا کمرہ ہے۔“

”وہ لیبارٹری ہے۔“ سروج نے جواب دیا

جو اس وقت لیبارٹری کوٹ پہنچے ہوئے تھی۔

”وہاں کوئی ہے۔“

اس نے نفی میں جواب دیا تو میں اسے لیبارٹری میں لے آیا اور یہ پوچھنے کے بجائے کہ ڈور لاک کی چابی کہاں ہے۔ میں نے اس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی اور دروازہ مقلقل کرنے کے بعد تنگ لیکن طویل کمرے کے دوسرے کونے تک لے آیا۔

”اس نے..... اس نے مجھے تمہارے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔“ وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

”کس نے؟“

”دلیر سنگھ نے..... وہ میرا چچا ہے۔“

”کیا؟“ میں حیرت سے صرف ایک لفظ کہہ سکا۔

”دلیر سنگھ میرا چچا ہے۔ مجھے موقع دو کہ میں بتا سکوں اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ تم ایک بار میری پوری بات سن لو۔ اگر تمہیں میری باتوں کا یقین نہ آئے تو پھر جوجی میں آئے کرنا۔“

سروج کی اس التجا نے مجھے قطعی متاثر نہ کیا اب میں اس حسین ناگن کے دام میں نہیں آنا چاہتا تھا لیکن میں اس کی باتیں ضرور سننا چاہتا تھا تجربے نے مجھے بتایا تھا کہ جب کوئی اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے تو کہیں کہیں سچ بولتا ہے اور اگر سروج کی داستان سچ پر مبنی ہوئی تو وہ میری بہترین مددگار بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے اس صفائی کا موقع دینے کا فیصلہ کر لیا۔

”یہ سچ ہے کہ میں ہوں میں تم سے معلومات حاصل کرنے کے لیے ملی تھی۔“ وہ بولی۔ ”مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ اگر تم کتابوں کی دکان پر مجھ سے بات نہ کرتے تو میں خود پھیل کرتی میں یہ جانتا چاہتی تھی کہ تم ہندوستان کیوں آئے ہو دراصل یہ معلومات میرے چچا کو درکار تھی۔ اسی نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔ لیکن اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہاں سہتا اور گوندہ بھی آئیں گے۔“



میں نے سروج کے چہرے کو فور سے دیکھا۔  
اب اس کی آنکھوں میں دہشت کی پرچھائیاں کم  
اور مصیبت زیادہ تھی۔

”میں نہیں جانتی کہ اس کے بعد تمہارے  
ساتھ کیا ہوا۔ اس رات میں ہوں گے کمرے میں  
کیسے ٹھہر سکتی تھی۔ جبکہ وہاں سنہا کی لاش پڑی  
تھی۔“

اس کی یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں  
نے کہا۔ ”بولتی رہو۔“

”میرے چچا نے میرے پتا جی یعنی اپنے  
بڑے بھائی کو کہیں قید کر رکھا ہے۔ اگر میں پولیس یا  
حکومت کے کسی آدمی سے رجوع کروں تو وہ  
میرے پتا جی کو قتل کر دے گا۔ میرا باپ بہت بیمار  
ہے۔ چچا کا کہنا ہے کہ میں نے اس کا کوئی حکم  
ماننے سے انکار کیا تو وہ اس کا علاج نہیں کروائے  
گا۔ میں اس کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہوں  
ارجن۔“

”کیا تم جانتی ہو کہ تمہارا باپ کہاں پر  
ہے۔“

”نہیں وہ اس حویلی نہیں کسی دوسری جگہ  
محسوس ہے۔“

میں انسانی نفسیات بھی جانتا ہوں اور میرا  
مشاہدہ اور تجربہ بھی اتنا ہے کہ جھوٹ اور سچ پر کھ  
سکوں۔ اگرچہ میں سروج سے سخت نفرت کرنے لگا  
تھا لیکن اب اس کے لب و لہجے میں مجھے کوئی  
جھوٹ کی جھلک دکھائی نہ دی۔ یہ بھی خارج از  
امکان نہیں تھا کہ دلیر سنگھا اس کے باپ کو مقید کر  
کے اسے بلیک میل کر رہا ہو۔

”تمہیں چند اور باتوں کی وضاحت بھی کرنا  
پڑے گی سروج۔“ میں نے کسی قدر نرمی سے کہا۔  
”پوچھو جو کچھ میں جانتی ہوں ضرور بتاؤں  
گی۔“

ابھی میں اس سے سوال کرنے والا تھا کہ  
دروازے کے باہر سے کسی نے سروج کو پکارا۔

”یہ کون ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میرے چچا کا ایک کارندہ دیوندر۔“

”میں اسے جانتا ہوں۔ اس کے سامنے  
یوں ظاہر کرنا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہر بات معمول  
کے مطابق ہے۔“

سروج نے اثبات میں سر ہلایا اور یہ آواز  
بلند ہوئی۔ ”ایک منٹ دیوندر۔“

میں نے جانی سروج کے حوالے کر دی اور  
ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جسے ہتھیار  
کے طور پر استعمال کر سکوں۔ مگر مجھے کوئی بھی ایسی  
چیز نہ ملی تو میں دروازے پر آ گیا۔ اگر دیوندر کے  
پاس کوئی ہتھیار ہوا بھی تو میں اس سے نمٹ سکتا  
تھا۔ کیونکہ اس سے دو دو ہاتھ کر چکا تھا۔

میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا اور  
سروج کو اشارہ کیا کہ وہ دروازہ کھول دے۔ یہ  
امتیازی لمحہ تھا۔ اگر سروج نے سچ بولا تھا تو وہ  
غدار ہی نہیں کر سکتی تھی اور اگر اس نے غدار ہی کرنا  
ہوتی تو میرا سچ ٹھکانا ناممکن تھا۔ میں نے سروج کی  
طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا مسکراہٹ آ گیا۔  
یہ تبسم دوستی کی علامت بھی ہو سکتا تھا اور دشمنی کی بھی  
پھر اس نے جانی گھما کر تالا کھول دیا۔

”دروازہ کیوں لاک کیا تھا تم نے۔“  
دیوندر نے پرہیزی سے پوچھا۔ اب اس کے چہرے  
پر نہ پشیمانی تھی اور نہ ہی وہ میرے کے یونیفارم  
میں تھا۔

”مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ دروازہ لاک  
ہے۔“ سروج نے جواب دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔  
اس کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات تھے۔  
شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ دیوندر کو میرے بارے  
میں بتادے یا یہ کہ نہ جانے اب کیا ہوگا۔

”آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔“ دیوندر  
نے اسے حکم دیا اور لیبارٹری میں داخل ہو کر زور  
سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر سروج سے بولا۔  
”تمہارا چچا اسٹڈی میں تمہارا منتظر ہے۔“

اس سے پہلے کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی، میں  
تائی کو انڈوین چکا تھا۔ پھر میری فلائنگ کلک نے  
اسے خاک چائے پر مجبور کر دیا۔ مگر وہ فوراً لوٹا ہوا  
میری دسترس سے باہر نکل گیا۔ میں نے اچھل کر  
اسے دبوچ لیا اور اس پر دباؤ ڈالنے لگا۔ ساتھ ہی  
میں نے سروج سے دروازہ لاک کرنے کو کہا۔

سروج نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ  
لاک کر دیا۔ دیوندر نے اسے مغلطات بکتے ہوئے  
زور لگایا اور میری گرفت سے آزاد ہو کر پیچھے ہٹنے  
ہوئے نیچے میں اڑسا ہوا پستول نکالنے لگا۔ یہ دیکھ  
کر مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا۔ میں نے دایاں  
گھٹنا پیٹ تک بلند کیا اور برقی رفتار سے سائیڈ  
کلک لگائی تو میرا پیراس کے اسی ہاتھ سے لگرایا  
جس میں پستول تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے  
چھوٹ کر دور جا گرا اور دوسرے ہاتھ سے کلائی  
تھام کر چیخنے ہی والا تھا کہ میں نے دونوں ہاتھوں  
سے اس کی گردن دبا دی۔ وہ پوری قوت سے اپنی  
گردن چڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”تمہاری آنکھوں کا کیا حال ہے۔ دیوندر۔“  
میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے پوچھا۔

وہ جواب تو نہیں دے سکا۔ اس لیے اس نے  
کسی فلمی ہیرو کا پوز بنالیا تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت  
پہلے محسوس ہوئی اور میرے ہاتھ کی خود کار مشین  
کی طرح جلنے لگی اور چند ہی لمحوں کے بعد وہ اپنی  
لونی ہوئی ٹپلیوں کے ساتھ کسی شرابی کی طرح  
بھول رہا تھا۔

”دلیر سنگھا تجھے چھوڑے گا نہیں۔ کتے  
کی۔“ وہ کرب سے بلبلاتے ہوئے بولا۔ دلیر سنگھا  
کا نام سنتے ہی میں پھر اس پر ٹوٹ پڑا اور مجھے یاد  
آ گیا کہ وہ مجھے کتنی کرب انگیز موت سے ہمکنار  
کرنا چاہتا تھا۔

”اب تمہارے حصے میں بھی وہی موت  
آئے گی۔ جو مجھے ملنے والی تھی۔“ میں نے غراتے  
ہوئے کہا۔

”نہیں، نہیں۔۔۔۔۔۔“ وہ بے ساختہ بولا۔ شاید  
وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ ”میں  
نے تو دلیر سنگھا کے حکم کی تعمیل کی تھی۔“

”میں بھی کسی کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔“  
میں نے جواب دیا اور اسے ہٹایا ہوا اسی جو ہڑکی  
طرف جانے لگا۔ جس میں ہر قسم کے سانپ موجود  
تھے۔ دیوندر نے چیخنا چاہا۔ مگر میں نے دونوں  
ہاتھ اس کی ٹھوڑی میں ڈال دیے اور اسی طرح  
گھسیٹ کر جو ہڑتک لے آیا۔ پھر اسے اٹھا کر میں  
نے دیوار سے بلند کیا اور جو ہڑتک میں ڈال دیا۔

اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ سانپوں کی  
پھنکاروں میں دب کر رہ گئی تھی۔ جب میں نے  
دیوار سے جھانکا تو متعدد سانپ پھن پھیلانے  
اسے ڈس رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں اور کانوں  
سے خون رسنے لگا اور منہ سے کف جاری تھا۔

”تمہارا چچا مجھے بھی اسی طرح مارنا چاہتا  
تھا۔“ میں نے اپنے قریب کھڑی سروج سے کہا۔  
جس نے یہ مکروہ منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ  
رکھ لیے تھے۔ پھر اس نے ہاتھ ہٹا کر میری طرف  
دیکھا۔ نہ اس کے رخسار آنسوؤں سے نم تھے۔ نہ  
اس کی آنکھوں میں مجھے ستارے جھللاتے دکھائی  
دیے۔ اس نے اپنے آپ کو پوری طرح قابو میں  
رکھا تھا۔

”تم نے بہت اچھا کیا ارجن!“ وہ آہستہ  
سے بولی۔ ”مجھے خوشی ہے اسے ایسی ہی سزا ملنی  
چاہیے تھی۔ میرے چچا کے کارندے میرے ساتھ  
جو بہیمانہ سلوک کرتے رہے ہیں۔ تم نہیں جانتے۔  
یہ بھیڑیے اسی لیے تو میرے چچا کا حکم ماننے اور  
اسے دیوتا سمجھتے ہیں۔ ان سب کو اس سے بھی  
زیادہ کرب ناک موت ملنا چاہیے۔“

یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ ٹھوکر اور آنکھیں نم  
ہو گئیں جو اس بات کا ثبوت تھیں کہ اس پر بے پناہ  
مظالم ہوتے رہے ہیں۔ میں اسے لیبارٹری میں  
لے آیا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کچھ دیر بیٹھی



روٹی رہی۔ میں نے اسے رونے دیا تاکہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔

”مجھے تمہاری ہر بات کا یقین ہے سروج۔“ میں نے اس کے شانوں کو ہچکتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارا ساتھ دوں گا لیکن یہ تو بتاؤ یہ کیوں ہے۔“ ”میں تمہیں یہ سب کچھ بتا دوں گی۔ مگر پہلے تم مجھے اس کرسی سے اچھی طرح باندھ دو ورنہ تمہارے فرار کا الزام مجھ پر آئے گا۔ پھر وہ میرے پتا جی کو اور مجھے بھی مار ڈالے گا۔“ یہ کہہ کر سروج ایک لمبی سی رسی لے آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے ہاتھ پاؤں اور جسم کرسی سے باندھنے لگا۔ اس دوران وہ ضروری باتیں بتاتی رہی۔

جب میں اسے کرسی سے جکڑ چکا تو اس نے کہا۔ بال یہاں سے چند میل دور واقع ہے۔ حویلی سے نکلنے کے بعد تم سڑک پر پہنچ جاؤ گے۔ یہی سڑک تمہیں نوپال لے جائے گی آج شام ہماری ملاقات ضرور ہونا چاہیے۔ تمہیں میرا انتظار کرنا ہو گا میں جو مزید معلومات حاصل کر سکی تمہیں فراہم کر دوں گی۔“

”یہ معلومات میرے اور تمہارے لیے ہی نہیں تمہارے پتا کی زندگی کے لیے بھی کارآمد ہوگی۔ سروج چاہے کچھ بھی ہو۔ اگر میں زندہ رہا تو تمہاری راہ دیکھوں گا۔“ پھر میں نے الماری سے ایک میلا سا کپڑا نکال کر سروج کے منہ پر باندھا۔ ایک لیبارٹری کوٹ پہنا۔ دیوندر کا فرش پر گرا ہوا ریوا اور اس کی جیب میں ڈالا اور باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ تب سروج نے اپنی نگاہیں مجھ سے ہٹائیں اور اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مجھے اس پر بے انتہا پیار آیا۔ مگر میں دل پر صبر کا بھاری پتھر رکھے لیبارٹری سے باہر نکل آیا۔

دہلی پہنچنے کے دو روز کے اندر اندر مجھے کتنی ہی نئی باتیں معلوم ہوئی تھیں اور کتنی ہی مصیبتوں سے پالا پڑا تھا۔ بیرون ملک سے نکل آنے پر بھی

یقین نہیں تھا کہ میں زندہ بچ بھی جاؤں گا کہ نہیں۔ پھر جیکسن سے ملاقات کے بعد دلیر سنگھ کا کردار سامنے آیا۔ یہ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کوئی فرضی کردار ہے یا سچ کا کوئی وجود۔ اب نہ صرف وہ حقیقت بن کر سامنے آ چکا تھا۔ بلکہ مجھے اس کے سائنسی تخلیق کردہ جسم کی روک کے بارے میں معلومات حاصل ہو چکی تھیں لیکن اب دلیر سنگھ اور اس کے ساتھیوں سے جان بچانا مشکل ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ نوپال کس طرف ہے۔ اس سے پہلے کہ دلیر سنگھ کو میرے فرار کا علم ہو۔ میں نوپال پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ اس کے کارندے مجھے راستے میں آلیتے۔

لیبارٹری سے نکلنے کے بعد جب میں ایک کارڈور سے دوسرے کارڈور میں مڑا تھا تو مجھے کسی کی آواز سنائی دی تھی۔ ”تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے دیوندر۔ جانتے نہیں کہ وہ اپنے حکم کی تعمیل میں تاخیر برداشت نہیں کرتا۔“

اس بات کا مطلب یہ تھا کہ بہت جلد بلکہ چند منٹوں میں انہیں یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ میں یہاں سے فرار ہو چکا ہوں اور دیوندر اسی موت سے ہلکتا ہو چکا ہے جو میرے صے میں آنے والی تھی۔ لہذا مجھے فوراً حویلی سے نکل جانا چاہیے۔ مگر یہ حویلی تو راہداریوں کی بھولی بھلیاں تھیں ایک ختم ہوئی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ بالاخر ایک دروازہ کھول کر میں عمارت سے باہر آ گیا۔

عمارت کے باہر چاروں طرف مختلف ممالک کے پھولوں کی کیاریاں تھیں اور چار دیواری کے ساتھ درخت اور اونچی باڑھ جب مجھے کوئی صدر دروازہ دکھائی نہ دیا اور راہداری سے دوڑنے بھاگتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں تو میں ایک باڑھ کے قریب پہنچا اور درخت کی شاخ پکڑ کر دیوار سے باہر کود گیا تھا دلیر سنگھ کی طرح اس کی یہ دیکھی حویلی بھی خاص پر اسرار تھی۔ اس سے

کے بعد میں بے تحاشا بھاگتا چلا گیا تھا اور اب سڑک پر آ پہنچا تھا۔ سروج نے مجھے کوئی ایسی نشانی نہیں بتائی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ مجھے کس سمت جانا چاہیے۔ میں نے سڑک کی دونوں سمتوں میں دیکھا۔ سڑک پر کوئی ٹریفک نہیں تھی۔ البتہ سڑک کے پار مجھے ایک مرد عورت اور چند بچوں کے ننگے بچے دکھائی دے گئے۔ میں دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔

”نوپال کس طرف ہے۔“ میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

اس سوال کا جواب ملنے کے بجائے بچے مجھ سے چٹ گئے اور ہتھکیش صاحب ہتھکیش چلانے لگے۔ حویلی سے چلتے وقت سروج نے مجھے چند روپے دیے تھے اور کچھ ریز گاری بھی۔ میں نے وہ ریز گاری انہیں دیتے ہوئے سوال دہرایا تو انہوں نے ایک جانب اشارہ کر دیا۔ میں اسی سمت دوڑنے لگا۔

میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ کوئی بس ٹرک یا تیل گاڑی مل جائے۔ مگر مخالف سمت سے دو کاریں آئی اور زن سے گزر گئیں۔ اتنے میں مجھے ایک آواز نے چونکا دیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے دہلی کی پہلی رات یاد آ گئی۔ یہ آواز موٹر سائیکل کی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ گووند اسکوٹر پر سوار ہو کر بھاگ نکلا تھا۔ اس وقت بھی یہ آواز بتا رہی تھی کہ بیک وقت دو یا تین موٹر سائیکل یا اسکوٹر آ رہے تھے اور یہ دلیر سنگھ کے کارندے بھی ہو سکتے تھے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے پلٹ کر دیکھا تو ایک موٹر سائیکل کچے راستے سے سڑک پر مڑتی دکھائی دی۔ جس پر دو آدمی سوار تھے۔ انہوں نے سکوں جیسی پکڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ میرا ہاتھ فوراً گووند کے ریوالور پر چلا گیا۔ یہ ریوالور سوگڑ اور مار سکتا تھا۔ میں پہلے بھی یہ ریوالور استعمال کر چکا تھا اور اس کی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ مگر جب میں نے گووند کے ریوالور چیک کیا تو اس میں ایک

بھی گولی نہ تھی۔

میں نے اسے دوبارہ جیب میں رکھا اور پلٹ کر دیکھا۔ دو موٹر سائیکل تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اتنے میں ایک گولی میرے بائیں کان کے پاس سے سنائی ہوئی گزری اور سامنے والے درخت کے تنے میں پھوست ہو گئی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ گولی چلانے والا ماہر نشانہ باز ہے۔ اتنے میں دوسری گولی میرے دائیں شانے کو تقریباً چھوتی ہوئی گزری۔ میں فوراً کچے میں اتر گیا جہاں تقریباً پچاس گز دور کوئی خستہ حال عمارت تھی۔ عمارت کی گلی تھی۔ چھوٹی سی چار دیواری میں چند چھپر اور ایک دو کوٹھے بنے ہوئے تھے۔

میں نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ موٹر سائیکل بھی کچے میں اتر گئے تھے۔ مگر دھول اڑنے کی وجہ سے ان کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رفتار بڑھا دی۔ میرا تعاقب کرنے والوں میں سے کسی نے بڑا واژ بلند کیا۔ ”موٹر سائیکل چھوڑ دو اور پیدل ہی اس کا پچھا کرو۔“

میں عمارت کے ادھ کھلے بھاگ میں داخل ہو گیا۔ جہاں بیلوں کے ڈکرانے، گوبر اور خون کی بدبو نے میرا استقبال کیا۔ غالباً یہ سلاٹر ہاؤس بنی مذبح خانہ تھا۔ جہاں کچھ لوگ بیلوں کو ذبح کر رہے تھے۔ وہ لوگ چھریاں لہرا لہرا کر مجھے رکنے کا حکم دینے لگے۔ مگر میں بیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا احاطے کے دوسری جانب بڑھتا چلا گیا۔ اتنے میں ایک کی آواز سنائی دی۔

”رک جاؤ! رجن ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ دلیر سنگھ تم سے معاہدہ کرنا چاہتا ہے۔“ ”میری موت کا معاہدہ۔“ میں نے خودکلامی کی اور دوڑ جاری رکھی سامنے کی دیوار کے ساتھ ناند بنی ہوئی تھی۔ جس کے آس پاس گوبر ہی گوبر تھا۔ اگر مجھ پر گولیاں نہ چلائی جاتیں تو شاید میں رکنے پر مجبور ہو جاتا۔ مگر ان گولیوں نے میری رفتار بڑھا دی۔ میں گوبر کی پرواہ کیے بغیر ناند پر



مقصود الٰہی شیخ

دراصل میں اسے آنے سے منع کرنا اور روکنا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم ہے اب وہ کئی روز تک ادھر کا رخ نہ کرے گا۔ میں بھی چاہتی تھی۔ یہ نہیں کہ بڑا خوددار ہے، برا مان گیا ہو گا۔ نہیں، میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ جب وہی سہارا ملا، وہ اکڑ گیا۔ بیڑی، بلاوا اور خوشامد چاہتا ہے۔ اماں کی خواہش بھی یہی ہے، کہہ چکی ہیں ہم لوکیں روکیں گے تو تماشا بنے گا۔

### غیرت و ضمیر کے ساتھ غربت کو ڈھال بنانے والوں کی کہانی

ہمیشہ چاہ کی اور آج تک نصیب نہ ہوئی، تحفہ میں ملے اور میں چپ رہوں، رتی برابر مسرت کا اظہار نہ کروں، سٹٹا گیا ہوگا! میں جانتی تھی حوصلہ شکنی کے لیے یہی رویہ کارگر تھی رثا بت ہوگا۔ اتنے میں اماں نے چائے لا کر سامنے رکھ دی۔ میں نے پینے کے لیے بھی نہ کہا۔ جانے کیا سوچ کر کھونٹ لیا اور پوچھا: ”کیسی ہو؟“ میں جواب ٹھہر کر دینا چاہتی تھی مگر عادتاً

وہ پھر آنے لگا تھا۔ بار بار، بہانے بہانے سے آتا۔ چھوٹا موٹا تحفہ بھی لاتا۔ اس روز وہ میری ہانڈ کی پرفیوم لایا۔ بڑی مہنگی ہے۔ چھوٹی سی شیشی میں پونڈ میں آئی ہے۔ ذرا منتظر رہ کر اس نے پرفیوم ٹیل پر رکھ دی۔ میں نے اٹھا کر چھٹی، نہ شکر یہ کہا۔ ہاں دھری تھی، وہیں بڑی رہی۔ وہ غلام میں لگا ہیں گاؤں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ ایسی عمدہ خوشبو جس کی

پوچھتا ہوا بالآخر وزارت خارجہ کے دفتر پہنچ گیا۔ مگر میرے پاس پاسپورٹ نہ تھا۔ نہ دیگر کاغذات اور نہ سفری چیک اوپر سے میری حالت ایسی تھی کہ خود مجھے اپنے آپ پر ہنسی آرہی تھی۔ اس وقت میری جیب میں وہی چند روپے تھے جو سروج کو باندھنے سے پہلے اس نے مجھے دیے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ دہلی چلا جاؤں اور واپس آ کر سروج سے ملوں لیکن دہلی آنے جانے میں کم از کم چھ گھنٹے لگتے۔

مجھے جینکس کو بھی ان حالات سے مطلع کرنا تھا اور شام کو سروج سے بھی ملنا تھا۔ ان سارے مسائل کو حل کرنے کی بس ایک ہی ترکیب تھی جو سمجھ میں آئی تھی۔ جو اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی تھی جب وزارت خارجہ کا آفسیر میری باتوں کا یقین کرتے ہوئے میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو جائے۔

میں اپنے گندے کپڑوں اور خستہ حالت کے ساتھ اس صاف ستھرے آفس میں داخل ہو گیا لیکن یونیفارم میں ملبوس گاڑ فوراً میری طرف لپکا اور اس نے میرا راستہ روک دیا۔

”مجھے براؤنج منیجر سے ملنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ اس لیے میری یہ حالت۔“

”منیجر کا نفرنس میں مصروف ہے۔“ گاڑ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اس وقت اسے ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا۔ پپی صاحب۔“ وہ طنزیہ مسکرایا۔ اور میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

﴿.....﴾  
﴿.....﴾

فولاد کی یہ سرگزشت جاری ہے بقیہ واقعات کے لیے آئندہ ماہ کا شمارہ ملاحظہ کریں۔

﴿.....﴾  
﴿.....﴾

چڑھا اور وہ بیخ شاخ پھاؤڑہ یا پنجالی اٹھالی جو دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی گئی تھی۔ اب میں نے پلٹ کر دیکھا تو گوند اور برتاب قریب آچکے تھے۔ برتاب نے ریو اور تو لا مگر اس نے گولی نہ اگلی۔ کیونکہ میں بیخ شاخ اس کی طرف اچھال چکا تھا جو اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

وہ ایک بیخ کے ساتھ اپنے پیچھے آنے والے گوند اور چاکر گوند ابھی گر پڑا۔ ان کے گولیاں چلانے کے باعث تیل پہلے ہی بھڑک اٹھے تھے اور ادھر ہی آرہے جہاں گوند اور برتاب گرے ہوئے تھے۔ میں ناند سے دیوار پر چڑھا اور باہر کود گیا۔ اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ وہ دونوں روندے گئے تھے یا گوند اناغ گیا تھا۔

اگرچہ میں بری طرح تھک چکا تھا۔ مگر پھر بھی میں دوڑتا رہا اور سڑک پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے عقب سے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک بہت پرانی فورڈ تھی میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کار میرے قریب رک گئی مگر ڈرائیور نے میری ہیبت کڈائی دیکھ کر ناک سکڑی اور کار آگے بڑھا دی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا اور سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ چند منٹ بعد مجھے پھر پیچھے سے ایک تیل گاڑی آئی دکھائی دی جس پر سوچی گھاس لدی ہوئی تھی۔

”اگر تو بال جارہے ہو تو مجھے بھی لے چلو بابا“ میں بہت تھک گیا ہوں۔

”اچھا، اچھا۔“ وہ بولا۔ ”گھاس پر لیٹ جاؤ۔“

میں گاڑی پر چڑھ گیا اور اپنے آپ کو گھاس میں چھپا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆

ایک گھنٹے بعد میں نوپال پہنچ گیا۔ مہربان بوڑھے گاڑی بان نے مجھے شہر سے باہر ہی اتار دیا تھا۔ میں نوپال کی گلیوں سے گزرتا اور لوگوں سے





فوراً بول اٹھی: ”ٹھیک ہوں“ شاید میرے سر درویدہ کے پیش نظر وہ جواب کی توقع نہیں کرتا تھا۔ ایک دم بھونچکا ہو گیا۔

کمرے میں پھر سے خاموشی چھا گئی۔ بات کرنے کو جی نہ چاہے تو کیا گفتگو کرتی؟ وہ اٹھا: ”چلتا ہوں“ میں بیٹھی رہی۔ اس نے توقف کیا جیسے تکلفاً پوچھوں گی ”اتنی جلدی کیا ہے؟ تھوڑی دیر اور نہیں بیٹھو گے؟ پھر کب آؤ گے؟“ میں چپ رہی۔ جاتے ہوئے پلٹا، مجروح نظروں سے دیکھا، مجھے شرارت سمجھی، ابرو اٹھا کر آنکھوں کے کونوں سے پل پل بھی لگاؤ سے دیکھا کرتی تھی۔ اس کے لب، مسکرائے کی کوشش میں نیم وا ہوئے۔ ریشہ کھلی ہوئے لگا تھا کہ میرا رویہ پھر سرد پڑتے دیکھ کر گنیوڑ ہو گیا۔ غیر ہموار قدموں سے باہر چلا تو میں نے ماں کو آواز دی: ”اماں دروازہ بند کر لیتا“ اتنی مروت بھی نہ برتی کہ الوداع کہتی۔

دراصل میں اسے آنے سے منع کرنا اور روکنا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم ہے اب وہ کئی روز تک ادھر کا رخ نہ کرے گا۔ میں بھی چاہتی تھی۔ یہ نہیں کہ بڑا خوددار ہے، برا مان گیا ہوگا۔ نہیں، میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ جب بھی مہاراملا، وہ اکثر گیا۔ ہیری، بلاوا اور خوشامد چاہتا ہے۔ اماں کی خواہش بھی یہی ہے، کہہ چکی ہیں ”ہم نوکیں روکیں گے تو تمنا شے نہ گا“

دن ہو یا رات، گھر کے فرد کے علاوہ کوئی ہو، بھلے اپنے محلے کا ہو، اپنے شخص کی آمد و رفت پاس پڑوس والوں سے خفیہ نہیں رہتی بلکہ کھلتی ہے۔ دیواروں کے کان ہی نہیں ہوتے، آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ ذرا بات نکلی سب سے پہلے اسی کے گھر والے طوفان اٹھائیں گے۔ مجھے امید نہیں کہ یہ کوئی طوفان روک سکتا ہے؟ ایسا بدحو، بھولا یا غافل نہیں ہے کہ گھر والوں کے ذریعے پیغام بھجوانے کی رسم سے بے خبر ہوگا یا نہیں جانتا کہ بندھن کے بغیر دنیا عیب دھرے گی، الزام لگائے گی۔ نہیں، نہیں بودا اور ڈھیٹ ہے۔

کیسے ماں لوں رشتہ جوڑا تھا لیکن اس کی حرمت نہیں جانتا، بھانا نہیں آتا، انتظار کے بخور میں چھوڑ کر سر، تلوار لٹکا کر توقع رکھتا ہے، میں اس کے گیت گاتی رہوں گی؟ جب دیکھو آؤ بھگت کرانے چلا آتا ہے۔ کیوں؟ بے غیرت کہیں کا!

بجی آؤ میری آنکھوں کی نمی اپنی انگلیوں کی پوروں پر لے کر دوتی اور پیار کی حدت سے خشک کرو تو بتاؤں وہ کتنے کوئل اور آٹاؤں بھرے لمحے تھے جب دل میں ایک صورت بسائی تھی۔ شاید وہ عکس، وہ نقش بھی نہ مٹے لیکن طبع اتر گیا ہے اور وہ جو کچھ کچھ ہوتا تھا تن میں، من میں، رگ رگ میں، بالکل نہیں ہوتا بلکہ پورے بدن میں خطرناک سم پھیلنے لگتا ہے، جیسے میں تری احق، بے وقوف اور اندھی تھی۔ جی یہ بھی چاہتا ہے مر جاؤں یا مار دوں۔ میری تڑپن کا کوئی ایک رخ تو نہیں۔ ہزار زاویے ہیں۔ بھی دوتی بن کر محسوس کرتی ہوں شاید میں کھوئی تھی۔ نہیں ایسا کچھ نہیں تھا۔ میرے اندر بے غرضی بھی، خلوص تھا، پیار تھا پھر ٹھنڈے دل سے سوچتی ہوں کہ اندھے کوئیں کی منڈ پر بیٹھے رہنا فضول ہے، لا حاصل ہے۔ جتانے کا رتی بھر فائدہ نہیں؟ کوئی حق نہیں بنتا۔ کوئی مطالبہ نہیں ہے کہ مٹوانے کے لیے زور ڈالا جائے۔ ایک ہی راستہ دکھائی دیتا ہے کہ ہمت جمع کروں اور منہ موڑ لوں، دھکا دوں، تھارت سے اس کا غرور توڑ دوں۔ یہ بھی ہے چپ سا دھ کر، صبر کر کے اور تغافل برداشت کرتے کرتے ہرا دوں۔ اس کا یہ مغالطہ زور کر دوں کہ اس نے چاہت ہے نام پر ایک لڑکی کو فتح کر لیا۔ اماں بچ بچ میں مجھے پکا کرنے کے لیے ٹٹولی رہتی ہیں: ”لڑکی کمزور نہ پڑنا، ورنہ خوار ہوگی“ اماں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتیں۔

یار! کیا بتاؤں غلطی میری ہے۔ گھر والوں کو مجھ پر اندھا اعتماد تھا۔ اب بھی ہے شاید۔ سب کچھ میرے اوپر چھوڑا ہوا ہے۔ میں پاگل سی لڑکی خوش فہمی میں جلتا تھی۔ سدا یہی سوچا کہ یوں محبت چھانور کرتا ہے زندگی بھر کا سا بھی بنے گا۔ ہم دو فریق نہیں کہ

السیلات طے کرتے اور معاہدہ پکا کرنے کے لیے لگت پڑھت کرتے۔ جب کہا جی کہا ”میں تمہارا ہوں۔“ ان تین لفظوں میں کون سا ابہام تھا کہ جھوٹا ہوتی تحریر تھی۔

انسوس تو یہ ہے کہ اپنے پن کا ہر ٹٹھا بول مراب لالہ۔ یوں اتنے فریب کھائے، یارا! تم تصور نہیں کر سکتیں کہ آج میری گرفت میں، محبت کے نام پر، ایک بھی سچا لفظ نہیں ہے۔ کتنی خالی خالی ہوں۔ ایک لڑکی آس تھی، جس پر دن گزار رہی تھی۔

اگر اس روز میں نے شرارت سے اسے مغالطے میں ڈال دیا تو کیا ہوا؟

مجھے اقرار ہے، پہلے آتا تو دل دھڑکنے لگتا تھا، اب وہ نہ آئے تو سکون رہتا ہے۔ جب آتا ہے تو ہرے تن بدن میں غصے کا ابال اٹھتا ہے۔ میں جانتی ہوں کمزور فریق کو غصہ آتا ہے۔ میں اپنے اوپر قابو نہیں پاسکتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دل پر اختیار نہیں، وہ بس میں ہے۔ کمزوری یہ ہے کہ راستی دادائیاں یاد آتی ہیں تو چچھتاوے کی یلغار ڈھانے لگتی ہیں۔ ڈر ہے بھی وہ بھانپ نہ لے۔ اس لیے بہتر ہے کہ کشیدگی رہے اور دوری رہے۔ خیال کی پائیزگی قائم رکھنے کے لیے احتیاط گناہ تو نہیں؟

تمہیں بتاؤں اصل بھی کیا رہ گیا ہے؟ یہ کوئی بھتوں کی جنگ نہیں، اسٹش بدل گیا ہے۔ طبقاتی فرق درمیان میں دیوار بن گیا ہے۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ میں دیوڑھی کے دوسرے سال میں تھی کہ ابابا پرانج گرا۔ ان کی بیماری طویل پکڑی گئی۔ ملازمت چلی گئی۔ باری، معذوری کا سرکاری ہمتہ اتنا نہیں ملتا تھا کہ گھر ہوئی۔ ابابا، اماں اور میں ہی نہ تھے۔ چھوٹا بھائی اور دو بیٹیاں تھیں۔ ماریج تھا۔ ہائر پریچر پر گھریلو سامان کی دیکھیں تھیں۔ بیماری کی پرائیویٹ انشورنس تک نہیں تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پہلے اماں نے فیکٹری میں کام کیا لیکن ابابا کو ہر وقت ان کی ضرورت رہتی تھی، ان کی دیکھ بھال اماں ہی کر سکتی ہیں۔ وہ مجھ سے کوئی خدمت نہیں لیتے تھے۔

تم نے سنا ہوگا کہ بے کس معذور و عورت کو محلے والے بھی سنبھال لیتے ہیں لیکن بیمار مرد کی تنہا داری بیوی ہی کر سکتی ہے۔ وہی اپنے مرد کو بھگت سکتی ہے۔ دوسروں کے لیے دوجہر ہوتا ہے۔ آخر اماں نے کام چھوڑا اور گھر پر سلائی کرنے لگیں۔ بیٹا پرانا اچھا کرتی تھیں، کام سراہا جاتا۔ لک چھپ کر تھوڑا بہت کمالو۔ گھر میں دوسری مشین رکھتے ہی سیفٹی اور دوسرے قواعد بچ آنے لگتے ہیں۔ اماں نے زائد کام دو ایک عورتوں کو یا تو نیشنل انشورنس اور ٹیکس کے کئی مسئلے پیدا ہو گئے۔ وقت پر کام نہ ہوا، شرمندگی الگ اٹھانا پڑی۔ گاڑی ہمارے پاس نہیں تھی۔ لانے لے جانے کا مسئلہ بھی تھا لہذا سب کچھ بھول بھلا کر اماں دن رات کام میں جت گئیں۔ میں نے پڑھائی ترک کر دی تاکہ بھائی تعلیم مکمل کر سکے۔ اماں اب کو سنبھالتیں، سلائی کا کام بھی کرتیں اور میں بھائی، بہنوں اور گھر کے کام کاج کو دیکھتی۔ ایسے میں ہر کوئی ٹوٹا ہے۔ میں بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ سودا سلف یا کسی دوسری ضرورت سے باہر نکلتی تو دیکھنے والوں کو دُور ہی سے کھکی کھکی دکھائی دیتی۔ اس نے جب دو ایک بار آنکھوں آنکھوں میں ہمدردی جتائی اور پھر قریب آیا تو تعارف ہو گیا۔ صورت بھی کسی جھٹے ہوئے لوفر جیسی نہ تھی کہ بدگمانی ہوتی۔ جانتی تھی کہ محلے میں رہتا ہے۔ ہم سے چند گھر پرے، ذرا ڈھلان پر۔ یہ حقیقت تو اب ظاہر ہوئی کہ جناب اندر، بھیتر سے سیانے تھے۔ ایک خاص زاویے سے ایک ہی کرسی پر بیٹھا کرتے اور اپنے گھر پر نگاہ ڈالتے رہتے۔ ادھر ان کے والد گھر آئے، یہ جھٹ رخصت ہو گئے! دوسرا چکر یہ چلا کہ جیسے جیسے ہمارے برے دن آئے، ان کے یہاں خوش حالی آئی گئی۔ گروہری کی دکان پر اپنے ابا کا ہاتھ بٹاتے بٹاتے، شام کو کاج جاتے جاتے ڈگری لے لی۔ دکان پر گروہری خریدنے پر ویشل لوگ آتے جاتے تھے، باپ نے کہہ کر کر بیٹے کو ملازم کر دیا۔ میرے گھر والے پہلے سے زیادہ پرامید ہو گئے۔ پھر اس کا دوسرا بھائی، اس کے بعد بہن کام سے لگ گئی۔ چھوٹا



میڈیکل میں چلا گیا۔ کاروبار چمک اٹھا تھا۔ ساتھ کی دوپرا پرائیال کے کرسپر مارکیٹ بنائی گئی۔ اب تم اندازہ کرو اس میں کتنا عرصہ لگا ہوگا، میں ہی نہیں، میری اماں اور ابا بھی منتظر تھے، سمجھتے تھے کہ میرا رشتہ پکا ہے۔ ادھر رسی بنام آیا، فوراً قبول کر لیا جائے گا۔ والدین فرض پورا کرتے ہوئے لڑکی کو بیاہ دیں گے۔ رخصت کر کے بلکہوش ہو جائیں گے۔ ہم بھول گئے کہ ہمارے حالات بدستور خراب ہیں۔ میری تعلیم ادھوری کی ادھوری ہے۔ وہی چال بے ڈھنگی جو برسوں پہلے تھی، اب بھی ہے۔

میں سے شام کرنے والے کنبے میں کسی قسم کی فراغت کہاں ہوتی ہے کہ شروع میں ہی تول لیتی، اس کے ساتھ ڈیٹ پر گھومنے پھرنے جانی۔ چاند کو گواہ بنا کر بیان باندھے جاتے۔ ایک اُن بھی اس سبھی کوئی۔ میری دوشیزگی کے ارمانوں میں بندھی، گندمی کوئی تمنا ہوگی، جو ابا اماں پر بھی آشکار ہوگی چنانچہ بن بولے اس کی آمد رفت کو گوارا کرتے رہے۔ یہی سوچتے ہوں گے کہ ہماری لڑکی برف کی بنا ہے۔ اس میں شوخی نہ شرارت دے، پچھلے ہی لڑکا بھی تر ت ہارت نہیں۔ قدیم جہانکے دو، پچ وقت پر ایک ہو جائیں گے۔ کیا خبر بھی دیر بھی ہے، اندھیر بھی!۔

ننگدستی نے ہمارے سارے گھر کو سوس کر رکھ دیا تھا۔ چولہا جلنا تو میں ساتھ جلتی۔ خود ایک ایک سے لڑکھ کر گنتی کی روٹیاں پکائی تھی۔ گنتے کو یہی چپا تیاں تھیں، زرد جواہر پارو پیسہ پیسہ نہیں تھا۔ ادھر دن گتے بنا بیت گئے۔ بیٹتے چلے گئے۔ یہ اپنے گھر والوں کو لے کر نہ آیا۔ دونوں کنیوں میں تعارف تک نہ تھا۔ ایک طرف جانکاری تھی کہ ہم حملہ ہیں۔ بس..... ہماری آس کی بنیاد گنتی کمزور تھی، اب ہر گھڑی احساس کے پکڑے لگتے ہیں۔

میرے فرشتوں کو خبر نہ ہوگی کہ ابا جدا ہونے والے ہیں انہوں نے ایک روز بلا کر کہا ”بہنی! لڑکا بہت اچھا ہے، مگر ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں۔ ابا اگے چلے گئے پھر غور سے میرا چہرہ پڑھنے

لگتے۔ وہ بہت شریف ہے پر ہماری غربت کی وجہ سے ہمیں بغیر اعلان شریعوں کے طبقے سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ایسے سماجی فیصلے بدلنے کی ہمت مجھ میں نہیں۔ بہنی وہ تیری قسمت میں نہیں۔ میری بات پلے باندھ لے کر ایسے ہی شریف اور خاموش لڑکے بھر وسا کرنے والی لڑکیوں سے دفاع کرتے ہیں۔“ ابا کی آنکھوں میں گٹ گٹ آنسو بھر رہے تھے۔ آواز کپکپا رہی تھی۔ ”میرے بعد تجھ پر بہت سی ذمہ داریاں پڑ جائیں گی۔ بوجھ بڑھ جائے گا۔ بھائی کو جیسے تیسے پڑھانا، لائق بنانا تاکہ بڑھاپے میں ماں کا سہارا بنے۔ بہنوں کا رشتہ ضرور کرنا۔ بد قسمتی سے تو لنگ گئی ہے، دونوں چھوٹی بہنوں کو گھر نہ بٹھانا۔“ ایک محذور باپ بہنی سے کتنا کچھ کہے گا۔ میں سمجھ گئی، قدرت مجھ ہی سے قربانی مانگ رہی ہے!

مجھی اور جھنگلی ہوتی تو میں پہلے سے تھی۔ ابا کی باتوں نے عزم و ہمت کی نئی روح چھونک دی۔ سماج کے فیصلے نہ بدل سکوں، مزاحمت تو کر سکتی ہوں۔ زمانہ جتنے تیر چاہے، بعد شوق برسا لے۔ رہ کیا گیا ہے، جو چھد یا چمن جائے گا۔

ابا کے مرنے پر ہر کسی نے اخلاق برتا۔ ہمارے خاندان کے لیے یہی سہارا بہت تھا۔ اس کے گھر والے بھی آئے۔ ہمدردی کی، مدد اور تعاون پیش کیا مگر ہم تو مدت ہوئی اپنی ضرورتوں کو سمیٹ چکے تھے۔ دستور کے مطابق، پاس پڑوس سے دو قوتوں کی روٹی قبول کی۔ اس سے زیادہ ہوتا ہے، نہ کوئی کرتا ہے۔ اس کے گھر والے تین روز تک آتے رہے۔ تب سچ اندازہ ہوا کہ وہ دوسرے گھڑے کی مچھلیاں ہیں۔ وہاں ضد، زور اور زر کی ریل چلے ہے۔ بہت سی درون خانہ باتوں سے پردہ اٹھا۔ ایک بہن مجھ سے زیادہ مانوس ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ ہمارے بھائیوں کے رشتے تو وطن کے اونچے خاندانوں میں تقریباً طے ہیں۔ بڑے بھائی یعنی ہمارے امیدوار پر ایک سابق وزیر جن کی دولت کا اندازہ مشکل ہے۔ بہت مہربان ہیں۔ لڑکوں کے رشتے اچھی جگہوں

ہو گئے تو پھر لڑکیوں کی شادی بھی بڑے گھروں میں آسانی سے ہو جائے گی۔

یہی وہ گھڑی تھی، جب میرے قلب و ذہن میں کمزورت جاگی اور دل برا ہوا۔ میں نے رو برو کہا کہ گھر والوں سے رشتہ ڈھواؤ ورنہ اب یہاں نہ آیا کرو۔ اماں کی موجودگی میں کچھ بھی قصہ نت نئے لے بیٹے، جھگڑے میں بدلنا گیا۔ پچھلے دنوں اس کے منہ سے نکل گیا میں گھر والوں کو راضی تو کر رہا ہوں، کوشش ہی کر سکتا ہوں، انہیں چھوڑ تو نہیں سکتا۔ میرا دماغ بھٹنا گیا، ترخ کر کہا: ”ہمیں تو چھوڑ سکتے ہو، چھوڑ دو۔“ اماں نے ذرا رसान لہجے میں کہا ”اب ہاؤ، تو نے توئے ہونے سے پہلے، عزت خاک میں ملنے سے پہلے، دونوں اپنی اپنی راہ لو۔ میری بھولی اور معصوم بہنی تمہاری آس پر بیٹھی رہے۔ اچھا رشتہ آنے کی اس کی عمر تو تقریباً نکل چکی، خدا خواستہ بدنامی ہوئی تو دونوں چھوٹیوں کے لیے مشکل پڑ جائے گی۔ تمہارا کیا کیا جائے گا؟

اماں نے اپنا فیصلہ سنایا ہے کہ اب آیا تو وہ اس کی ماں سے جا کر ملیں گی۔ محلے میں سے دو چار کو ساتھ لے کر جائیں گی۔ آخر کو لوگوں سے اس کی آواز چھپی تو نہیں۔ پڑوسیوں کو ہم پر بھر دوسا ہے۔ اس لیے کسی نے ہم پر حرف نہیں رکھا۔ ہماری شرافت کا اعتماد کیا جاتا ہے۔ اماں کا خیال ہے اب نہیں آئے گا۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں اب نہ آئے۔ اس نے رات کی تو اماں نے جیسا کہا ہے، وہی کریں گی۔ میرا ابا بھی یہی خیال ہے کہ اس کے نو دو لیتے والدین بھی اس میں مانیں گے۔ وہ اپنے لڑکے کو قابو کر لیں گے۔

اماں نے مجھ سے پوچھا: ”لڑکی! بعد میں کمزور نہیں پڑے گی؟ اپنی زندگی کا فیصلہ بھی کو کرنا ہے۔ مجھے ابا یاد آگئے۔ مجھے کیا فیصلہ کرنا ہے؟ میری زندگی کا فیصلہ تو بے رحم سماج کر چکا ہے۔ ایک بات میں آج تک نہیں سمجھی کہ آخر وہ آتا کس برتے پر تھا۔ میں کس آس پر اسے برداشت اور گوارا کرتی

ہوں؟ اگر اسے محبت کہتے ہیں تو دھوکا اور فریب کے

کہتے ہیں؟ خود مغالطے میں پڑ دیا دوسرے کو محل دو۔ بات تو وہی ہے کہ خبر بڑے پر چھری کرے یا چھری پر خبر بڑو!

میری یار، دلدار اتم بہت پوچھتی رہی ہو۔ سن لو، ذرا جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں آج کی لڑکی ہوں۔ چھوٹی عمر سے مخالف حالات سے لڑ رہی ہوں۔ بہت اونچ نیچ دیکھی ہے۔ نظر نظر کو بھانپنا آ گیا ہے۔ یقین کرو مجھے سکون اور چین پانے کے کئی آسان راستے بھائے گئے۔ درغلانے والے بھی بہت تھے۔ محنت کے بدلے آرام اور دکھ کے بدلے سکھوں کے بڑھیا سنے دکھائے گئے تھے مگر میں نے اپنے باپ کی قناعت دیکھی تھی۔ اپنی ماں کی سخت کوشی اور ان کے اندر بچوں کے لیے پہاڑ اٹھانے کی ہمت سے واقف ہوں۔ یہی سیکھا ہے کہ سر بلند رکھو۔ جھکو نہیں۔ بھوکا رہ کر مرنے میں ایک وقار ہے جبکہ جو ٹھل، نہایت مرغین کھاٹوں سے پیٹ بھر تو جاتا ہے مگر روح مر جھاتی اور صحت کھو گئی ہو جاتی ہے۔

اگر کسی کے پاس شعور ہے، ضمیر ہے، غیرت ہے تو غربت ہی اس کی ڈھال بن جاتی ہے۔ غربت ہی دنیا کا سب سے بڑا استاد ہے۔ بہترین استاد اور اتالیق..... اور یہ جو محبت میں پھول جڈیوں اور نازک احساسات اور بے غرضانہ دوسرے پر نثار اور قربان ہو جانے کا ذکر ہوتا ہے، میں اس حوالے سے دل کو شیشہ نہیں مانتی۔ یہ کا سچ کا بتانا نہیں ہے کہ ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا۔ چور چور ہو گیا۔ ذرا سی آج لگی اور پھل گیا۔

جذبات سے مغلوب ہونا، ایک بات ہے اور عقل و عمل سے جذبات کو مغلوب کرنا، اس سے زیادہ اہم ہے۔ ایسا نہ ہو تو عزم و ارادہ بے معنی اور کاغذ پر محض آڈی تر جھی لکیریں بن کر رہ جاتا ہے۔ تم دیکھنا، میں دل کو پل دوں گی اور جی کر، زندگی کر کے دکھاؤں گی۔







ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عابدہ نے اب کے خود کو سنبھالا اور غور سے سامنے بیٹھے شعیب کو دیکھا جو، اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ چہ فٹ ایک انچ قد، کشادہ سینے، لمبے مضبوط بازوؤں اور مردانہ وجاہت سے بھرپور یہ شخص..... اسے اس پہل کس قدر حقیر اور پست لگا۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ.....!!!

### ایک ٹکھن فیصلے نے اسے سر بلند کر دیا

**دریچے** کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور کمرے کے اندر جتنا اندھیرا تھا، اتنا باہر ڈور کھلی فضا میں بھی تھا۔ بارش تھمے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور غضبناک ہوا کے تیز جھونکے، ٹکسل سے اندر آرہے تھے۔ فضا میں تازگی، فرحت اور راحت کا جال فزا احساس تھا۔ اس سے تو ہر دل کھل اٹھتا ہے۔ سب کو ایک سرشاری آتی ہے۔ اندھیرا بھی خوبصورت لگنے لگا ہے کہ برسات کے اندھیرے کا اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ بجلی جانے سے، جو بارش کے پہلے چھینٹے کے ساتھ ہی، حسب معمول غائب ہو چکی تھی، اندھیرا کچھ اور گہرا ہو چکا تھا۔ ورنہ کم سے کم کئی کوچوں اور مڑوں کے کھمبوں ہی کی، کچھ سہی روشنی تو ہوتی مگر اس وقت صرف اندھیرا تھا۔ بھرا اندھیرا.....! ہوا کی سیائیں سائیں کے سوا، کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور عابدہ..... اکیلی، تنہا، تنہی تنہی ہی زندگی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے، جس کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے، درتچے کے سامنے اس کے نیچے تختے پر دائیں ہاتھ کی ہلکی سی ٹیک لگائے، دیر سے یوں اندھیرے میں دیکھ رہی تھی، جیسے اپنی قسمت کے ستاروں کو تلاش کر رہی ہو۔ آتسو تو کبھی اس کی پگلوں تک آتے نہیں تھے۔

نہیں، صرف عذرا کی طرف ہی ملتفت رہتے ہیں۔ اسی کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ مجھے دن رات میں صرف ایک بار پوچھنے آتے ہیں ورنہ وہ بھی نہیں، صرف ایک دن جب پہلی بیوی عذرا نے کہا، اس عورت کو زیادہ لفٹ مت دو۔ یہ کہتے ہوئے وہ بالکل مختلف اور بھیا تک سی آواز، شکل اور لہجے کی لگی تھی اور شعیب اس سے زیادہ..... اس لمحے اس نے سوچا کہ آخر ایسا کیوں ہے، پڑھ لکھ کر انسان کی فکر و نظر تبدیل ہو جاتی ہے مگر یہاں معاملہ ہی دوسرا ہے۔ شاید اسی وجہ سے دوسری شادی کی مخالفت کی جاتی ہے مگر سوال یہ تھا کہ پھر وہ خود کہاں جاتی اور کیا کرتی۔ ابا کو رخصت ہوئے دو سال ہو گئے تھے اماں نے تو پلنگ ہی پکڑ لیا تھا۔ اگر تھوڑی بہت آمدنی کا وسیلہ نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔ بس اسی دوران شعیب کا رشتہ آ گیا۔ بڑھا لکھا، معقول عہدے پر فائز، گاڑی، اپنا تین منزلہ گھر، دو ذاتی ملازم..... اور کیا چاہیے ایک لڑکی کو، وہ بھی ایسی جس نے باپ کی زندگی میں بھی کوئی سکھ کم ہی دیکھا ہو۔ سچ ہے، دولت، سارے میبوں کا پردہ ہوتی ہے۔ بس یہی بات تھی کہ بہت سارے خیر خواہوں کے دے اور کھلے الفاظ میں انتباہ

اور خود اس کی چند ایک بہت قریبی سہیلیوں کی کھلم کھلا جھاڑ پھینکا رکے باوجود..... وہ ایک دن شعیب کی..... پہلے سے شادی شدہ شعیب کی، ایک عدد ایڈوانس سولن کی مالکن بن کر شعیب کے گھر آ گئی تھی۔ وہی طور پر اس نے خود کو اس بات کے لیے بالکل تیار کر لیا تھا کہ شعیب پہلی بار منہ دکھائی میں چاہے کچھ بھی دے، لیکن ایک بات ضرور کہے گا اور وہ یہی بات تھی، جس کے ہوتے ہوئے سب نے مخالفت کی تھی، ایک مرحلے پر اماں بھی ڈگمگانے لگیں لیکن پھر اپنی اور اس کی حالت دیکھ کر ڈگمگاہٹ ختم گئی اور یوں اس کی کشتی شعیب کے ساحل سے آگئی تھی۔ آگے کیا ہوتا تھا۔ یہ بتانا شاید اتنا ضروری نہیں رہا تھا۔ اندیشے، کوئی کبھی ہوں، کچھ بھی ہوں، عمو اماں کی کوئی بنیاد کوئی پس منظر ضرور ہوتا ہے۔ پھر عابدہ جیسی لڑکی، جس نے زندگی ایسے ماحول میں گزاری تھی جو کسی کو کبھی وقت سے پہلے علم و شعور اور فہم سے آراستہ کر دیتی ہے مگر دوسرا راستہ کیا تھا؟ آگ کی مانند بھڑکتی لالچ کی آگ..... جیسے لوگوں کو لڑکی نہیں، گاڑی، بجلے اور بینک بینکس سے شادی کرنا ہو..... اور ابا میاں چھوڑ کر کیا گئے تھے۔ ایمانداری اور





دیانت سے نوکری کرنے والے کے پاس چپتا بھی کیا ہے۔ ایسے میں اگر شعیب کا رشتہ آگیا تھا اور کھلی کھلی شرانڈ پر رشتہ طے ہو گیا تھا اور اس نے سر جھکا کر اپنا مقدر سمجھ کر مان بھی لیا تھا کہ ایسے معاملات میں درحقیقت شرانڈ بھی کچھ نہیں ہوتیں، صرف اسے معاہدے پر دستخط کرنے تھے، سو اس نے کر دیے۔ اب شکوہ و شکایت درحقیقت اس امر کا اعتراف ہوتا کہ وہ خودیے وقف تھی، عاقبت اندیشی اسے چھو کر نہیں گزری تھی لہذا اب وہ ایلا کیا!

شعیب نے پہلی رات اسے منہ دکھائی کا ہار پہنا کر پہلی بات کسی محبت بھرے جملے، دل پر ٹھنڈی پھوار سانے والے فقرے یا اس کے دامن کو سونے چاندی نہ سہی، پھولوں سے بھر دینے والی بات سے نہیں، اس جملے سے کہ تھی کہ عابدہ! تم بلا شہاب میری بیوی ہو، مجھ سے تمہارے حق کے لیے جو ہو سکا، کروں گا لیکن صاف صاف سن لو، میری پہلی اور آخری محبت صرف اور صرف عذرا ہے۔ اس کے سوا کسی عورت کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا، تم کو ضرور عزت اور محبت دون کا ممکن ہے کہ میرے دل میں تمہارے لیے بھی کوئی جگہ پیدا ہو جائے۔ بس مجھے اولاد کی ضرورت ہے اگر تم یہ کر سکو تو.....! شعیب نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

اگر وہ پہلے سے اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتی تو اس کے سہاگ کی پیچ، شعلوں کا کفن بن جاتی، پھر بھی بت بنی، سب کچھ سہی رہی۔ آنسو اس نے پہلے ہی روک لیے تھے۔ اس لمحے وہ کسی کمزوری کو ظاہر نہیں کرتا جانتی تھی۔ تو اس کی حیثیت صرف اتنی تھی کہ وہ شعیب کے لیے بچہ پیدا کر دے۔ بچہ پیدا کرنے کی مشین..... انکو بیڑا!

کیا وہ صرف بچہ پیدا کرنے کے لیے لائی گئی تھی۔ یہ اس سے اچھا تھا، شعیب کی اور عورت کو اٹھالاتا، جو اس کی مرضی کے بچے پیدا کرتی۔ وہ اس کے ساتھ جو چاہتا، سلوک کرتا۔ مگر عابدہ ہی کیوں؟ شعیب..... شعیب بے حد چالاک شخص ثابت ہوا

تھا۔ اس نے ڈھونڈ کر ایسی لڑکی تلاش کی تھی، جو اگر چاہے بھی تو اس کی مجبوریاں چھوڑنے نہ دیں اور وہ آہ و فغاں بھی نہ کر سکے اور اس کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ اس صورت میں اسے قابو میں رکھنا مشکل نہیں ہوتا اور بالکل سہی ہوا تھا اور ہو بھی رہا تھا۔ عابدہ کھلے در پیچھے سے دور اندھیرے میں دیکھتی، یہ سب کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ شعیب کی خود غرضی، بے اعتنائی، لا پرواہی، اور عذرا کی تابعداری، ہر وقت وہ اس ہی کے کمرے میں گھسا رہتا۔ نہ آفس جاتے وقت خیریت پوچھتا، نہ واپس آکر دو گھڑی اس کے پاس ٹکنا..... اماں بچاری تو دم کشیدم، تمہیں۔ مارے پچھتاوے کے ان کے منہ سے کچھ نکلتا ہی نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی مرحومہ بہن کی روح سے اور سامنے اپنی بہو سے جو، ان کی سگی بھانجی تھی، شرمندہ ہوا کرتیں۔ عابدہ بنیادی طور پر نہایت صاف ستھری، سلیبی ہوئی، سمجھ دار اور سعادت مند تھی۔

وہ ایک ایک بات جانتی اور سمجھتی تھی۔ خالہ کی شرمندگی، شوہر کی کمینگی، خود غرضی اور بے مروتی، سوکن کی آگ برسانی حاسد نظریں اور اس کی زبان پر صرف ایک چپ تھی اور یہ چپ ہزار نہیں، لاکھ باتوں کا جواب تھی۔ اسے صرف ایک دن کا انتظار تھا۔ جب قدرت حرکت میں آئی ہے اور اس وقت ناممکن بھی، ممکن ہو جاتا ہے۔ ادھر اماں بی، اس کی ہلدی ہوئی رنگت اور کھلے بدن کو دیکھ کر ہلکان ہوتیں۔ کہیں میرے پیچھے اس کو کچھ نہ ہو جائے۔ شعیب کا تو خون سفید ہو گیا ہے، ارے لایا ہی کیوں تھا۔ وہ بڑبڑاتیں۔ عابدہ ان کو پچ کر دیتی، بس چپ ہو جائے۔ ایک دن اللہ تعالیٰ میری بھی سنے گا۔ شعیب میری طرف آئیں گے۔ اماں بی بلبل کر رہ جاتیں۔ عذرا کے ایک ایک انداز و اطوار سے سوکنا یا کے سوا کچھ جھلکا ہی نہیں تھا اور شعیب کو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔!

☆.....

وقت اپنا رنگ بدلتا ہے۔ ایک وقت وہ آیا، جب اسے خود یقین نہیں آیا تھا لیکن اماں بی اسے لیدی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ لیدی ڈاکٹر نے تصدیق کر دی۔ اماں بی کو مبارک باد دی کہ وہ دادی جان بننے والی ہیں۔ ان کی جو گود، عذرا، شادی کے سات برس میں بھی نہیں بھر سکی تھی، عابدہ، تیسرے برس ہی میں بھرنے والی تھی۔ آخر خدا کو اس کی پے لہانی، بے بسی، بے کسی پر ترس آ ہی گیا تھا اور واقعی اس کی دعا میں سن لی گئی تھیں۔ شعیب کو معلوم ہوا تو پہلے اسے یقین نہ آیا، جب آیا تو گھر میں ہنگامہ ہو گیا۔!!

عابدہ کو امید تھی کہ شعیب اب سہی، اس کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اپنی توجہ، محبت اور وقت میں سارا نہیں تو کچھ حصہ اسے بھی ضرور مل جائے گا۔ آخر وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ شعیب اب اس حد تک تو بدلا تھا کہ آتے جاتے اس کی خیریت پوچھتا اور اپنا خیال رکھنے کی ہدایت کرتا۔ یہ وہ ضرور جانتی تھی کہ دراصل وہ اس کے لیے نہیں، اس سے پیدا ہونے والے بچے کے لیے کر رہا ہے ورنہ کبھی اس نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کیسی ہو، بنا تو نہیں ہے۔ تم اتنی دبی اور پٹی کیسی ہو گئیں۔ اب..... شاید اب سہی..... اس نے پوچھا تھا اور اب ننھا شہزاد اس کی گود میں آیا تھا تو وہ اسے سارے کھلے ڈھک بھول گئی تھی۔ سارا گھر خوشی سے بھر گیا تھا۔ اس نے جانتی آنکھوں جتنے سینے دیکھے تھے، سب حقیقت بن کر سامنے آنے لگے لیکن یہ شیش محل تھا اور اس کے چٹنا چور ہونے کے لیے صرف ایک پتھر کا ٹی تھا اور شعیب نے تو پوری چٹان لڑھکا دی تھی۔ اس روز خلاف معمول وہ دیر تک اس کے کمرے میں رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کچھ خوش اور کچھ خوفزدہ سی ہوتی رہی تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ ایک مدت بعد سہی، شعیب نے اسے اتنے وقت ساتھ دیا تھا۔ ڈر..... ایک نامعلوم موبوم سے خدشے کا، پھر شعیب نے مخاطب کیا: عابدہ..... میں مانتا

ہوں کہ تم نے مجھے بیٹا پیدا کر کے دیا اور ہم سب کی سب سے بڑی تمنا پوری کر دی، جس کا ہم سب کو برسوں سے انتظار تھا۔! شعیب پل بھر کوڑکا، اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں! خدا جانے یہ کیا کہنے کو ہیں؟ میں اب ان کے لیے اس سے بڑھ کر کیا کر سکتی ہوں، پھر کوئی امتحان؟

شعیب اس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر بولا:

”دیکھو شہزاد ہم سب کا ہے!“

وہ بے اختیار بول اٹھی: ”جی ہاں ہم سب ہی کا ہے..... اللہ اسے سلامت رکھے اور آپ کو خوشیاں دے!“ اس کا گلہ اندہ سا گیا اور وہ چپ ہو گئی۔

شعیب نے بڑے اطمینان سے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا:

”دیکھو..... شہزاد کو عذرا، بہت چاہتی ہے، تمہاری گود تو بھر گئی، اس کی اب بھی خالی ہے، اب تم ایک کام اور کرو، شہزاد کو عذرا کی گود میں ڈال دو، ہمیشہ کے لیے، آخراں کو بھی اپنی گود بھرنے کا حق ہے۔!“

اس فرمائش پر حکم پر چند لمحے تو وہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ شعیب نے اسے کیا کہا ہے اور جو کہا ہے، اس کا کیا مطلب ہے، جب سمجھ میں آیا تو وہ آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھتی رہ گئی:

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!“ اس کے سوال اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا تھا۔

”ہاں!“ شعیب نے سخت زور کے اور بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہا: ”میں نے جو کچھ کہا ہے، بالکل سادہ اور آسان زبان میں اور طبعی واضح طور پر کہا ہے۔ اگر کہو تو دوبارہ دو ہزاروں، تم اتنی خود غرض ہو کہ یہ نہیں سوچتیں کہ بچے پر صرف تمہارا نہیں، عذرا کا بھی حق ہے، میں چاہوں تو زبردستی شہزاد کو چھین کر عذرا کو دے سکتا ہوں لیکن بہتر ہے کہ یہ کام تم خود کرو۔!“

عابدہ نے اب کے خود کو سنبھالا اور غور سے



سامنے بیٹھے شعیب کو دیکھا جو اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ چھٹ ایک انچ قد، کشادہ سینے، لمبے مضبوط بازوؤں اور مردانہ وجاہت سے بھرپور یہ شخص..... اسے اس بل کی قدر تھی اور پست لگا۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ دفتر میں نہایت ذمے دار عہدے پر فائز، صاف سحرے اور شاندار ملبوس میں لپٹا ہوا، بات بات پر ہنسنے اور ہنسنے لگانے والا، اعلیٰ چوکن بننے والا..... یہ شخص اندر سے کس قدر غلیظ، کتنا بددور اور کس قدر گھلیا ہے۔

”میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے تو اس پر عمل کرو۔“

شعیب تو گویا اسے کچھ کہنے سننے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتا تھا، اس نے ایک مرتبہ پھر نظر اٹھا کر شعیب کی طرف دیکھا تھا، وہ تو یوں کھڑا تھا، جیسے اس نے، اس سے بیٹھا نہیں، میک آپ کا بیکس مانگا ہو، اپنی پہلی بیوی کے لیے۔ گہری اور بھیا تک خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ اچھا ہوا، جو اس دوران شہزادہ پنکھوڑے میں گہری نیند سوتا رہا، ورنہ شاید وہ خود پر قابو نہ رہ کر پانی، اسے بھی احساس ہو چکا تھا کہ آقا اور باندی کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہوا کرتا۔ وہ اس کی منکوحہ ضرور تھی لیکن اس کی حیثیت صرف اتنی تھی کہ اسے شعیب کے لیے ایک بچہ پیدا کر کے دینا تھا۔ اس کے بعد اس کا کام ختم۔ اب اس کا کیا بننا ہے اور وہ کیا کرتی ہے، کہاں جانی ہے۔ یہ سب کم سے کم شعیب کا درد نہیں تھا، اسے اگر فکر تھی تو صرف عذرا کی اور صرف عذرا کی..... اور یہاں سے نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ دنیا کے بازار میں ہر دکان پر کھتی اور شاید اپنے بچے کی صورت دیکھ بھی نہیں پائی۔ واپسی کا دروازہ، وہ رکھتی ہی نہیں تھی کہ اماں کے مرنے کے بعد وہاں کچھ اور لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ تو ابھی تک اس پر عیاں نہیں تھا کہ اس میں بھی شعیب کا ہاتھ تھا اور اس کے عوض اس نے بہت کچھ کمایا بھی تھا اور ابھی اس کی اپنی عمر کتنی تھی۔ بائیس برس، بھرپور جوان

اور خوش شکل لڑکی۔ کوئی اسے بچے کی ماں نہ سمجھتا..... ایک راستہ تھا اور وہ صرف اسی گھر میں لوٹ کر آنے کا تھا اور نکلنے کا کوئی نہیں تھا، اس نے گہری سانس لی۔

”جی اچھا!“ اس نے اس طرح کہا جیسے اسے خود یقین نہ آیا ہو کہ اس نے کیا کہا ہے۔ شعیب صرف اس ”جی اچھا!“ سے مطمئن ہونے والا نہیں تھا: ”کھل کر بولو کہ تم اسے بالکل سے عذرا کو دے رہی ہو۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں رہے گا۔“

اس کے حلق میں جیسے گولہ سا انگ گیا، وہ چیخنے لگا، صرف آنسوؤں سے رونے کے لائق بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے شعیب کو دیکھا۔

”شعیب صاحب! تم اتنے بڑھے لکھے اور اعلیٰ منصب کے حامل آدمی ہو اور بیوی کو..... اس بیوی کو، جس نے تمہیں بیٹا جن کر دیا ہے، وہ وقعت بھی نہیں دے سکتے، جو کوئی جاہل گولا اپنی گائے بھینس کو، بھیڑ بکری کو دیتا ہے کہ اس سے پیدا ہونے والے بچے کو اس کے ساتھ رکھتا ہے، الگ نہیں کرتا، ایسی ہی بات تھی تو تم اس بازار کی کوئی عورت اٹھالو، ورنہ لاکھوں اور بھی سہیم اور بے سیارا ہیں، کسی کو گھر میں ڈال لیتے، کیا میں ہی رہ گئی تھی، جو تمہارے اپنے خاندان کی ہے، صرف اس لیے کہ میرے اوپر کسی کا آمرانہ..... سوائے اس کے، جو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔“

وہ یہ سب صرف سوچ کر رہ گئی۔ کہا ایک لفظ نہیں۔ شعیب نے دوبارہ سخت لہجے میں کہا تو اس نے آہستہ سے سر ہلایا: ”ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی!“ شعیب نے جھپٹ کر پنکھوڑے میں سوئے ہوئے شہزادہ کو اٹھایا اور لے کر دوڑ پڑا اپنی بیوی عذرا کے کمرے کی طرف..... اس نے پلیٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کے نکلنے سے پہلے عابدہ ہوش سے بیگانہ ہو چکی ہے۔

☆.....

یہ بات جانتے سب ہیں لیکن مانتے اتنے ہی

کم ہیں کہ جب قدرت حرکت میں آ جاتی ہے تو پھر وہ کچھ ہوتا ہے، جس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ سب کی تدابیر بڑی اور ہوشیاریاں دھری رہ جاتی ہیں اور یہ سب کچھ اس قدر تیز رفتاری سے ہوتا ہے کہ انسان کے لیے کچھ کرنے کو راستہ، مہلت، موقع ملتا ہی نہیں!

برسوں سے جس کی گود میں ایک بھی پھول بھی نہیں کھلا تھا، اچانک ہی قدرت نے اس کی گود بھرنے کا اہتمام کر دیا۔ یہ بھی شعیب کے لیے اتنا ہی ناقابل یقین تھا، جتنا عابدہ کے حوالے سے تھا۔ عذرا تو خوشی سے آدمی باہل ہو چکی تھی۔ میڈیکل بیک آپ سے جب بالکل تصدیق ہو گئی تو عذرا بالکل بستر کی ہو گئی۔ حالانکہ لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بالکل بستر پر بڑ جائنا بھی صحیح نہیں ہے۔ لیکن شعیب نے ایک نہیں سنی تھی اور اسے زبردستی بستر پر ڈال دیا تھا۔ اس دوران ہی اماں بہت خوش تھیں، وہاں عابدہ کو دونوں نے نظر انداز کر دیا تھا، جس نے ان دونوں کی خوشی کے لیے اتنی بڑی قربانی دی تھی، جس کا اندازہ اگر اسے شادی سے پہلے ہوتا، تو وہ عمر بھر بین بیاہی رہتی، مگر شادی نہیں کرتی، لیکن اب تو سب کچھ ہو چکا تھا۔ اسے خوشی اور غم دونوں نے معنی کھنڈے لگے تھے، ہاں..... اس خبر کے بعد ایک ملائی سی کرن دکھائی دینے لگی تھی۔ اب..... شاید اب شعیب کو خیال آ جائے اور وہ اس کے بچے کو واپس لوٹا دے۔ بلاشبہ شہزادہ اس کا اپنا بچہ تھا لیکن اب تو وہ اسے بس زور سے دیکھ سکتی تھی صرف کبھی کبھی ہاتھ لگا لیتی۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ بچے کو یہ باور کروانا مقصود تھا کہ اس کو پیدا کرنے والی عورت عذرا ہے، عابدہ نہیں۔ عابدہ کی حیثیت تو اب ایک آیا جتنی بھی نہیں تھی۔ دونوں میاں بیوی سر سے پاؤں تک اگر کسی چیز سے بے ہوش تھے تو اسے خود غرضی کے سوا، کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ عذرا کی شکایت بے جا تھی۔ وہ تو کبھی سوگن۔ اوپر سے بے اولاد، تیسرا مسئلہ یہ

بھی تھا کہ وہ ظاہر ہے کہ عمر میں عابدہ سے بڑی تھی۔ خوبصورتی کی بات بالکل الگ ہے۔ عابدہ اپنی معصوم صورت، پاکیزہ فطرت اور کم سنی کے سبب جس خدا داد دلکشی سے آراستہ تھی، وہ شعیب کو نظر بھی آتا تھا تو عذرا سامنے آ کھڑی ہوتی، پھر اس کا بھرا پڑا امیکہ.....!! شہر کے پوش ایریا میں مقیم امیکہ.....!

اسے اب شعیب کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ صرف اپنے بچے کی ضرورت تھی، جو اس کا ہوتے ہوئے، اس کا نہیں رہا تھا، اس سے چھین لیا گیا تھا، اسے اپنے بچے کو اپنا دودھ پلانے سے بھی محروم کر دیا گیا تھا، گود میں لینے سے بھی روک دیا گیا تھا۔ ہر حق چھین لیا گیا تھا، یہ ظلم کی آخری حد تھی، جہاں تک دونوں میاں بیوی جاسکتے تھے اور وہ اسے بھی پار کر گئے تھے۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ اس حد کے بعد قدرت اپنا کام شروع کر دیتی ہے، پھر بندے کو فرار کا راستہ بھی نہیں سوجھتا۔

نوماد پورے ہو گئے۔ عذرا نے بھی پھول سے بچے کو ختم دیا۔ شعیب کی خوشی کا اندازہ نہیں تھا۔ اماں بی کھلی ہوئی تھیں۔ ان کا بھی دراصل یہی خیال تھا کہ اب ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہو گئے ہیں۔ اب شعیب انصاف کی تول، تولے گا۔ حقدار کو اس کا حق اور پورا حق دے گا۔ عابدہ کو اس کا بچہ واپس کر دے گا۔ اب، عذرا بیک وقت دودھ شیر خواروں کو سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔ اب صرف اپنے بچے پر دھیان دے گی تو عابدہ کے بچے سے اس کا دھیان ہٹ جائے گا۔ عابدہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی کچھ تو تلائی ہو جائے گی..... لیکن قدرت کا منصوبہ دوسرا ہی تھا۔

فرہاد کی پیدائش کی خوشیوں کے ہنگامے ابھی ختم نہیں تھے کہ اچانک وہ بیمار پڑ گیا۔ خدا جانے کیا ہوا تھا۔ دو تین دن کا تیز بخار اور پھر شہر کے مہنگے ترین جائلڈ اسپیشلسٹ کا علاج بھی اسے نہ بچا سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے، عذرا کی گود آجڑ گئی۔ شعیب سکتے



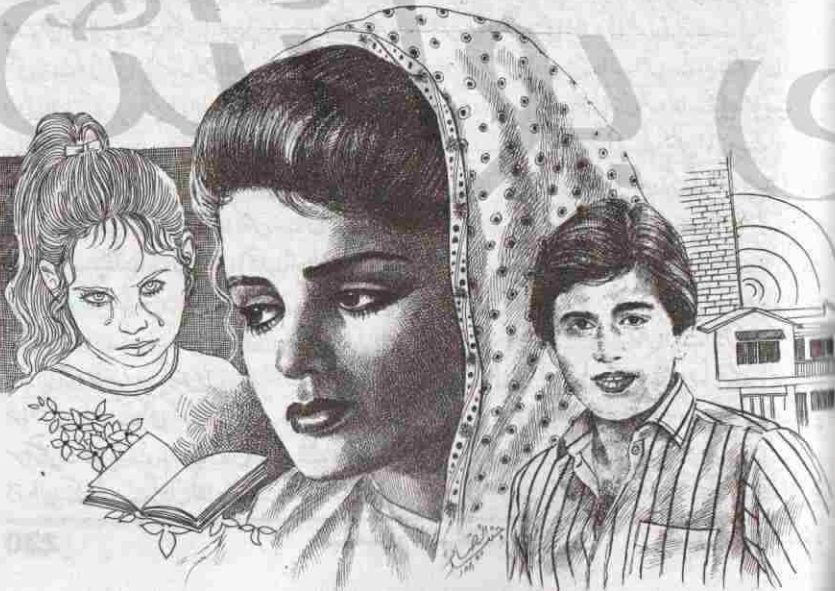
بیدم سیف آبادی

تو پھوپھی کی بات کا جواب ہی گول کر دیا تھا۔ وہ ماضی کے اس لمحہ کو بالکل بھول چکے تھے اور بیٹی کے لیے کسی اچھے اور دولتمند رشتے کی تلاش میں تھے لیکن پھوپھی کا خط ملتے ہی نہ جانے کیا ہوا، ان کے دماغ نے ایک دم ہلٹا کھایا اور انہوں نے بس فیصلہ کر لیا کہ اگر میٹروک میں تین دفعہ فیل ہونے والے اس بھانجے کو انہوں نے بیٹی نہ دی تو.....!!

انا کے ہاتھوں نسل نو کی پامالی کی کہانی

خوف سے، وہ سب ایک دم سے غائب ہو گئیں، پھر جب ابا کمرے کی بجلی ان کو تھما کر فیکٹری چلے گئے تھے، تو انہوں نے اسے آزاد کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جلدی جلدی پراٹھے بنائے تھے اور بڑے چاؤ سے بیٹی کے لیے ناشتہ لے کر آئی تھیں لیکن جیلہ نے ناشتے کی ٹرے کو نظر انداز کر کے غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے سوچا تھا کہ اگر اس کو آزادی ملی

اور اس نے باپ کے حکم کے آگے آخر سر تسلیم فرم کر ہی دیا۔ پھر گویا جس بے جا کے دروازے ایک دم سے وا ہو گئے، اُن دیکھی پھٹکیاں کھل گئیں اور بیڑیاں ٹوٹ کر گر پڑیں۔ کم سے کم اماں کو تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ جیسی تو، ان کے چہرے پر جو اتنی لکیریں پڑ گئی تھیں، فکر و تردد سے، اندیشوں سے،



انتقام لے گی اور مجھے اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔ شعیب تو اتنے شرمندہ ہیں کہ تمہارے کمرے میں نہیں آ رہے..... لو اپنا کچھ سنبھالو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ ہمیں بھی معاف کر دے، تمہارا بچہ تمہیں مبارک!۔“

عذرا! آنسو بہاتی اٹھنے لگی تو عابدہ نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا:

”عذرا..... شہزاد میرا نہیں، تمہارا ہی بیٹا ہے، تم بے شک اسے اپنے پاس رکھو اور پالو، مجھے صرف اس سے ملنے دو، مجھے اسے اپنا دودھ پلانے دو، یہ میرا حق ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی، تمہاری گودا جڑی ہے تو میں دوبارہ نہیں آ جاؤں گی، بس شہزاد اور شعیب میرے سامنے رہیں، مجھے اس سے زیادہ اور کیا چاہیے، وہ دیکھنے اور سننے والا سب سنتا اور دیکھتا ہے، اور اپنے وقت پر، اپنی مرضی سے سب کچھ کرتا ہے۔ دیر سے سہمی، مگر اس نے میری سنی تو سہمی!! اور میرے لیے وہی سب کچھ ہے!“

شعیب ایک دم اندر آ گیا اور عابدہ نے پلکیں جھپکا کر دیکھا۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ سنگدل، سفاک، خود غرض، بے رحم شخص..... اس کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے تھا۔ اس نے سر جھکا لیا:

”پلیز شعیب! ایسا نہیں کریں، شہزاد اب ہم سب کا بیٹا ہے، میں ہی نہیں، عذرا ابھی اس کی ماں ہے! اس سے زیادہ کچھ نہیں کہیے گا!“

”عابدہ مجھے معاف کر دو..... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم کتنی عظیم ہوا“ شعیب ہکھلایا۔

شعیب صاحب! عظیم ذات صرف پیدا کرنے والے کی ہے، کیا یہ فرہاد کا ہی دوسرا نہیں، پہلا ہی روپ نہیں ہے؟“

شعیب کا سر جھک گیا۔ عذرا نے عابدہ کو ایک بازو سے اپنے ساتھ لگالیا اور شہزاد کو دوسرے بازو سے سینے سے بچھنے ہوئے رو پڑی!!



میں اور اماں بی مہربان۔ یہ بات صرف وہ جان اور سمجھ سکتی تھیں کہ ان میاں بیوی کو قدرت نے سزا دی ہے۔ بہت ہی سخت اور نہایت کڑی سزا..... انہوں نے ایک یتیم و سیر لڑکی کو قدم قدم ذلیل کر کے رکھا اور اس کا بچہ تک چھین کر اسے اولاد سے بھی محروم کر دیا تھا، اب قدرت نے بتا دیا کہ وہ بھی ظلم کرنے والوں سے ٹھیک ٹھیک نمٹنا جانتی ہے اور غمگینی بھی ہے۔

عابدہ درختے سے ہٹ کر بیڈ پر آ گئی تھی اور کب گہری نیند سوئی، اسے کچھ پتا نہیں چل سکا، جب سے شہزاد اس کے ہوتے ہوئے، اس سے بچھڑا تھا۔ اسے نیند ہی نہیں آتی تھی۔ آج کی غیر معمولی اور پرسکون نیند..... خود اس کے لیے تعجب چیز تھی۔

اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ جانے کتنی دیر سوئی ہوئی۔ نیم اندھیرے نیم اچالے میں جو بیرونی روشنی سے تھا، بجلی کی وقت آ گئی تھی۔ اس نے عذرا کا دھندلا سا ہیولا دیکھا، جو اس کے بیڈ کے کنارے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ شہزاد اس کی ٹھوڈ میں تھا اور شاید اسے بیدار کرنے والی ہی تھی کہ اس کی آنکھ خود کھل گئی۔ عذرا کو بول اپنے نزدیک دیکھ کر اس کو حیرت ہوئی۔ بہر حال اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل ڈوبنے لگا تھا، اس کا بچہ اس کے سامنے تھا۔ لیکن وہ اسے گود میں نہیں لے سکتی تھی۔

”عابدہ.....!“ نیم اندھیرے میں عذرا کی سسکی ابھری: ”مجھے معاف کر دو عابدہ..... میں نے تم سے بہت زیادتی کی ہے، بہت ظلم کیا ہے!“ وہ سچ سچ رو پڑی اور عابدہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ عذرا جیسی عورت رو بھی سکتی ہے، یہ تو شاید یقین کیا جاسکتا، لیکن رو کر اس سے عابدہ سے..... معافی مانگ سکتی ہے، اس پر یقین آسان نہیں تھا۔!

”عابدہ! لو میں تمہارا بچہ واپس کرنے آئی ہوں اور تم سے معافی مانگنے بھی..... فرہاد ہی نہیں رہا، جو اتنے برسوں کے انتظار کے بعد آیا تھا، میں نے اور شعیب نے تم سے تمہارا بچہ چھین کر جو ظلم کیا تھا، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ قدرت اس قدر جلد اور اتنا سخت



ہے تو اس کے پاؤں کیوں یوں گھس رہے ہیں، گویا، ان میں بھاری بھاری بیڑیاں پڑی ہوں، جسم کے مختلف حصوں میں ابھی تک ابا کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کی بخشی چوٹ کا درد موجود تھا، جو رفتہ رفتہ اس کی روح میں منتقل ہو رہا تھا، اس کی رگ و جان میں تحلیل ہو رہا تھا اور پھر نہانے کے بعد ٹب کے پانی کو بہاتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اس پانی کے ساتھ اس کے سارے خواب، ساری خواہشیں، امیدیں، ولولے سب بے جا رہے تھے اور اس کے اندر مایوسی کے سیاہ بادل سے بھر گئے تھے۔ اب بہتے ہوئے پانی میں اس کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے۔

رات کو ابا کے آنے کے بعد یہ خوشخبری سنائی کہ وہ جبر سے کام پر جاسکتا ہے۔ ابھی چند دن باقی تھے، شاید اس وقت تک اس کے چہرے سے یہ نشانات بھی غائب ہو جائیں، اماں نے سوچا تھا اور پھر جلدی سے برف کی ڈلی کپڑے میں لپیٹ کر گھر کرنے لگی تھیں۔ شادی پر جیلہ کی رضامندی سے اماں مطمئن ہو گئی تھیں۔ آئیں اپنی پڑی تھی۔ اب چند دن کے لیے اطمینان ہوا۔ ابا کے کڑوے کیلے جملوں اور دل دکھانے والے طعنوں سے وقتی طور پر چھڑکا رل گیا تھا۔ گوکہ اماں کو اختیار کسی بات کا نہ تھا۔ وہ کسی فیصلے کی مجاز تھیں اور نہ ہی کسی بات میں ممانعت، ان کی رائے پوچھتے پھر بھی جب کوئی بھی نیا مسئلہ کھڑا ہوتا، اس کی ساری ذمہ داری ان کے سر پر آ پڑتی اور ماں ہونے کے ناطے ابا سارا الزام ان پر دے مارتے۔ بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ان کے بڑے ہونے سے اماں کو یہ فائدہ ہوا کہ ابا نے ان پر اتھار اٹھانا بند کر دیا تھا لیکن اب ہی مشکل یہ آ پڑی تھی کہ بچے اب چھوٹی چھوٹی باتوں میں ابا کے فیصلے رد کرنے کے لیے تیار ہو جاتے اور اماں کی مصیبت آ جاتی..... ہمارے زمانے میں تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ہم والدین کی عائد کردہ باہندیوں کے خلاف کچھ کہنے کی خواہش رکھنے کے بھی جھگڑا ہوتے۔ وہ بے بسی سے سوچتیں۔ خدا جانے یہ بچے کیوں ایسے نکلے۔ باپ کا ڈر، ان کے دل سے کیوں نکلا جا رہا ہے۔ حالانکہ انہوں

نے تو شروع ہی سے ڈر اسہا کر رکھا تھا۔ پھر یہ کیوں باغی ہو رہے ہیں۔ شاید اس ملک میں رہنے کی وجہ سے یہ ایسے نکل گئے۔ یہاں کی تعلیم بھی بچوں کو غور و بنیاد پر ہے۔ اچھا ہی ہوا، جیلہ کے ابا نے سولہ سال کی عمر میں اسے اسکول سے اٹھا کر کام پر لگا دیا تھا، اب وہ تین سال سے ملازمت کر رہی تھی، پیسے کماتے تھی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر نگروں سے بوجھل دل سے سوال کرتیں۔ اگر ہم یہاں نہ آتے تو یہ جھگڑے بھی نہ ہوتے۔ یہاں کی فضا میں کپکنے والے بچے اتنے خود مختار ہو جاتے کہ بس ہر کام اپنی مرضی سے، اپنی مرضی کے کپڑے پہنے جاتیں، اپنی مرضی سے کھوئیں، پھریں۔ ہر بات میں اپنی مرضی مقدم۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ انہیں اپنا وطن یاد آتا، اپنا گاؤں، جہاں وہ پیدا ہوئیں۔ پتی بڑھیں، شادی ہوئی گران کو کیا اختیار تھا اپنی ذات پر..... پھر ان یادوں کے ساتھ وہاں کی غربت، تنگ دہلی اور بھوک کی یادیں بھی ذرا تیں اور وہ جلدی سے خدا کا شکر ادا کرتیں اور زندگی کے سارے مسئلے اللہ کی مرضی پر چھوڑ کر قدرے ہلکے دل کے ساتھ گھر کے کام کاج میں مشغول ہو جاتیں۔ اماں کو مطمئن دیکھ کر جیلہ سوچ رہی تھی کہ اماں خوش ہیں لیکن مجھے تو عمر قید ملنے والی ہے۔ ابا کا بھانجہ بھی ان کی طرح ہوگا اور اس کی زندگی بھی اماں کی طرح گزرے گی، یہ سوچ سوچ کر اس کا دل بیٹھ جاتا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ ایک باہمت لڑکی بن کر دکھائے اور ابا کے غلط فیصلے کے آگے ہتھیار نہ ڈالے، لیکن اماں نے پورے خاندان کی بدنامی کی جو تصویر کھینچی تھی، اس سے اس کا معصوم دل سہم گیا تھا، وہ خود تو ایسا سے بغاوت کر سکتی تھی لیکن اس کے انجام سے ڈرتی تھی۔ غصے میں ابا نہ جانے کیا کر سکتیں، ان کا غصہ کس پر اترے، اماں پر، چھوٹے بہن بھائیوں پر۔ اماں اسے اکثر اردو کا اخبار سنانے کی کوشش کرتی تھیں۔ خصوصاً ایسے بابوں کی خبریں جو کہتا نہ مانے پر بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے یا کرایے کے قاتل بھیج کر قتل کروانے کی کوشش کرتے، وہ کسی صورت میں باغی بیٹیوں کو بخشتے نہ تھے اور وہ

لے کے لیے تیار نہ تھی، وہ جینا چاہتی تھی۔

ایک ماں کہہ دینے سے کتنی آفات سے چھٹکارا مل سکتا ہے، جسمانی بھی، ذہنی بھی، وقتی طور پر سہی۔ ان نے اسے سمجھایا تھا۔ اور وہ تو کمزور سی لڑکی تھی، ایک نازک سے پھول کی مانند جو ایک چٹنی میں سلا سلا ہے۔ کاش وہ لڑکا ہوتی، خاندان کی عزت کا اتنا بھروسہ شائون پر تو ہوتا۔ وہ اداسی سے سوچتی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ابا کی ایک چھوٹی بہن تھیں، جنہوں نے اسے بچپن میں مانگ لیا تھا۔ مانگا لگا تو خاک نہ تھا، بس ہلکی ہلکی میں اپنے چھ سالہ بیٹے سے دو سال کی جیلہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی، ابا نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔ ابا گاؤں کے ننھے منے بچوں کی ملنے کی رواج سے واقف تھے اور انگلستان میں رہائش اختیار کرنے کے بعد وہ اس کے بہت ملال ہو گئے تھے اور اب تو وہ اپنی بیٹی کے لیے کچھ اور ہی منصوبے سوچ رہے تھے۔ ایک ایسے روشن مستقبل کا جس نے ان کے افلاس زدہ رشتہ داروں کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھوپھی بے چاری کی زندگی حسرتوں، گمبویوں اور سختیوں کی داستان تھی۔ پھوپھا بالکل نکلے تھے، انہوں نے بھی ڈھنگ سے کوئی کام کر کے نہ دیا۔ اب پھوپھی کسی طور اپنے بھائی سے نانہ مضبوط کرنا چاہتی تھیں۔ شاید اسی بھائی کے وسیلے سے ان کے مقدر کی سیانی کچھ چھٹ جائے، شاید ان کے دن بھی پھر جائیں اور اب زندگی کے آخری دنوں میں تو روٹی کا سہارا ہو جائے۔ بیٹا تو ان کا بھی اسے باپ کے لئے قدم پر چل رہا تھا، کام میں اس کا دل بالکل نہ لگا۔ میٹرک میں تین دفعہ فیل ہو کر پڑھائی سے بھی اس کا دل بھر گیا تھا۔ اب دن بھر قلمی گانے گانا اور لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا، ان سے عشق لڑانا، اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اب پھوپھی کو یہ خبر ملی تھی کہ جیلہ نے نوکری کر لی ہے، تو انہوں نے بڑی ناک بھوں پڑھائی تھی مگر بھائی کو کچھ لکھنے کی ہمت نہ پڑی تھی کہ لڑکیوں کو اتنی آزادی نہ دیں۔ مہاراج بھائی کو برا لگ جائے اور وہ پیسے بھیجتا بند کر دیں اور ابا کی فیکٹری خریدنے کے بعد سے تو

انہیں ایک دم سے اپنے بیٹے کے بہتر مستقبل کی بشارت ہوئی، انہوں نے فوراً بھائی کو لکھ بھیجا کہ چونکہ جیلہ کو انہوں نے مانگ لیا تھا، اس لیے اب اس فرض کی ادائیگی کا وقت آ گیا ہے، لڑکی جوان ہے اور ابا کو اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ گوکہ ابا کو اچھی طرح سے یاد تھا کہ انہوں نے وعدہ قطعاً نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے تو پھوپھی کی بات کا جواب ہی گول کر دیا تھا۔ وہ ماضی کے اس لمحہ کو بالکل بھول چکے تھے اور بیٹی کے لیے کسی اچھے اور دولت مند رشتے کی تلاش میں تھے لیکن پھوپھی کا خط ملنے ہی نہ جانے کیا ہوا، ان کے دماغ نے ایک دم پلٹا کھایا اور انہوں نے بس فیصلہ کر لیا کہ اگر میٹرک میں تین دفعہ فیل ہونے والے اس بھانجے کو انہوں نے بیٹی زندگی، تو، ان کے آباؤ اجداد کی عزت و حرمت پر حرف آنے گا۔ وہ عزت جو نہ صرف ان کو بلکہ ان کے پورے خاندان کو، ان کی اس چھوٹی سی فیکٹری کی ملکیت سے حاصل ہو گئی تھی۔ حالانکہ گاؤں میں ان کی کوئی بھی حیثیت نہ تھی اور نہ عزت..... اس کا انہیں احساس تھا اور یہ بھی کہ خاندان کی جس عزت کے لیے وہ بیٹی کی قربانی دے رہے تھے، اس کا وجود صرف ان کے ذہن تک محدود تھا۔ پھوپھی کے خط کو پڑھتے ہی اماں سمجھ گئیں کہ پھوپھا پھوپھی، صرف پیسے کے لالچ میں اس شادی کے خواہاں ہیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ یہ رشتہ کسی طور پر بھی موزوں نہ تھا، لیکن وہ کیا کہیں، کس سے کہیں؟ ابا کے کسی حکم کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے نہ ان کے پاس آواز تھی نہ الفاظ۔ شادی کے ابتدائی چند برسوں ہی میں ان کی آواز خشک ہو گئی تھی اور الفاظ ختم۔ انہوں نے خاموش رہنے میں سلامتی کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اب تو یہ حال تھا کہ احتجاج کا کوئی جملہ زبان پر آ بھی جاتا، تو وہیں اڑ کر رہ جاتا اور باہر نکل کر ہی نہ دیتا، نکلنے سے انکار کر دیتا۔ ابا اچھے شوہر تھے اور اچھے باپ بھی۔ مشتاق اور مہربان..... بالکل اپنے معاشرے کے مردوں کی



طرح، جو بیوی سے اور بچوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے سارے احکامات بلا چون و چرا بحال لیں، جو نہ صرف یہ توقع رکھتے ہیں بلکہ اس کا مطالبہ بھی کرتے ہیں اور اکثر اپنے جائز و ناجائز فیصلوں کو مذہب اور شریعت کا مقدس لبادہ اوڑھا کر ان کو اور مجبور کر دیتے ہیں۔ اب ابھی پہلے بیوی کو ایسی ہی رحمت سمجھتے رہے، پھر رفتہ رفتہ بنیاں بھی شریک ہوتی گئیں، گو کہ لڑکے بھی خود مختار تھے مگر ان کے کچھ خصوصی اختیارات ضرور تھے۔ اب ایک مطلق العنان حکمران کی مانند تھے، اسی لیے جب ان کی بیٹی نے ان کے بھانجے سے شادی کرنے میں حیل و حجت کی، تو وہ آپے سے باہر ہو گئے، بھلا اس لڑکی کی یہ خیال، انہوں نے غصے میں جوان بیٹی کو دھتک کر رکھ دیا تھا اور انہیں اپنے اس فعل پر ذرہ برابر ندامت نہ تھی۔ حکم عدولی کی برداشت ان میں قطعی نہ تھی۔

پھر جیلہ کو زبورات پہنا کر اور ریشمی ملبوسات میں لپیٹ کر ایک خوبصورت سے پیکٹ کی مانند ابائے بھانجے کو پیش کر دیا گیا۔ وہ بے ڈھنگا انسان، جو اس نئے اور اجنبی ماحول میں اور بھی بے ڈھنگا لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر خوبصورت مردانہ سوٹ ایسا لگ رہا تھا، جیسے اسے سوٹ کے اندر انڈیل گیا ہو۔ ایک ایسا مرد جس کو مذہب طریقے سے کھانا کھانا بھی نہ آتا ہو اگر اس کے سامنے ”گورڈول بلو“ کا سات کورس کا ڈنر پیش کیا جائے، تو وہ اس سے لطف اندوز ہو سکے گا؟ لطف اندوز ہونے کی اہلیت رکھتا ہوگا۔ ابانے ایک بیڈروم کا فلیٹ لے کر اسے جیلہ کے جھمپے سے آراستہ کر دیا، اس کی ہر زاویے سے تصویریں بھی کھینچوائی تھیں تاکہ انہیں پچھو پچھو یا کو بھیج کر ان پر عرب ڈالا جاسکے کہ وہ ان کے بیٹے کے لیے کیا کچھ نہ کر رہے تھے۔ اسے ہر طرح کی آرام اور آسائش مہیا کر رہے تھے۔

لیکن یہ سب تو ابائی خوش فہمیاں تھیں کہ لوگوں پر، ان کی امارت کا عرب پڑے گا۔ ان کی بہن نے بیٹے کو جو ہنر باغ دکھائے تھے، اس میں بڑا سا مکان

تھا، نئی کار اور دولت کی ریل چل رہی تھی۔ پچھو پچھو سے بیٹے کو کھانوں کی طرح جو تصویر پیش کی تھی، وہ یہاں نہیں بن رہی تھی۔ سب سے پہلے تو بھانجے کو تیسری منزل پر ایک بیڈروم کا یہ فلیٹ ناپسند ہوا۔ کئی سیڑھیاں چڑھنی پڑنی تھیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ صوفے پر بیٹھا تھا اور جو سامان فلیٹ میں سمجھا تھا، ان میں زیادہ تر چیزیں ایسی تھیں جن کی ضرورت اور استعمال سے وہ قطعی ناواقف تھا لیکن انہوں نے تو اس جنت کا تذکرہ کرتے وقت بھی کام کرنے کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن رجسٹریشن کے دوسرے ہی دن ماموں نے اس کو اپنی فیکٹری میں لے جا کر کھڑا کر دیا تھا اور محنت سے کام کر کے کامیابی حاصل کرنے کا لیچر پلاتے ہوئے، ایسے تمام کام اس کے سپرد کر دیے تھے، جو ایک داماد کے قطعی شایان شان نہ تھے۔ اب اسے بھانجے سمجھتے ہوئے بے تکلفی سے کام کر دیتے لیکن اسے تو یہی بتایا گیا تھا کہ داماد کی کیا شان ہوتی ہے اور بھانجے جب داماد بن جائے تو بھانجے نہیں رہتا۔ اسے تو یہ معلوم تھا کہ اس کو ایسا کوئی کام نہ آتا تھا، جو خواتین کے ملبوسات تیار کرنے والی اس چھوٹی سی فیکٹری میں اس کے سپرد کیا جاسکتا۔ اسے داماد سے فیکٹری فلور پر کام کروانے کا کوئی عذر سمجھ میں نہیں آتا اور جب اسکول کی چھٹیاں آئیں، تو ابانے اپنے داماد کو حساب کتاب کرنے والی بوڑھی سبز براؤن سے کام سیکھنے پر لگا دیا، جو پارٹ ٹائم کام کرتی تھیں، یہ دیکھ کر اس کا خون کھول کر رہ گیا۔ وہ تو خود کو اس آفس میں دیکھنے کا متمنی تھا، جہاں ایک جوان اور طرحدار گوری بھی ہوگی، جو اس سے بے تکلفی سے ”ڈیر“ کہہ کر بات کرے گی اور چست لباس اور اونچی ایڑی کے جوتوں میں نکل کھڑا کر چلے گی اور اس سے عشق لڑانے کا منصوبہ تو، اس کے ذہن میں شروع دن سے مل رہا تھا۔

غضب یہ ہوا کہ شادی کے تین ماہ بعد ہی اسکول کی چھٹیاں آن پڑیں اور ماموں کی کسی بات پر وہ ہر حد گرم تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ کام دھام کا عادی نہ تھا،

اب کی طرح چند دن کے لیے کوئی کام کرتا اور پھر اسے چھوڑ چھاڑ کر آوارہ گردی میں لگ جاتا۔ یہاں ماموں صبح آٹھ بجے ہی بلایتے، اتنی سردی اور اندھیرے میں اور شام کو چھ بجے سے پہلے بھی کھڑے ہی نہ تھے جبکہ دوسرے کام کرنے والے ساڑھے پانچ بجے چلے جاتے۔ سارا دن کھڑے کھڑے گزرتا۔ گھر پہنچتا تو بدن چھکن سے چور اور انہیں غصے سے کھولتا ہوا، بھلا یہ بھی کوئی جنت تھی..... اور اسی کوئی بات مرضی کے خلاف ہوتی اور وہ پھٹ پڑتا۔ کھانے میں ذرا سی دیر ہوتی اور وہ جیلہ کو بے نقط بناتا اور کابلی کے طعنے دیتا، حالانکہ وہ بھی اس سے ٹھوڑی دیر پہلے کھر پچھتی تھی اور جلدی جلدی کھانا تیار کرنے میں لگ جاتی تھی، اگر اس کی باتوں کے جواب میں بھی وہ عادتاً کوئی جملہ انگریزی میں کہہ پڑتی، تو وہ گالی گلوچ پر اتر آتا..... اور اس دن بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ غصہ تو اسے ماموں پر تھا لیکن وہ ان سے کچھ کہہ نہ سکا لیکن اس نے گھر آکر جیلہ کے پکائے ہوئے کھانے میں خوب عیب نکالے تھے۔ وہ بھی تھکی ہوئی تھی، اسے غصہ آگیا اور جل کر اس نے ایک چھوٹا سا جملہ انگریزی میں کہہ دیا تھا: ”پھر خود کیوں نہیں کھا لیتے!“ پھر تو اس نے بیٹیں توڑنے کے علاوہ جیلہ کو بھی نہیں بخشا تھا اور زور زور سے کئی چھڑ لگا دیے تھے۔

جب وہ روتی ہوئی اماں کے پاس آئی تھی، تو وہ بھی اس کو دیکھ کر رونے لگی تھیں اور داماد کو گالی کوٹنے دینے لگی تھیں، اس کے علاوہ ان کے اختیار میں اور کیا تھا، پھر وہ برف کی ڈلی کپڑے میں لپیٹ کر اس کے پیرے کی فلور کرنے لگی تھیں۔ رات گئے جب ابائے گھر آئے تو اماں کو ان سے کچھ بتانے کی ہمت نہ ہوئی..... جب جیلہ کے شوہر کے اس رویہ پر ماموں نے اسے کچھ بھی نہ کہا، تو اس کے مزے آ گئے، پھر تو اس نے اپنا فخر خندا کرنے کا بھی آسان طریقہ اختیار کر لیا۔ اب جب بھی اسے ماموں کی کسی بات پر غصہ آتا، وہ گھر آکر اس کی بیٹی پر نکال لیتا۔ فیکٹری کے لڑکوں نے اسے کچھ انگریزی گالیاں سکھا دی تھیں، اب وہ دھڑلے سے

جیلہ پر، ان کا استعمال کرتا۔ وہ یہ بھی جانتا چاہتا تھا کہ گورے بیویوں کی کس طرح پٹائی کرتے ہیں اور اس نے عزم کیا تھا کہ یہ معلوم ہونے پر وہ جیلہ کو انگریزی بولنے اور دفتر میں کام کرنے کا مزہ چکھادے گا۔ اب جیلہ بھی مار کھا کر اماں کے پاس جانے کی بجائے گھر ہی میں رو دھو کر رہ جاتی۔ اماں سے شکایت کرنے کا فائدہ بھی کیا۔ اب صبح سات بجے کے گئے، رات کہیں نو دس بجے گھر پہنچتے، تو ان کو کون بتاتا! کیا بتاتا؟ جیلہ سو جاملے لیے، سیاہ چشمہ لگا کر کام پر چلی جاتی، جہاں اس کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیاں عورتیں اسے پولیس میں رپورٹ کرنے کا مشورہ دیتیں، اصرار کرتیں لیکن ابائی بدنامی کا ڈر اسے روک دیتا۔

ان حالات میں تو جیلہ کے شوہر کی ہمت تو بڑھتی ہی تھی۔ اب اس نے بیوی کو مختلف طریقوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا اور مطالبے بڑھ گئے تھے۔ ایک دن تو اس کو احساس ہی نہ رہا اور معاملہ حد سے کہیں آگے بڑھ گیا۔ پہلے تو اس نے جیلہ کو کرسی سے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا، پھر لالٹوں اور گھونٹوں سے مارنا شروع کر دیا تھا اور وہ چھ ماہ کی حاملہ تھی۔ اس کی چھینٹیں سن کر پڑوس کے فلیٹ سے مسز ولن دوڑی آئی تھیں اور انہوں نے دروازہ پھینکا شروع کر دیا تھا، جس سے وہ آدی گھبرا کر گر گیا تھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا، کسی طرح جیلہ نے خود کو کھینٹ کر دروازہ کھول دیا تھا اور پڑوس نے بڑی مشکل سے اس کو اپنی گاڑی تک پہنچایا تھا اور اس کے والدین کے گھر چھوڑ آئی تھیں، جہاں وہ رات بھر درد میں تڑپتی رہی، حتیٰ کہ ڈاکٹر کو بلانا پڑ گیا تھا، جس نے فوراً ایبویٹس بلا کر اسے اسپتال بھیج دیا تھا۔ ابانے ڈاکٹر اور ایبویٹس کو آتے جاتے دیکھا مگر ان معاملات سے، مسائل سے، ان کو زیادہ دلچسپی نہ تھی، وہ تو بیٹی کو کیا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے اور پھر ان کو ایک آرڈر پوزا کرنا تھا، جس کے لیے فیکٹری میں دن رات کام ہو رہا تھا، ورنہ ہزاروں پونڈ کا نقصان ہوتا اور ابائی کی صورت میں اس نقصان کے



جمیلہ اور اس کے بھائی، جنہوں نے منہ سے تو کوئی شکایت نہ کی مگر انہوں نے اس آدمی کو سزا دے گئے کا ایک طریقہ سوچ لیا تھا، جس نے ان کی بہن پر غم طمر وار کھا تھا۔ بس جمیلہ نے خاموشی سے ہوم آفس کو خط لکھ دیا تھا، پھر جب بھانجے کے ”ڈیپورٹیشن“ کا آرڈر آ گیا، تو بایا ایک دم شینا گئے، حقے چلائے، جان لینے کی، جان دے کی دھمکی دی مگر کچھ کرنے سکے کیونکہ جمیلہ نے

”ہمیں..... یعنی ابا کو بھی؟“  
 ”نہیں ابا کو نہیں صرف ان کے بیوی بہن

”واہ آپاواہ..... انکار کردوں تمہاری طرح اور میرا بھی وہی حشر ہو۔ کمرہ میں قید کھانا پانی بند اور گھونے پھڑ علیحدہ، تمہارے منہ پر ابھی تک ایک



اس تمام عرصے میں وہ بس ایک یا دو بار پاکستان آیا ایک بار جب میں میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھا اور دوسری بار شاید جب میں خود ملک چھوڑ کر ایران جا چکا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان اتنے قریبی تعلق کے باوجود خط و کتابت بس نئے سال کے تہنیتی کارڈ اور تصاویر کے تبادلے تک محدود تھی۔ نہ وہ لکھنے کا شوقین تھا اور نہیں میں کچھ پابند مگر ہاں دل کے نہاں خانوں میں گزرا ہوا وقت ایک.....!!

### ادب سے انتخاب..... ایک دل نشین تحریر

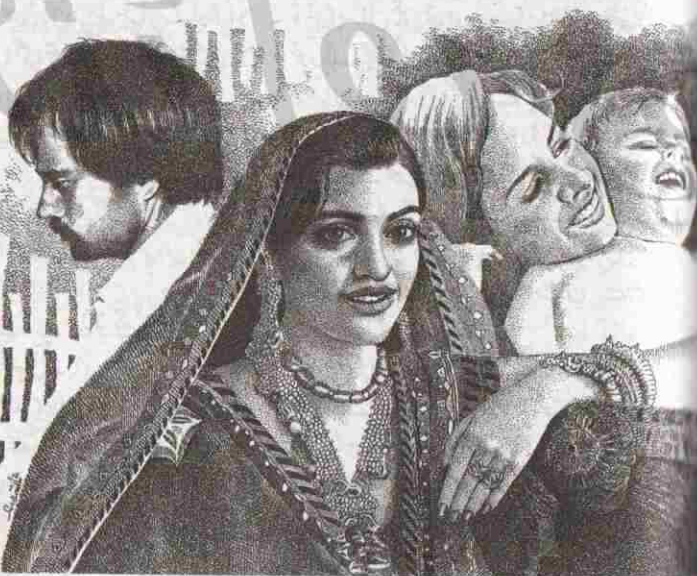
آج کل میں دن ڈھلنے سے بہت پہلے سیر کے لیے نکل جاتا ہوں گھر سے میلوں دوڑ جٹکوں اور ویرانوں کی طرف جیسے مجھے گھر نہ لوٹنا ہو یہ سب مجھے اپنے تسلسلے کے مشورے کے مطابق خود کو فٹ رکھنے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ ایک روٹین جو ساری عمر میں اپنے مریضوں کا تباہ کر رہا۔ شاید عمر کے ایک حصے میں کچھ کر جینے کی لگن بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ زندگی کا جواز جیسے اجاںک ہو جانے والے سورج گرہن کی طرح ہم پر غلبہ ہوتا ہے۔ مگر تب چلتے ہوئے سانس پھولنے لگتا ہے۔ دل دھڑکتا ہے جو زخموں میں ہوجاتے ہیں اور آنکھوں کے آگے دنیا اندھیر ہونے لگتی ہے۔ میں بار بار پرانی تصویریں تلاش کرتا ہوں

..... شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ برسوں پہلے میں کس قدر دبلا یا کتنا حازب نظر تھا تب بھی وزن کے بڑھنے کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ کالج میں دن بھر پڑھائی کے بعد شام کو ٹینس کھیلتا اور بس۔ یہ کالج کی ٹینس ٹیم کو فوٹو ہے۔ اس تصویر میں میرے برابر میں موجود میرے چچن کا دوست ہوی ڈی سوزا ہے۔ ہوی اور میں نے ایک ساتھ

آ جاتا۔ سامنے دھوپ بھرے برآمدوں میں دور تک رکھے ہوئے بڑے بڑے لکڑی کے ٹرک اور لمبے لمبے پاؤؤں والی جہازی آرام کرسیاں، کسی اسٹیشن کے ویٹنگ روم کا منظر پیش کرتیں۔ وہ بے بسی ہوی کا گھر ویٹنگ روم ہی تھا جہاں سے کئی مسافر اپنی اپنی منزلوں کی طرف جا چکے تھے۔ گھر کیا تھا کئی کنال زمین میں بنا ہوا تقریباً سو سال پرانا ایک بنگلہ تھا، جو دور سے ہمیشہ ایک ویران ریست ہاؤس کا تاثر دیتا۔ بنگلے کے مشرق میں برآمدوں کے سامنے خالی میدان کے کنارے برسول لائنز میں انگریزوں کے عہد کے بنی ہوئی پومیس سپر سٹنٹ اور ڈپٹی کمشنر کی وسیع عریض کوشیوں کی پشت پر پھیلے ہوئے باغات اور بنیوں کے کھیتوں کی حدود ہوی کے بنگلے سے آگرمقے تھیں۔ شمال کی سمت بنگلے کی مہندم دیوار کے پیچھے بہت دور طارق روڈ پر واقع حملے کے مکانات کی افقی حد نظر آتی اور مغربی سمت میں ریلوے کے افسران کی بڑی بڑی کوشیوں کے آگے پھیلے ہوئے کئے کے کھیت دکھائی دیتے۔ جب گنے کی فصل تیار ہوتی تو پس منظر میں موجود

مکانات اور مغربی سمت میں نظر آنے والی کوٹھیاں اور ان کی سرٹینس کو ارڈر چھپ جاتے اور کھیتوں کی باڑھ ہوی کے بنگلے کے قریب ہوجاتی۔ جس زمانے میں گنوں کی کٹائی کے بعد کھیت میں چھوٹی فصلیں کاشت ہوتیں تو یہ بنگلہ اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے ویرانے میں کچھ اور ویران نظر آنے لگتا۔ ہم دونوں جا کر ایک برے ہال نما ڈرائینگ روم میں ب بیٹھ جاتے۔ ہوی خود میرے لیے کافی بنا کر لے آتا اور پھر گھنٹوں ہم پرانے انڈین گانوں کے ریکارڈ سنا کرتے۔ ہوی اور میرے درمیان ٹینس کے علاوہ پرانے فلمی گانے ایک قدر مشترک بلکہ ہمارے رابطے کا ہم جزو تھے۔ کبھی کبھار جب ہم کافی پیتے ہوئے گانے سنتے یا باتوں میں مشغول ہوتے تو ہوی کے والد سیٹھ بہرام ڈی سوزا سے اجاںک ملاقات ہوجاتی۔ بہرام ڈی سوزا ایک فعال قسم کے ادھیڑ عمر شخص تھے جو سردیوں میں کوٹ چٹلون اور ٹائی میں نظر آتے اور گرمیوں کے موسم میں سفید بٹن شرت اور سفید پیٹ میں ملبوس دکھائی دیتے۔ مجھے وہ بالکل دوسری جنگ عظیم پر بنی ہوئی

ٹینس کھیلنے کے بعد اکثر میں اُس کے گھر چلا جاتا۔ ہوی کا گھر سارے شہر میں ایک الگ تھلک مقام تھا جہاں پہنچتے ہی ایک مانوس اجنبیت کا تحریرے وجود کو اپنے حصار میں لے لیتا۔ زرد اور سفید گلابوں سے بھری ہوئی جھاڑیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا کچا ڈرائیو ہے جس پر برسوں پہلے ضرور کبھی بجری پڑی ہوگی۔ کیونکہ اڑنی ہوئی مٹی میں ایک آدھ ٹنکر اب بھی نظر





فلوں کے ریٹائرڈ فوجی افسر لگتے۔ اُن کا رنگ روپ بھی ایرانی نثر ادھونے کے باعث صدیاں گزر جانے پر بھی سرخ پیدا تھا۔ جس کی ایک بڑی وجہ شاید خاندانی شادیوں کا رواج ہو۔

”ہیلو بیک ٹین“ گانے سنے جا رہے ہیں!“ ان کی آواز مجھے سنائی دیتی، ابھی میں سلام کا جواب دینے کے بعد کچھ کہنے کے بارے میں سوچتا تو وہ جا چکے ہوتے۔ اُن کی نیگم میرے دوست ہوی کی مئی سس ڈی سوزا بھی فراک پہنے گول شیشوں والی نیک گلے میں لگائے، کیٹس کے بوپنے میں سائے کی طرح پرانے بنگلے کے برآمدوں اور راہ دار یوں میں گھوما کرتیں۔

ہوی کی فیملی پاریسی تھی۔ معاشرتی اعتبار سے شہر بھر میں الگ تھلک ہونے کے باوجود ان کے گھر کا ہر فرد بے حد ملنساز اور مشفق تھا۔ ہوی کی مئی جنہیں میں آنٹی کہا کرتا، مجھے ہمیشہ بیٹا کہہ کر پکارتیں اور پھر انگریزی زبان میں باتیں شروع کر دیتیں۔

”ہاؤ اماؤٹ پورٹس؟“

ہیزاٹ کم اپ فار وولڈن!“ بھی بھی وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولنے لگتیں۔ یہ زبان صدیوں پہلے یہاں آکر آباد ہونے کے باوجود ابھی تک ان کے مزاج میں نہ رہی تھی۔ مائی، باورچی یا گھر کے پرانے نوکر سے باتیں کرتے ہوئے، وہ مجھے کسی اور دنیا کی مخلوق لگتیں۔

”تم کو ہم نے بولا تھا کہ نہیں بولا“ جس کے جواب میں بوڑھا نوکر بس یہی کہہ پاتا۔

”نیگم صاحب آپ نے تو مجھے نہیں بلایا“ اور مجھے ہنسی آجاتی۔

ہوی کے والد بہرام ڈی سوزا پیٹے کے اعتبار سے انجینئر تھے، جن کی شہر میں چھوٹی سے ورکشاپ تھی۔ ان سے ملنے جلنے والے انہیں سیٹھ

صاحب کے نام سے مخاطب کرتے، حالانکہ مجھے تو وہ سیٹھ کم اور ایک ریٹائرڈ فوجی افسر زیادہ دکھائی دیتے۔

ہوی بہرام ڈی سوزا کی اولاد میں سب سے چھوٹا اور اگلیوتا بیٹا تھا بڑی بیٹی شادی کے بعد کراچی کے کسی پارسی اسکول میں انگریزی کی استاد تھی اس سے چھوٹی ڈاکٹر بن کر کچھ عرصہ مقامی سول اسپتال میں کام کرتی رہی پھر شادی کے بعد بمبئی چلی گئی تھی۔ اب بڑے ڈھنڈار بنگلے میں بہرام ڈی سوزا اور مسز ڈی سوزا کے علاوہ ہوی اور ایک بہن انتلا باقی رہ گئے تھے۔ انتلا کسی ادارے میں سوشل ویلفیئر آفیسر تھی اور ہوی کے بارے میں تو میں بتا چکا ہوں میرا کالج فیلو تھا۔

یہ تصویر اس نے مجھے انگلیڈ سے بھیجی تھی۔ بی ایس سی کرنے کے بعد ہوی انگلیڈ چلا گیا تھا، جہاں سے فن تعمیر میں ڈگری کے حصول کے بعد اس نے برازیل کی کسی تعمیراتی کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

اس تمام عرصے میں وہ بس ایک یا دو بار پاکستان آیا ایک بار جب میں میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھا اور دوسری بار شاید جب میں خود ملک چھوڑ کر ایران جا چکا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان اتنے قریبی تعلق کے باوجود خط و کتابت بس نئے نئے سال کے تہنیتی کارڈ اور تصاویر کے تبادلے تک محدود تھی، نہ وہ لکھنے کا شوقین تھا اور نہیں میں کچھ پابند مکرہاں دل کے نہاں خانوں میں گزرا ہوا وقت ایک ننھے بچے کی طرح گھٹنوں چلا رہتا اور اپنی کلکاریوں سے میری یادوں کو گدگداتا رہتا۔

ہوی کے چلے جانے کے بعد میں میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہو کر کچھ عرصے کے لیے فوج میں پھر گیا تھا، جہاں سے فراغت کے بعد شہر میں دوبارہ اپنی پریکٹس شروع کر دی۔ پریکٹس کی

مصرفات اور نئے نئے ہنگاموں نے مجھے ایک مدت کے لیے ہوی اور اس کے گھر سے منقطع کر دیا تھا۔ ایک دن جب میں اپنے مریضوں میں مصروف تھا تو سیٹھ بہرام ڈی سوزا، جنہیں میں اگلے کہتا تھا۔ میرے کلینک میں داخل ہوئے۔ پہلی بار میں انہیں پریشان حال دیکھا تھا۔

”یار تمہاری آنٹی ٹھیک نہیں۔ ممکن ہو تو اسے چل کر دکھاؤ“ میں سب کچھ چھوڑ کر انہیں دیکھنے چلا گیا۔ مسز ڈی سوزا، ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں ہی اب اُن کا دل بڑھ گیا تھا۔ ہوی کے برازیل چلے جانے کے بعد انتلا بھی اپنی ملازمت کے سلسلے میں کراچی منتقل ہو چکی تھی اب دونوں بوڑھے میاں بیوی اس لق و دق بنگلے میں تنہائی کے دن ویرانے میں اُگے ہوئے لیکٹس کی طرح کاٹ رہے تھے۔ شاید دل کے بڑھ جانے کا ایک غیر طبی جوان تہا دل میں پہاڑوں کی پرورش ہو!

اس کے بعد اکثر میں مسز ڈی سوزا کو دیکھنے چلا جایا کرتا دھوپ بھر برآمدے تک پہنچتے ہوئے ہرنے آنے والے کو اس بات کا یقین ہو جاتا کہ وہ خارج کی دنیا سے کہیں اندر اتر آیا ہے۔ سکون ہی سکون، خاموشی ہی خاموشی، سکون ایسا، جیسا لاہریڑیوں میں ہوتا ہے اور خاموشی جیسے مقبروں میں ہوتی ہے!

آدھی دھوپ اور آدھی چھاؤں میں پڑی کرسی دراز ڈھیلے ڈھالے لمبے سوئی فراک میں ملبوس سرخ پید جسم والی مسز ڈی سوزا ناک پر چھوٹے چھوٹے گول شیشوں والی عینک لگائے کوئی کجمرانی ناول پڑھتی نظر آتیں۔

”گڈ آفٹرنون آنٹی“ میں کہتا

”گڈ آفٹرنون بیٹا“

”ہاؤ آر یو پور فنی اینڈ یور پریکٹس؟“

محبت بھرے روائی انداز میں وہ طویل جملے

میں، مجھ سے سب کچھ معلوم کرنے کی خواہش کرتیں۔ لیکن جب ان سے ان کی طبیعت کے بار میں دریافت کرتا، تو عام مریضوں کی مانند اپنا دکھارونے کے بجائے ہمیشہ کی طرح شخص ”الس گڈ، گڈ،“ کہہ دیتی۔

میں ان کا بلڈ پریشر چیک کرنے کو کہتا تو وہ اپنی اسٹک اٹھاتیں اور فوراً ہی ان کے پیروں پر منہ رکھتے ہوئے ان کا پالتو کتا، جو بظاہر سورہا ہوتا، اٹھ کر ان کے آگے آگے دم ملاتا ہوا چلنے لگتا۔

میں اکیلا برآمدے میں کھڑا دور پھیلے ہوئے کھیتوں میں ابھرتی ہوئی نئی تعمیر کو دیکھ رہا ہوتا۔

”کم این ڈاکٹر!“ مسز ڈی سوزا کی شفقت بھر آواز مجھے متوجہ کرتی اور میں بڑے ہال کمرے میں داخل ہو جاتا اور پھر یوں لگتا جیسے ٹائم مشین نے مجھے کہیں اور پہنچا دیا ہے۔

قرون پرانا لکڑی کا فرنیچر، کمرے میں اینٹوں کے ٹکے فرش پر زیادہ نمایاں نظر آتا۔ کھڑکیوں پر ملنے ہوئے لاتعداد سفید پردے اور ایک دیوار سے لگے ہوئے جانے کس عہد کے چھپر کھٹ پر پڑے بستروں کی سفید چادروں کا رنگ گزرتے وقت کے ساتھ زرد ہو چکا تھا، کمرے کے کونوں میں موجود میزوں پر چھوٹے بڑے سلور ارکڑی کے فریضوں میں خاندان بھر کے عہد کی تصویریں، کمرے کے وسطی دیوار پر عین بڑے دروازے کے اوپر کسی بزرگ کی پرانی فلمی تصویر کے نیچے بے حد قدیمی کلاک جس میں وقت سوادو بجا کر ٹھم گیا تھا!

میں ان کا بلڈ پریشر چیک کرتا، اُن کو تسلی دیتا اور وہ ”رائٹ رائٹ“ کی گردان شروع کر دیتیں۔ لیکن ابھی اگر بھولے سے میں ہوی کی بات کر دیتا تو وہ اک دم یوں چپ ہو جاتیں کہ تم دونوں کے مابین پڑتی ہوئی خاموشی نا قابل برداشت ہو جاتی اور میں کمرے سے باہر نکل آتا



میں نے غرور سے اپنے بالوں کو جھٹکا دیا اور اپنے اوپر ہرفیوم کا اسپرے کرکے باہر نکل آئی۔ مجھے صرف انتظار کرنا تھا اپنے محبوب کا انتظار۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ گھنٹہ بھر بعد ہی شیراز کی بائیک کی آواز سنائی دی اور پھر کال بیل بجی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا سامنے وہ دشمن جاس کھڑا تھا۔ سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ میں وہ پہلے سے بھی بڑھ کر خوبرو اور امسارٹ لگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

### اس شارے کے لیے ایک حساس و جذباتی دل گداز گئی کہانی

پہلے ہی اجاڑ دیا اور عجب بات یہ ہے کہ آج تک اسے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی خوشیوں کی قاتل میں ہوں۔ اس کو کیا کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ اوپر سے اتنی شائستہ اور اتنی مہذب نظر آنے والی لڑکی اندر سے کسی ڈائن سے کم نہیں۔ ڈائن بھی وہ جو کسی غیر کا نہیں بلکہ اپنوں کا ہی کلچر چاہتی ہو۔ ہمارا گھرانا اچھے کھاتے پیتے خوشحال

آج میں اپنے ماضی پر نظر ڈالتی ہوں تو اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ کیا واقعی اس دنیا میں کوئی اتنا بھی گر سکتا ہے۔ جتنا میں گر گئی تھی۔ کیا واقعی دنیا میں ایسی سگی نہیں بھی ہوتی ہیں جو اپنی ہی بہن کا گھر اجاڑ دیں۔ ہاں! میں وہ زہریلی ناگن ہوں جس نے اپنی سگی بہن کو ڈس لیا۔ اس کی خوشیوں کو آگ لگا دی، اس کا گھر بننے سے

دور تک پھیلے ہوئے بے کراں صراچی وسعت میں بلند و بالا مینار نظر آئے اور اس سے مل کہ میں کسی ہمسفر سے ان کے بارے میں دریافت کرتا۔ پائلٹ کی آواز نے مسافروں کو کرمان کے ایئر پورٹ پر اترنے کے علاوہ ”ٹاورز آف سالمینس“ سے متعارف بھی کرا دیا۔ پارسیوں کے عدم آباد سے بالمشاقہ یہ میرا پہلا تعارف تھا جانے کیوں انہیں دیکھتے ہی مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا اور ہوی یاد آنے لگا۔

کئی برس ایران میں رہنے کے بعد واپسی پر سیٹھ بہرام ڈی سوزا اپنے ویران جنگلے میں پہلی مرتبہ ایک چاق و چوبند فوجی افسر کے بجائے مریض نظر آئے ہوی کی کمی کے بارے میں پوچھنے پر انہوں نے اپنی عینک کو اتار کر رومال سے صاف کیا اور آنکھوں کے کونوں کو پوچھتے ہوئے بولے ”یار ڈاکٹر تم نہیں جانتے“ ”شی واز فرم ان ہر بلیف“ ”بس یہاں سے چلی گئی۔“

”کیا مطلب انکل؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”بس وہ یہاں کے قبرستان میں دفن ہونے کے خلاف تھی“

”تو پھر انکل؟“

”پھر ایک دن اس کی بڑی بیٹی اور داماد آکر اسے یہاں سے کراچی لے گئے اور جیسے وہ مدتوں سے بس اسی بات کی منتظر تھی، کراچی پہنچ کر کچھ دن میں اس کی طبیعت بحال ہوئی، فون پر اکثر اس سے بات چیت ہوتی اور وہ اپنی گفتگو میں مجھے ہمیشہ بے حد مطمئن لگی۔ لیکن ایک بات بس وہ سوتے میں مر گئی۔ اور وہاں اُس کی خواہش کے مطابق ہم نے اسے ”ٹاورز آف سالمینس“ کے سپرد کر دیا، بہرام ڈی سوزا یہ کہہ کر چپ ہو گئے لیکن مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر مزار سکوت کی بلندی پر تنہا چھوڑ دیا ہو۔

.....

مجھے یوں لگا جیسے میں کسی پرانے مقبرے سے باہر آ گیا ہوں۔

دقتاً فوقتاً میں انہیں دیکھنے جایا کرتا۔ لیکن ہوی کی غیر موجودگی میں سکوت میں ملخوف جنگلے کی ویرانی، میرے ذہن میں ہوی کی بتائی ہوئی پارسی جیمیز و شیفٹ کے پس منظر کو اجاگر کر دیتی۔

یہ شاید اسکول کے زمانے کی بات ہے، جب ہوی کے کسی بزرگ عزیز کا انتقال ہوا تھا اور ہوی نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا تھا کہ پارسی اپنے مردوں کو اس شہر میں تو بحالت مجبوری گورا قبرستان کے بغل میں موجود ایک چھوٹے سے قبرستان میں دفناتے تھے۔ لیکن پارسی روایت کے مطابق جیسے ان کی معیدوں میں آگ ہمیشہ روشن رہتی ہے، اسی طرح وہ اپنے مرنے والوں کو آبادیوں سے دور ویرانوں میں بنائے گے ”ٹاورز آف سالمینس“ میں چھوڑ آتے۔

یہ بلند و بالا مینار یہاں ملک کے شاید ایک ہی شہر میں تھے۔ جہاں پارسی مرنے والے کی لاش کو مینار کی بلندی پر چالی پر رکھ دیا جاتا تھا وہاں لاش کو چیلپیں، گدھ اور دوسرے مردار خور پرندے کھالیتے اور عرصے بعد بچی بچی ہڈیاں چالی کے سوراخوں میں سے نیچے مینار کی تہ میں گر جاتیں اور خاموشی کی گرد بن جاتیں۔

جانے کیوں، میں جب مسز ڈی سوزا کو دیکھنے جاتا تو مجھے اُن کا گھر ایک ”ٹاورز آف سالمینس“ دکھائی دیتا۔!

پھر کچھ عرصے بعد میں اپنی پریکٹس چھوڑ کر دشت نور دی کے لیے ایران چلا گیا، جہاں میرے پوسٹنگ کرمان کے صوبے میں ہوئی۔ تہران اور کرمان کے درمیان چار برس کے دوران، کئی بار ہوائی اور زمینی سفر ہوئے لیکن پہلی بار جب ہوائی جہاز نے کرمان کے ایئر پورٹ پر اترنے کے لیے صحرا میں چکر لگانے شروع کئے تو جہاز کی کھڑکی سے نیچے اڑتی ہوئی چیلپوں کے دائروں تلے دور



گھرانوں میں سے ایک تھا۔ ابو کا اپنا بڑا بھائی تھا۔ ہمارے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ہم کل تین بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑے جمال بھائی، پھر میں اور مجھ سے آٹھ سال چھوٹی شفاء جمال بھائی ایک عرصے سے جرمنی میں مقیم تھے۔ وہاں کی قومیت بھی ان کے پاس تھی اور ان کی منگنی تایا کی لڑکی افروز سے ہو چکی تھی۔ دو سال بعد شادی ہونا طے پایا تھا۔ شفاء انٹر کا امتحان دے چکی تھی اس کی اور میری عمروں میں کافی فرق تھا مگر پھر بھی ہم دوستوں کی طرح رہتے اور شفاء مجھ سے ہر قسم کی بات کر لیتی۔ اسی نے مجھے ایک دن یہ بتایا کہ اسے شیراز پسند ہے۔ شیراز ہمارے تایا کا اکلوتا بیٹا تھا اور بڑا ہی خوبصورت اور اساتذہ لڑکا تھا اس کی دو بہنیں بھی تھیں تایا جان کا کہہ اندھ بھی کافی خوشحال تھا مگر ان کا اسٹینڈرڈ ہم سے کچھ کم تھا۔ جب شفاء نے مجھے یہ بات بتائی کہ وہ شیراز کو پسند کرتی ہے تو نہ جانے کیوں مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ یہ ظاہر تو میں ہنس دی۔

”اچھا تو یہ بات ہے بنو کو شیراز پسند ہے مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ چاہت یک طرفہ ہے یا اس نے بھی تم سے کچھ کہا۔“

”کہا تو کچھ نہیں آئی مگر اس کے انداز سے لگتا ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔“

یہ بات کہتے ہوئے شفاء کے چہرے پر پھول سے کل اٹھنے لگی اندر ہی اندر مل کھا کر رہ گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کب اور کیسے ہوا مگر یہ ایک سچ حقیقت تھی کہ میں بھی شیراز کو پسند کرتی تھی حالانکہ وہ مجھ سے چھ سات سال چھوٹا تھا اور وہ مجھے ہمیشہ ہما آئی کہہ کر پکارا کرتا تھا مگر نہ جانے کیوں میں تنہائی میں اس کے بارے میں سوچا کرتی۔ میرے پاس اس کے دو ایک فوٹو بھی تھے جو میں اپنے کمرے میں الماری کے لاکر میں رکھا کرتی تھی۔ مجھے خود اپنے آپ پر حیرت ہوتی تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ دنیا والے کیا کہیں گے۔ خود

میرے گھر والے اس رشتے پر کبھی راضی نہ ہوں گے۔ یہ ایک بے جوڑ شادی ہوگی اور پھر خود شیراز جو مجھے ہما آئی کہا کرتا ہے وہ یہ سب سن کر کیا سوچے گا مگر اس دل کا کیا کیا جائے۔ اس پر کسی کا کنٹرول نہیں یہ بعضاوقات ایسی خواہش کر بیٹھتا ہے جیسے چکور چاند کی۔

شفاء کے یہ بات بتانے سے پہلے میں یہ بات محسوس کر چکی تھی کہ شیراز جب بھی ہمارے گھر آتا ہے شفاء ہی کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ شفاء کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کے جنو جنک گانے لگتے تھے۔ پھر ان دونوں کی پسند ناپسند اور مشاغل بھی ایک جیسے تھے۔ وہ ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ایک دوسرے پر جھلے کتے شفاء نے شیراز کا نام ’میاں کھوڑا کھا ہوا تھا کیونکہ شیراز ہر کام لٹے ہاتھ سے کیا کرتا تھا اس طرح شیراز شفاء کو بی بی بھلکڑ کہہ کر چھیڑا کرتا تھا کیونکہ شفاء کو راستے وغیرہ بہت مشکل سے یاد ہوتے تھے۔ کئی کئی بار بتانے کے بعد اسے بڑی مشکل سے اپنے کانچ کا راستہ یاد ہوا تھا۔ یہ ظاہر وہ لوگ ایک دوسرے سے لڑتے تھے مگر ہم سب لوگوں کو ان دونوں کی چاہت کا اندازہ تھا اور کسی کو اس بات پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔ اس سے بہتر اور کیا بات ہوئی کہ ان کی بہن ہمارے گھر اور ہمارے بہن ان کے گھر چلی جائے۔ دیے بھی ابو شیراز کو بے حد پسند کرتے تھے۔ بس اس رشتے سے اگر کسی کو تکلیف تھی تو وہ میری ذات تھی۔ شیراز میرے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ میں چاہتی تھی وہ میرے ساتھ بھی بے تکلف ہو جھلے کتے میرا بھی کوئی نام رکھے مگر شیراز میرے ساتھ بڑے احترام سے پیش آتا ہمیشہ ہما آئی کہہ کر مخاطب ہوتا تھا مگر میرے خیالات کسی اور ہی ڈگر پر چل پڑے تھے۔

جب بھی شیراز ہمارے گھر آتا میں چپ کر اس کی عمرانی کرتی۔ یہ ظاہر تو ڈیڑہ جا کر اس سے مل لیتی اس کے گھر والوں کی خبر خیریت پوچھ

کر چوہاں سے ہٹ جاتی مگر شیراز کہاں جا رہا ہے کس سے باتیں کر رہا ہے مجھے سب معلوم ہوتا۔ میں اسے شفاء کے ساتھ کئی بار چھوٹی چھوٹی گستاخیاں کرتے دیکھ چکی تھی جن پر یہ ظاہر شفاء ناراض ہوتی مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ اندر سے نہال ہو جاتی ہے۔ ایک روز میں اوپر اپنے کمرے کی کڑکی میں کھڑی تھی نیچے لان میں شفاء بیٹھی اپنا کانچ کا کام کر رہی تھی کہ شیراز آ گیا۔ میں شیراز کو دیکھتے ہی پردے کی اوٹ میں ہو گئی۔ شیراز چپکے چپکے شفاء کے پیچھے پہنچا اور اس کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ دونوں میں کچھ دیر کچھ مکالمے بازی ہوئی پھر شیراز نے ادھر ادھر دیکھ کر شفاء کا ہاتھ چوم لیا اور اس کی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ شفاء ایک دم لال ہو گئی اس نے ایک کتاب اٹھا کر شیراز پر پھینکی جو شیراز نے سچ کر لی۔

اس سے زیادہ میں نہ دیکھ سکی۔ نہ جانے کیوں مجھے شفاء سے شدید نفرت محسوس ہونے لگتی۔ میرا دل چاہنے لگا کہ ابھی جاؤں اور شفاء کا منہ فوج لوں اس کے اتنے پھیر لگاؤں کہ اس کا چہرہ ہی بگڑ جائے اور پھر شیراز اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ آخر کیا تھا شفاء میں جو مجھ میں نہ تھا۔ مانا کہ شفاء انتہائی حسین لڑکی تھی اس کی رعیت گلانی اور چہرے کے نقوش انتہائی چمکے تھے مگر یہ صورت تو میں بھی نہ تھی۔ میرا شمار بھی خاندان کی حسین ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا میرا جسم انتہائی سڈول تھا لیکن شفاء نے کھنک اپنی عمر کی وجہ سے یہ بازی جیت لی تھی شیراز اس کا ہم عمر تھا لہذا وہ اکی کا دلوانہ تھا۔ میری طرف اس نے اس نظر سے بھی دیکھا ہی نہیں۔

ایک روز میں شفاء اور شیراز امی کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شفاء نے کچھ آڈیو کیسٹ بھروائی تھیں۔ وہ شیراز کو اور مجھے دکھا رہی تھی۔ جس کرسی پر شفاء بیٹھی تھی وہ شیراز کے بہت نزدیک تھی میں ڈرادر دھری اتنے میں شفاء فون آ گیا۔ وہ

اٹھ کر فون سننے چلی گئی میں فوراً اٹھ کر اس کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اتفاق سے لائن چلی گئی۔ شیراز اس تبدیلی کو نوٹ نہ کر سکا اس نے فوراً موبیخ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بازو پر ایک زوردار چٹکی لی۔ وہ غالباً یہی بھڑکا ہوا تھا کہ میں شفاء ہوں۔ تکلیف سے میری سسکاری نکل گئی۔ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میرے کمرے میں آتے ہی لائن آ گئی۔ شیراز نے واقعی بڑے زور سے چٹکی لی تھی۔ جس جگہ اس نے چٹکی لی تھی۔ وہاں چھوٹا سا لال نشان پڑ گیا تھا۔ میں پتا نہیں کتنی دیر اس نشان کو سہلاتی رہی۔ یہ میرے محبوب کا دیا ہوا تحفہ تھا۔ لذت اور کیف کی لہریں میرے سارے جسم میں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تصور ہی تصور میں شیراز کی بانہوں میں پھنسی گئی۔

اکثر شفاء شیراز کو دینے کے لیے چھوٹے موٹے تحفے خریدتی تو مجھے بھی دکھائی۔ ابھی فریوئم کبھی ٹائی پن، کبھی کوئی جین وغیرہ۔ اسی طرح سے شیراز بھی جب اسے کوئی گفٹ دیتا تو وہ مجھے ضرور دکھاتا۔ یہ ظاہر تو میں بڑی خوش ہوتی لیکن اندر ہی اندر سلگ کر رہ جاتی۔ پھر انہی دنوں چھوٹے ماموں کی لڑکی فوزیہ کی منگنی کا شور اٹھا۔ ماموں کی دو بی لڑکیاں تھیں ان کی بڑی لڑکی کی بات طے ہو گئی تھی۔ وہ اپنی لڑکی کی منگنی کر رہے تھے۔ شادی ایک سال بعد ہونا طے پائی تھی۔ ظاہر ہے اس اہم موقع پر ہمارے سارے خاندان کا بلاوا آیا تھا۔ میں اور شفاء بھی ماموں کے یہاں جانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ منگنی سے ایک روز پہلے شفاء میرے کمرے میں آئی اور کہنے لگی۔

”ہما آئی اوہ آپ سے ایک بات کہنا تھی۔“

”ہاں ہاں شفاء کہو کیا بات ہے۔“

”وہ آپی میں۔ میں فوزیہ کی منگنی میں نہیں جاسکتی۔“

”کیوں۔“



”وہ مجھے بہت کام ہے۔ کالج سے اتنا کام ملا ہے۔ پریکٹیکل کے لیے جزل بھی بنانا ہے پھر میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”لیکن شام! ماموں جان کیا سوچیں گے اور پھر فوڈ تو باقاعدہ تم سے ناراض ہو جائے گی۔“

”اسی لیے تو آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ ان کے گھر جائیں گی تو انہیں اس طرح سے سمجھا دیجئے گا کہ وہ برائے نام ہیں۔“

”مگر ابھی کل تک تو تم جانے کے لیے تیار تھیں۔ تم نے اپنے کپڑے وغیرہ بھی مجھے دکھائے تھے یہ اچانک کیا ہوگا۔“

”جی جی آئی۔ پلیز بس میں نہیں جاسکتی میں نے کہہ تو دیا نا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

اور پھر شام تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے کچھ شک سا ہو رہا تھا کہ شام کالج کے کام یا طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر رہی ہے۔ بات کچھ اور ہے۔ یقیناً اسے شیراز نے منع کیا ہوگا کہ وہاں نہ جائے مگر کیوں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے شیراز کو فون کھما دیا۔

”ہلو جی شیراز کیسے ہو۔“

”بس ٹھیک ہوں آئی آپ سنا بیٹے کیسے یاد کیا۔“

”کچھ نہیں بس میں یہ کہہ رہی تھی کہ کل تم ماموں جان کے یہاں آؤ گے نا تو ذرا راستے میں رک کر کچھ تازہ پھولوں کے ہار لیتے آنا۔“

”میں آئی۔ میں تو شاید نہ آسکوں۔“

”ہائیں تم مفتی میں شرکت نہیں کرو گے۔“

”وہ بات اصل میں یہ ہے آئی کے کالج کا کام کچھ زیادہ مل گیا ہے۔ پریکٹیکل کے جزل وغیرہ بھی بنانے ہیں اور پھر میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے دو دن سے نزلہ زکام چل رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے کل میں گھر پر آرام ہی کروں تو بہتر ہے۔“

”اوہ اچھا اچھا۔ خیر تم آتے تو بڑا حزا آتا۔“

سبھی کزن آرہے ہیں خیر چلو کوئی بات نہیں خدا حافظ۔“

میں نے فون بند کر دیا مگر اب میں ساری کہانی سمجھ چکی تھی۔ شیراز نے شام کو یہ پٹی پڑھائی تھی کہ وہ بہانہ کر دے مفتی میں نہ جائے پھر یہی رک جائے۔ یہی حرکت شیراز اپنے گھر کر رہا تھا گو یاد رکھو مفتی میں جانے کے بجائے یہاں آئے گا اکیلے میں شام سے ملنے کے لیے۔ میرا خون کھولنے لگا۔ ایک دفعہ پھر مجھے شام سے شدید رقابت کا احساس ہونے لگا۔ وہ دونوں کل گھر میں تنہا ہوں گے بالکل تنہا۔ شیراز کی وہ چٹکی اس کی وہ گستاخیاں..... اچھا تو وہ دونوں اکیلے میں۔ اس کے آگے مجھ سے سوچا نہیں جا رہا تھا۔ میں چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھانے لگی اور پھر میرے شیطانی دماغ نے ایک منصوبہ بنایا۔

اگلے روز سبھی ماموں کے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے شام اپنے کمرے میں بھی وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں مفتی میں جا رہی ہوں تو وہ گھر پر رک سکے گی۔ دن کے وقت جب سب باہر ڈرائنگ روم میں جمع تھے میں نے اپنے کمرے میں تین چار سیب اور دو ایک کیلے کھائے اور پھر کن میں جا کر ایک گلاس نیم گرم پانی میں نمک ملا کر پی لیا۔ گرم پانی پیتے ہی میرا پیٹ مٹلانے لگا۔ میں باہر آ کر سب کے ساتھ بیٹھ گئی۔ طبیعت تو ماش کر رہی تھی میں نے طبیعت خراب ہونے کی اداکاری بھی ساتھ شروع کر دی پھر مجھے زوردار قسم کی الٹی آئی۔

میں نے ہاتھ روم کی طرف دوڑ لگی مگر ہاتھ روم آنے سے پہلے ہی تھوہڑی ہو گئی۔ میرا سارا کھانا پانی باہر آ گیا۔ سارے گھر والے بری طرح کھبرا گئے۔ میں وہیں صوفے پر لیٹ گئی اور ہاتھ پاؤں بالکل ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اب مجھے کسی سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ میری طبیعت خراب ہے۔ امی جان نے فوراً فیصلہ سنا دیا کہ ہمارے گھر میں آرام کرے گی اور شام مفتی میں جائے گی۔ شام کو برا تو

بہت لگا مگر ایک تو میری الٹی کو دیکھ کر اور دوسرے امی کے غصے کے سامنے وہ منہ پھلائے تیاری کرنے لگی۔ اس دوران میں وہ دو ایک مرتبہ فون کے قریب بھی آئی۔ مجھے خوب اندازہ تھا کہ وہ کے فون کرنا چاہ رہی ہے مگر ہر دفعہ میں نے زور اور سے کرنا شروع کر دیا۔ میں فون کے بالکل قریب ہی لیٹی ہوئی تھی۔ شام کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ فون کر سکے اور اسی دوران جانے کا شور مچ گیا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں گھر میں سناٹا تھا۔

سب لوگوں کے جانے کے بعد میں اطمینان سے اٹھی۔ میں نے شاور لیا۔ نیا سوٹ نکال کر پہنا۔ ہلکا سا میک اپ کیا اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میرا حسن غضب ڈھار رہا تھا۔

میں نے غور سے اپنے بالوں کو جھٹکا دیا اور اپنے اوپر پرفیوم کا اسپرے کر کے باہر نکل آئی۔ مجھے صرف انتظار کرنا تھا اپنے محبوب کا انتظار۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ گھنٹہ بھر بعد ہی شیراز کی بائیک کی آواز سنا دی اور پھر کال بیل بجی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا سامنے وہ دشمن جاں کھڑا تھا۔ سیاہ پیٹ اور سفید شرٹ میں وہ پہلے سے بھی بڑھ کر خوبصورت اور امسارٹ لگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

”ہا آئی۔ آپ۔“

”ہاں کیوں۔ تمہیں کسی اور کی توقع تھی کیا۔“

”نہیں۔ نہیں تو۔“

شیراز کھینچا ہوا کراؤ اندر چلا آیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

”پانی گھر والے ماموں جان کے یہاں مفتی میں گئے ہوئے ہیں۔“ میں نے جان بوجھ کر شام کا نام نہیں لیا۔

”جی۔ جی مجھے معلوم ہے مگر آپ کیوں نہیں کہیں۔“

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں گھر پر آرام کرنا چاہ رہی تھی۔ آج کل مفتی وغیرہ میں

بہت ہڑبویگ ہوتی ہے۔“

”آج تو آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“

وہ مصحوبیت سے بولا۔

سرشاری کی ایک لہر سر سے پاؤں تک میرے جسم میں دوڑ گئی۔

”ہوں آج شام نہیں ہے تو میری تعریف کر رہے ہو۔“

”نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے شام شام ہے اور آپ آپ ہیں۔“

”اچھا ٹھہرو میں تمہیں اچھی سی چائے پلائی ہوں۔“

میں چائے بنانے کچن میں آئی تو میں نے اپنی قمیض کے اوپر کے دو بٹن کھول دیے۔ چائے بنانے کے بعد میں واپس شیراز کے پاس پہنچی اور چائے میں چینی ملانے کے بہانے اس کے بالکل سامنے جھک گئی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کہاں دیکھ رہا ہوگا۔ میں نے اچانک گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کا چوہ پڑا گیا۔

”چینی کتنی؟“

شیراز بالکل گھبرا گیا۔ ”جی۔ وہ۔ وہ۔“

”ارے بھی میں پوچھ رہی ہوں تم چائے میں کتنی چینی لیتے ہو۔“

”جی۔ دو۔ ایک۔ ایک۔ ایک۔ ایک۔“

شیراز نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ میں اپنی فتح پر مسکرانے لگی۔

چائے پینے کے دوران ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے مگر میں محسوس کر چکی تھی کہ شیراز کی نظریں میرے سینے کے ارد گرد ہی بھگ رہی ہیں۔ چائے پینے کے بعد میں نے شیراز سے کہا۔

”ارے بھی شیراز! اب تم آئی گئے ہو تو پلیز میرا ایک کام کر دو۔“

”جی جی کہئے۔“

”میرے کمرے میں الماری کے اوپر کچھ کتابیں رکھی ہیں مجھے ان کی ضرورت ہے مگر میرا



ہاتھ وہاں نہیں پہنچ رہا۔

”چلنے میں اتار دیتا ہوں۔“ اس نے فرمانبرداری سے کہا۔ شیراز میرے ساتھ میرے کمرے میں چلا آیا میں نے اسے ایک چھوٹا سا اسٹول دیا اور وہ اسٹول پر چڑھ کر کتابیں اتار اتار کر مجھے پکڑنے لگا۔ میں نے تین چار مرتبہ کتابیں لینے وقت اپنے جسم کا مخصوص حصہ شیراز کے ہاتھوں سے مس کر دیا۔ شیراز گہرا ہٹ بڑی واضح تھی۔

کتابیں اترانے کے بعد وہ ہاتھ جھاڑتا ہوا اسٹول پر سے اتر گیا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ادھر آؤ شیراز! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔“

”جی جی کہئے۔“ اس ل آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے شیراز کو اپنے بیڈ پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”شیراز! مجھے معلوم ہے کہ تم ثناء کو پسند کرتے ہو۔“ میں نے بلا جھجک کہا۔

”جی ہاں! ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

”لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ کوئی اور بھی تمہیں پسند کرتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی۔“

شیراز حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”شیراز! میں بھی تمہیں پسند کرتی ہوں۔ پوچھا کرتی ہوں تمہاری۔ میرے من مندر کے دیوتا ہو تم۔ کاش میں اپنا دل چر کر تمہیں دکھا سکتی۔“

میری آواز جذبات سے مغلوب تھی۔

شیراز پہلے تو خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا مگر پھر جب میری باتوں کا مفہوم اس کی سمجھ میں آ گیا تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں

پیدا ہو گئی۔

”یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ہما آپی۔“

”میں جی کہہ رہی ہوں شیراز۔“

میں نے آگے بڑھ کر شیراز کا ہاتھ تھام لیا۔

”پتا نہیں کب سے تمہارے پیار کی آگ میں جل رہی ہوں۔ پتا نہیں کتنی راتیں میں نے تمہارے فراق میں جاگ کر کاٹی ہیں۔ میں تمہیں دیوانہ وار چاہتی ہوں مگر تم بے خبر ہو۔“

میں نے شیراز کا ہاتھ چوم لیا اچانک شیراز نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور کھڑا ہو گیا۔

”ہما آپی

ہوش

”کچھ“ میں تو آپ کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ میں ثناء کو پسند کرتا ہوں آپ یہ سب مجھ سے کہہ رہی ہیں۔ آپ کو شرم نہیں آتی آپ اپنی اور میری عمروں کا فرق تو دیکھیں۔“

”شیراز۔ میری بات تو سنو“ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

”میں کچھ سننا نہیں چاہتا“ مجھے معلوم تھا کہ آپ اتنا گر بھی سکتی ہیں۔ میں آج ہی ثناء کو بتاؤں گا کہ۔“

”تم ثناء کو کیا بتاؤ گے۔“ میرا انداز فوراً بدل گیا۔ میں طیش کے عالم میں کھڑی ہو گئی۔ اپنی توہین کے احساس سے میں تھلائی جا رہی تھی۔

”جب ثناء یہ دیکھے گی تو تمہارے منہ پر تھوکے گی بھی نہیں۔“ میں نے ایک جھٹکے سے جھری آواز کے ساتھ اپنی محض کا گریبان پھاڑ ڈالا۔ مارے حیرت کے شیراز کا منہ کھلا رہ گیا۔

”جب میں ثناء کو بتاؤں گی کہ تم مجھے کھر میں تنہا پر کرنا کرنے والے تھے تو وہ تمہاری شکل بھی نہیں دیکھے گی۔“ میں دانت پیس پیس کر بول رہی تھی۔

”اور میں یہ پہنا ہوا گریبان اپنے ابو کو بھی

دکھاؤں گی اور چمال بھائی کو بھی اور اس کے بعد تمہاری بہن کی منگنی ٹوٹنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگے گا۔“

شیراز کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ وہ چپ کھڑا تھا۔ میں نے اپنے غصے کو قابو کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”دیکھو شیراز! میری بات نہ مان کر تم ثناء کو تو کھو گے ہی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی بہن کا گھر بھی اجاڑ دو گے۔ میری بات مان جاؤ۔ اس کمرے میں جو کچھ ہوگا اس کا علم کسی تیسرے کو نہیں ہوگا۔“

”آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے ہما آپی۔ آپ کی خواہش گناہ کی ہے۔ آپ کبھی کیوں نہیں ہیں۔“

”محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ شیراز! میں نے تمہیں چاہا ہے کیا یہ جرم ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ دنیا والے بھی جائز طریقے سے مجھے اپنی یہ خواہش پوری نہیں کرنے دیں گے۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“ میں سرمستی کے عالم میں کہے جا رہی تھی۔

شیراز سر جھکا کر میرے بیڈ پر بیٹھ گیا گویا اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور کمرے کی لائٹ آف کر دی اور شیطانی کھیل شروع ہو گیا۔

اس واقعے کے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد میں نے شیراز کو فون کیا۔ اس دوران میں شیراز نے ہمارے گھر آنا بالکل بند کر دیا تھا۔ ثناء کو بڑی بے چینی تھی اور میں اندر ہی اندر بہت مسرور تھی۔ فون پر شیراز بڑا اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کل دن میں امی اور ثناء شاپنگ کے لیے جا رہی ہیں لہذا وہ شرافت سے کل گھر آ جائے۔

”سوری ہما آپی! میں کل بہت مصروف ہوں۔“ اس نے مجھے نالٹا چاہا۔

”دیکھو شیراز میں بہت آرام سے بات کر رہی ہوں اور میں اپنی بات دہراؤں گی بھی

نہیں۔ تم اگر کل تین سے چار کے درمیان میرے پاس نہیں آئے تو میں جمال بھائی کو فون کر کے سب کچھ بتا دوں گی اوکے۔ خدا حافظ۔“

اگلے روز شیراز میرے کمرے میں موجود تھا۔ اس کا موڈ کافی خراب تھا مگر مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے خوشیوں میں سے اپنا حصہ کشید کرنا تھا اور بس۔

اس روز ہلی ہلی بارش ہو رہی تھی۔ امی اور ثناء ماموں جان کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ موسم بڑا رنگین ہو رہا تھا۔ میں تو ایسے موقع کی تلاش میں رہتی تھی جب گھر پر کوئی نہ ہو۔ میں نے حسب معمول شیراز کو فون کر کے بلا لیا۔ یہ شاید چھٹایا سا تو اس موقع تھا جب میں نے شیراز کو اکیلے میں بلوایا تھا۔ اس روز شیراز کافی عرصے میں لگ رہا تھا۔ میری اکثر باتوں کا تو اس نے کوئی جواب ہی نہ دیا۔ جب وہ واپس جانے کے لیے کپڑے پہن رہا تھا تو میں نے بڑے پیار سے اسے پکارا۔

”شیراز! میری ایک بات سنو۔ بھیجی میری طرف دیکھو تو سنی آخر ہم نے محبت کی ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ شیراز غصے میں پھنکا رہا۔

”میں نے آپ سے کبھی محبت نہیں کی اور آپ۔ معاف کیجئے گا آپ نے بھی مجھ سے محبت نہیں کی۔ آپ نے صرف اپنے نفس سے محبت کی ہے، صرف اپنے نفس کی خواہش کو پورا کیا ہے۔“

”چلو یوں ہی سہی۔ مگر وہ بات تو سن لو جو میں کرنا چاہتی ہوں۔“

”کہئے۔“

”میں اگلے ہفتے اپنی ایک سہیلی کے ساتھ مری جا رہی ہوں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم بھی کسی طرح مری آ جاؤ صرف چند دن کے لیے۔ خرچے کی تم بالکل فکر نہ کرو میں جہاز سے تمہاری سیٹ بک کروا دوں گی۔“

”کس لیے ہما آپی۔ محض اس لیے آپ وہاں دن رات اپنی خواہش پوری کر سکیں۔ بلا کسی



نکاح کے دوسرے روز میں نے فرحت کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ اس روز کفیل بھائی کو بھی دیکھ لیا پھر یہ دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا کہ کفیل بھائی جمیل سے زیادہ خوبصورت زیادہ اسمارٹ تھے وہ کسی صورت جمیل کے بڑے بھائی نہیں لگتے تھے جب کہ وہ جمیل سے پانچ سال بڑے تھے۔

### اس شاعر کے لیے ایک حساس وجد باقی دل گداز گئی کہانی

ٹھنڈک اور میری روح کو چین ملے لیکن مجھے کوئی سزا دینے والا نہیں مجھے کوئی سکون بخشے والا نہیں اور مجھ میں اتنی جرات نہیں کہ میں اپنے کرب اپنے دکھ اور اپنی بے چینی تڑپ اور اس آگ کا کسی سے ذکر کروں مجھے اندر ہی اندر جلارہی ہے۔  
میں ان مجرموں میں سے نہیں ہوں جو جان بوجھ کر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جرم کرتے

میں اپنے حمیر کی عدالت میں گزشتہ پانچ سال سے کھڑی ہوں میرا دکھ میرا کرب ایسا ہے کہ میں کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی۔ نادانی اور بے وقوفی میں جو جرم میں نے کیا تھا وہ میں کسی سے بتا بھی نہیں سکتی تاکہ میرے دل پر جو بوجھ ہے وہ ہلکا ہو۔ میں بغیر اقرار جرم کے سزا چاہتی ہوں اسی سزا کہ جس سے میرے قلب کو سکون میرے ذہن کو



تھی۔

ایک گھنٹے بعد ہی تاپا جان کا فون آیا۔ وہ سول اسپتال سے بول رہے تھے۔ شیراز کا ایکسٹنٹ ہو چکا تھا۔ وہ بارش میں بہت تیز بائیک چلا رہا تھا کہ شاہراہ فیصل پر اس کی بائیک سلب ہو گئی اسے اسپتال پہنچایا گیا مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی تاپا جان کے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

اس کے بعد مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ کیا ہوا۔ تاپا جان کا سنا ہوا چہرہ تانی اماں کا بینا بہنوں کے آنسو اور کفن میں لپٹا ہوا شیراز سب کچھ میری نظروں میں آج بھی ایک فلم کی طرح گردش کرتا ہے۔ سب کو اس بات پر حیرت ہے کہ شیراز جیسا تپا کا بارش میں اتنی تیز بائیک کیوں چلا رہا تھا جبکہ عام آدمی بھی بارش میں آہستہ گاڑی چلاتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی جوان موت کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ بارش میں اتنی تیز بائیک کیوں چلا رہا تھا۔ سوچتی ہوں گناہ تو میں نے کیا تھا سزا شیراز کو کیوں ملی۔ مرنا تو مجھے چاہیے تھا مگر منوں مٹی کے ٹپے وہ جاسویا جس نے گناہ کے خلاف بغاوت کی تھی وہ میری ہوس کی بھینٹ چڑھ گیا۔

آج اس بات کو برسوں بیت چکے ہیں۔ ثناء کی شادی ہو گئی۔ جمال بھائی کی بھی افروز سے شادی ہو گئی۔ ماں باپ کا انتقال ہو گیا مگر میں نے شادی نہ کی۔ میں نے اپنے لیے یہ سزا خود تجویز کی ہے۔ تہائی کی سزا مجھ ایسی ڈائن کے لیے تو ہر سزا سے کم ہے۔ شاید شیراز کی روح مجھے معاف کر دے۔ شاید۔



روک ٹوک کے۔

”دیکھو شیراز! میں جتنے قتل سے بات کرتی ہوں تم اتنا ہی بڑا کر جواب دیتے ہو۔ تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ انکار کی صورت میں میں کیا کر سکتی ہوں۔“ میں نے دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا۔

”ہاں ہاں جانتا ہوں خوب جانتا ہوں“ جیسے کچھ فون اپنے بھائی کو اب میں آپ کو نہیں روکوں گا۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔“ وہ آج تو مجھے سے اکھڑا جا رہا تھا۔

”شیراز شاید تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔“ ہوش میں تو میں اب آپا ہوں ہمارا آئی! مگر اب میں گناہ کی اس دلدل میں نہیں اتر سکتا۔ اگر ثناء مجھے نہ ملے تو یہ میرا نصیب! اگر میری بہن کی منگنی ٹوٹ گئی تو یہ اس کا مقدر! مگر اب میں آپ کے اشاروں پر نہیں ناچ سکتا۔ میں جا رہا ہوں اب آپ کا جو جی چاہے وہ کیجئے۔“

شیراز میرے چہرے پر ہلکا سا ہنس گیا۔ میں جیتتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے بھاگی۔

”رگ جاؤ شیراز۔ شیراز میری بات سنو“ شیراز صرف ایک منٹ۔“

مگر شیراز نہ رکا۔ اس نے اپنی بائیک اشارت کی اور کوئی کی طرح گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس وقت بارش تیز ہو چکی تھی۔ میرا دل ہول گیا۔ ایسی بارش میں اتنی تیز بائیک چلانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

پھر مجھے پچھتاوا شروع ہو گیا۔ شیراز ٹھیک کہتا ہے گناہ کا یہ کھیل مجھے اب بند کر دینا چاہیے۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ ایک دو دفعہ کے بعد یہ کھیل ختم کر دوں گی مگر شیطان نے ہوس کا ایسا جال پھیلایا کہ میں سب کچھ بھلا بیٹھی بہر حال میں نے سوچ لیا کہ میں کسی کو کوئی فون نہیں کروں گی۔ اب تک جو ہوتا تھا ہو چکا مگر اب میں شیراز کی زندگی میں دخل نہیں دوں گی مگر میں نے یہ فیصلہ کرنے میں دیر کر دی مجھ سے پہلے قدرت اپنا فیصلہ سنا چکی



ہیں۔ میں نے تو بغیر سوچے سمجھے ایک حرکت کردی اور اپنی اس حرکت کا احساس بھی مجھے اس وقت ہوا جب میں خود ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں سے واپسی کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں اور ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے جو موت کی کھائی کی طرف جاتا ہے۔ میں کسی کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلا سکتی تھی اور سوائے خدا کے کوئی میری مدد کر بھی نہیں سکتا تھا اور خدا شاید میری مدد کرنا ہی نہیں چاہتا تھا ورنہ جو دعائیں فرحت جہاں کے لیے میں نے مانگی تھیں وہی قبول ہو جاتیں۔

فرحت میری بہت اچھی دوست تھی۔ شادی تو میری فرحت کی شادی سے تین سال بعد ہوئی تھی اور اپنی شادی سے دس پندرہ دن پہلے ہی مجھے معلوم ہوا کہ میں بھی علامہ اقبال کا لونی ہی میں بیاہ کر جاؤں گی اور اس گھر میں جہاں فرحت بیاہ کر گئی ہے۔ فرحت اور میں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے یہ بات الگ ہے کہ فرحت مجھ سے دو کلاس آگے تھے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو فرحت کا بچہ میں تھی۔ اس کے کالج پہنچنے کے بعد میری اس سے ملاقاتیں کم ہو رہی تھیں پھر جب اس کی شادی ہو گئی تو یہ بھی کسی کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔

میں نے جب اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر دیکھی تو پہلا خیال میرے دل میں یہی آیا تھا کہ جمیل احمد یقیناً فرحت کے شوہر سے خوبصورت ہوگا۔ جمیل بے تو فرحت کے شوہر کا چھوٹا بھائی لیکن چھوٹے عمو اپنے بڑوں سے خوبصورت ہوتے ہیں۔ لیفل احمد کو میں نے دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی مجھے فرحت نے اپنے شوہر کی تعریف میرے آگے کی تھی اگر وہ جمیل احمد جیسا بھی ہوتا تو فرحت اس کی تعریف ضرور کرتی۔ یہ سوچ کر میں خود ہی مسکرا دی تھی۔ پتا نہیں یہ بے وقوفی کے خیالات میرے ذہن میں کیوں آ رہے تھے اگر فرحت جہاں کا شوہر جمیل احمد سے خوب صورت بھی ہے تو کیا ہوا دنیا میں ایک سے ایک خوبصورت چیز ہے۔ جو چیز جس

کو مل جائے یہ تو اپنے اپنے مقدر کی بات ہوتی ہے۔ فرحت جہاں کے شوہر سے اپنے شوہر کا مقابلہ میں کیوں کروں۔

یہ خیالات چند لمحوں کے لیے میرے ذہن میں آئے تھے اور پھر میں نے سوچا تھا میں بیاہ کر فرحت جہاں کے گھر ہی میں جا رہی ہوں پہلے تو میں فرحت کے شوہر کو دلہا بھائی کہتی تھی اب تو وہ جیسے جی ہو جائیں گے اور فرحت میرے شوہر کو کیا کہے گی۔

”یہاں کمرے میں بڑی کیا سوچ رہی ہو۔“ امی کی آواز پر میں چونک گئی۔ ”شام میں مہمان آرہے ہیں۔ میرا ہاتھ بناؤ جھانکیلی سے اب کچھ نہیں ہوتا۔“

میں بیڈ سے اٹھ گئی۔ میں نے امی سے نہیں پوچھا کون مہمان آرہے ہیں کیوں کہ میں جانتی تھی۔ فرحت کے گھر والے شادی کی تاریخ لینے آرہے ہیں میرے گھر میں صرف میں بڑی تھی دوسری دو بہنیں اسکول گئی تھیں وہ دنوں گھر کا کام کرتی نہیں تھیں پھر ان کی عمر بھی کیا تھی۔ ایک پانچ سال کی اور دوسری سات سال کی امی تو اچھی ان سے کوئی کام نہیں لیتی تھیں۔ میں نے ڈرائنگ روم کی صفائی کرتے ہوئے سوچا تھا۔ میں گھر سے چلی جاؤں گی تو امی بہت پریشان ہو جائیں گی مگر افراد بھی تو کم ہو جائیں گے۔ میرے ایک کم ہو جانے سے گھر کا کتنا کام کم ہوگا۔ بس چار پانچ روٹیوں کا فرق پڑے گا۔ بانی گھر تو میرے جانے کے بعد بھی اتنا ہی بڑا رہے گا جتنا بڑا ہے۔

ابو کو گھر کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مارکیٹ سے سودا تک نہیں لاتے تھے۔ ”مردکی ذمہ داری صرف سروس کرنا نہیں ہے۔“ امی بسا اوقات بڑبڑاتی تھیں۔ ”آپ تو یہ سمجھتے ہیں کہ سروس کر کے ہی آپ بڑا تیر مار رہے ہیں دفتر سے واپسی کے بعد بھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلا لیا کریں۔ آپ تو بس کتابوں میں کم ہو جاتے ہیں۔“

”تم بھی کچھ پڑھا کرو۔“ ابو کہتے۔ ”مطالعہ کرنے سے دماغ روشن ہوتا ہے اور انسان کی ادنیٰ میں ترتیب آ جاتی ہے۔“

”گھر اور بچے سنبھال کر بھی ترتیب آ جاتی ہے۔“ میں تو کہتا ہوں گھر کے کام کے لیے ایک ملازمہ رکھ لو لیکن تم تو زمانے بھر کی ہو پیسہ تم سے چپک جاتا ہے۔ خرچ کیسے ہوگا۔

”ایک دو نہیں پوری تین ہیں جب جائیں گی گھر خالی کر کے جائیں گی۔“

”اپنے اپنے مقدر کا لے کر جائیں گی ہمارا کیا ہے۔“ ایسی بات کرنے سے فرض ادا نہیں ہوتا۔

”تم جو جانتی ہو وہ تو گری ہو۔ اب میری کیا ضرورت ہے۔“ ابو کہتے۔ ”نخواہ تمہارے ہاتھ میں لڑکیاں تمہارے ہاتھ میں اور ہم تمہارے ہاتھ میں۔“

”آپ کو تو بس باتیں بنانا آتی ہیں۔“ امی کہہ کر اپنے کام میں لگ جاتیں۔ امی غلط کہتی تھیں کہ ابو کو صرف باتیں بنانی آتی تھیں۔ وہ بہت پیسے کماتے تھے ملازمت کے سوا کسی دوسری کاروبار میں اٹھے ہوئے تھے۔ ان سے ملنے جو گھر پر آتے تھے۔ میں ان کو دیکھ کر ہی اندازہ لگاتی تھی جو کاروبار بھی ان کی سمجھ میں آتا وہ کر لیتے تھے۔ اس کاروبار کی آمدنی سے وہ دیگر اخراجات کرتے تھے داؤد ادائی اور اپنے چھوٹے دو بھائیوں کی تعلیم کے اخراجات بھی وہ پورے کرتے تھے وہ کہا کرتے تھے نخواہ میں کیا ہوتا ہے جب تک انسان دوسرا کوئی کام نہ کرے زندہ نہیں رہ سکتا۔

میری دونوں بہنیں ابھی بہت چھوٹی تھیں لیکن ہر ماہ ان کے اکاؤنٹ میں بھی ایک مخصوص رقم جمع کر دیا کرتے تھے میرا اپنا بھی اکاؤنٹ ہے گھر سے نام پر جمع کی ہوئی رقم ہی میری شادی میں

خرچ ہوگی۔

شام میں مہمان آئے اور میری شادی کی تاریخ دی گئی۔ میرا خیال تھا کہ تاریخ لینے فرحت بھی آئیں گی لیکن معلوم نہیں کیوں نہیں آئی تھی۔ میں کسی سے پوچھ تو نہیں سکتی تھی کہ فرحت کیوں نہیں آئی ورنہ اس دن مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ بیاہ ہے اس لیے نہیں آئی۔ اس دن میں نے یہی سوچا تھا کہ اب شادی میں تو اس سے ملاقات ہو جائے گی۔

فرحت سے میری ملاقات شادی سے پہلے ہی ہو گئی۔ جمعہ بازار میں وہ خریداری کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا اس لیے میں خود اس کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا بدن کچھ بھاری ہو گیا تھا پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا۔

”شادی سے پہلے چند دن تو پردہ کر لے۔“ فرحت نے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

”اگر اس وقت میرے ساتھ جیل ہوتا تو۔“

”اس روز لینے کیوں نہیں آئی تھیں۔“

”ارے پاگل، اب تو نہیں چلے گا۔“ فرحت نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”اب رشتے میں میں بڑی ہوں، میرا ادب کیا کرو۔“

”وہ تو میں اچھی طرح ادب کروں گی۔“ میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ ”ویسے تم سال دو سال مجھ سے بڑی تو ہو لیکن جیسا ادب میں تمہارا اسکول میں کرتی تھی ویسا ہی کروں گی۔“

”اسکول میں تو تم بہت شرارتیں۔“ فرحت نے کہا۔ ”کیا اب بھی ایسی ہی ہو۔“

”جب ساتھ رہیں گے تو تمہیں پتا چل جائے گا۔“ ویسے جمیل بھی تمہاری طرح خوش مزاج ہے جوڑی خوب رہے گی۔“ فرحت نے کہا۔ ”آج اس کی چھٹی ہے میں نے کہا بھی کہ چلو کچھ خریداری کر لیں گے تو بولا۔“ بیوی آ جائے پھر مارکیٹ جایا کروں گا۔ آپ اپنے میاں کو لے کر جائیں۔ وہ سامان اٹھا کر آپ کے پیچھے پیچھے چلیں



”کے۔“ اس فقرے نے مجھے موقع دیا اور میں نے پوچھا۔ ”کیسے ہیں لگیل بھائی میں نے تو انہیں دیکھا چھی نہیں۔“

”جیسے مرد ہوتے ہیں ویسے ہی وہی بھی ہیں۔“

”خوبصورت تو بہت ہوں گے۔“

”اچھا اب بھی۔“ فرحت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جیل سے زیادہ خوبصورت نہیں تیرا نصیب اچھا ہے۔“

فرحت کی بات سن کر مجھے تسلی تو ہوئی تھی لیکن میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ فرحت جھوٹ بھی تو بول سکتی ہے۔ خیر چند دن بعد خود دیکھ لیں گے۔ ہم دونوں بہت جلد رخصت ہو گئے تھے۔ اس کے بعد مہندی والے دن فرحت سے ملاقات ہوئی تھی یا پھر نکاح والے دن۔ نکاح والے دن میں اس قابل تو تھی نہیں کہ فرحت سے باتیں کرتی۔ بس بعض بعض وقت میں اسے ترچھی نظروں سے دیکھ لیتی تھی۔

نکاح کے دوسرے روز میں نے فرحت کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ اس روز لگیل بھائی کو بھی دیکھ لیا پھر یہ دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا کہ لگیل بھائی جیل سے زیادہ خوبصورت زیادہ اسماٹ تھے وہ کسی صورت جیل کے بڑے بھائی نہیں لگتے تھے جب کہ وہ جیل سے پانچ سال بڑے تھے۔

”فرحت“ جیل کی دلہن تو بہت خوبصورت ہے۔“ انہوں نے دوسری صبح مجھے دیکھ کر کہا تھا۔

”مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت۔“ فرحت نے بہت آہستہ سے کہا لیکن میں نے سن لیا۔

”بتائیں۔“

”تم سے زیادہ خوبصورت تو کوئی نہیں ہے۔“ لگیل بھائی نے تیز آواز میں کہا۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔

لگیل بھائی کے جانے کے بعد فرحت نے

میرے قریب بیٹھے ہوئے پوچھا۔ ”کیسا ہے جیل جی جی بتانا۔“

”بہت اچھے بہت شری اور بہت باتونی“ میں نے بھی اپنی آواز دبا کر فرحت ہی کے انداز میں کہا۔ ”اور کچھ یا بس یہ کافی ہے۔“

”تمہیں پسند آ گیا یہ ہی میرے لیے بہت ہے ویسے جیل دل کا بھی برا نہیں ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”انصاف پسند بھی ہے کھری بات کرتا ہے چاہے کسی کو بری لگے کہ بھئی ویسے اماں کی بھی جان ہے وہ۔“

”اماں بھی تو مزاج کی اچھی ہی ہوں گی۔“ میں نے زیر لب کہا۔

”اللہ میاں کی گائے ہیں۔ بس چائے بہت پیتی ہیں اور پان لکھتی رہتی ہیں۔ اپنے سر کو میں نے نہیں دیکھا لیکن سنا ہے وہ بھی بہت نیک تھے۔ لگیل اور جیل کے بعد اماں کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔“

”اس کا مطلب ہے تند ہماری کوئی نہیں ہے۔“

”ہم ایک دوسری کی تند بن جائیں گی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم بھی تو اماں کی بیٹیاں ہیں۔“

شادی کے دوسرے دن صبح دس بجے میں امی کے گھر آ گئی تھی اور پھر شام میں اپنے گھر پہنچ گئی۔ اس کے بعد کے چار دنوں میں نے اپنے ہی گھر میں گزارے۔ ان چار دنوں میں مجھے بہت ساری باتیں معلوم ہوئیں۔ اماں کو بچوں کی اولاد کی بہت خواہش تھی۔ ان کے جینے کا بھی ایک لڑکا شادی شدہ ہے پر اس کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ میرے دادا سر کے صرف دو لڑکے تھے۔ ایک میرے مرحوم سرور ان کے بڑے بھائی باقی سارا خاندان ہندو مسلم فسادات میں مارا گیا تھا۔ اب اگر لگیل بھائی اور جیل کے اولاد ہوئی تو خاندان آگے بڑھتا یا پھر لگیل اور جیل پر ہی ختم ہو جاتا۔

”اولاد تو اللہ کے ہاتھ ہے۔“ میں نے کہا۔

فرحت میرے قریب لیٹی ہوئی اس خاندان کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”ویسے اللہ ہمیں نوازنے والا ہے۔“ فرحت نے کہا۔

”کیا مطلب۔“

”جب تمہاری تاریخ لینے اماں وغیرہ ہمارے گھر آئے تھے اس دن میری طبیعت خراب تھی۔ اس دن لیڈی ڈاکٹر نے میرے معائنے کے بعد بتایا تھا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔“

”ہاں اماں کا کہنا ہے کہ یہ جیل کی آنے والی رہی کی وجہ سے ہے وہ بڑی نیک قدم ہوگی۔“

”میری شادی کے پہلے ہی سال بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ اماں بار بار مجھ سے کہتی تھیں فرحت مجھے ایک نہیں پورے چار لڑکے چاہئیں یاد رکھو تلے اوپر چار لڑکے۔“

”یہ بوڑھی عورتیں بھی بڑی تو ہم پرست ہوتی ہیں۔ انہوں نے تمہیں بہت ہی ہدایات بھی دی ہوں گی۔ دم دم اور الٹا سیدھا چیر ڈال کر مت چنان۔ کسی کی دی ہوئی یا اپنی سیدی کوئی چیز مت کھانا کھوت چھات کے کسی گھر میں مت جانا اور پھر تمہاری کمر سے کوئی تعویذ بھی باندھ دیا ہوگا۔“

”چل اماں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ بس اتنا کہا کہ جب تک لکنا نہ ہو جائے۔ لگیل سے دور رہنے کی کوشش کرنا اگر تمہارے منہ کرنے کے باوجود اس نے زیادتی کرنے کی کوشش کی تو مجھے بتانا۔ میں اس کی اچھی طرح خبر لوں گی پھر ٹھیک ہو جائے گا۔“ یہ سب کہتے ہوئے فرحت کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا تھا۔

”یہ تم میرے آگے اس طرح شرما کیوں رہی ہو۔“ میں نے اس کی زبان پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”پھر بتاؤ اماں سے لگیل بھائی کی شکایت کی کیا نہیں۔“

”چل پاگل میں کیسے ان کی شکایت کرتی۔“

”ٹھیک ہے تو پھر ایک دن پچھتاؤ گی۔“

”اللہ نہ کرے۔“ فرحت نے کہا اور یہ کہہ کر اٹھ گئی کہ رات کے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ فرحت نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ میرے گھر سے تاریخ لے کر جب اماں گھر پہنچیں اور انہیں بتایا کہ فرحت ماں بننے والی ہے تو انہوں نے ایک کالا مرغ اس کے سر سے اتار کر اللہ کے نام پر چھوڑ دیا اور فرحت کا منہ مٹھائی سے بھر دیا تھا۔ لگیل بھائی نے جب کہا کہ محلے میں بھی مٹھائی تقسیم کرادیں تو اماں نے کہا تھا ابھی ایسی حرکت مت کرنا سو دوست اور سو دشمن ہوتے ہیں اگر کسی دشمن نے کچھ کر دیا تو وہ لگیل کی پہلی اولاد سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ جب لڑکا پیدا ہوگا تو وہ محلے بھر کی دعوت کریں گی۔ چالیس فقیروں کو کھانا اور کپڑے دیں گی اور اپنی بہو کو پچھلوں میں تول دیں گی۔

فرحت کو تیسرا امینہ لگ گیا تھا اور گھر میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہو رہی تھی۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ زیادہ وقت اماں کے کمرے میں گزارتی تھی۔ میں نئی دلہن تھی لیکن میرے اتنے نخرے نہیں اٹھائے جا رہے تھے جتنے نخرے فرحت کے اٹھائے جا رہے تھے۔

ایک دن فرحت نے مجھ سے کہا۔ ”تم بھی شادی کے پہلے ہی سال صاحب اولاد ہونے کی کوشش کرو۔“

”نہیں میں اتنی پاگل نہیں ہوں۔“ میں نے منہ بنا کر جواب دیا تھا۔ ”عورت کو شادی کے بعد پانچ سال تک تو اولاد کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ دو تین بچوں کے بعد تو عورت ویسے ہی بوڑھی ہو جاتی ہے کسی کام کی ہی نہیں رہتی اور پھر پیار یوں کے حصار میں الگ آ جاتی ہے تمہیں خود بھی ابھی دو سال اور انتظار یا احتیاط کرنا چاہیے تھا لیکن اب تو تم شخص ہی گئی ہو تو بھگت لو لیکن پہلے اور دوسرے بچے کے درمیان پانچ نہیں تو تین سال کا



”ارے شازیہ تو تو دادی اماں ہو گئی ہے کہاں سے سیکھ لیں یہ ساری باتیں۔“

”پڑھنے سے سب معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہے مجھے مطالعے کا کتنا شوق ہے۔ شادی سے پہلے میں نے بہت سے کتابچے اس انداز کے پڑھے ہیں جو کچھ میں بتا رہی ہوں یہ سب ڈاکٹر بتاتے اور لکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ ساری کام کی باتیں ہیں اور میں ان پر عمل کروں گی۔“

”ایسا غضب مت کرنا۔ اس گھر میں اولاد بہت ضروری ہے۔ اماں کا کہنا ہی کہ قلیل اور جمیل کی شادیاں انہوں نے وقت سے پہلے کر دی ہیں۔ قلیل ایکس سال کے تھے تو ان کی شادی ہو گئی اور جمیل ایک ہفتے بعد بیس سال کا ہوا ہے۔ وہ کہتی ہیں جب تک مرد بچیس سال کا نہ ہو جائے اس کی شادی نہیں کرنی چاہیے۔“

”میں نہیں جانتی اماں کیا کہتی ہیں ان کی خواہش کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تو اپنے دل کی اور علم کی بات کر دی ہے۔ میں وہی کروں گی جو ڈاکٹر کہتے ہیں۔“

اس گفتگو کے ایک ہفتے کے اندر ہی میں نے بغیر سوچے سمجھے وہ کچھ کر دیا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ میرا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کے اثرات اتنے تباہ کن نہیں ہوں گے اور پھر ذہن کے کسی گوشے میں یہ بھی تھا کہ اس سے فرحت کی ذات کو فائدہ پہنچے گا، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کہ وہ ابھی سے ہر بچے کے وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ اس کشمکش میں بھی موت زندگی پر غالب بھی تو آ سکتی ہے۔ شادی کے چار پانچ سال تک تو انسان کو زندگی کی سرتمیں سیکھنی چاہیے۔ یہ کیا کہ شادی کے صرف ایک یا دو سال بعد بچوں کے عذاب میں مبتلا ہو جائے بچے پیدا کرنا اور انہیں پرورش کرنا میرے لیے ایک کار عذاب ہی تھا اور میں اس عذاب سے

ابھی فرحت کو گزرنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے جب اچانک ہی فرحت کی طبیعت بگڑ گئی وہ یوں تڑپ رہی تھی کہ اسے اسی وقت اسپتال پہنچایا گیا اور پھر صبح تک زندگی اور موت کی کشمکش میں رہی صبح کو بچے اس کا آپریشن ہوا اور ڈاکٹروں نے اس کی جان بچائی اس آپریشن کے بعد ہی پتا چلا کہ حمل چار ماہ سے زیادہ ہی کا تھا۔ میں اسپتال میں فرحت کے ساتھ ہی تھی۔ چونکہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اس لیے وہ بچے گھر آگئی پھر چھبے بجے تک آرام کر کے ٹھیک سات بجے اسپتال پہنچ گئی تھی۔

تین دن بعد ہی فرحت کو شام میں چٹی ملی تھی میں اسے گھر لے آئی وہ بہت اداس تھی۔ میں نے اس کا دل بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے لبوں پر مسکراہٹ تک نہیں ابھری۔ دوسری صبح میں پھر اس کے کمرے میں چلی گئی۔ فرحت بیڈ پر اداس سی بیٹھی ہوئی تھی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے فرحت کہ تمہاری جان بچ گئی۔

میری بات سن کر فرحت نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر بولی۔ ”میری جان کہاں پئی وہ تو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مر گئی ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ لڑکا تھا۔“

”لڑکا تھا۔“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ تو گوشت کا ٹوٹھڑا ہوگا پھر لڑکا، لڑکی کی تمیز کیسے ہو سکتی ہے۔“

”وہ گوشت کا ٹوٹھڑا نہیں تھا۔“ فرحت نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”ڈاکٹر تو مجھ پر الزام لگا رہی تھی کہ میں نے حمل ختم کرنے والی دوا کھا کر اچھا نہیں کیا۔“

”واہ!“ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر تم کیا بولیں۔“

”بولنا کیا تھا میں نے ایسی کوئی دوا استعمال ہی نہیں کی تھی میں نے انکار کر دیا مگر ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ ان گوشت کے ٹوٹھڑوں کا لیبارٹری میں تجزیہ

کر کے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ میں نے کون سا زہر استعمال کیا تھا۔“

”تو کیا تجزیے کے لیے لیبارٹری۔“

”نہیں، قلیل نے منع کر دیا۔“ فرحت نے کہا۔

”وہ میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی ورنہ میرے چہرے سے میری گھبراہٹ اس پر واضح ہو جاتی۔“ قلیل مجھ سے بھی کہہ رہے تھے کہ جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا۔

اب کہاں تجزیے وغیرہ کے چکر میں پڑیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ضرور تھا کہ میں نے کوئی دوا تو استعمال نہیں کی اگر کی ہو تو بچ بچ بتا دوں لیکن میں نے ایسی دوا استعمال نہیں کی تھی تو میں کیا بتاتی، میں نے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ میرا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر بولے تم واقعی سچ کہہ رہی ہو۔“

میں فرحت کی ایک بات توجہ سے سن رہی تھی اور اس دانی کو دل ہی دل میں کوس رہی تھی جس نے دوا کی دو پڑیاں دے کر کہا تھا کہ بغیر کسی تکلیف کے حمل گر جائے گا۔ کینی عورت میں نے سوچا اگر وہ مجھے بتا دیتی کہ حاملہ کا یہ حشر ہوگا تو میں کبھی اس سے دوا نہ لیتی۔ وہ دانی ہمارے ہی محلے کی تھی اور اس کا ہمارے گھر بھی آنا جانا تھا۔ محلے کے کئی گھروں میں اس نے کیس کیسے تھے اور عورتوں کو دوا میں بھی دیتی تھی اور محلے میں یہ بات مشہور تھی کہ ذکیہ بی کے ہاتھ کوئی کیس خراب ہی نہیں ہوتا بہت ہوشیار دانی ہے۔

میں نے جب ذکیہ بی سے مشورہ کیا تو اس نے کہا تھا کہ کام مشکل نہیں ہے۔ یہ آسانی ہو جائے گا۔ دوا کا کوئی ڈانڈ نہیں ہے کسی بھی کھانے والی چیز میں ملا کر کھلائی جاسکتی ہے۔ ایک خوراک کے اس نے مجھ سے سو روپے لیے تھے۔ پہلی خوراک سے جب کچھ نہیں ہوا تو میں نے دوسری خوراک بھی دے دی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ فرحت کو اسپتال لے جانا پڑے گا اور پھر ڈاکٹر اس کا آپریشن کر دیں گے۔ ڈاکٹر زیتون خان آخری وقت تک کہتی رہی تھی کہ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے اور پھر جب

فرحت کی زیادہ حالت بگڑ گئی تو فرحت کا آپریشن کر دیا گیا آپریشن سے قبل فرحت کو تکلیف سے نجات دلانے کے لیے بے ہوش کر دیا گیا تھا پھر آپریشن کے بعد ہی اسے ہوش آیا تھا۔

”فرحت جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا ہے۔“ میں نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”اب خوش رہا کرو۔“

”اب کہاں خوش رہ سکتی ہوں۔ زندگی ہی ادا سیوں کے حوالے ہو گئی ہے۔“

”اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ قلیل بھائی کی زندگی دراز ہو۔ تم پھر ماں بن جاؤ گی۔“

”اب ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”کیا مطلب۔“

”ڈاکٹر زیتون خان کہتی ہے کہ اب میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔“ فرحت نے آہستہ سے کہا۔ ”قلیل نے مجھے یہی بتایا ہے۔“

”کبواس کرتی ہے ڈاکٹر۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے بہت سی عورتوں کے حمل گرتے ہیں گرائے جاتے ہیں اور وہ ماں دوبارہ نہ بار بن جاتی ہیں۔“

”قلیل کا خیال ہے ڈاکٹر ٹھیک ہی کہتی ہے۔“

”چھوڑو، قلیل بھائی کیا جانتے ہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ۔“ میں پھر تمہیں کسی اچھی لینڈی ڈاکٹر کو دکھاؤں گی۔“

میری تسلی آمیز گفتگو کا فرحت پر نہ اس وقت کوئی اثر ہوا ورنہ بعد میں۔ وہ ٹھیک تو ہو گئی تھی لیکن اداس ادارے لگی تھی اس نے بیماری کے دوران میں ہی بتا دیا تھا کہ میں اماں سے یہ کبھی نہ بتاؤں کہ اب وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ قلیل بھائی خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ اماں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ ان خیال تھا کہ اماں ایسی بہو کو گھر ہی میں نہیں رکھیں گی جو ماں بننے کے قابل نہ ہو۔ وہ قلیل بھائی کی دوسری شادی کی بات شروع کر دیتیں اور



ان پر زور دیتے ہیں کہ وہ فرحت کو طلاق دے دے۔ میرا خیال تھا فیصل بھائی فرحت کو کسی صورت طلاق نہیں دیتے۔ وہ فرحت سے بہت محبت کرتے تھے۔ اماں کا سلوک بھی ہمارے ساتھ قابلِ تحریف تھا لیکن انہیں اولاد کی اولاد چاہئے تھی۔ بے اولاد بھوکے شکل دیکھنا بھی انہیں گوارا نہیں تھی۔

فرحت کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا تھا اس کے بعد کا ایک سال جیسے اداسیوں کے نام ہی لکھا گیا تھا۔ اماں کا منہ بنا رہتا۔ فرحت کام کاج تو کرتی تھی لیکن وہ بات بس مطلب کی کرتی تھی۔ رتے تو کفیل بھائی بھی اداس ہی تھے لیکن فرحت کو تسلی دیتے اس سے کہتے کہ اولاد اگر نہیں ہوگی تو نہ سہی تم کیوں فکر کرتی ہو میں تمہیں نہ چھوڑوں گا اور نہ دوسری شادی کروں گا اماں اگر کہتی ہیں تو انہیں کہنے دو۔ اماں کو پتا چل گیا تھا کہ فرحت اب کبھی ماں نہیں بنے گی اور انہوں نے کفیل بھائی کو دوسری شادی کرنے پر اکسانے اور مجبور کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

مجھ سے بھی انہوں نے کئی بار کہا۔ ”اگر بڑی بھو بیکار ہوگئی ہے تو تم ہی کچھ کرو کب تک یونیورسٹی رہو گی۔“

”اولاد دینا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اماں۔“

”اللہ کے ہاتھ میں تو ہے لیکن بندہ بھی تو ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔“ اماں نے کہا۔ ”تم جمیل کے ساتھ خود ڈاکٹر کے پاس جاؤ کچھ تو پتا چلے۔ اب تمہاری شادی کو کبھی خاصے دن ہو گئے ہیں۔“

”خاصے دن تو نہیں ہوئے اماں۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”آپ کہتی ہیں تو میں چلی جاؤں گی ڈاکٹر کے پاس۔ ویسے اماں میری ماں کے گھر شادی کے پورے پانچ سال بعد میں ہوئی تھی۔ کہتے ہیں شادی کے جتنے سال بعد ماں کے گھر بچہ ہوتا ہے اتنے ہی سال بعد اولاد کے گھر بھی بچہ ہوتا ہے۔“

”یہ غلط بات ہے۔“ اماں نے کہا۔ ”میرے

گھر ایک سال چند ماہ بعد اولاد ہوئی تھی جب کہ میری ماں نے تین سال بعد میرے بڑے بھائی کو جنم دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے اماں آج میں جمیل سے بات کر کے کل ہی ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤں گی۔“ میں نے کہا اور اماں کے آگے سے ہٹ گئی۔

میں نے فرحت کو بھی کئی ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ جب سب نے ایک ہی بات کی تو میں اسے شہر میں موجود پیروں فقیروں کے پاس لے گئی۔ انہوں نے جو کچھ کہا وہ کیا لیکن اس ایک سال میں تو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ نہ فرحت کی اداسی گئی اور نہ ہی بچے کے آثار پیدا ہوئے۔

”یہ ہم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں سب فضول ہے۔“ فرحت کہتی۔ ”تم میرا بہت خیال کرتی ہو تمہاری محبت اپنی جگہ لیکن نصیب کے لکھے کو نہ تمہاری کوشش مٹا سکتی ہے نہ محبت ختم کر سکتی ہے۔“

فرحت جب ایسی باتیں کرتی تو میں اندر ہی اندر کہنے لگتی۔ اپنے آپ پر دل ہی دل میں لعنت بھیجتی لیکن فرحت سے کیسے کہتی کہ یہ سب کیا دھرا میرا ہے جیسے جیسے دن گزر رہے تھے میری محنت اور میرا دکھ بڑھتا جا رہا تھا۔ بعض بعض اوقات میں فرحت سے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرتی مگر پھر ایک انجانا خوف میری زبان پر تالے لگا دیتا۔

اماں کے کہنے پر میں جمیل کے ساتھ ڈاکٹر رضیہ بٹ کے گئی تو کبھی اس نے دوائیں بھی دیں لیکن باتوں باتوں میں ڈاکٹر سے میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں ابھی اولاد پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہوں وہ یا تو میری بات سمجھی نہیں تھی یا اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ میں دوا تو اس کی لے کر آتی تھی لیکن ان کے استعمال کرنے کی میں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی اس کے برعکس میں نے وہی دوا استعمال کی جو عورت کو اولاد کی پیدائش سے دور لے جاتی ہے۔ یہ دوا بھی میں جمیل سے چھپ کر استعمال کرتی تھی۔ پہلے پائل تو جمیل مجھے یہ دوا استعمال

کرنے سے نہ صرف روکتے نہیں تھے بلکہ خود بھی ایسی ہی دوا استعمال بھی کرتے تھے لیکن جب اولاد کے لیے اماں کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا اور انہوں نے زور دینا شروع کیا تو جمیل نے داکا استعمال چھوڑ دیا اور مجھے بھی مشورہ دیا کہ میں بھی ایسی کوئی دوا استعمال نہ کروں لیکن میں جمیل سے وعدہ کرنے کے باوجود اسے استعمال کرتی رہی۔ میں نے پڑھ رکھا تھا کہ اس دوا کے مضر اثرات نہیں ہوتے اور میں نے بھی ایسا محسوس بھی نہیں کیا تھا۔

فرحت کو جب اولاد سے محروم ہوئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا اور میرے بھی کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے تو اماں نے شور مچا دیا۔ ایسے ہی لگا جیسے ان کے صبر کا پیمانہ بھر گیا ہو اور اب انہیں ایک منٹ کی تاخیر بھی گوارا نہ ہو۔ ”میں لڑکی دیکھ آئی ہوں۔“ یہ آواز سننے ہی میرے قدم رک گئے۔ کفیل بھائی ان کے کمرے میں تھوڑی دیر پہلے ہی گئے تھے۔ ”لڑکی کی ماں خود آٹھ بچوں کی ماں ہے لوگ غریب ہیں لیکن خاندان شریف ہے۔ اب اگر تو نے انکار کیا تو میں خود کو ختم کر لوں گی۔“

”لیکن اماں۔“

”میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔“ اماں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”لڑکی والے کہتے ہیں کہ وہ سوکن پر اپنی لڑکی نہیں دیں گے۔ تم فرحت کو طلاق دو تو بات آگے بڑھے گی ویسے میں وعدہ کر آئی ہوں تم فرحت کو طلاق دو اب میں اسے نہیں رکھنا چاہتی اور تمہارے پاس جواز بھی ہے۔ جو عورت بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی وہ تمہارے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔“

”مگر اماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”سب ہو سکتا ہے بس اب فرحت ہمارے گھر نہیں رہے گی۔“

اس کے بعد بات اتنی آگے بڑھی کہ گھر میں ہنگامہ ہو گیا اور پھر اماں جیت گئیں اور فرحت ہار گئی۔ کفیل بھائی نے فرحت کو طلاق دے دی۔ یہ میرے

لیے انہونی تھی۔ میں نے اس عرصے میں اس پہلو سے بھی نہیں سوچا تھا۔ فرحت کو پہلے اس کے گھر بھیجا گیا تھا اور پھر طلاق بھیج دی گئی تھی۔ فرحت نے بہت کوشش کی تھی کہ کفیل بھائی دوسرا نکاح بھی کر لیں اسے بھی رکھیں لیکن لڑکی والے اس بات کے لیے تیار نہیں تھے اور اماں کسی بڑے مطلقہ عورت سے شادی کے لیے تیار نہیں تھیں۔ بس انہیں ضد تھی کہ وہ آٹھ بچوں کی ماں کی لڑکی ہی کو بھونا نہیں گی۔

بہت خاموشی سے کفیل بھائی کی دوسری شادی ہو گئی۔ مجھے ان کی بیوی بالکل پسند نہیں آئی۔ میں نے کوئی تین ماہ تک اس سے ڈھک سے بات نہیں کی پھر فرحت کی بربادی کا دکھ مجھے بچوں کے لگاتا رہتا۔ میرا ضمیر مجھے چوبیس گھنٹے ملامت کرتا یہی وجہ تھی کہ میں کچھ چڑ چڑی اور بد مزاج بھی ہو گئی تھی۔ فرحت کا انجام دیکھ کر مجھے خود اولاد کی جلدی ہو گئی تھی میں چاہتی تھی کہ کئی آنے والی سے پہلے ہی میں صاحب اولاد ہو جاؤں۔ میں نے کفیل بھائی کی دوسری شادی سے پہلے دو واؤں کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور اولاد کی جلد پیدائش کے سلسلے میں بھی ڈاکٹروں سے رجوع کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہی نہیں میں امی کے گھر جاتی تو انہیں لے کر پیر فقیروں کے دروازوں پر بھی دستک ضرور دے آئی اور ان کے بتائے ہوئے نسخے بھی آزمائی رہتی۔

شادی کے چند ماہ بعد ہی پتا چلا کہ کفیل بھائی کی بیوی ماں بننے والی ہے۔ اس کے بعد اس لڑکی کی آؤ بھگت شروع ہو گئی اور میں خود کو اماں کی بھو نہیں تو کرانی سمجھنے لگی تھی پھر وہ دن بھی آ گیا جب اس لڑکی نے اماں کو خوشیوں سے نواز دیا۔ شریفہ کے جب لڑکا ہوا اور وہ اسے اسپتال سے گھر لے کر آئی تو اماں کی خوشیوں کا کوئی ٹکھا نہ نہیں تھا۔ سوائے اس لڑکے اور اس کی ماں کے گھر میں انہیں کوئی نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس صورت نے مجھے مزید اداس کر دیا اور پھر میں جیکے جیکے رونے لگی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میرا جی پھرا تا اور میں اپنے کمرے







”بابو جی! حکومت بڑے بڑے ملکوں کو جو ذرا ٹیڑھی نظر کرتے ہیں۔ ٹھینگا دکھاتی ہے۔ ہندوستان جیسے اپنے سے بڑے ملک کی دم پائوں کے انگوٹھے میں دبائے رکھتی ہے وہ اپنے ملک کے تاجروں اور دکانداروں کو قابو میں نہیں کر سکتی۔ جو من مانی کرتے ہیں۔“

### اس شمارے کے لیے ایک حساس و جذباتی دل گداز سچی کہانی

وہ میرے ساتھ بے تکلف نہ تھا پھر بھی اس نے بے تکلفی سے میری ران پر ایک کڑا کے دار ہاتھ مارا تو میں تملاکر رہ گیا۔ میں شامت اعمال سے اس سے پوچھ بیٹھا کہ اس نے سجر ممنوعہ کے کتنے پتے بینک میں جمع کرائے ہیں۔

”بابو جی! پاکستان بننے کے بعد پہلی بار اپنے غریب ہونے کی بہت خوشی ہوئی۔“ اس نے کھوڑے کو اس کا کوئی رشتہ یاد دلایا۔

”کیوں..... پاکستان بننے سے قبل تم کھوڑوں کی تجارت کرتے تھے کیا۔“

میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ میری طنز کو بھانپ گیا۔

”بادشاہو! کھوڑوں کا بیوپاری نہ تھا تو تانگے والا بھی نہیں تھا۔“ وہ پھر پھر کر بولا۔

”خرا کا کام تھا۔ نوکر کام کرتے تھے۔ دو دو جوان جہان بیٹے۔ ایک کی سائیکلوں کی دکان تھی دوسرا موٹر مینیک تھا۔ ایک لڑکی تھی۔ گھروالی..... بہو.....

کل چھ جی تھے کھانے والے۔“

اس کے لہجے کی افسردگی میرے دل میں اتر گئی۔ میں معاً اداں ہو گیا۔ میری نظریں اس کے ہاتھوں پر پھیلی ہوئی رنگوں کے نقشے پر جمی گئیں۔ خشک

وقت بھی کام نہ آئی۔ جب نرگس کو وہ لوگ اٹھالے گئے۔“

”نرگس.....“ میری آواز مشکل سے نکلی۔

”میری بیٹی.....“ میری کنواری مریم۔ سکوت طاری ہو گیا۔ کھوڑا دلی چلتا رہا۔ گرم بکولے سسکیاں لیتے رہے۔ گرجا گھر کی خردلی چھت پر گڑی ہوئی صلیب سے ایک گواچینا ہوا اڑا۔ ”کنواری مریم..... کنواری مریم۔“

”تمہارے بیٹے.....“ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

”مارے گئے..... کسی حجاج نے کسی بن قاسم کو ہماری مدد کے لیے نہیں بھیجا۔ ایک بیٹا بیوی کی عزت بچاتے ہوئے مارا گیا۔ دوسرا اپنی بہن کی عزت پر قربان ہو گیا۔ بیٹی کی عزت ہمیشہ کتنی رہنے کے لیے اس وقت بچ گئی اور بہو عزت لٹا کر ہمارے ساتھ آ گئی۔“ پوچھنے کے لیے اب کچھ نہ رہا تھا۔ پھر بھی خاموش رہتا میرے اختیار میں نہ تھا۔

”تانگا تمہارا اپنا ہے بابا جی.....“

”کہاں بابو جی۔“ ایک ٹھنڈی سانس۔ ”تب ہی تو تیس سال میں پہلی بار خوشی ہوئی کہ ہم غریب

ہیں اور ہمارے پاس بینک میں مجھے کرانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

”کتنا کمالیتے ہو روزانہ.....“

”مالک کا بھگتان اور گھوڑے کا راشن نکال کر تیس چالیس بچ جاتے ہیں۔ عید تہوار اور کسی رکشہ کی پڑتال پر پچاس ساٹھ ہوجاتے ہیں لیکن بابو جی! کمائی میں حصے اور بھی تو نکلتے ہیں کیا چتا ہوگا۔ آپ خود سوچیں۔“

”دو حصے کس کے.....“

”ایک حکومت صاحب کا اور دوسرا جانوروں کو بے رحمی سے بچانے والے مجھے کے رحم دل بابوؤں کا۔“

مجھے ہنسی آئی..... ”تم تانگے رکشے والے اور کس کے کنڈیکٹر پولیس والوں کو حکومت صاحب کیوں کہتے ہو.....“

”اُس لیے کہ ہماری آنکھیں تو انہیں حکومت کرتے دیکھتی ہیں۔ ہم کیا جانیں کہ صدر اور گورنر کیا قانون پاس کرتے ہیں اور وزیر کا کیا حکم ہوتا ہے۔ ہمارے لیے تو ایسا ہی گورنر اور تھانیدار صدر ہے۔ ہماری کیا بحال جوان کے سامنے سر اٹھا کر





بات بھی کریں۔“

میں نے شککیوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی تھانے دار تو نہیں گذر رہا ہے۔ میں اسے کیا بتاتا کہ بڑے میاں..... پولیس قانون کی محافظ ہے۔ اس کی نظروں میں کوچان اور صحافی دونوں برابر ہیں کہ دونوں اس کی فرض شناسی اور دیانت داری کے قصیدہ گو ہیں اور قصیدہ گوئی پر انعام ملتے ہیں۔ کہیں گالیاں اور ڈنڈے بھی ملتے ہیں بھلا۔

”بابو جی آپ کیا کام کرتے ہیں.....“ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔

”میں اخبار والا ہوں۔“

”تو ایک بات بتائیں۔ آپ لوگ اخبار میں اخلاق، شرافت اور نیکی کی باتیں اتنی زیادہ کیوں لکھتے ہیں۔ آپ کے گھر والے بھی انہیں پڑھتے ہوں گے۔“

”کیوں نہیں پڑھتے۔ سب ہی پڑھتے ہیں۔“

”اسی اخبار میں وہ فلموں کے اشتہار بھی دیکھتے ہوں گے۔ جنہیں دیکھ کر کوٹھے والیاں بھی ان کی نقل کرنے پر مجبور ہو جائیں۔“

اس نے گھوڑے کو ایک چابک مارا اور میری کمر کی چڑی ادھر گئی۔

”شیر کوئی بات نہیں۔ پیٹ تو سب کے ساتھ لگا ہے۔ اس کی خاطر کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اچھا بابو جی!..... یہ بتائیں کہ کیا تفریح کرنے سے ساری بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور علاج کی ضرورت نہیں رہتی۔“

”میں..... میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”دیکھیں نا! علاج کے لیے گورنمنٹ کے چند اسپتال ہیں۔ وہ بھی انگریز اور ہندو کے نام پر۔ جیسے جیو اسپتال، گنگا رام، گلاب دیوی اور تفریح کے لیے ساٹھ ستر سینما تو ہوں گے ہی! اتنے ہی اور بننے والے ہیں۔ اسی لیے مجھے خیال آیا کہ علاج و علاج کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ کہیں فلم دیکھ ڈالو۔ ساری بیماریاں دھمال اور ہنسنڈا دیکھ کر بھاگ جائیں گی۔“ میں نے ماتھے پر ابھر آنے والے

قطرے رومال میں جذب کیے اور انہیں سینت کر رکھ لیا۔

”بابو جی! آپ میری باتوں سے اکتا تو نہیں گئے۔ میری گھر والے بھی کہتی ہیں کہ بہت باتوں اور لیکن بابو جی ہم نے تیس سالوں میں باتیں کرنے اور باتیں سننے کے سوا کچھ ہی کیا ہے۔ مسجدوں میں باتیں، جلوسوں میں باتیں، اخباروں، ہولٹوں ہر جگہ باتیں ہی باتیں بابو جی ایسا لگتا ہے کہ آزادی کے بعد دل اور دماغ نے اپنی ساری طاقت زبان کو دے دی ہے اور کرنے کی صرف ایک یہی چیز رہ گئی ہے۔“

”کوچان! تم ارسطو اور برینڈرسل بننے کی کوشش نہ کرو۔ صرف تا نگہ چلاؤ۔ زبان مت چلاؤ۔“ میں نے کہنا چاہا مگر اس کی آواز نے میرے دونوں ہونٹوں کے درمیان گوند کی سلاکی پھیر دی۔ وہ بولے جارہا تھا۔ ”بابو جی! شراب اسلام میں تو حرام ہے لیکن قانون بھی اسے پینے سے منع کرتا ہے نا۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔“ میں نے سمجھا کر کہا۔ دراصل میں خود کو ہاتھ میں بیٹ لیے فاسٹ باؤڈر کے سامنے کھڑا محسوس کر رہا تھا۔

”آپ بھی کراچی گئے ہیں۔“

”میں وہاں سات سال رہا ہوں۔“ میں نے خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کراچی نہیں دیکھی۔“ اس نے کہا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ ایک پتھر میرے سر پر آگیا۔

”بابو جی! کیا وہاں اسلام اور قانون دونوں نہیں ہیں کیوں کہ سنا ہے کہ صدر کے علاقے میں ہولٹوں کی طرح جگہ جگہ شراب خانے ہیں۔ جس طرح لوگ ہوٹل میں بے دھڑک مہس کر چائے پیتے ہیں۔ اسی طرح شراب بھی پی جاتی ہے۔“

میں نے سر کی چوٹ سہلار کر اس کی طرف دم طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ بڑے سکون سے سگریٹ پی رہا تھا۔ غیبت بڑھا..... شیطان کا چیلہ۔“ میں نے زیر لب بڑبڑایا۔ وہ کہنے لگا۔ ”بابو

آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں اور پھر اخبار لے لے۔ یہ بتائیں کیا شیطان کچ مجھ موجود ہے.....“

”کیا تمہیں قرآن پر یقین نہیں۔“ میں نے لالچ کے کہا۔ ”اس میں شیطان کا ذکر ہے۔“

”قرآن کی بات چھوڑیں بابو جی! اس نے ایمان کی چٹکی بجا کر سگریٹ کی راہ ہلا دی۔“ قرآن میں کیا کچھ نہیں لکھا ہے۔ آپ اس کی کن باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اگر رکھتے ہیں تو کچھ کراں پر عمل کیوں نہیں کرتے۔“

عمل..... عمل..... گھوڑے کی ٹاپ

مسلمان سڑک پر گونجنے لگی۔

”مکلی والے! کرا دیں گے بخشش ہماری۔“ ایک لکھی زنٹے سے یہ قولی سناتے گذر گئی۔

”مکلی والے..... مکلی والے.....“ وہ ممکناتے لگا۔

”بابو جی! مکلی والے نے تو کہا ہے کہ انسان کا عمل ہی اس کے کام آئے گا۔ میری وجہ سے میری اولاد کو بھی چھوٹ نہیں ملے گی۔“

”بابو جی! حکومت بڑے بڑے ملکوں کو جو ذرا لیڈر نظر کرتے ہیں۔ ٹھنڈا دکھائی ہے۔ ہندوستان جیسے اپنے سے بڑے ملک کی دم پاؤں کے انگوٹھے میں دبائے رکھتی ہے وہ اپنے ملک کے تاجروں اور وکلاء کو قابو میں نہیں کر سکتی۔ جو سن مانی کرتے ہیں۔“

”کیوں نہیں کرتی۔ کب نہیں کرتی۔“ میں نے غصہ سے کہا۔

”پھر یہ مہنگائی..... اور تیل کی طرح کیوں بڑھتی ہی جارہی ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ میں نے بھی سگریٹ سلاکی اور خلا میں تاحہ نظر پھینکی ہوئی امرتیل کو دیکھنے لگا۔ وہ اب خاموش تھا اور دور کی کوئیں سے آواز آرہی تھی۔

”بابو جی! میرے تانگے میں ہر روز کتنے ہی مسافر بیٹھتے ہیں۔ میں ان کی باتیں سنتا ہوں! اچھی بری۔ سب قسم کی باتیں۔ ایک ہی بات کے گرد گھومتی

ہیں۔ نا انصافی، مہنگائی رشوت، سفارش، لوٹ کھسوٹ کی باتیں میں دل میں کہتا ہوں کہ اگر میں ان پڑھ اور کم عقل ہوں تو سب لوگ ایسے تو نہیں۔ پھر میں دل کو سمجھاتا ہوں نادان! میں تا نگہ چلا کرتیں برسوں میں جانے کتنے ہزار دل روند چکا ہوں لیکن ہوں اسی شہر میں۔ انہی سڑکوں پر اپنے ہی گھر میں اسی طرح ہم سب اس ملک کے سارے لوگ تیس سال بعد بھی اسی لگام پر ہیں۔ جہاں وہ تھے جس طرح میں نے اس شہر سے باہر قدم نکالنے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ وہ بھی اپنے وجود کو اپنے جسم سے باہر نکالنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ہر شخص دوسروں کو اپنا دشمن سمجھتا ہے لیکن وہ حقیقی دشمن کو نہیں پہچانتا۔ اسے یہ گمان تک نہیں تھا کہ ہو سکتا ہے اس کا دشمن اس کے اپنے جسم میں چھپا بیٹھا ہو۔

آواز قریب آرہی تھی۔ میں فلسفی، مفکر، مفکر، صلح اور ہر نہیں ہوں۔ ایک عام آدمی ہوں اور اپنی بساط کے مطابق سوچتا اور کہتا ہوں۔ میں نے مولی مولی کتابیں نہیں پڑھی ہیں لیکن روزانہ انسانی چہروں کے کتنے ہی صفے پڑھ ڈالتا ہوں اور رات کو جب اپنی جھلنگا سی کھاٹ پر لیٹتا ہوں تو ان صفحات کے حروف میرے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔ ناچتے ناچتے وہ گرد گھیرا ڈال دیتے ہیں اور مجھے کچھ تان کر تیس سال پہلے کے موڑ پر لے جاتے ہیں میں اس موڑ پر کھڑا سوچتا ہوں کہ میں نے..... ہم سب نے کیا کھویا۔ کیا پایا! اس سوچ کے باوجود میں دوڑ کر پھر اپنی اسی جگہ آ جاتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ کسی نہ کسی صبح کوئی نہ کوئی کرن ایک نیا پیغام لائے گی۔

”بابو جی! اترنا نہیں۔“

میں چونک پڑا۔..... ”مجھے معاف کر دینا جناب..... بڑھا ہوں نا..... ٹھیک کیا ہوں۔ آپ کا دماغ چاٹ ڈالا..... ارے یہ بانی پیسے تو لیتے جاتیں کیا آپ بھی میری طرح ٹھیک گئے ہیں۔“

◆◆◆



پانچ نمبر کی بس ..... جمشید نگر جاکر ختم ہوتی تھی۔ تاہم اسی راستے پر جارہے تھے۔ آخری اسٹاپ سے پہلے ہی ہمیں پولیس کی گاڑی نظر آئی۔ سڑک کے کنارے دو بسیں رکی ہوئی تھیں۔ دونوں کا رنگ سرخ تھا اور باڈی پر سفید دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ پولیس والے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ہمارے پہنچنے تک اگلی بس روانہ ہو گئی۔ احسان نے کار کو موڑ کر بس کے قریب روکا۔ ہم کار سے اتر کر تیزی سے روانہ ہوئے۔

ایک معاشقہ کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے





پروفیسر افضال احمد سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ نوجوان تھی۔ غیر شادی شدہ تھی۔ بے حد خلیق اور ملسار اور بہت دھمکی تھی۔ عمروں کے تضاد کی بنا پر میں اس سے بعد کچھ نہ کہہ سکا، لیکن غیر محسوس طریقے سے ہم ایک دوسرے کے قریب آئے اور آخر کار عمروں کے فاصلے مٹ گئے اور ہم دونوں نے شادی کر لی۔

ویسے بھی میں اس بھری دنیا میں تنہا تھا۔ ایک آپتی تھیں۔ انہوں نے بھی شادی نہیں کی تھی اور ایک اسکول میں ملازمت کرتی تھیں۔ شادی کے بعد ہم دونوں بہت خوش تھے۔ ہم نے ایک خوبصورت گھر کرائے پر لے لیا۔ ہمارے گھر کے متصل ہمارے کالج کا ایک پروفیسر احسان رہتا تھا اس کی بیگم کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی تیرہ سالہ بیٹی نازش کی شمشیر سے گہری دوستی ہو گئی تھی۔ زندگی کی گاڑی عذمتی سے چل رہی تھی۔ ہم نے گھر میں ایک ملازمہ رکھ لی تھی جس کا نام نادرہ تھا۔

ایک دن ہم پر سے کو ٹپکے تھے۔ شمشیر کا چلا رہی تھی۔ وہ بہت موڈ میں تھی اور بہت تیز کار چلا رہی تھی کہ اچانک کار بے قابو ہو گئی۔ ایک خوفناک حادثہ ہوا۔ شمشیر توجھ گئی لیکن میں شدید زخمی ہو گیا۔

شمشیر کے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ اس کی حالت خراب ہو گئی۔ ایسے حالات میں مجھے شمشیر آپتی یاد آئیں بعد میں نے انہیں تار سے اطلاع دے دی۔ شمشیر آپتی نے سب کچھ سنبھال لیا۔ ان کے آنے سے بڑی تقویت ہو گئی۔ میں بیٹوں میں تھا اور مجھے ابھی طویل عرصہ ہسپتال میں رہنا تھا۔ ایک دن وہ ہسپتال آئیں تو باتیں کرتے ہوئے کہا۔

”فیصل! میں نے شمشیر سے بہت تفصیل سے باتیں کی ہیں۔ مجھے تمہاری شادی کی پوری باتیں پتا ہیں۔“

”گلتا ہے۔ تم نے اس کی کمپری پر ترس کھا

کر شادی کر لی ہے۔“

”یہ بات نہیں آ پ۔ دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔“ میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اسی وجہ سے میں نے آپ کو زحمت دی۔“

”سہارے کے لیے شادی کرنا تو ضروری نہیں تھا۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”تم اس کے بغیر بھی اس کی مدد کر سکتے تھے۔“

”کسی جوان اور تنہا لڑکی کی مدد کرنا آسان تو نہیں آ پ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور پھر شمشیر بہت نیک اور اچھی لڑکی ہے۔“

”لیکن وہ تم سے عمر میں بہت چھوٹی ہے۔ فیصل علی۔“ انہوں نے یاد دلایا۔ ”تم پچاس سے تیرہ کی عمر کے ہو۔ وہ تم کو فرشتہ سمجھتی ہے۔ لیونائی طرح بوجہ ہے۔ تم نے کام بھی تو فرشتوں والا کیا ہے۔“ انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

”ارے نہیں آ پ۔ کیوں شرمندہ کرتی ہیں مجھے۔“

”تم ہمیشہ کے رحم دل ہو کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارے احسانات کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے بھاری کبتی ہے۔ تم نے اسے موت کے منہ سے نکالا ہے۔“

”وہ بڑی اچھی لڑکی ہے آ پ۔“

”بھیک لیکن تم بھی بڑے پیارے ہو۔ خیر کوئی فکر نہ کرو۔ میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر آئی ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہاں۔ آ پ! لیکن آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتلایا ہی نہیں۔“

”ٹھیک ہوں۔ ایک اسکول کی ہیڈ مسٹر ہیں ہوں۔ دو سال بعد ریٹائر ہو جاؤں گی۔“ انہوں نے بتلایا۔ ”بچ پوچھو تو اتنے بڑے شہر کی ہنگامہ خیز زندگی سے تنگ آ گئی ہوں یہاں بڑا سکون ہے۔“

میرا دل بہن کی محبت سے جھرا آیا۔ وہ پھر مستقل نہیں آ جائیں ناں۔ آپ کا اپنا گھر موجود ہے کب تک یوں تنہا زندگی بسر کریں گی آپ۔“

”دیکھا جائے گا۔ پہلے تو پوری طرح صحت یاب ہو جاؤ۔“ انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا پیغام موصول ہوا تو میں بدحواس ہی ہو گئی تھی۔“

”آپ کے علاوہ اب کون ہے میرا۔“

میری آواز بھرا گئی۔ ”آپ کے آنے سے بڑی ڈھارس ہو گئی تھی۔“

شمینہ آ پ مجھے آرام کرنے کی ہدایت کر کے چلی گئیں شام کو جب وہ آئیں تو شمشیر ان کے ساتھ تھی اور اس عملی اور شرمندہ سی۔ ”اب کیسی طبیعت ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔“

وہ رونے لگی۔ ”سب کچھ میری غلطی سے ہوا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔“

”نہیں شمشیر! یہ شخص اتفاق تھا۔ تم بلا سبب خود کو قصور وار نہ سمجھو۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”فیصل علی کہتے ہیں تمہارا کوئی قصور نہ تھا۔“

آ پ نے تائید کی۔

”شمشیر چند روز کی بات ہے۔ پھر میں گھر آ جاؤں گا۔“ میں نے سمجھایا۔ ”آپ آ پ آ گئی ہیں۔ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھیں گی۔“

کچھ دیر بعد دونوں چلی گئیں۔ ایکسی میں آ پ نے اسے پھر تسلی دی۔ ”تم کیوں اس طرح ہلکان ہو رہی ہو۔ تمہارا بھلا کیا قصور تھا۔“

”آ پ! مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔“ شمشیر نے کہا۔ ”انہوں نے میرے لیے بڑی زحمتیں اٹھائی ہیں۔“

”میں جانتی ہوں۔ اسے ہر لمحہ تمہارا خیال رہتا ہے۔“

”وہ میرے لیے۔“

آ پ نے بات کا ختم ہونے کہا۔ ”اس کا دل ہمیشہ سے بہت نرم ہے۔ کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتا۔“

”آپ اندازہ نہیں کر سکتیں آ پ! کچھ مجھے مجھے ان سے تقی محبت ہے۔“ صوفی آ پ کے ماتھے پر شکنیں آ گئیں۔ ”وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ عمر میں تم سے بہت بڑا ہے۔“

”میں ان کا احترام کرتی ہوں آ پ۔“ شمشیر نے کہا۔

”اب دل پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو بیمار پڑ جاؤ گی تو وہ پریشان ہو گا۔“

آ پ نے چند روز میں ہی شمشیر کو شاکر دینا لیا تھا۔ وہ اسے بولنے کا بہت کم موقع دیتی تھیں۔ بھاری شمشیر ان کی ہر بات کی حامی بھرنے کے سوا کچھ نہ کرتی تھی۔ مجھے جلد اندازہ ہو گیا آ پ پوری طرح اس پر حاوی ہو گئی ہیں۔

دن گزرتے رہے۔ پہلے آ پ اور شمشیر ساتھ آئی تھیں۔ وہ دونوں بہت خوش اور مطمئن دکھائی دیتی تھیں۔ آ پ نے چند ہی روز میں شمشیر میں خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اس کے چہرے پر باپوسی اور محرومی کی جگہ اب عزم اور حوصلے کی چمک نظر آنے لگی تھی۔ وہ دونوں مجھے حوصلہ دلا کر واپس چلی جاتی تھیں اور میں شمشیر میں ہونے والی اس تبدیلی پر خوش بھی تھا اور حیران بھی۔

پھر کئی بار شمشیر آ پاتھا آئیں۔ پوچھنے پر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شمشیر بہت تھک گئی تھی۔ آرام کر رہی ہے۔ انہوں نے دبے الفاظ میں یہ بھی کہا کہ اب مجھے کفایت شعاری سے کام لینا چاہئے۔ نادرہ کو ملازم رکھنے کی کیا ضرورت تھی لیکن میں ٹال گیا۔ پروفیسر احسان اور کالج کے دوسرے ساتھی بھی بھی عیادت کے لیے آ جاتے لیکن میں اسپتال میں پڑے پڑے عاجز آ گیا تھا۔ ایک دن شمشیر مجھ سے ملے تھا آ گئی۔ اس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ وہ ملازمت تلاش کر رہی ہے۔



”دیکھتے ہاں۔“ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی آپ کئی ماہ تک کالج نہیں جاسکیں گے چھٹیاں ختم ہو جانے کے بعد خواہ بھی نہ لے لی اور میں بیکار بیٹھ کر کیا کروں گی۔“

بلاشبہ وہ عمل طور پر صحت مند ہو چکی تھی۔ اب وہ پہلے جیسی خاموش صلیح اور شرمیلی سے لڑکی نہیں رہی تھی۔ اس کی بات چیت میں اعتماد آچکا تھا۔ جھجک کی جگہ بے تکلفی آ گئی تھی۔ آپا نے اس میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ”عورت صرف گھر کی زینت نہیں ہے۔“ شمشہ نے کہا۔ ”اسے مرد کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔“

اس کے شانہ بشانہ چلنا چاہیے۔ ”اگر تمہیں ملازمت کا اتنا ہی شوق ہے تو میں منع نہیں کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”باغیہ کیا حال ہے۔“

”ٹھیک ہی ہوگا۔ میرا مطلب ہے۔ آج کل تو اتنی فرصت نہیں کہ ادھر توجہ دے سکوں۔“

”اوہ بہت مصروفیت ہے۔“

”آدمی زندگی گھر میں قید رہ کر گزار دی۔“

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”اب ذرا دنیا دیکھی ہے۔“

”کیسی لگی یہ دنیا تم کو۔“

”اوہ بڑی دلچسپ..... لیکن دنیا میں بڑی کشش ہے۔ جدوجہد اور مقابلے کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔“

”خوب مجھے خوشی ہے کہ تم میں اتنا اعتماد پیدا ہو گیا۔“ میں نے جواب دیا اور وہ خوشی سے مسکرا دی۔

”سب آپا کی مہربانی ہے۔ انہوں نے مجھے احساس دلایا کہ عورت اتنی بے بس اور مظلوم نہیں وہ اپنی دنیا تعمیر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔“

میں جانے کیوں یہ سن کر اداس ہو گیا کہ اب شمشہ میرے سہارے کی محتاج نہیں تھی۔ کیا میں ہمیشہ اسے اپنا دست گرد دیکھنا چاہتا تھا۔

چند روز بعد مجھے اسپتال سے پسی کی بیساکھیوں کے سہارے کھڑا ہوا تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اب مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔ بڑا ڈیٹاک تھا یہ احساس ڈاکٹر نے بتلایا تھا کہ ہڈی کی ہڈی چکنار چور ہو گئی ہے اور اس میں اسکیل کی راڈ ڈالی جائے گی اور ضرورت ہوگی تو ایک آپریشن ہوگا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی ایک عرصہ تک میں بیساکھیوں کا محتاج رہوں گا۔

شام کو شمشہ نے میرے گھر واپس آنے کی خوشی میں احسان اور اس کے گھر والوں کو جائے کی دعوت دی۔ نازش گھر کے ایک فرد کی طرح اہتمام میں لگی ہوئی تھی۔ میں بیساکھیوں کے سہارے کمرے میں داخل ہوا تو شمشہ کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

”تمہیں اس حال میں دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔“ احسان نے کہا۔ ”لیکن حوصلہ رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو تمہاری دیکھ بھال کے لیے ایک نہیں دو دو سہارے ہیں۔“

میں بے بسی سے مسکرا دیا۔ ”جی یہ ہی مشورہ میں دوسروں کو دیتا تھا۔“

”میں تو کہتی ہوں۔ اب ملازمہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ آپا نے کہا۔ ”گھر میں کام ہی کیا ہے۔“

”آپ دونوں پر ملازمت کی دھن سوار ہے۔ میں اکیلا گھر کیسے سنبھالوں گا۔“ میں نے کہا۔

”جب تک آپ ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ میں ملازمت نہیں کروں گی۔“ شمشہ نے فوراً کہا۔

”ویسے بھی کسی ملازمہ پر گھر چھوڑنا کہاں کی غفلندی ہے۔“ آپا نے کہا۔ ”اور ان عورتوں کا کیا بھروسہ۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں آپا۔“ میں نے کہا۔

”نادرہ بہت نیک اور ایماندار عورت ہے۔“

”تم عورتوں کے بارے میں جانتے کیا

ہو۔ زندگی میں جی تمہارا واسطہ پڑا نہیں۔“ آپا نے کہا۔

”لیکن آئی۔“ نادرہ بہت اچھی عورت ہے۔ ہم اسے بہت عرصے سے جانتے ہیں۔“

نازش نے کہا۔ اسے بھی آپا کی یہ بات ناگوار محسوس ہوئی تھی۔

جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ گھر پر آپا کا راج ہے۔ پورے گھر کی ترتیب بدل دی گئی تھی۔ خود شمشہ کی حیثیت گھر کی مالک کے بجائے ملازمہ جیسی ہو گئی تھی۔ یہ کام ایسے نہیں دیے کرو۔ تم کو اس بات کا بھی سلیقہ نہیں۔ تم نے یہ چیز وہاں کیوں رکھ دی۔ شمشہ ان کے اشاروں پر ناچتی تھی اور پھر میں نے محسوس کیا کہ آپا کو نازش کی آمدورفت بھی پسند نہیں تھی۔ وہ جب تک میرے قریب رہتی ان کی کڑی نگاہیں گمرانی کرتی رہتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے ایسی بات کہہ دی کہ میں اچھل پڑا۔

”مجھے پڑوسیوں سے اتنی بے تکلفی پسند نہیں۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں آپا۔ احسان کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ اس نے اور نازش نے شمشہ کی بڑی دیکھ بھال کی ہے۔ بڑا خیال رکھا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ آپا نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ کسی لمبی کی طرح اپنے باپ پر نظر رکھتی ہے۔“

”ماں کے انتقال کے بعد احسان نے ہی اسے پالا ہے۔“

”شاید اسی لیے وہ ڈرتی ہے کہ کہیں احسان دوسری شادی نہ کر لے۔“

”آپ نے یہ اندازہ کیسے کیا۔“

”اس میں توجہ کی کیا بات ہے۔ احسان ابھی جوان ہے۔ خوبصورت ہے۔ ظاہر ہے وہ دوسری شادی ضرور کرے گا۔ تمام عمر یونی کو نہ بیٹھا رہے گا۔“

”وہ نازش سے بہت پیار کرتا ہے۔ مجھے

یقین نہیں کہ وہ ایسا کرے گا۔“ شمشہ نے کہا۔

”تم ان مرد لوگوں کو نہیں جانتے ہو۔“ آپا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”یہ عورت کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا تصور کرتے ہیں۔ ممکن ہے۔ وہ ساس کے مرنے کا انتظار کر رہا ہو۔“

”نہیں آپا۔ وہ تو ماں کی طرح احسان سے محبت کرتی ہیں۔“

”ممکن ہے لیکن مجھے تو اس معذور عورت پر رحم آتا ہے۔ بے چاری داماد کے سہارے زندہ ہے۔ میں تو اس کی بچاری پر موت کو ترجیح دوں گی۔“

میں اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر میری ٹانگ ٹھیک نہ ہوگی اگر میں ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیا تو کیا شمشہ بھی میرے بارے میں بھی یہ ہی سوچے گی۔ میں اسے ایک بوجھ محسوس نہیں ہوں گا۔ آخر میں عمر میں اس سے اتنا بڑا تھا۔ پندرہ بس سال بعد میں اپنا چاق تصور کیا جاؤں گا۔ خدا نہ کرے جو یہ دن دیکھنا پڑے۔

اسی حالت میں ایک ماہ اور گزر گیا۔ اب اس بات میں کوئی شک نہ رہا تھا۔ کہ شمشہ آپا کو اپنے علاوہ ساری دنیا میں خامی نظر آتی تھی۔ ساری زندگی وہ آزاد اور خود مختار رہی تھیں۔ ان کی زندگی میں کسی کو دخل نہیں رہا تھا۔ اس لیے اب بھی ان کو اپنے کسی فیصلے میں مداخلت گوارہ نہ تھی اور اس صورتحال سے سب سے زیادہ بچاری شمشہ متاثر ہوئی تھی۔ شمشہ آپا نے اب مستقل نہیں رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ملازمت تلاش کر رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اپنے ہی جال میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔

گھر میں مسلسل رہنے سے دیے ہی بیزار ہو چکا تھا۔ احسان اور نازش بھی بھی ضرور آ جاتے تھے لیکن انہوں نے بھی شاید آپا کی سرد میری کو محسوس کر لیا تھا۔ کیونکہ اب ان کے رویے میں پہلی سی گرجوئی نہ رہی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ آپا



کے آنے کے بعد شمسہ اب تک ان کے ساتھ ہی کمرے میں سوئی تھی۔ اس نے میرے کمرے میں داخل ہونے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی، آپا کے رویے پر مجھ بھلانے کے باوجود وہ ان کے اشاروں پر چلتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آپا ہر وقت بیچاری نادرہ کے پیچھے بڑی رہتیں۔

بات بات پر ٹوکنا، ہر لمحہ ٹکرانی کرنا، ان کا معمول بن گیا تھا۔

اس صبح صفائی کرتے ہوئے اتفاق سے  
 نادورہ کے ہاتھ سے شیشے کا گلدان گر کر ٹوٹ گیا۔  
 چھٹا کے کی آواز سنتے ہی آپا تیر کی طرح کمرے  
 میں داخل ہوئیں۔

”توڑ دیا۔“ انہوں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”شمسہ کتنے شوق سے لائی تھی۔“

”میں نے جان بوجھ کر تو نہیں توڑا ہے۔“

نادرہ نے غصے میں جواب دیا اور ٹوٹے ہوئے  
گلدان کے ٹکڑے جمع کرنے لگی۔ ”صفائی کرتے  
ہوئے ہاتھ سے پھسل گیا۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم نے دانستہ توڑ دیا۔“ آپا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”ذرا احتیاط سے کام کیا ہوتا تو نہ گرتا۔“

’بہت برا ہوا لیکن کوئی بات نہیں تاوڑہ دوسرا آجائے گا۔ صرف دوسروں کا تھا۔‘

”میں نے کب کہا دس ہزار روپے کا تھا۔“  
آپا نے درشت لہجے میں کہا۔

”میں اس کی قیمت ادا کر دوں گی۔“ نادرہ نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

”آپ بھی حد کرتی ہیں آپا۔ معمولی سا گلہ ان ٹوٹے پر اتنی برہم ہو گئیں۔“ میں نے کہا۔  
”ایک اتفاقی حادثہ تھا۔“

”یہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ اس نے دانستہ  
گلدان کو توڑا ہے کیونکہ وہ مجھ سے خار کھاتی  
ہے۔“

“—”

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ مجھ سے جلتی ہے۔ کیونکہ میں ہر لمحہ اس کی نگرانی کرتی ہوں۔“

”لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔“

”ضرورت ہے۔ میں تم دونوں کی طرح  
آنکھیں بند کر کے گھر کو لٹے نہیں دیکھ سکتی۔“  
انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”کوئی بھی  
لوگر چوری کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

میرا دل چاہا کہ سرپیٹ لوں لیکن شمسہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ ”آپا یہ غلط ہے۔ نادرہ نے کبھی چوری نہیں کیا۔ آپ نے یہ بہت بڑا الزام لگا دیا اس پر۔“

”تم دونوں کو اس پر اتنا اندھا اعتماد کیوں ہے۔ میرے مقابلے پر تم اس کی حمایت کر رہے ہو“ وہ غصے سے بولیں۔

”بس ختم کیجئے آپ۔“ میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا اور اس کا کیا مقابلہ۔“

نادرہ اسی روز ملازمت چھوڑ کر چلی گئی، میں بیان نہیں کر سکتا مجھے کتنا دکھ ہوا لیکن وہ بڑی بہن تھیں۔ اس لیے کیا کر سکتا تھا۔ شرمہ بھی کئی دن تک خاموش اور ادا اس رہی لیکن ہم دونوں حالات کے ہاتھوں مجبور تھے۔ آپا کا حکم کون ٹال سکتا تھا۔

حالات دن بدن کشیدگی کا رخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ میرا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں مطالعہ کرتے گزرتا تھا۔ ہم شہمینہ آپا کے معمولات کے عادی ہو چکے تھے۔ ہر چیز کا وقت مقرر تھا۔ ناشتہ کھانا، جانے اور تفریح سب مقررہ اوقات میں ہونے لگے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ شمشہ مجھ سے دور دور رہنے لگی تھی۔ وہ تنہا کمرے میں نہ آتی باتیں کرتے ہوئے بھی وہ مجھے سے آنکھ نہ ملاتی تھی۔

”کیا بات ہے شمسہ۔“ ایک دن موقع ملے  
ی میں نے پوچھ لیا۔ ”یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا آیا

نے کچھ کہا۔“

”نہیں تو۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”وہ تو میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔“ لیکن اس کے لہجے کی غی نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

”کاش میں نے انہیں نہ بلایا ہوتا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ اپنے علاوہ کسی کو برداشت نہیں کر سکتی ہیں۔“

”یسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ وہ آپ کی  
ڈی بہن ہیں۔“ وہ پھرتی کے ساتھ کمرے سے  
کل گئی۔

میں حیران تھا۔ کیسی عورت تھی شمسہ۔ ہر  
ت کو برداشت کر لیتی تھی۔ ہر غم لی جاتی تھی۔  
یہ نہیں آپا اس سے کیا کچھ کہتی ہوں گی۔

ایک دن میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا پڑھ رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جہاں سے بچن صاف نظر آتا تھا۔ بچن کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شمرہ اور آپا کی باتیں کرنے کی آواز میں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بار بار کچھ کہہ رہی تھیں اور اسے احتجاجی لہجے میں تردید کر رہی تھی۔ اسی لمحے بچن نے احسان کو عقبی دروازے سے بچن میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ڈش تھی۔ آپا نے جلتے بھنے لہجے میں کچھ کہا۔ میں نے بلی بار شمرہ کو تیز لہجے میں بات کرتے ہوئے سنا۔ ”آپا۔ خدا کے لیے رحم کیجیے۔“

”لیکن میں برداشت نہیں کر سکتی۔“ آپا غصے  
 سے چیخ کر باہر نکل آئیں شمسہ آگے بڑھی اور پھر  
 ہانک لڑکھرائی۔ احسان نے لپک کر اسے بازوؤں  
 سے سمجھایا۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے  
 لگی۔ اسی لمحے آپا کمرے میں داخل ہوئیں۔ مجھے  
 ان کی سمت دیکھتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے مڑ کر  
 دیکھا اور پھر زہرے پیلے لہجے میں بولیں۔

”آپ نے کیا کہہ دیا شمسہ کو جو وہ اتنا رو رہی ہے۔“

”تم کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔“ وہ غصے سے بولیں۔ ”میں جو کچھ بھی کہتی ہوں اس کے بھلے کے لیے کہتی ہوں۔ مجھے تمہاری حالت پر رحم آتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں۔ ابھی بھی کچھ نہیں گیا ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ پایا آپ۔“  
 میں نے حیران ہو کر پوچھا اور انہوں نے ٹھنڈی  
 سانس لے کر دم بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔  
 ”فیصل علی مجھے کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے لیکن تم  
 نے اس لڑکی سے شادی کر کے حماقت کی ہے۔“  
 ”حماقت کی ہے۔“

”ہاں۔“ انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے جو کچھ کہا ہمدردی میں کیا لیکن کیا تم تو اندازہ تھا کہ صحت مند ہونے کے بعد بھی شمشہ ویسی ہی رہے گی۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“

”سنو۔ وہ عمر میں تم سے بہت چھوٹی ہے۔  
ایسی عمر میں جذباتی ہو جانا حیرت کی بات نہیں  
ہوتی۔“

”میں جانتا ہوں آپا لیکن۔“  
 ”بحث نہ کرو۔ میری بات دھیان سے  
 سنو۔ وہ بیمار تھی تو اور بات تھی۔ وہ احساس محرومی  
 کا شکار تھی۔ مایوس تھی تب اسے سہارے کی  
 ضرورت تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ جوانی  
 کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ اب وہ صحت مند  
 ہے۔ اسے شدت سے ہر بات کا احساس ہے۔“  
 ”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔

”خاک معلوم ہے۔ اگر تم کو ذرا بھی احساس ہونا تو شمسہ کو یہاں لا کر نہ رکھتے۔ احسان جیسے خوبصورت نوجوان سے ربط و مضطرب کا موقع فراہم نہ کرتے۔ تم نے خود اپنے پیروں پر کھلادی ماری ہے۔ فیصل اس کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

”آپا۔“ میں نے سراپا احتجاج بن کر کہا۔



”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

”اب بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ فیصل میں جانتی ہوں کہ شمشہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمہارا بہت احترام کرتی ہے۔ لیکن عمر میں تم سی بہت چھوٹی ہے۔“

”خدا کے لیے آپ بس کیجئے۔“

”یہ حقیقت ہے اور بڑی سچ بھی۔ تم کو بھی حوصلے کے ساتھ اسے تسلیم کر لینا چاہیے۔“ انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

”شمشہ خوبصورت ہے۔ جوان ہے اور احسان اس کا ہم عمر بھی ہے اور خوب صورت بھی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔“

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ خدا یا کیا یہ سب کچھ سچ تھا۔ کیا اسی لیے شمشہ مجھ سے دور دور تھی اور بے رخی کا سلوک کر رہی تھی۔ کیا میں نے جو کچھ دیکھا وہ اسی حقیقت کی ایک جھلک تھی۔

”اس میں احسان کا بھی قصور نہیں ہے۔ اس کا شمشہ کے ساحرانہ حسن سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ جذبات انسان کو اندھا بنا دیتے ہیں۔“

”آپا۔ آپا آپ مجھے دیوانہ کر دیں گی۔“ میں چیخ اٹھا۔

”نہیں۔ فیصل تمہیں دیوانہ نہیں، ہوش مند بننا چاہیے۔ تم مرد ہو، ہمت سے کام لو۔ بچاری شمشہ بے قصور ہے۔ قصور وار تو تم ہو۔“

”آپ کیا چاہتی ہیں آخر۔“

”شمشہ تم سے بے وفا کی نہیں کر سکتی۔ وہ مجبور ہے۔ اگر تم واقعی اس کو نہیں چھوڑ سکتے تو فوراً اس جگہ کو چھوڑ دو۔“

”نہیں۔“ میں غصے سے چیخا۔ ”اگر وہ مجھ سے وفا کر سکتی ہے۔ تو یہاں رہ کر بھی کر سکتی ہے۔ بصورت دیگر۔“

”بے شک۔ بے شک۔ بصورت دیگر میں

یہ ہی بہتر ہوگا کہ تم اس کے لیے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ وہ سنگدلی کے ساتھ بولیں۔ ”اگر وہ احسان کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے تو۔“

”نہیں یہ ناممکن ہے۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔“

”کیا تم اس سے محبت کرتے ہو۔“

”مجھے نہیں معلوم لیکن میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔“

”میں سمجھتی ہوں فیصل۔ بے شک تمہارے لیے یہ فیصلہ بہت اذیت ناک ہوگا لیکن تم خود سوچو اس عمر میں کب تک تم اس کا ساتھ دے سکو گے۔ اس سے پہلے کے وہ خود بیزار ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ زندگی سے پھر مایوس ہو جائے۔ اسے زندگی کی خوشیاں دے دو۔ جو وہ تم سے حاصل نہیں کر سکتی۔ یہی دانشمندی ہوگی۔“

آپا کمرے سے جا چکی تھیں لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر سست تار کی جھاچکی تھی۔ سینے میں آگ سی بھری ہوئی تھی۔ زندگی کرب و اذیت بن چکی تھی۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ محبت کیا ہوتی ہے لیکن ان چند دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا۔

دل کو بار بار سمجھانا تھا۔ کہ آپا نے جو کچھ کہا سب غلط تھا۔ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا۔ سب جھوٹ تھا۔ لیکن تین روز گزر چکے تھے اور شمشہ میرے پاس نہیں آئی تھی۔

آپا نے کہا تھا کہ اگر اسے مجھ سے محبت ہوگی۔ اگر اسے میری ضرورت ہوگی تو وہ خود آئے گی۔ مجھے پہل نہیں کرنی چاہیے۔ اسے فیصلہ کرنے کا موقع دینا چاہیے تو کیا یہ سچ تھا کہ وہ احسان سے محبت کر رہی تھی۔ کیا میں اس کی راہ میں حائل تھا۔ وہ میرے احسانات کے بوجھ تلے اتنا دبی ہوئی ہے کہ مجھے چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ میں اس کی محبت۔ اس کی مسرتوں کی راہ میں حائل تھا۔ میں جو عمر میں اس سے دو گنا تھا۔

میں جس نے اس کی بے بسی اور بے کسی پر رحم کھا کر اس کی مدد کی میں خود غرض تھا اپنے احسانات کے عوض اس کی محبت کا طالب تھا لیکن محبت احسانات کے ذریعے نہیں خریدی جاسکتی۔ محبت تو خوشبو ہے۔ اسے قید نہیں کیا جاسکتا۔ میں شمشہ کی زندگی سے خوشبوؤں اور شادمانیوں کو چھین لینا چاہتا تھا۔ میں اپنے احسانات کے صلے میں اسے ان مسرتوں سے محروم کر دینا چاہتا تھا جو مجھ جیسا ادھیڑ عمر شوہر اس کو بھی سمجھی نہیں دے سکتا تھا۔ زندگی کے اس سفر میں کتنی دیر اس کے ساتھ چل سکوں گا۔

چند برس بعد تھک کر اس کے لیے ایک بوجھ بن جاؤں گا اور باقی زندگی وہ مجبوراً یہ بوجھ اٹھائے چلتی رہے گی۔ کیونکہ وہ میری احسان مند تھی میں واقعی بڑا خود غرض تھا۔ اپنے احسانات کے عوض اس سے محبت کا طالب تھا لیکن محبت احسانات کے ذریعے نہیں خریدی جاسکتی۔ محبت تو خوشبو ہے۔ اسے قید نہیں کیا جاسکتا۔

میں جانتا تھا شمشہ میرے جذبات کو نہیں پہنچانے کی کوشش ہرگز نہ کرے گی۔ وہ مجھے خوش رکھنے کے لیے اپنی محبت قربان کر دے گی۔ شاید اس شرمندگی کی وجہ سے وہ میری پلاس آتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اس نے زندگی میں بھی سکون نہ دیکھا تھا۔ بھی محبت کی مٹھاس نہ چکھی تھی۔ کبھی زندگی کی کچی مسرتوں سے ہلکا کر نہیں ہوئی تھی۔ کیا مجھے یہ زیب دیتا تھا کہ میں اس کے دامن میں محرومیاں بھر دوں۔ کیا مجھے یہ حق پہنچتا تھا کہ میں اس سے وہ سب کچھ چھین لوں جو قدرت نے اسے زندگی میں پہنچا دیا ہے۔

کئی دن تک میں تنہائی میں غور کرتا رہا۔ راتوں کو کروٹیں بدل کر سوچتا رہا کہ اس فیصلے پر مجھے بڑی مسرت ہو رہی تھی ذرا بھی خوف نہ تھا۔ اس کے برعکس ذہن پر سے بوجھ سا اتر گیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر فخر سامحوس ہو رہا تھا۔ اتنا اور

قربانی تو انسان کا طرہ امتیاز ہے اور پھر اپنے فیصلے پر عمل کرنے کا موقع بھی مجھے بہت جلد مل گیا۔

شمشہ نے آپا نے اپنی ملازمت سے پیشین لینے کی جو درخواست دی تھی۔ وہ پہلے ہی منظور ہو چکی تھی۔ صبح سویرے ڈاک سے آنے والا خط آیا اسے پڑھتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑیں۔ انہیں ایک مقامی پرائیویٹ اسکول میں ملازمت مل گئی تھی جو حال ہی میں قائم ہوا تھا۔ انہوں نے اسی اسکول میں شمشہ کی ملازمت کے لیے بھی بات کی تھی اور خط بھی تحریر کیا تھا کہ وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے کر آئیں تاکہ انٹرویو لے لیا جائے۔

میرے لیے اس خبر میں خوشی کی بات صرف یہ تھی کہ بالآخر مجھے تنہائی نصیب ہو جائے گی اور میں اپنے منصوبے پر عمل کر سکوں گا۔ ہم ناشتا کر رہے تھے شمشہ اپنی فراک میں بیٹن لگا رہی تھی۔ آپا نے بڑی مسرت سے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ شمشہ کو بھی جاب مل جائے گی۔ بس دشواری یہ ہے کہ اسکول بہت دور ہے اور بس میں سفر کر کے بڑی کوفت ہوگی۔ فیصل کیوں نہ ہم اس جگہ کو چھوڑ دیں۔“

”چھوڑ دیں۔“ شمشہ اتنی زور سے اچھلی کہ سوئی انگلی میں چبھ گئی۔

”ہاں۔ ہمیں شہر میں اسکول کے قریب بھی مکان مل سکتا ہے۔“ آپا نے اس کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”شمشہ! تمہاری انگلی زخمی ہو گئی ہے۔“

”لیکن آپا! یہاں ہمیں بہت آرام ہے۔ اتنا بڑا مکان ہے اور۔“

”ہاں۔ پڑوس بھی اچھا ہے۔“ آپا نے کہا۔ ”احسان کو چھوڑنے میں ہمیں واقعی افسوس ہوگا۔“ انہوں نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شمشہ! ہاتھ دھولو۔ خون کا دھبہ تمہاری فراک پر لگ رہا ہے۔“



شمسہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ ”آپ آپ نے شمسہ کو چوکا دیا۔ اسے نازش سے بڑی محبت ہو گئی ہے۔“

آپا نے بے دھڑک کہا۔ ”تم نے دیکھا نہیں مکان چھوڑنے کی بات سن کر وہ اتنی زور سے اچھلی کہ انگلی زخمی کر لی۔“

ذرا دیر بعد شمسہ لباس تبدیل کر کے واپس آئی تو اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ میں مبہوت رہ گیا۔ مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ آپا کی نگاہیں ہم دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”آپا۔ ہم دونوں کے جانے کے بعد یہ اکیلے کیسے رہیں گے۔“ شمسہ نے آہستہ سے کہا۔

”ان کو کیا بچے پالنا ہیں۔“ آپا نے سر دہلچے میں کہا۔ ”اور پھر خدا نخواستہ یہ کوئی معذور تو نہیں ہیں۔“

”تم میری فکر نہ کرو شمسہ۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میں تو تنہا رہنے کا عادی ہوں۔“ میں نے اسے جی بھر کے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں چلی گئیں۔ گھر میں سناٹا چھا گیا۔ کتنی خوبصورت اور محسوس تھی شمسہ بے شک اسے ایک ایسے شریک حیات کی ضرورت تھی جو اس کا ہم پلہ ہو۔ جو زندگی کے تیز سفر میں اس سے قدم ملا کر چل سکے۔ میرے ساتھ دیکھ کر لوگ شمسہ کو شریک حیات نہیں۔ میری بیٹی تصور کریں گے اور جن کو حقیقت کا علم ہوگا وہ مجھے خالم اور حریص تصور کریں گے۔ نہیں شمسہ! میں تم سے اپنے احسان کی اتنی بڑی قیمت وصول نہیں کروں گا۔

میرا فیصلہ اٹل تھا لیکن ہر چیز سلیقے سے کرنا تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ احسان چھٹی پر تھا اس لیے اس کے دفتر سے مطلوبہ شیشی حاصل کرنے میں مجھے دشواری نہ ہوگی۔ میں کسی کے لیے بوجھ نہیں بنوں گا۔ جب وہ دونوں واپس آئیں گی تو میں

اپنے بستر پر آرام سے سوتا ہوا ملوں گا۔ انہیں کچھ دیر بعد اندازہ ہوگا کہ میری نیند اب دی ہے۔ بیشک انہیں بڑا صدمہ ہوگا لیکن وقت اس زخم کو مندمل کر دے گا۔

نئی زندگی کی مسرتوں میں شمسہ مجھے بھول جائے گی۔ جس طرح باپ کی موت کا غم آہستہ آہستہ بھول گئی۔

لیکن مرنے سے پہلے ایک خط مجھے ضرور چھوڑ دینا چاہیے۔ تاکہ کئی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ موت کا تصور کر کے ایک مرتبہ پھریری آگئی۔ لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ بھلا موت سے کیا ڈرنا۔ کسی کے لیے مرجانا تو ایک سعادت تھی اور پھر میں تو ابھی شمسہ کے لیے جان دے رہا تھا۔ اس کی محبت کے لیے یہ تھک دینا تو نہیں تھا، پیاری نے زندگی میں دکھ ہی دکھ جھیلے تھے۔ احسان کے ساتھ اسے زندگی کی سچی مسرتوں کا لطف ملے گا۔

بارہ بجے کے قریب میں لباس تبدیل کر کے بیڈ کے سہارے لٹکڑا تا ہوا باہر نکلا میں نے در پیچے سے پہلے ہی جھانک لیا تھا۔ احسان یا اس کے گھر کا کوئی فرد باہر نہ تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ میں بس اسٹاپ تک پہنچا۔ کچھ دیر بعد بس مل گئی۔ میں کالج پہنچا تو چھٹی ہو چکی تھی۔ میں احسان کی لیبارٹری میں پہنچا تو دفتر کے کمرے میں اس کا اسٹنٹ موجود تھا۔ وہ رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔

”فیصل صاحب آپ۔“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”آپ نے کیسے زحمت کی۔“

”زحمت نہیں مایاں، ورزش کہو ڈاکٹر نے چلنے پھرنے کی ہدایت کی ہے سوچا ذرا کالج ہو آؤں۔ احسان نے کہا کہ اس کی دراز میں ایک ضروری خط رکھا ہوا ہے وہ لیتا آؤں۔“

”اوہ..... مجھے فون کر دیا ہوتا چلے میں نکال دوں۔“ اس نے دراز سے سچی نکال لے ہوئے کہا۔

”نہیں تم کام کرو احسان نے مجھے بتلا دیا

ہے کہ وہ کہاں رکھا ہے۔“ میں نے کنجی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا، میں نے لیبارٹری کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر بند کر لیا، احسان کی دراز کھول کر چابیاں نکالیں اور سامنے رکھی ہوئی الماری سے وہ شیشی نکال لی جو ایک دن احسان نے میرے سامنے اس میں رکھی تھی۔ اس نے بتلایا تھا، یہ بے مزہ زہر پلک جھپکتے انسان کو موت کی نیند سلا سکتا تھا، اسے ایک خاص تجربے کے لیے لیبارٹری میں منگوایا گیا تھا۔ میں اپنے ساتھ زیتون کے تیل کی شیشی لے کر آیا تھا جو چکن میں رکھی ہوئی تھی۔ یہ خوب صورت چھوٹی سی شیشی میں نے خود خریدی تھی۔ کیونکہ شمسہ سلاڈ میں ہمیشہ زیتون کا تیل ملائی تھی۔ جس سے وہ بہت مزے دار ہو جاتا تھا۔

میں نے اس بے مزہ اور بغیر بو والے زہر کو مناسب مقدار میں اپنی شیشی میں بھرنے کے بعد الماری کو مقفل کر دیا۔ کنجیاں دراز میں بند کیں اور پھر کاغذ کے نیلے لفافے میں ڈال کر ساتھ لائے ہوئے تھیلے میں رکھ لی۔ باہر آ کے کنجی لب اسٹنٹ کو واپس کی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا، بس اسٹاپ کی سمت روانہ ہوا، مجھ پر خوشی کا جنون سوار تھا، موت کا تصور بڑا حسین لگ رہا تھا۔ خوف کے بجائے ایک عجیب سا قاتحانہ سوز طاری تھا۔ زندگی کا جب کوئی مقصد نہ ہو تو زندہ رہنا بے کار ہے۔ میں اس دنیا میں بالکل تنہا تھا، شمسہ نے زندہ رہنے کی جو لگن پیدا کی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن اس نے کسی کو اپنی محبت کا خور بنایا تھا، بے شک محبت ایک آگ کا دریا ہے۔ اس میں ڈوب کر جانے کی ہمت صرف ایثار کرنے والوں میں ہوتی ہے۔ شمسہ کی محبت پر مجھے اپنا پیار قربان کر دینا چاہیے۔

میں اپنے خیالات میں اتنا گویا ہوا تھا کہ کسی بات کا ہوش نہ تھا، بس میں بیٹھ کر باہر جھانکتا

رہا، اور اس وقت چونکا جب سپر مارکیٹ کا اسٹاپ آ گیا، بس سے اترتے ہوئے مجھے کسی نے آواز دی لیکن میں نے توجہ نہیں کی۔ دوکان سے ڈبل روٹی، کھن، اور کافی خریدی، دکاندار نے سامان میرے تھیلے میں رکھ دیا، میں وہاں سے پیدل چلتا ہوا، گھر واپس پہنچا تو احسان کی خوش دامن اپنے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

”میرے خدا! تم کو اس حالت میں بازار جانے کی کیا ضرورت تھی۔“ انہوں نے کہا۔

”احسان سے سامان منگوایا ہوتا۔“

”بٹھئے، بٹھئے کھرا گیا تھا۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”ویسے بھی ڈاکٹر چلنے پھرنے کی ہدایت کی ہے۔“

میں تیزی کے ساتھ گھر میں داخل ہوا، اس وقت میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا، میں جانتا تھا کہ اگر میرا ارادہ ایک مرتبہ متزلزل ہو گیا تو پھر کبھی اس پر عمل نہ کر سکوں گا۔ چکن میں پیچ کر میں نے سامان کا تھیلا رکھا، اور ایک ایک کر کے ساری چیزیں نکالنا شروع کر دیں۔ تھیلا خالی ہو گیا، لیکن نیلے کاغذی تھیلے میں رکھی ہوئی زہر کی شیشی اس میں نہ تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سامان خریدتے ہوئے زہر کی شیشی میں نے تھیلے سے نکال کر دوکان کے کاؤنٹر پر رکھی تھی اور روانہ ہونے سے پہلے سامان والے تھیلے میں رکھ لی تھی۔ تھیلا میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا، پھر زہر کی شیشی کہاں گئی۔ گھر اگر میں نے اپنی تمام جیبیں ٹٹول لیں لیکن شیشی نہ ملی۔ ایک لمحہ کو میرا جسم خوف سے سرد ہو گیا۔ آخر وہ زہر کی شیشی کئی کہاں۔

اجانک مجھے خیال آیا کہ زہر زیتون کی رنگیں شیشی میں تھا، وہ بغیر بو اور بے مزہ زہر شیشی کے تیل میں مل کر شناخت نہ ہو سکے گا۔

”اوہ..... میرے خدا یہ میں نے کیا کیا۔ کیا



میں کسی بے گناہ کا قاتل بن جاؤں گا۔ نہیں نہیں! یہ نہیں ہو سکتا، میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، دنیا مجھے کہے گی ہر طرف سے لعنت ملا مت ہوگی۔ ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ خدا یا میں کیا کروں۔ میں خوف و دہشت سے گرا ہٹا۔

اسی لمحہ دردناک کھلا اور شمسہ اندر داخل ہوئی۔ ”فیصل میں واپس آگئی، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی، میں آج آپ سے بات کرنے آئی ہوں میں۔“ اچانک اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”غضب ہو گیا، شمسہ! غضب ہو گیا۔“ میں نے دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پولیس کوفون کرنا پڑے گا فوراً۔“

شمسہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ میں تیزی سے لنگڑاتا ہوا احسان کے گھر کی سمت بڑھا۔ شمسہ بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آ رہی تھی، لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ احسان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے پولیس کا نمبر ڈائل کیا۔ ”پولیس اسٹیشن، میں فیصل علی بول رہا ہوں، شاہ زمان کالونی کالج نمبر ۴ سے مجھ سے ایک شیشی گم ہو گئی ہے، جس میں مہلک زہر بھرا ہوا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”شیشی پر او لیو آکل لکھا ہوا ہے، ہاں زیتون کے تیل کی چھوٹی شیشی ہے، گہرے سرخ رنگ کی، بشکل پانچ انچ لمبی ہوگی اور وہ کاغذ کے نیلے تیلے میں رکھی ہوئی ہے، کوئی اسے زہر نہ سمجھ پائے گا، خدا کے لیے اسے تلاش کیجئے۔ لوگوں کو کسی طرح خبردار کر دیجئے۔“

شمسہ نے دیوار کا سہارا لے لیا تھا۔ دہشت سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا، لب کانپ رہے تھے۔

”میں نے وہ کالج لیبارٹری سے چوری کیا تھا۔ نہیں مجھے زہر کا نام نہیں معلوم، لیکن وہ مہلک

ہے، میں کالج سے پانچ نمبر کی سرخ بس پر روانہ ہوا تھا۔ جس پر سفید دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ ٹھیک وقت تھا۔ پھر مارکیٹ کے اسٹاپ پر اتر گیا تھا۔ وہاں جنرل اسٹور سے کچھ سامان خریدا اور پھر پیدل گھر واپس آ گیا۔ ہاں یہاں آنے کے بعد چلا کہ زہر کی شیشی غائب ہے، نہیں میں نے اچھی طرح تلاش کر لیا ہے۔ کیوں ہاں ہاں میں خودکشی کرنے جا رہا تھا۔“ میں نے غصے میں چیخ کر کہا۔ سامنے ٹکڑی شمسہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دوسری جانب فون پر پولیس والا بحث کیے جا رہا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ کسی نے اسے زیتون کا تیل سمجھ کر استعمال کر لیا تو کیا ہوگا۔ وہ فوراً مر جائے گا۔ اسی لیے تو آپ کوفون کر رہا ہوں۔ میں..... میں مجرم ہوں، میں نے مجرمانہ غفلت کی ہے۔ یہ بحث بعد میں کر لیتا۔ میرے بھائی پہلے خدا کے لیے کچھ کرو۔“ میں نے التجا کی۔ اپنا پتا اور احسان کا فون نمبر دوبارہ نوٹ کر لیا۔ ریسیور رکھ کر پلٹا تو شمسہ آگے بڑھی۔

”کیوں۔ آخر کیوں۔“ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے سوال کیا۔ ”اگر مجھے سے کوئی خطا ہوئی ہے تو معاف کر دیجئے۔“

”تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔“ میں نے سر دلچے میں کہا۔ ”جرم میں نے کیا ہے، اگر کوئی مر گیا تو قاتل میں قرار دیا جاؤں گا۔“

”نہیں فیصل علی! جرم آپ نے نہیں، میں نے کیا ہے، مجھے آپ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ مجھے پہلے ہی یہ احساس ہو جانا چاہیے تھا کہ آپ کو کتنی ذہنی اذیت ہو رہی ہے۔“

”خدا کے لیے شمسہ تم جاؤ۔“

”میں..... میں ہرگز نہیں جاؤں گی، ہم ساتھ چل کر اس شیشی کو تلاش کریں گے، گھبراہٹ نہیں فیصل کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ بھاگتی ہوئی اندر گئی۔ دوسرے ہی لمحے احسان بدحواسی کے عالم

میں باہر نکلا۔

”خدا کی پناہ فیصل..... میں کیا سن رہا ہوں۔“ اس نے غصے میں کہا۔ ”میں کار نکال رہا ہوں، تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔“

ذرا دیر بعد ہم دونوں اس کی کار میں بیٹھے مارکیٹ کی سمت روانہ ہو گئے۔ ”وہ زہر تم کو ملا کہاں سے۔“ اس نے پوچھا۔

”لیب میں تمہاری الماری سے چوری کر کے لایا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یاد ہے تم نے خود ایک مرتبہ مجھے وہ شیشی دکھائی تھی۔“

”خدا یا..... یہ تم کو ہوا کیا ہے، کیا دیوانے ہو گئے ہو۔“

”میں خودکشی کرنے جا رہا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ نہ پوچھو کہ کیوں، پہلے ہر قیمت پر شیشی تلاش کر لو، پھر سب کچھ بتا لوں گا۔“

”میں خود محسوس کر رہی تھی کہ آپ کتنے پریشان ہیں۔ میں آپ سے بات کرنے آئی تھی۔ جس دن سے آپ آئی ہیں۔“ اس نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

پولیس ہم سے پہلے مارکیٹ پہنچ چکی تھی۔ دکان کے سیلز مین نے بڑے یقین کے ساتھ بتایا کہ میں نے شیشی وہاں نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے سامان رکھتے وقت میرے تیلے میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب میں مارکیٹ پہنچا تو شیشی میرے پاس نہیں تھی۔

”آپ نے بس میں تو نہیں چھوڑی۔“ شمسہ نے پوچھا۔

”ایک منٹ.....“ سب انسپکٹر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو یقین ہے کہ بس میں بیٹھے ہوئے شیشی آپ کے پاس تھی۔“

”ہاں۔“

”خوب غور کر لیجئے۔ آپ اس وقت ذہنی کشمکش میں تھے۔“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

”تو پھر یقیناً شیشی بس میں چھوڑ دی۔“ سب انسپکٹر شاہد نے کہا۔ ”ہم بس کو تلاش کر رہے ہیں اور ریڈیو پر لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے وارننگ بھی نشر ہونے لگی ہوگی۔“

”لیکن اگر شیشی کسی کو مل گئی اور اس نے زیتون کا تیل سمجھ کر استعمال کر لیا تو۔“ احسان نے کہا۔ ”سب لوگ ہر وقت ریڈیو تو نہیں سنتے۔“

”ہم بس کو تلاش کر رہے ہیں، آپ بھی کوشش کیجئے۔“ شاہد نے کہا۔ ”اور اگر شیشی مل جائے تو فوراً پولیس اسٹیشن فون کر دیں۔“

”اب کیا کریں۔“ شمسہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

”میرا خیال ہے ہم لوگ بھی بس کی تلاش میں چلیں۔“ احسان نے کہا۔ ”تم بس کو پہچان لو گے۔“

”ہاں..... شاید پہچان لوں۔“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میں جس کیفیت میں بس میں بیٹھا تھا اس میں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔

پانچ نمبر کی بس..... جشید نگر جا کر ختم ہوتی تھی۔ تاہم اسی راستے پر جا رہے تھے۔ آخری اسٹاپ سے پہلے ہی ہمیں پولیس کی گاڑی نظر آئی۔ سڑک کے کنارے دو جیس رکی ہوئی تھی۔ دونوں کارنگ سرخ تھا اور باڈی پر سفید دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ پولیس والے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ہمارے پیچھے تک اگلی بس روانہ ہو گئی۔ احسان نے کار کوموٹر ٹرپس کے قریب روکا۔ ہم کار سے اتر کر تیزی سے روانہ ہوئے۔

”یہ مسٹر احسان ہیں۔“ احسان نے پولیس والے سے کہا۔ ”شیشی کا کچھ بتا چلا۔“

”جی نہیں۔“ سارجنٹ نے کہا۔ ”آپ نے اسی بس میں سفر کیا تھا۔“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”جی نہیں۔“

”خوب غور کر لیجئے۔ آپ اس وقت ذہنی کشمکش میں تھے۔“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“



”ہاں..... میرا خیال ہے یہ ہی بس تھی۔“  
 میں نے بس کو پہچانتے ہوئے کہا۔ ”میں ادھر  
 کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔“  
 ”لیکن ہمیں تو اس سیٹ پر کوئی شیشی نہیں  
 ملی۔“ کنڈیکٹر نے کہا۔  
 ”ممکن ہے کسی نے شیشی اٹھالی ہو۔“  
 ڈرائیور نے کہا۔ ”اس سیٹ پر آپ کے علاوہ  
 کون بیٹھا تھا۔“  
 ”ایک عورت یا لڑکی۔“ میں نے سوچتے  
 ہوئے کہا۔ ”شاید نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا  
 اس نے.....“  
 ”اگر اس نے شیشی اٹھائی تو اس کی جان  
 خطرے میں ہے۔“  
 ”ٹھہرو..... ایک منٹ۔“ ایک نوجوان  
 نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تم نیلی کے برابر  
 بیٹھے تھے۔ ہاں..... مجھے بھی یاد پڑتا ہے، اوہ مائی  
 گاڈ! اگر وہ مر گئی تو.....“  
 ”تم اس کو جانتے ہو۔“ سارجنٹ نے  
 پوچھا۔ ”کہاں رہتی ہے وہ۔“  
 ”نہیں مجھے نہیں معلوم۔“  
 ”پھر تم نے اس کا نام کیسے معلوم کر لیا۔“  
 ”نام..... مجھے نہیں معلوم اس کا نام کیا  
 ہے۔ میں اسے نیلی کہتا ہوں کیونکہ وہ عموماً نیلا  
 لباس پہنتی ہے۔“  
 ”تم کو یہ کیسے معلوم۔“  
 ”ایک منٹ.....“ کنڈیکٹر نے کہا۔ ”وہ  
 نیلے لباس والی لڑکی کس اسٹاپ پر اترتی تھی۔“  
 ”میں جانتا ہوں۔“ نوجوان نے بات کا  
 شکر کہا۔ ”آپ کے پاس کار ہے نا؟ آئیے دیر نہ  
 کیجئے۔“  
 ”نیلی کو تلاش کرنے۔“ نوجوان نے کہا۔  
 ”اس کی زندگی خطرے میں ہے۔“  
 ”اگر شیشی مل گئی تو ہم فوراً پولیس کو فون  
 کر دیں گے۔“ احسان نے کہا۔ ”چلو دیر نہ

کرد۔“  
 ”میرا نام دیک ہے۔“ اس نوجوان نے  
 کہا۔ ”اگر اسے کچھ ہو گیا تو اچھا نہ ہوگا۔“ اس  
 نے مجھ سے کہا۔  
 ”اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ شمس نے جلدی  
 سے کہا۔ ”بس دعا کرو کہ شیشی اس نے اٹھائی  
 ہو۔“  
 ”اتنی اچھی بیوی ہوتے ہوئے آپ کو  
 خودکشی کیا سوچھی تھی۔“ اس نے کہا۔  
 ”دماغ خراب ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا۔  
 ”لگتا تو یہ ہی ہے۔“ اس نے بے ساختہ  
 کہا۔ ”ویسے حقیقت کیا تھی۔“  
 ”چھوڑو..... اس بحث کو تم اپنی نیلی کے  
 بارے میں بتلاؤ۔“ شمس نے مداخلت کی۔  
 ”اوہ..... وہ بہت خوب صورت ہے۔“  
 اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اتنی خوب صورت  
 کہ اس کی وجہ سے میری نوکری جانی رہی۔“  
 ”وہ کیسے۔“  
 ”دیکھئے نا، وہ ٹھیک ایک بجے اسپتال سے  
 چھٹی کرتی ہے اور میں ہر روز اسٹاپ پر اس کا  
 انتظار کرتا ہوں۔“ اس نے بڑی مصومیت سے  
 کہا۔ ”بس میں اس کو اس کے گھر کے اسٹاپ تک  
 چھوڑ کر دفتر واپس پہنچتا تھا تو وہ ڈھائی بج جاتے  
 تھے۔ اس لیے سینٹھ نے نکال دیا۔“  
 ”اتنی محبت ہے تم کو اس سے۔“ شمس نے  
 حیرت سے کہا۔ ”مجھے یہ فکٹنگز ہر گز رہی تھی۔“  
 ”جی ہاں لیکن پھر بھی میں اس کے لیے  
 خودکشی نہیں کروں گا۔“  
 ”تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔“ میں نے  
 چیخ کر کہا۔  
 ”شادی..... لیکن ابھی تک تو نام بھی معلوم  
 نہیں کر سکا۔ بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔“  
 شمس..... بے ساختہ ہنس پڑی احسان بھی  
 مسکرایا تھا، میں غصے میں اسے ٹھوکر مارا احسان

نے اسے یاد دلایا۔ ”تم کو راستہ تو یاد ہے نا تم  
 کام کیا کرتے ہو۔“  
 ”ڈرائیور ہوں۔“ دیک نے جواب دیا۔  
 ”یوں حیرت سے نہ دیکھئے گریجویٹ ہوں، بھوکا  
 مرنے سے بہتر یہ کہ جو کام ہے وہ آدنی کر لے۔  
 آپ کو ڈرائیور کی ضرورت تو نہیں۔“  
 ”نہیں۔“ میں نے فوراً کہا۔ ”شمس خود  
 ڈرائیور کر لیتی ہیں۔“  
 ”نہیں فیصل حادثے کے بعد اب مجھ میں  
 ہمت نہیں۔“  
 ”حادثہ کیا حادثہ۔“ دیک نے پوچھا۔  
 شمس نے خوف سے پھر پری لی۔ ”برا  
 ہولناک حادثہ تھا۔“ اس نے دیک کو تفصیل  
 بتاتے ہوئے کہا۔ ”تم ڈرائیور ہونا۔ مجھے ایک  
 بات بتلاؤ۔ میں بائیں طرف چل رہی تھی۔ کار  
 اچانک سامنے آ گئی۔ سڑک کے چپے لٹیب میں  
 گڑھا تھا۔ اس لیے میں نے دائیں جانب کار کو  
 موڑ دیا۔ اس نے بھی دائیں جانب کار کھائی اور  
 ٹکر ہوئی، کیا میری غلطی تھی۔“  
 ”نہیں۔“ دیک نے کہا۔ ”غلطی آپ کی  
 نہیں تھی۔ ویسے بھی ایسے حادثے اچانک اور  
 اتفاقیہ ہوتے ہیں۔ کوئی دانستہ حادثہ نہیں کرتا۔“  
 ”میں دائیں جانب بیٹھی تھی اس لیے بچ  
 گئی۔“ شمس نے کہا۔ ”لیکن فیصل شدید زخمی  
 ہو گئے۔ مجھے ہر لمحے یہ خیال رہتا ہے کہ اگر میں  
 کار کو دائیں جانب نہ موڑتی۔“  
 ”تو فیصل صاحب زخمی نہ ہوتے بلکہ آپ  
 ہوتیں۔“ دیک نے بات کاٹ کر کہا۔ ”لیکن  
 حادثے کسی کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے  
 محترمہ ورنہ حادثہ نہ کہلا میں۔“  
 ”لیکن ٹھینہ آپا کا تو خیال یہ ہے کہ حادثہ  
 کوئی چیز نہیں انسان کے ہر عمل میں اس کے  
 لا شعور کا دخل ہوتا ہے۔ جو کچھ ہوا اس میں میری  
 اپنی لا شعوری خواہش کا رفرما تھی۔“

”حاشا کوئی چیز نہیں۔“ دیک نے آنکھیں  
 نچا کر کہا۔ ”یہ محترمہ رہتی کہاں ہیں۔“  
 ”وہ..... وہ بہت دانشمند اور تجربہ کار  
 ہیں۔“ شمس نے جلدی سے کہا۔  
 ”عقل حد سے بڑھ جائے تو انسان کو پاگل  
 خانے پہنچا دیتی ہے۔“ دیک نے جواب دیا۔  
 ”بعض لوگوں کو عقل کا ہیضہ ہو جاتا ہے۔ حادثہ  
 کبھی اختیاری یا دانستہ نہیں ہوتا۔“  
 ”واقعی تمہارے خیال میں میرے لا شعور کا  
 کوئی دخل نہ تھا اس میں۔“  
 ”خدا کی پناہ۔“ دیک چلایا۔ ”پہلے فرض  
 کیجئے کہ آپ کا لا شعور باغی ہو گیا تھا۔ وہ دوسرا جو  
 حادثے میں مر گیا۔ اس کے لا شعور نے کیا یہ  
 مشورہ دیا تھا کہ ٹکرا کر مر جاؤ۔“  
 شمس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ ”تم  
 جج کہتے ہو میرے دل پر سے ایک بوجھ ہٹ  
 گیا۔“  
 ”شمس کیا آپ اپنے تم سے یہ کہا تھا کہ تم نے  
 دانستہ مجھے زخمی کیا۔“  
 ”دانستہ تو نہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ اس  
 میں میرے لا شعوری ارادے کا دخل ضرور تھا۔  
 وہ..... وہ مجھے الزام تو نہیں دیتیں اور چھوڑو اس  
 ذکر کو۔“  
 ”واہ..... کیسے چھوڑ دیا جائے۔ یہ عمر جو  
 بھی ہیں بلاوجہ آپ کو احساس جرم میں مبتلا کر رہی  
 تھیں۔“ دیک نے کہا۔ ”ویسے یہ ہیں کون۔“  
 ”میری بہن ہیں دیک کا خیال درست  
 ہے شمس! آپا نے تم کو احساس جرم میں مبتلا  
 کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں.....“  
 ”اب جانے بھی دو فیصل۔“ شمس نے کہا۔  
 ”ویسے دیک دلچپ آدمی ہے، انجان لڑکی سے  
 محبت کرتا ہے۔“  
 ”بھلا محبت جان پہچان کی محتاج کب رہی  
 ہے۔“ دیک نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”محبت میں



کرتا ہوں وہ تو نہیں۔“

”تم نے اسے بتلانے کی کوشش بھی نہیں کی۔“ احسان نے پوچھا۔

”کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔“

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ”ان جیسا بے نیاز عاشق پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“ میں نے کہا۔

”بس یہ اگلے موڑ پر کار کو ایک سمت پار کر لیں۔“ دیکھ نے کہا۔ ”وہ لڑکی یہیں پر اتری ہے اور سامنے والی سڑک پر جاتی ہے۔“

احسان نے کار سڑک کے کنارے پارک کی۔ ہم سب اتر کر باہر آگئے کار کو لاک کر کے احسان نے کہا۔ ”تم اس کا نام جانتے ہو اور نہ پتا ہم اسے تلاش کیسے کریں گے۔“

”اپنی عقل سے۔“ دیکھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ بہت خوب صورت ہمیشہ نیلا لباس پہنتی ہے۔ شاید اسپتال میں نرس ہے۔“ فیصل صاحب آپ دونوں کو ساتھ لے کر بائیں سمت کے مکانات پر دستک دیں۔ میں دائیں سمت سے شروع کرتا ہوں پہلے انتظار کس بات کا ہے۔“

ہم ابھی تیسرے مکان ہی پر پہنچے تھے کہ دیکھ نے چلا کر آواز دینا شروع کی۔ وہ ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ ہم لپکتے ہوئے پاس پہنچے تو دیکھا کہ دروازے پر ایک خوب صورت لڑکی فٹری حیرت سے ہم کو دیکھ رہی تھی۔

شاید وہ سوئے سے اٹھ کر آئی تھی۔ کیونکہ آنکھیں خوابیدہ تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

”دیکھا..... آپ نے آخر میں نے تلاش کر لیا۔“ اس نے شمس کی سمت دیکھ کر فاتحانہ لہجے میں کہا۔

”آخر بات کیا ہے۔“ لڑکی نے حیران ہو کے پوچھا۔

”بات بہت ضروری، بلکہ خطرناک ہے۔“ دیکھ نے کہا۔ ”اندر چلیے وہیں بات ہوگی۔“

لڑکی ان سب کو لے کر جس کمرے میں داخل ہوئی وہ صاف ستھرا چھوٹا ڈرائنگ روم تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے پھر سوال کیا۔ ”جی اب بتلائیے کیا بات ہے۔“

”دیکھو ہم تمہیں الزام نہیں دے رہے۔“ دیکھ نے جلدی سے کہا۔ ”لیکن کیا تم کو آج بس میں زیتون کے تیل کی شیشی ملی تھی۔“

”نہیں تو۔“ لڑکی نے قدرے غصے میں جواب دیا۔ سب کے چہرے اتر گئے۔

”دیکھو! بات یہ ہے کہ شیشی میں زہر تھا۔“ شمس نے کہا۔ ”میرے شوہر فیصل علی صاحب تمہارے برابر میں بیٹھے تھے۔“ اس نے میری طرف اشارہ کر کے بتلایا۔ ”یہ شاید سیٹ پر وہ شیشی چھوڑ آئے ہیں۔“

”زہر کی شیشی سیٹ پر چھوڑ آئے۔“ لڑکی نے ملامت آمیز نظروں سے دیکھا۔ ”لیکن مجھے تو نہیں ملی۔ ویسے آپ کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگتا ہے۔“ اس نے دیکھ کی سمت دیکھ کر کہا۔

”لگتا ہے نا۔“ دیکھ نے خوش ہو کر کہا۔ ”میں روزانہ بس پر تمہارے ساتھ ہوتا ہوں۔“

”اوہ..... آپ بس ڈرائیور ہیں۔“ ”مم..... میں..... نہیں تو۔“ دیکھ نے جلدی سے کہا۔ ”میں..... میں تو۔“

”ایک منٹ دیکھ۔“ میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”آپ کا کیا نام ہے مس۔“

”میلی۔“ میں اسپتال میں نرس ہوں۔“ ”بڑا پیارا نام ہے۔“ دیکھ جلدی سے بولا۔ میں نے اسے غصے سے گھورا۔

”مس میلی! یہ مسئلہ بڑا سنگین ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں وہ زہر کی شیشی کہیں بھول آیا ہوں۔ خیال ہے شاید بس پر رہ گئی ہو۔ مجھ سے مجرمانہ غفلت ہوئی ہے اور اگر کسی نے اس زہر کو زیتون کا تیل سمجھ کر استعمال کر لیا تو مر جائے گا۔“

پولیس شیشی کو تلاش کر رہی ہے۔ ریڈیو پر اس سے متعلق اعلان نشر ہو رہا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید

وہ شیشی آپ کو مل گئی ہو۔ اس لیے آپ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آئے۔ خدا کے لیے ذہن پر زور دے کر یاد کیجئے۔ شاید آپ نے کسی کو وہ شیشی اٹھاتے ہوئے دیکھا ہو۔“

لڑکی چند منٹ سوچتی رہی۔ ”نہیں مجھے کچھ یاد نہیں۔“ اس نے جواب نہیں دیا۔ ”میں نے اس وقت کچھ توجہ نہیں کی۔“

”آپ نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔“ شمس نے پوچھا۔ ”یہ تو دیکھا ہوگا کہ ان کے آس پاس کون بیٹھا تھا۔“

”ممکن ہے۔“ ”ایک منٹ۔“ میلی نے کہا۔ ”میں نے بیگم رضوان کو دیکھا تھا اور اس بات پر حیران بھی ہوئی تھی کہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود وہ بس پر سفر کیوں کر رہی ہیں۔ ان کے پاس چار کاریں ہیں۔“

”آپ انہیں جانتی ہیں۔“ میں نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ ”شاید انہوں نے دیکھا ہو ان کا فون نمبر کیا ہے۔“

”فون نمبر تو نہیں معلوم، البتہ کوشی کا پتا معلوم ہے۔“ میلی نے کہا۔ ”وہ بیمار تھیں تب میں نے ان کی نرسنگ کی تھی۔“

”بس تو فوراً ہمارے ساتھ چلو۔“ دیکھ نے کہا۔ ”زندگی اور موت کا سوال ہے۔“

میلی چند منٹ میں تیار ہو کر ہمارے ساتھ روانہ ہو گئی۔ ہم کار کے پاس پہنچے تو دیکھ نے کہا۔ ”آپ لوگ پیچھے بیٹھیں میں کار ڈرائیو کروں گا۔“ میلی پتا بتلائی جائے گی۔“

احسان نے مسکراتے ہوئے کار کی چابی دیکھ کے حوالے کر دی۔ ہم اس خوشی کا سبب سمجھ رہے تھے۔ جبکہ میلی حقیقت سے بے خبر تھی۔

”سوال یہ ہے کہ آپ کو خوشی کرنے کا خیال کیوں آیا۔“ میلی نے اچانک سوال کیا۔

”تمہیں آپا کی وجہ سے۔“ دیکھ نے فوراً

کہا۔

”اوہ..... نہیں۔“ شمس نے جلدی سے کہا اور گھبرا کر میری سمت دیکھا۔ ”آپ ایسی بری بھی نہیں۔“

میں جانتا تھا کہ وہ مجھے تلی دینے کے لیے کھد رہی تھی لیکن میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا کیا یہ سچ نہ تھا۔ دیکھ نے اجنبی ہوتے ہوئے چند لمحوں میں حقیقت کا اندازہ کر لیا تھا۔ محرومی ماپوسی اور زندگی سے بے زاری کا یہ زہر میرے ذہن میں پھیلایا تھا خدا یا۔ اس بدنامی اور احساس جرم سے بہتر تو یہ ہوتا کہ میں مر جاتا۔

”فیصل صاحب بڑے بڑھے لکھے سمجھ دار آدمی ہیں۔“ یہ دیکھ کہہ رہا تھا۔ ”ان کی بیگم بھی کافی سمجھ بوجھ کی مالک ہیں، لیکن یہ آپ۔“

”اوہ پلیز یہ فیصلہ فیصل علی صاحب پر چھوڑ دو، ہمیں تو یہ سوچنا ہے کہ ان کی لا پرواہی کتنی کی جان نہ لے لے۔“

میں کراہ اٹھا۔ اگر واقعی ایسا ہو گیا تو میں قاتل قرار پاؤں گا۔ خدا کرے وہ شیشی بیگم رضوان کو مل گئی ہو۔

کار ایک شاندار کوشی کے پورچ میں جا کر رک گئی۔ ایک باوردی ملازم نے دروازہ کھولا۔ ”بیگم رضوان موجود ہیں۔“ میلی نے کار سے باہر نکل کر پوچھا۔

”جی ہاں..... آپ لوگ اندر آجائیے۔“ ہم لوگ ایک ہال نما شاندار ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک ادیبانہ عمر خاتون اندر داخل ہوئیں۔ عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہو گئی لیکن چہرے سے جائق و چوبند لگ رہی تھیں۔ سفید رنگ کی قیمتی ساڑھی اور نیلے بلاؤز میں وہ بڑی باوقار لگ رہی تھیں۔ انہوں نے حیرت سے ہم سب کو دیکھا اور پھر میلی کو پہچان لیا۔

”اوہ میلی تم..... خیر تو ہے۔“ ”جی بیگم صاحبہ! میں نے آج آپ کو بس پر



”اوہ ہاں بھی یہ لڑکے کارے کرکھل جاتے ہیں۔ دے بھی تم جانتی ہو کہ مجھے بس کا سفر کرتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں ہوتا۔“

”بات بہت اہم ہے بیگم صاحبہ۔“ میلی نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ”آپ کو بس میں نیلے رنگ کے تھیلے میں رکھی ہوئی کوئی شیشی تو نہیں ملی۔“

”شیشی۔ نہیں تو، کیسی شیشی تھی۔“

شمسہ سے ضبط نہ ہوسکا۔ ”معافی چاہتی ہوں بیگم رضوان۔“ اس نے کہا۔ ”میرا نام شمسہ ہے اور یہ میرے شوہر پر دفسر فیصل علی ہیں۔“ اس نے ساری تفصیل بتلا دی۔

”خدا خیر کرے۔“ بیگم رضوان نے مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یاد پڑتا ہے میں نے تم کو بس میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔“

”اور میلی نے آپ کو اس لیے ہم نے آپ کو زحمت دی۔“ اس نے مایوس لہجے میں کہا۔ ”اوہ لیکن وہ شیشی مجھے نہیں ملی۔ ایک منٹ مجھے یاد آیا کہ میرے سامنے والی سیٹ پر راجیش بیٹھا ہوا تھا۔“

”راجیش.....“ دپک نے اچھل کر کہا۔ ”یہ راجیش کون ہے۔“

”تم راجیش کو نہیں جانتے۔ شہر کا نامور مصور ہے۔“

”ممکن ہے شیشی اس کو مل گئی ہو۔“ میں نے کہا۔

”وہ رہتا کہاں ہے۔ فون ہے اس کے گھر پر۔“ احسان نے پوچھا۔

”اس طرح بدحواس ہونے سے کام نہیں چلے گا۔“ بیگم رضوان نے کہا۔ ”ممکن ہے پولیس نے شیشی تلاش کر لی ہو، ٹھہرو میں فون کر کے معلوم کرتی ہوں۔“

انہوں نے نمبر ڈائل کیے۔ چند لمحات بات کی اور پھر مایوس لہجے میں کہا۔ ”پولیس اب تک ناکام رہی ہے۔“

”آپ راجیش کو بھی فون کر لیں بیگم صاحبہ۔“ دپک نے کہا۔

”راجیش اپنے اسٹوڈیو میں ہوگا اور وہاں فون نہیں ہے۔“ بیگم رضوان نے بتلایا۔

”تو پھر ہم وہیں کیوں نہ چلیں۔“ شمسہ نے کہا۔

”میرا بھی یہ ہی خیال ہے۔“ بیگم رضوان نے کہا۔ ”لیکن کارڈ کے لے گئے ہیں، ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔“

”اس کی ضرورت نہیں بیگم صاحبہ۔“ دپک نے فوراً کہا۔ ”ہمارے پاس کار نما ایک سواری موجود ہے۔“

ذرا دیر بعد ہم شہر سے باہر والی سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ چھوٹی سی کار میں ہم سب چھٹے ہوئے بیٹھے تھے۔

”ہاں بھی، فیصل میاں یہ خود کشی کا کیا قصہ ہے۔“ بیگم رضوان نے پوچھا۔

میرے جواب دینے سے پہلے شمسہ بول اٹھی۔ ”جب سے نمینہ آیا آئی ہیں۔“ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

”جب سے وہ آئی ہیں بیگم صاحبہ پتا نہیں ان کو کیا کر دیا ہے۔“ انجمنوں نے مجھے بھی دیوانہ کر دیا ہے۔

”بڑے کام کی عورت معلوم ہوتی ہیں تمہاری نمینہ آیا۔“

”میری نہیں، وہ ان کی بڑی بہن ہیں۔“ شمسہ نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے ان کے بارے میں مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لیکن ان کی آمد سے پہلے ہم کتنے خوش تھے۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ یہ خود کشی کا ارادہ کریں گے اور پھر اب میرے لیے چپ رہنا ممکن نہیں ہے۔“ وہ اچانک سسکیاں لینے لگی، دل میں چھپا غبار بہہ نکلا تھا۔

”اگر کہیں وہ زہر کھا کر مر گیا تو خون نمینہ آپ کے سر ہوگا۔“ دپک نے کہا۔

”ایسی بات نہ کرو۔“ بیگم صاحبہ نے شمسہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا، لوہم پہنچ گئے۔“ اور ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے تھے درختوں کے جھنڈ میں کچھریلوں کی چھت کا ایک مکان نظر آ رہا تھا۔

”کیسے ٹھیک ہو جائے گا، بیگم صاحبہ۔“ دپک نے کہا۔ ”اس عورت نے شمسہ صاحبہ کے ذہن میں یہ احساس جرم بھر دیا ہے کہ وہ دانستہ فیصل علی کو حادثے کا شکار کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے خود کو بچانے کے لیے فیصل علی کو زخمی کر دیا۔ ان کے نکلنے والے ہونے کی ذمہ داری یہ ہیں۔ اس احساس نے شمسہ کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ بے چاری ذہنی اذیت اور کرب کی مرلیفہ ہو گئی ہیں۔ حالانکہ حادثہ شخص اتفاق تھا لیکن یہ نمینہ آیا بڑی بے رحمی خاتون ہیں آپ سمجھ رہی ہیں نا۔ وہ جو کچھ کہتی ہیں بس وہ سچ ہی ہوتا ہے۔“

”اوہ..... میں سمجھ گئی۔“ بیگم رضوان نے کہا۔ ”اور احسان کی بڑی بہن ہیں اس لیے شمسہ ان کی تردید بھی نہیں کر سکتی۔ یہ ہی بات ہے نا بیٹی۔“

”جی جی..... جی۔“ شمسہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم جی بھر کے رولوڈل کا غبار نکل جائے گا۔“

”لیکن یہ تو سراسر ظلم ہے بیگم صاحبہ۔“ میلی نے کہا۔ ”فیصل صاحب کو خود کشی کے بجائے اس عورت کا گلا گھونٹ دینا چاہیے۔“

”اب بھی وقت ہے بس یہ ہمت کر لیں۔“ دپک نے تاکید کی۔

میں دل ہی دل میں سلگ رہا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آپا اس بے گناہ لڑکی پر ظلم کر رہی تھیں۔

”قصہ ان کا نہیں میرا ہے۔“ شمسہ نے کہا۔ ”بزدلی میں نے دکھائی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ کسی کو بولنے کا موقع کہاں دیتی ہیں۔ مجھے تو پاگل کر دیا ہے انہوں نے۔“

”لیکن فیصل میاں! تم تو مرد ہو، تمہارا فرض تھا کہ تم اپنی بہن کو اس رویے سے روکتے۔ تم نے خود کشی کا ارادہ کر کے بڑی بزدلی دکھائی ہے۔“ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟

دپک نے میری سمت دیکھا۔ ”بیگم صاحبہ ٹھیک کہتی ہیں، دوست آپ کو کم از کم شمسہ کا خیال تو کرنا تھا۔“

”ان کو دوسروں کا خیال کب آتا ہے۔“ شمسہ نے پہلی بار شکوہ کیا۔ میرا دل تڑپ اٹھا۔ کتنا ظلم کیا تھا، میں نے اس پر۔

”تم کو بھی حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔“ بیگم رضوان نے کہا۔ ”بڑی لکھی عورت ہو مجھے دیکھو گھر بھی دیمکتی ہوں اور درجنوں فلاجی اداروں کی سربراہی بھی کرتی ہوں، عورت کمزوری کا مظاہرہ کرے گی تو ظلم کا شکار رہے گی، شکوہ کرنا بزدلی ہے، عورت کس لحاظ سے مرد سے کم تر ہے۔“

”کسی لحاظ سے نہیں، عورت تو مرد کے دل و دماغ پر بھی حکومت کرتی ہے۔“ دپک نے میلی کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

”قصہ شمسہ کا نہیں میرا ہے۔“ میں ضبط نہ کر سکا۔ ”مجھے آنکھیں کھلی رکھنی چاہیے تھیں، قصور دار میں ہوں۔“

”چلو کوئی بات نہیں، اب خیال رکھنا۔“ دپک نے تسلی دی۔

”لو، بھی ہم منزل پر پہنچ گئے۔“ بیگم رضوان نے کہا۔ ”کار میں روک لو۔ اور تم لوگ ٹھہرو، شیلہ کی موجودگی میں شاید وہ سب کا آنا پسند نہ کرے۔“

”شیلہ۔ یہاں بھی کچھ چکر ہے۔“ دپک



نے کہا، لیکن بیگم رضوان جواب دیے بغیر مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

ہم ایک وسیع اور کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ جہاں دیوار پر ہر سمت خوب صورت تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ آئل پینٹنگ کے ایسے نادر نمونے کسی فنکار کی صلاحیتوں کا زندہ ثبوت تھا لیکن ہمارے سامنے کھڑا ہوا فنکار خود ایک نمونہ تھا۔ زرد رنگ بال بھرے ہوئے لباس گلجا، لیکن آنکھیں غیر معمولی چمک دار اس کے برابر کھڑی خور و دو شیرہ مسکرا رہی تھی۔ لباس سے ظاہر تھا کہ وہ راجیش کی ماڈل ہے۔

”راجیش صاحب آپ کو بس پریزنتوں کے تیل کی کوئی شیشی تو نہیں ملی؟“ شمش نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔ ”وہ نیلے رنگ کے کاغذی تھیلے میں رکھی تھی۔“ راجیش نے جواب دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ ایک ایک کو دیکھ رہا تھا۔

”تم بس پر موجود تھے۔“ اس نے دیکھ کی سمت دیکھ کر کہا۔ ”اور تم بھی۔“ اس نے فیصل کو مخاطب کیا۔ ”باقی چہرے ابھی ہیں۔“

”ہاں..... حیرت انگیز.....“ دیکھ نے کہا۔ ”تمہاری یادداشت اتنی اچھی ہے۔“

”ہاں میں جو کچھ ایک بار دیکھ لیتا ہوں وہ ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔“ راجیش نے کہا۔ ”اور یہی میرے فن کی کامیابی کی بنیاد ہے۔“

”پھر تو تمہیں وہ شیشی بھی یاد ہوگی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”تمہارے بائیں ہاتھ میں کاغذ کا تھیلا تھا“ نیلے رنگ کا، تم خیالات میں کم تھے۔ میں نے تمہیں غور سے دیکھا تھا، کیونکہ تم بہت مایوس اور سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ تم نے جیب سے سیاہ نوٹ بک نکالی۔ وہ بتلا رہا تھا اور میرا دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔

”ہاں..... ہاں..... تم ٹھیک کہتے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”وہ شیشی..... وہ۔“

”تم نے نوٹ بک میں کچھ لکھا اور پھر سوچنے لگے اور پھر جیسے کہیں کو گئے۔ بس میں نے کچھ اور نہیں دیکھا۔ کیونکہ مجھے سامنے بیٹھی ایک خوب صورت لڑکی نظر آ گئی تھی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میسکی کی سمت دیکھا۔

میں نے جلدی سے اپنی نوٹ بک نکالی اور ورق الٹنے لگا۔ اس پر جگہ جگہ صرف ایک لفظ لکھا ہوا تھا۔ شمش..... شمش..... شمش..... وہ میرے قریب کھڑی دیکھ رہی تھی میں نے نظریں اٹھائیں تو شمش کی آنکھوں میں بے پناہ محبت اور کرب کے آنسو جھلکارہے تھے۔

”میں..... میں تم کو خط لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ایک خط۔“ راجیش نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا نام فیصل علی ہے نا۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”کسی نے تم کو نام لے کر پکارا تھا۔“

”ہاں..... ہاں.....“ میں نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”مجھے بھی یاد ہے۔ دو مرتبہ جب میں بس سے اتر رہا تھا کوئی میرا جاننے والا رہا ہوگا۔“

”کون ہو سکتا ہے، فیصل؟ آخر کون۔“ شمش نے پرامید لہجے میں کہا۔

”مجھے کچھ یاد نہیں، میں اس وقت ہر چیز سے بے پروا ہو چکا تھا۔“ میں نے بتلایا۔ ”شاید راجیش نے دیکھا ہو۔“

”میں نے توجہ نہیں کی تھی۔“ راجیش نے کہا۔ ”لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کسی کو سیٹ سے وہ تھیلا اٹھاتے دیکھا تھا۔“

”کے۔“ میں اچھل پڑا۔ میرے ساتھ ہی سب کے لبوں سے بھی یہی سوال نکلا۔ ”کون تھا وہ۔“

”ایک نوجوان، اور خوب صورت لڑکی یا عورت۔“ راجیش نے کہا۔ ”بہت خوب صورت وہ تھیلا لے کر بس سے اتر گئی تھی۔“

”کہاں کس اسٹاپ پر۔“

”میرا خیال ہے اسی اسٹاپ پر جہاں یہ اترے تھے۔“ اس نے بتلایا۔ ”پہلے اگلے اسٹاپ پر۔“

”شکل و صورت تو یاد ہوگی۔“ شمش نے بے تابی کے عالم میں سوال کیا۔

”خوب صورت تھی، جوان تھی اور بال لانے اور بھورے تھے۔“

”نازش۔“ احسان نے اچھل کر کہا۔

”اوہ..... میرے خدا وہ یقیناً نازش تھی یہاں تک کہ اس نے بدحواسی میں کہا۔

”لیکن احسان اوہ نازش کیسے ہو سکتی تھی۔“

”کیونکہ وہ نیچر کے یہاں گئی ہوئی تھی جو قریب ہی مقیم ہے۔“ احسان نے کہا۔ ”مکن ہے جہاں فیصل بس سے اتر رہے تھے وہ وہیں سے سوار ہوئی ہو اس نے فیصل کو سیٹ پر وہ تھیلا چھوڑ کر جاتے دیکھا ہو اور گھر لے آئی ہو۔ تم جانتی ہو وہ سلاڈ میں ہمیشہ زیتون کا تیل استعمال کرتی ہے۔ میرے خدا اگر اسے کچھ ہو گیا ہو تو۔“

”اوہ..... میرے خدا! تم سچ کہتے ہو میں نے سلاڈ بنانا اسی سے سیکھا ہے۔“ شمش نے کہا۔

”میرا دل ڈوب رہا تھا۔ اگر نازش کو کچھ ہو گیا تو زندگی بھر احسان سے نظریں نہیں ملا سکوں گا۔“

”خدا نہ کرے کہ وہ نازش رہی ہو۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے فوراً گھر پہنچنا چاہیے۔ میں ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتا۔“ احسان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کہیں قریب فون بھی نہیں ہے۔“

”راستے میں ٹیل کا پیڑول پپ ہے، ہم سب وہیں چلے ہیں۔“ راجیش نے کہا۔

”ہم سب کار میں ایک دوسرے پر لدے پھندے پیڑول پپ پہنچے تو ٹیلا کے باب کا منہ ہمیں دیکھ کر کھل گیا۔ لیکن ٹیلا کچھ کہے بغیر ٹیلی فون کی سمت بڑھی، احسان نے نہر بتلا دیا تھا۔ مسلسل ملانے کے بعد اس نے پکارا۔“ نمبر منسلک انجینئر مل

رہا ہے۔“

”نہ جانے کیا بات ہے۔“ احسان نے گہرا کر کہا۔

”تم نمبر ملاتی رہو۔“ دیکھ نے ٹیلا سے کہا۔ ”اگر نمبر مل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ شیشی مل گئی ہے تو خبردار کر دینا کہ اسے ہاتھ نہ لگائے۔“

”ہم فوراً ہی روانہ ہو گئے۔ راجیش نے احسان کے چہرے کی بدحواسی دیکھتے ہوئے کہا۔

”اتنا پریشان کیوں ہو بھائی! مجھے یقین ہے وہ تمہاری لڑکی نہیں تھی۔“

”اور پھر نازش بڑی سمجھ دار بچی ہے۔ وہ اس طرح ملی ہوئی چیز استعمال نہیں کرے گی۔“ شمش نے سمجھایا۔

”اس ساری پریشانی کا ذمہ دار میں ہوں۔“ میں نے اعتراف جرم کیا۔

”راجیش نے غور سے میرا چہرہ دیکھا۔ ”زندگی بڑی سندر اور قیمتی ہے بھائی، تم نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کیوں کر لیا۔“

”شاید یہ زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔“

”میلی نے کہا۔“ یا ممکن ہے کوئی صدمہ پہنچا ہو۔“

”جی نہیں تم خود جواب کیوں نہیں دیتے۔“

بیگم رضوان نے مجھ سے پوچھا، لیکن میں خاموش رہا، کیا جواب دیتا۔

”کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتے۔“ میرے برابر بیٹھی شمش نے کہا۔ ”ہماری شادی کو صرف چند ماہ ہوئے ہیں زندگی سے میں مایوس تھی۔ یہ نہیں انہوں نے مجھ پر ترس کھایا۔ مجھے مایوسیوں سے نکال کر نئی زندگی دی لیکن اب میں شاید ان پر بار بن گئی تھی۔ شاید یہ اپنے فیصلے پر پشیمان تھے۔“

”نہیں..... نہیں۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو شمش۔“ میں نے اس کا بازو پکڑے ہوئے کہا لیکن اس نے جھٹکے سے بازو پھرایا۔



”پھر کیوں تم نے یہ فیصلہ کیا۔“ اس نے لڑتی آواز میں کہا۔ ”آخر کیوں۔ شاید شہینہ آپ نے آپ سے کچھ کہا ہوگا۔ یقیناً یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ خدایا کیسے بتلاؤں اسے بیگم رضوان مجھے ملامت بھری نظروں سے گھور رہی تھیں۔ ”کیا یہ سچ ہے بھائی۔“ راجیش نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس میں آپا کا کچھ قصور نہیں ہے ان کو الزام دینا زیادتی ہوگی۔ انہوں نے تو صرف حقیقت کا احساس دلایا تھا۔“

”کس بات کا احساس۔“ شمشہ نے چونک کر کہا۔ ”یہ ہی ناکہ تم نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔ تم نے ترس کھا کر۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ شمشہ۔۔۔۔۔“ میں نے بڑے پیار سے سمجھایا۔ ”میں نے بھی یہ محسوس نہیں کیا، لیکن تم کیوں مجھ سے دور ہو گئیں تھیں۔ میں جانتا ہوں کہ میری عمر تم جیسی نو جوان اور خوب صورت لڑکی سے شادی کرنے کی نہیں تھی، تم نے میرے لیے بڑی قربانی دی تھی۔ زیادتی میں نے تمہارے ساتھ کی تھی۔“

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ایسا نہ کہو فیصل! آپا نے تم کو غلط تاثر دیا تھا۔ میں نے ایسا بھی نہیں سوچا، وہ بار بار مجھے یقین دلاتی تھیں کہ تمہارے زخمی ہونے کی ذمہ دار میں ہوں۔ میں لاشعوری طور پر تم سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یہ حادثہ میرے اس لاشعوری احساس کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے اتنی بار مجھے یہ احساس دلایا کہ میں خود کو مجرم سمجھنے لگی تھی۔“ اس نے سسکی لے کر کہا۔ ”اسی لیے مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید تم مجھ سے نفرت کرنے لگے ہو۔ میں سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تم نے مجھ پر اتنے احسانات کیے ہیں کہ میں اس کے لیے بھی

تیار تھی۔ میرا خیال تھا کہ آپا نے تم کو اس بات پر آمادہ کر لیا۔“

”لیکن وہ تو ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ شمشہ تم اس کے لیے کیسے قصور وار ہو سکتی ہو۔“ میں نے سرگوشی سے کہا۔

”میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اشارتا کئی بار کہا بھی، لیکن وہ تمہاری بڑی بہن ہیں، تم ان کا احترام کرتے ہو، اس لیے میں نے سوچا کہ تم کو ان ہی کی بات پر یقین ہوگا۔“

”یہاں سے دائیں جانب موڑ لو۔“ احسان نے تقریباً چلا کر کہا۔ ”بس وہ سامنے والا مکان میرا ہے۔“

کار احسان کے گھر کے سامنے رک گئی۔ وہ کو در باہر نکلا اور تیزی سے مکان کی سمت لپکا۔ ہم سب بھی اس کے پیچھے تیزی سے بڑھے۔ میرا دل زور زور سے اچھل رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ خدایا سب خیر ہو اسی لمحے دروازہ کھلا اور نازش بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ ”اوہ پاپا۔۔۔۔۔ مل گئی وہ شیشی۔۔۔۔۔؟“

”شیشی اس لڑکی نے نہیں اٹھائی تھی۔“ راجیش نے فوراً کہا۔

احسان نے محبت اور خوشی سے نازش کو سینے سے لگا لیا تھا۔ ”خدایا حیرا شکر ہے، میں تو سمجھ رہا تھا کہ شیشی تم نے سیٹ سے اٹھائی ہے۔“ اس نے کہا۔

”میں نے۔“ نازش نے حیران ہوتے کہا۔ ”آپ کو یہ خیال کیسے آیا۔ ذرا دیر پہلے ایک عورت کا فون بھی آیا تھا۔ شاید شیلانا تمہارا س کا۔ وہ بھی یہی پوچھ رہی تھی، ہم نے تو یہ جبر ریڈیو پر سن لی تھی۔ وہ وقفہ وقفہ سے خبردار کر رہے تھے۔“ ”جب تو آپا کو بھی خبر ہو چکی ہوگی۔“ میں نے شمشہ سے کہا۔

”نہیں انکل شاید ان کو خبر نہ ہو۔“ نازش نے کہا۔ ”ریڈیو والے آپ کا نام نہیں کر رہے

ہیں۔ ارے آپ لوگ کیا ہمیں کھڑے رہیں گے اندر آئیے آپ لوگ۔“

ہم سب اندر داخل ہو گئے۔ احسان نے اپنی خوش دامن سے سب کا تعارف کرایا۔ بیگم رضوان بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے احسان کی خوشدامن کو مخاطب کر کے کہا۔ ”احسان بڑی محبت کرتا ہے آپ سے، سارے راستے پریشانی سے برا حال تھا غریب کا۔“

”اس کے اور نازش کے سوا میرا ہے ہی کون اس دنیا میں۔“ انہوں نے کہا۔ ”لیکن بیٹے تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ نازش کسی ملی ہوئی چیز کو کھانے کی بات سوچے گی۔“

”بس ای پریشانی میں طرح طرح کے دوسرے پیدا ہو رہے تھے۔“

”میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ شیشی اٹھانے والی لڑکی تمہاری نہیں ہو سکتی، وہ عمر میں کافی بڑی تھی۔“ راجیش نے کہا۔

”تو پھر کون تھی وہ۔“ شمشہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”خدا کے لیے یاد کرنے کی کوشش کرو۔“

”ہم سب کو دعا کرنی چاہیے کہ وہ محسوس مل جائے۔“ احسان کی خوشدامن نے کہا۔ ”جانے یہ پولیس والے اب تک کیا کر رہے ہیں۔“

”شمشہ! میں معلوم کرتی ہوں۔“ بیگم رضوان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”فون کہاں ہے۔“ ذرا دیر بعد انہوں نے آکر بتلایا کہ پولیس کو اب تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب لوگ میری حماقت کی سزا بھگت رہے تھے۔ مجھے خود پر شرم آنے لگی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ سب کو اتنی پریشانی ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہ تم حماقت کرتے اور نہ ہی ہم دونوں کی ملاقات ہوئی۔“ دپک نے پرسش کی نظروں سے میلی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو تمہارا مشکور ہوں۔“

”خوب کسی کی جان گئی۔ آپ کی اٹھری۔“ میلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ساختہ سب ہنس پڑے۔ نازش شربت بنا کر لے آئی۔ سب تھکے ہوئے تھے۔ شربت پل کر تازہ دم ہو گئے۔ بیگم رضوان نے احسان سے دوستی کر لی تھی۔ دونوں باتوں میں منہمک تھے۔ اچانک انہوں نے احسان کی سمت دیکھ کر کہا۔ ”مجھے تو حیرت ہے احسان نے دوسری شادی نہیں کی۔“

”احسان کو نازش سے بڑا پیار ہے۔“ شمشہ نے کہا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ آئی میں تو پاپا سے ہمیشہ ضد کرتی ہوں کہ میرے لیے ایک خوب صورت سی امی لے آئیں۔“ نازش نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بالکل آپ کی طرح۔“ میرا دل ڈوبنے لگا۔

”لیکن لڑکی! کیا تم سوتیلی ماں کو گوارہ کر لو گی۔“

”سب جہالت کی باتیں ہیں۔“ نازش نے کہا۔ ”مجھے بھی یہ خیال بھی نہ آیا، اگر آئی شمشہ کی عمر زیادہ نہ ہوتی تو میں پاپا کے لیے ان کو پسند کر لیتی۔“

شمشہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ سب نے بے ساختہ قہقہہ لگایا لیکن میں حیران رہ گیا تھا۔ وہ شمشہ کی عمر زیادہ بتلا رہی تھی۔

”بھئی سچ پوچھو تو شمشہ کی عمر کچھ ایسی تو زیادہ نہیں ہے۔“ بیگم رضوان نے کہا۔ ”میں تو یہ کہوں گی کہ وہ فیصل علی کی بیوی نہیں بنی لگتی ہے۔“ ایک لمحہ کو سناٹا چھا گیا۔

”ہاں نہیں آپ لوگوں کو یہ عمر رسیدہ کیوں لگتے ہیں۔“ شمشہ نے غصے میں کہا۔ ”مجھے تو جوان لوگ بھی پسند نہیں تھے۔ میں ایک سنجیدہ شریک حیات کو پسند کرتی ہوں۔“

”مجھے تم سے پورا اتفاق ہے۔“ راجیش



نے فوراً تائید کی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، خدایا! آپا نے ہمیں کتنی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

شمینہ آپا کو بھی میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ شمسہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ”لیکن..... لیکن میں سچ کہتی ہوں، شادی سے پہلے ہی میں ان سے بے پناہ محبت کرنے لگی تھی۔“

”لیکن..... لیکن آپا تو کہتی ہیں کہ تم کو مجھ میں باپ کی محبت اور جھلک نظر آتی ہے۔“ میں نے نہ جانے کیسے کہہ دیا۔

”غلط کہتی ہیں وہ۔“ شمسہ غصے سے چیخی۔

”تم میرے والد کو نہیں جانتے۔ وہ ہمیشہ کے انتہائی بچل بچل، تنگ نظر اور خود غرض تھے۔ میری ماں اسی غم میں مگر گئی بے شک وہ میرے باپ تھے میں ان سے محبت کرتی تھی لیکن ان کا تم سے کیا موازنہ؟ تم انتہائی فراخ دل، ہمدرد اور محبت کرنے والے ہو اور میں آپ کو ایک عظیم انسان سمجھتی ہوں۔“ وہ اچانک سکیاں لینے لگی۔

سب حیرت سے شمسہ کو دیکھ رہے تھے۔ میرا دل جاہ رہا تھا کہ اسے سینے سے لگا لوں، آپا نے ہمیں کس جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ وہ ہمارے ذہن میں کیسا زہر گھول رہی تھیں۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ آپا زہر کی پڑیا ہے۔“ دیکھ نے کہا۔ ”وہ یقیناً ذہنی مریض ہیں۔ شعور..... لاشعور..... اسی بہانے وہ تمہاری زندگی تباہ کر رہی ہیں۔“

”وہ ہمیشہ مجھ سے یہ ہی کہتی رہتی ہیں کہ مجھے کسی نوجوان شخص سے شادی کرنا چاہیے۔“ شمسہ نے کہا۔ ”احسان جیسے نوجوان اور خوب صورت شخص سے۔“

”خدا کی پناہ۔“ میں کرایا۔ ”مجھ سے تو وہ کہتی رہتی ہیں کہ میں عمر میں تم سے بہت بڑا ہوں، معذور ہوں، تم سے شادی کر کے ظلم کیا ہے میں نے۔“

”محبت عمر اور خوب صورتی کی محتاج نہیں ہوتی۔“ راجیش نے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ شمسہ نے کہا۔ ”حادثے کے بعد تو میں ان کی پرستش کرنے لگی ہوں۔ کاش میں بتلا سکتی کہ میری محبت اتنا ہر ہے۔“

”خدا تم دونوں کو تمہاری محبت پر قائم رکھے۔“ احسان نے کہا۔ ”اور خدا کرے وہ زہر کی شیشی مل جائے تو اطمینان ہو جائے۔“

”آؤ..... شمسہ ہم دونوں گھر چلیں۔“ میں نے اسے محبت سے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

”ریلیکس ہو جاؤ، آپا کا کیا حال ہے۔“ ہم گھر میں داخل ہوئے تو شمینہ آپا میز پر کھانا لگا رہی تھیں، ہمیں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتے دیکھ کر ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”حد کر دی تم دونوں نے۔“ انہوں نے غصے میں کہا۔ ”اس طرح گھر کھلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔ احسان تم اس عمر میں بھی کتنے غیر ذمے دار ہو۔“

مجھے ان کی حال دیکھ کر ترس آ گیا۔ انہوں نے ساری زندگی تنہا گزار دی تھی۔ نہ شوہر کی محبت پائی تھی، نہ والدین کی شفقت اور محبت سے ان کا حقد فطری تھا۔ بے چاری محبتوں کی لذتوں سے نا آشنا تھیں۔

”آپا آج ہم دونوں بہت خوش ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کے ہوتے ہوئے گھر کی فکر کرنا کیسا۔“

آپا نے شمسہ کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر محبت سے بولیں۔ ”جاؤ تم دونوں ہاتھ منہ دھو لو، میں نے کھانا تیار کر دیا ہے۔“ انہوں نے ہمیں ایسے حکم دیا جیسے ہم بچے ہوں۔

ہم خاموشی سے باہر نکل آئے۔ آپا کو اب تک کچھ خبر نہ تھی۔ ہم تازہ دم ہو کر واپس گھرے

میں لوٹے تو کھانا میز پر لگا ہوا تھا۔ ”آج آپ کو بڑی زحمت ہوئی آپا۔“ شمسہ نے کہا۔

”چلو کھانا شروع کرو۔“ انہوں نے حکم دیا۔ ”اور مجھے ملاؤ کہ تم دونوں کیا کرتے رہے ہو۔“

”ہم آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔“ شمسہ نے کہا۔ ”اور امید ہے آپ ہمیں معاف کر دیں گی۔“ آپا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں..... آپا غلط فہمیوں کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔“ میں نے ہمت کر کے کہا۔

”اوہ..... تو تم آپس میں باتیں کرتے رہے ہو۔“ آپا نے ہمیں ملامت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو تم دونوں میرے بچوں کی طرح ہو گئے تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہ تھی۔ میں تو صرف تمہاری اپنی بھلائی کے لیے۔“ میں نے بات کاٹ کر کہا۔ آپا کی آنکھیں حیرت سے کھیل گئیں۔ ہونٹ پھڑکنے لگی۔ انہیں اچانک جیسے دھچکا لگا ہو۔

”کیا یہ سچ ہے شمسہ۔“

”ہاں..... آپا..... میں ان سے پرستش کی حد تک محبت کرتی ہوں یہ میرا آئیڈیل ہیں۔“

”اوہ..... بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر۔“ انہوں نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔ بے چاری آپا انہیں سخت مایوسی ہوئی تھی۔

”اب کھانا شروع کرو، ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

لیکن اسی لمحہ دروازہ کھلا اور سب تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ راجیش سب سے آگے تھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ دکھا رہا تھا۔ ”بھائی فیصل ہم نے پتا لگایا۔“

”ہاں..... اب بالکل فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ذپک نے نعرہ لگایا۔

”کیسے..... کب..... خدا کے لیے کچھ تو سہی۔“ شمسہ چلائی، آپا حیرت سے منہ پھا سب کو دیکھ رہی تھیں۔

”میں بتلائی ہوں۔ اکل۔“ نازش بڑھتے ہوئے کہا۔ ”جب مجھے معلوم ہوا کہ راجیش اکل مصور ہیں تو میں نے ضد کی کہ اس عورت کی تصویر بنا کر دکھائیں جسے شیشی اٹھاتے رہا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”اور جانتے ہیں انہوں نے جو تصویر بنائی وہ کس کی تھی۔ نادرہ کی شیشی..... نادرہ نے اٹھائی تھی۔“

”کیا.....؟“ میں اچھل پڑا۔ ”نادرہ..... وہ خیریت سے ہے۔“

”بھلا کی خوب صورت عورت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پولیس اس کے مکان پر چلی گئی اب کسی فکر کی ضرورت نہیں۔“ آپا..... اکل..... کون سی عورت؟

”ہم آپ کو بتا لے لی جا رہے تھے آپا۔“ شمسہ نے کہا۔ ”خدا نے بڑی بھلائی۔“

”اوہ..... تو یہ ہیں شمینہ آپا۔“ ذپک نے آپا کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”سب انہی کا کیا دھرا ہے۔“

”فیصل! کون ہیں یہ بدتمیز شخص۔ میں اپنے ہی گھر میں بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ غصے میں کانپتے ہوئے بولیں۔

لیکن میری نگاہیں بچن کے ایک ریک پر مرکوز تھیں۔ میں ہر چیز اور ہر بات سے بے پروا آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہا تھا۔ ”شمسہ.....“ میں اچانک چیخا۔ ”وہ..... وہ کاغذ کانپے رنگ کا تھیلا، وہ بچن میں کہاں سے آیا۔“ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ہر نگاہ بچن میں دیکھ رہی تھی۔

”تو بے فیصل تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔“ آپا نے کہا۔ ”وہ نادرہ یہاں آئی تھی۔ گھر خالی



بڑا تھا۔ اس لیے وہ زیتون کی شیشی گھر میں رکھ دی گئی تھی۔ تم بس میں بھول آئے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تم کو آواز بھی دی، لیکن جیسے تم نے سنا ہی نہیں۔ اس لیے اس نے بعد میں دوبارہ یہاں آ کر مجھے بتلایا تھا۔“

”آپا.....“ میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔  
”کیا..... کیا آپ نے ریڈیو پروگرام نہیں سنا۔“  
”تم جانتے ہو مجھے چڑ ہے ان ریڈیو پروگراموں سے۔“

”وہ شیشی کہاں ہے آپا۔“ شمشہ دہشت زدہ لہجے میں بولی۔ ”وہ زیتون کے تیل والی شیشی۔“

”سلا دینا کے بعد میں نے الماری میں رکھ دی۔ آخربات کیا ہے۔“ وہ غصے میں بولیں۔  
”آپ نے اس سلا میں کیا ملایا ہے۔“  
میں نے گھبرا کر پلیٹ کی سمت دیکھا۔

”ہاں..... اس سلا میں پی نہیں گئی میں۔“  
انہوں نے برہم ہو کر کہا۔ ”لو..... چکھ لو۔ شمشہ کے بنائے ہوئے سلا سے کم مزے دار نہیں۔“  
”آپا.....“ شمشہ دہشت زدہ ہو کر چچی۔  
”خدا کے لیے ہاتھ نہ لگایے اسے یہ زہر ہے خطرناک زہر۔“

”کھالینے دو تھوڑا سا۔“ دیک نے آہستہ سے کہا۔ ”قصہ تمام ہو جائے گا۔“

اجانک سب کے قہقہے گونج اٹھے۔ آپا غصہ ناک انداز میں اٹھیں۔ ”فیصل! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میرے ساتھ ایسا سلوک کرو گے۔ میں بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک لمحہ بھی نہیں پتھروں کی میں اس گھر میں۔“ وہ اتنی غضب ناک تھیں کہ سب خاموش ہو گئے۔

”نہیں آپا یہ آپ کا گھر ہے۔“ شمشہ نے لپک کر انہیں روک لیا۔ ”آپ کو نہیں معلوم کہ ہم سب دوپہر سے اب تک جتنے پریشان رہے ہیں۔“ اس نے مختصر آپا کو سب کچھ بتلادیا۔

”خدا کی پناہ فیصل۔“ آپا نے کہہ دیا۔  
”ہو کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔“ اگر تم کو خدا نہ کہے ہوتا ہو جاتا تو میں کیا کرتی۔“ ان کی آواز بھرا کی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ”میرا کون تمہارے سوا دنیا میں۔“

”لاشعور..... آپ لاشعوری طور پر انہیں گل کرنا چاہتی تھیں۔“ دیک نے کہا۔  
”ہوش میں تو ہوئے۔“ آپا فوج کر بولیں۔  
”میں اپنے بھائی کو قتل کر سکتی ہو لی۔“  
”تو کیا شمشہ اپنے شوہر کو قتل کر سکتی ہے۔“ دیک نے کہا۔ ”اب جان جایے کہ حادثہ اتفاقیہ ہوتے ہیں۔“

”بند کرو اس بحث کو۔“ بیگم رضوان ڈانٹا۔

میں نے لپک کر انہیں گلے لگالیا۔ ”آپا سب کچھ غلط فہمی سے ہوا۔ معاف کر دیجئے ہم سب کو۔“

”ہاں..... ہم سب آپ سے شرمندہ ہیں۔“ شمشہ بھی ان سے لپٹ گئی۔ آپا رو رہی تھیں، میرا دل ان کے درد کو محسوس کر رہا تھا۔  
”تم میری وجہ سے خودکشی کرنے جا رہے تھے۔“ انہوں نے شکوہ کیا۔ ”میری وجہ سے۔“  
”شمینہ بہن۔“ بیگم رضوان نے کہا۔ اب جانے دیجئے آپ ان دونوں کی بزرگ ہیں۔“

”ہاں..... آپا جانے دیجئے۔“ دیک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو میلی بھی رونے والی ہے اور میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔“

سب ہنس پڑے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔ محبت کی زندگی، شفقت کی زندگی، زہر کی اس شیشی نے زندگی کا سارا زہر دور کر دیا تھا۔

